



انوارِ مثنوی

مولانا رومؒ

تحقیق وترتیب

محمد طاہر ہاشمی

ایم اے علوم اسلامیہ

ایم اے تاریخ

الصلوٰۃ والسلام علیک یاسید نا

رسول اللہ ﷺ

الصلوٰۃ والسلام علیک یاسید نا

حبیب اللہ ﷺ

انتساب

عشق اوّل کے نام جو سرّ دلبراں، جانِ جاناں، محبوب اکمل ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

نام کتاب	انوارِ مثنوی مولانا رومؒ
تاریخ اشاعت	اگست 2023ء بمطابق محرم الحرام 1445ھ
طباعت	محمد طاہر ہاشمی سروری قادری
ٹائیٹل	پروفیسر محمد حسان ہاشمی
تکنیکی خدمات	محمد انس الہاشمی
ہدیہ	
تعداد	برقی

ضروری وضاحت

ایک مسلمان دینی کتابوں میں دانستہ غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔
غلطیوں کی تصحیح واصلاح کے لئے ہمہ وقت تیار۔ اگرچہ کتاب کی طباعت کے
دوران اغلاط کی تصحیح پوری توجہ سے کی جاتی ہے تاہم انسان غلطی کا پتلا ہے۔
غلطی رہ جانے کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا احباب سے گذارش ہے کہ جو غلطی
نظر آئے تو مطلع فرمائیں تاکہ اسے درست کیا جاسکے۔ نیکی کے کام میں آپکا
تعاون یقیناً صدقہ جاریہ ہوگا۔

رابطہ: hashmipk786@gmail.com

تحقیق و مرتبہ

ناچیز کا نام محمد طاہر ہاشمی ولد نور احمد ہاشمیؒ ہے۔ بندہ ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ والدین اللہ کی عظیم نعمت ہوتے ہیں۔ قبلہ والد گرامی اولیاء میں تھے زمیندار تھے کچھ عرصہ گاؤں کی نمبرداری کی لیکن چھوڑ دی۔ مزاج میں غنا اور تصوف کی فراوانی تھی زیادہ عرصہ فقر و درویشی میں گذارا۔ رجسٹرڈ پریکٹیشنر تھے لیکن طب کی پریکٹس کی نہیں کہتے تھے کہ اس سے دل مطمئن نہیں ہوتا یا تو انسان فی سبیل اللہ خدمت کرے۔ 58 سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اللہ کریم جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنائت فرمائے اور اپنی رحمت سے نوازے آمین! نے اور والدہ محترمہؒ نے چلنا پھرنا اور باتیں کرنا، قائدہ پڑھنا اور ابتدائی تعلیم کا آغاز کروایا۔

والدہ محترمہ کی علمی استعداد، معاملہ فہمی اور بروقت علمی پکڑ ہمیں آخر تک لاجواب کر دیتی تھی۔ امی جی سکول سے پڑھے ہوئے تو نہ تھے پر گھر میں اپنے والد گرامی قدر جناب محمد عظیمؒ ہاشمی قدس سرہ العزیز! سے تعلیم حاصل کی تھی جو پورے علاقے میں تقویٰ و بزرگی میں جانے پہچانے جاتے تھے، سے حاصل کی تھی۔ کمال کا حافظہ تھا۔ اللہ کریم انکی قبر پر اپنی کرم و فضل کی بارش ہمہ وقت فرماتا رہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِهٖ و صحبه و بارك وَسَلِّمْ۔

اللهم اغفر لی وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ والمؤمنات

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِیْ صَغِيرًا

رَبَّنَا اغْفِرْ لِی وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ

ابتدائی تعلیم اوکاڑہ کے دور افتادہ ایک گاؤں چک 18 جی ڈی میں حاصل کی۔ پرائمری میں سکول ٹاپ کیا اور وظیفہ کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا وظیفہ لگا لیکن ملا نہیں۔ قرآن پاک اور ابتدائی تعلیم ایک عظیم درویش و حافظ جناب قبلہ عبد الرشید صاحب سے حاصل کی۔ حافظ صاحب قبلہ نابینا تھے لیکن صاحب کرامت تھے۔ ان کی منزل سننا، ان کے لئے کتاب خوانی کرنا بندۂ ناچیز کے سپرد تھا۔ بالخصوص رمضان المبارک میں۔ وقت بغیر گھڑی دیکھے بتا دیتے تھے۔ تجوید و قرآت کچھ عرصہ قاری خوشی محمد الازہریؒ سے حاصل کی تھی۔ بلا کا حافظہ تھا۔ ایک دفعہ کوئی مل لیتا تو مدتوں بعد اسے پہچان لیتے۔ اللہ کریم ان کی مرقد کو اپنے نور سے منور کرے آمین!

پھر قبلہ ماموں "پھوپھا" جان جناب غلام یٰسین ہاشمی نور اللہ مرقدہٗ سے درس لیا۔ پورے علاقے میں ماہر طبیب اور اللہ کے بر گذیدہ بندے کے طور پر جانے جاتے تھے۔ جب تک حیات رہے پورے گاؤں میں صرف ایک جگہ جمعہ ہوتا تھا۔ خدمت خلق جبلت میں تھی۔ گھر سے کئی لوگوں کا کھانا جاتا تھا یہ خدمت بندہ کے حصہ میں تھی۔ دو تین تو یاد ہیں، ایک بابا جمعہ خادم مسجد، ایک محمد رفیق صوفی کھڈی کا کام کرتے تھے، اور عبد الحمید ڈسپنسر، باقی یاد نہیں۔

ماموں جان بڑے وضع دار شخصیت کے حامل تھے۔ گاؤں کی پنچائت کے سربراہ تھے، زمیندار تھے اور ایک بڑے باغ کے مالک تھے۔

اس کے بعد بندہ کے والدین قدس سرہ العزیز! اوکاڑہ شفٹ ہو گئے۔ وہاں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں میں پاس کیا اور کلاس میں دوسری پوزیشن لی۔ اوکاڑہ ایک علمی شہر تھا۔ اس میں مولانا غلام علی اکاڑویؒ، جناب سید صاحب، کچھ عرصہ مفتی محمد شفیع اکاڑویؒ بعد ازاں کراچی چلے گئے، مفتی الہ یار، پہلے کچھ عرصہ جناب علامہ احمد سعید کاظمیؒ صاحب اور مفتی غلام سرور قادریؒ صاحب جو بعد ازاں لاہور اور ملتان بالترتیب منتقل ہو گئے تھے، علاوہ ازیں مفتی محمد اقبال چشتیؒ جو 2023 میں انتقال فرما گئے تھے کی خدمات لافانی ہیں۔ ان کے علاوہ اہل حدیث علماء جامعہ محمدیہ میں معین الدین لکھوی، اور عبد الحلیم صاحب بڑی علمی شخصیات تھیں، دیوبندی علماء میں محمد امین صفدر بڑے نامور علمائ تھے۔ ان میں سے اکثر علمائ سے دروس لئے۔

اس کے بعد ہم سمبڑیال شفٹ ہو گئے باقی تعلیم سیالکوٹ اور پسرور سے حاصل کی اور محکمہ تعلیم میں بحیثیت استاد فرائض سر انجام دئے۔ آخر میں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سے ریٹائرمنٹ لی۔ 1985 سے 2014 تک مختلف مساجد میں خطابات جمعہ سرانجام دیئے۔ اور اب مختلف مضامین میں تحقیق کر کے وٹس ایپ پر گروپوں میں شئیر کر رہا ہے۔ اور انہیں ای بک بنا رہا ہے۔ اللہ کریم انہیں مقبول بنائے اور ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین بجاہ نبیہ الکریم الامین ﷺ!

الشکر والحمد للہ جل فی علاہ فالیہ ینسبی الفضل کلہ فی الکمال ویبقی للہ وحدہ

اللّٰهم لك الحمد أنت قلت وقولك الحقّ المبين، قل صدق الله، فاتّبعوا ملّة إبراهيم حنيفاً، ومن أصدق من الله قيلا، ومن أصدق من الله حديثاً، وأشهد أن لا إله إلاّ الله، المتوحّد في الجلال بكمال الجمال تعظيماً وتكبيراً، المتفرّد بتصريف الأمور على التّفصيل والإجمال تقديراً وتدبيراً، وأشهد إن نبيّنا محمّد عبده ورسوله، أرسله إلى عموم الثّقلين بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً،

لا إله إلاّ الله، ربّ الأرباب، ومسبّب الأسباب، وخالق خلقه من تراب، فسبحان من خضعت لعظمته الرّقاب، ولانت لجبروته الصّعاب، وذلّت له الشّدائد الصّلاب، غافر الذّنب وقابل التّوب شديد العقاب، ذو الطول لا إله إلا هو عليه توكّلت وإليه متاب، لا إله إلا الله، الكريم، الحليم، العظيم، ربّ العرش العظيم، ونحن على ما قال ربنا وخالقنا من الشّاهدين، ولم ألزم وأوجب غير جاحدين،

والحمد لله ربّ العالمين،

وصلوات الله وسلامه على سيّد الأوّلين والآخرين، وخاتم الأنبياء والمرسلين، وعلى أزواجه أمّهات المؤمنين، وعلى آله الطّيبين الطّاهرين، وعلى صحابته الغرّ الميامين،

اللّهم أرضى عنا معهم برحمتك يا أرحم الرّاحمين،

فہرست

ضروری وضاحت 5
تحقیق و مرتبہ 6
مولانا جلال الدین رومیؒ کے حالات زندگی 31
علم الاسماء 36
مثنوی معنوی 36
مثنوی دکان وحدت 42
معنون 50
خود غریبے در جان چُون شَمس نیست 52
مولانا رومؒ شمس کی شکل میں اپنے شیخ کو دیکھتے ہیں 53
شاہ شمس کی پہلی کرامت 55
شَمُس در خارج اگرچہ ہست فَرد 57
شَمُسِ جان کو خارج آمد از اَثیر 58
سورج کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں، برکتیں اور نشانیاں ہیں 59
در تَصوّر ذاتِ اوراگُنج کُو 61
سچائی کا وہ سورج انسان کے تصور میں کہاں فٹ ہوتا ہے کہ وہ اس کے تصور میں آجائے؟ 61
ادراک 63
چون حَدیثِ روئے شَمسُ الدّین رَسید 64
قرآنی لفظِ 'سمآء' کے مفاہیم اور سات آسمانوں کی حقیقت 65
کائنات سے متعلق سات آسمانوں کا تصوّر 67
فلکیاتی تہوں کے تناسُب میں سات آسمانوں کا ذِکر 68
سات آسمانوں کا معنی 69
قرآن۔۔۔ محبوب حقیقی کا خط 70
واجِب آمد چونکہ بُردم نامِ اُو 72
روحانی تربیت کرنے والے میں درج ذیل گیارہ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے 74
ایں نَفَس جانْ دامَنم بَر تافتہ ست 75
بہت فاصلہ سے حضرت یعقوب تک حضرت یوسف کی خوشبو پہنچنے کی توجیہ 77

تفندون کے معانی 77
ضلال کے معانی 78
حضرت یعقوب کی بینائی کا لوٹ آنا 79
اپنے مظالم کو دنیا میں معاف کرالینا 79
بیٹوں کے استغفار کو موخر کرنے کی وجہ 79
کز برائے حقِ صُحبت سالہا 82
انسانی طبیعت پر ماحول کا اثر 83
نیک صحبت کی اہمیت 85
صحبتِ صالح کے ثمرات 87
صحبتے با اولیاء 87
تا زمین و آسمان خنداں شود 88
لَا تُكَلِّفْنِي فَإِنِّي فِي الْفَنَا 93
فنا ہونا بھی ایک اعتبار سے نعمت ہے 94
فنا ایک کیفیت ہے یا ایک حال ہے 95
عرفان میں مقام فنا 95
فنا کے تین درجے ہیں 96
كُلُّ شَيْءٍ قَالَهُ غَيْرُ الْمُفِيقِ 97
دیوانے کی طلاق واقع نہیں ہوتی 98
فقیر یا درویش پر 2 کیفیات طاری ہوتی ہیں 98
خالص محبت کی علامات تین ہیں 99
من چگویم یک رَگم ہُشیار نیست 101
جذب و سلوک کیا ہے؟ 101
اقسام جذبہ 102
سلوک کا معنی 104
طریق سلوک 104
جی اٹھے مردے تری آواز سے 105
شرح این ہجر اں وایں خونِ جگر 106
ہجر عربی زبان کا لفظ ہے 107

قالَ اَطْعِمْنی فَاِنّی جائِع'' 110

نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کی سیرت سے ہمیں بامقصد زندگی گزارنے کا سبق ملتا ہے 113

صوفی اِبنُ الوَقت بَاشد اے رَفیق 115

صوفی 115

ابن الوقت 115

قرآن وحدیث میں مؤمنین کو مخاطب کرنے والے الفاظ 116

(1)ذاکرین 116

(2)صابرین 117

(3)خاشعین 117

(4)صادقین 118

(5)قانتین 118

(6)موقنین 119

(7)مخلصین 119

(8)محسنین 120

(9)خائفین 121

(10)وجلین 122

(11)عابدین 122

(12)متوکلین 122

(13)متقین 123

(14)مقربین / مقربون 123

(15)ابرار 124

(16)فقراء 124

(17)عباد 125

(18)اولیاء 127

صُوفیاء کے لفظِ صُوف (اُون) کی اصل 128

صُوفِی اِبنُ الحَال بَاشَد درِ مِثَال 130

صوفی بھی دو طرح کے ہوتے ہیں 131

تصوف میں ہر عمل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے 131

وقت اور اس سے متعلق عواملات کو سمجھنے کے لئے 134
تو مگر خود مَردِ صوفی نیستی؟ 136
گُفتَمَش پوشیدہ خُوشتَر سِرِّ یار........ 138
جو چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنتا ہے دیکھیں کس قدر شدید وعید آئی ہے 139
راز امانت ہے 140
خوش تَر آن باشد کہ سِرِّ دِلبَران........ 142
گفت مُکشوف و برہنہ، بی غُلول........ 142
پَردہ بَردار و بِرِہنہ گو کہ من........ 144
گفتم اَز عُریان شود او در عِیان 146
آرزو می خواہ، لیک اندازہ خواہ........ 148
آفتابی کَز وِیٔ این عالَم فُروخت 150
تجلیِ الٰہی اور واقعہِ طور 151
اللہ کے نورانی حجابات (حدیثِ نبوی ﷺ) 152
نورِ الٰہی سے کائنات کی روشنی........ 153
انسانی استعداد اور اعتدال 153
سائنسی تشریح(Scientific Perspective) 154
فلسفیانہ تشریح(Philosophical Perspective) 155
تمثیل کا خلاصہ 156
حقیقت کا ادراک........ 156
سورج بطور حقیقتِ مطلق 156
براہِ راست سامنا کرنے کی تاب نہ لانا 156
نتیجہ 157
فِتنہ و آشوب وخون ریزی مَجوی 159
شمسِ تبریزیؒ کا ذکر اور جلالِ الٰہی 160
"فتنہ و آشوب" سے مراد 160
خاموشی کی تلقین........ 160
وجدانی نکتہ 160
فتنہ اور آزمائش 161

کتمانِ سر (راز کو چھپانا- سنتِ نبوی ﷺ) 161
جلالِ الٰہی سے لرزہ بر اندام ہونا 162
اتباعِ نبوی ﷺ اور اعتدال 162
نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ صحابہ کرام کی تربیت میں توازن رکھا 162
ریاضی اور جیومیٹری کے اصولوں پر اس شعر کی بحث 163
این ندارد آخر، از آغاز گوئ 167
اس شعر کے دو اہم پہلو ہیں: ایک ادبی اور دوسرا صوفیانہ 168
بے پایاں حقیقت 168
تکرارِ ذکر 169
کلماتِ الٰہی کی بے انتہا وسعت (بے پایاں حقیقت) 169
قرآنی اسلوب (تکرارِ قصص) 170
معرفتِ الٰہی کا سفر 170
حقیقتِ محمدی ﷺ 171
اس ولی کا بادشاہ سے خلوت (تنہائی) طلب کرنا، تاکہ کنیز کے رنج و درد کی حقیقت معلوم کر سکے 173
گفت ای شہ خَلوَتی کُن خانہ را 173
ظاہری مفہوم 173
روحانی و عرفانی مفہوم 174
خلوت کی اہمیت 174
دل کی یکسوئی اور انابت 175
خلوت اور ذکرِ الٰہی (سنتِ نبوی ﷺ) 175
وجدانی حقیقت 177
خلوت میں خودی 181
سائنسی فکر 183
کس ندارد گوش در دِہلیزہا 185
نفسیاتی نکتہ 185
روحانی اشارہ 186
امانت اور رازداری (حفظِ اسرار) 186
دوسروں کی غلطیوں کو چھپانے کی ترغیب 187

تزکیہ نفس اور تخلیہ (دل کی صفائی) 187

خلوت اور مناجات (اللہ سے تنہائی میں کلام)........ 188

حکمت اور بصیرت........ 188

علامہ اقبال کے مطابق (خودی اور مردِ مومن) 189

طبی اور سائنسی لحاظ سے اس کے اہم پہلو درج ذیل ہیں........ 191

خانہ خالی ماند و یک دَیّار نَہ 193

حکایتی پس منظر 193

قلبِ سلیم: دل کا غیر اللہ سے خالی ہونا........ 194

خلوت اور دعا: بندے اور رب کا مکالمہ 195

اللہ ہی حقیقی طبیب (الشافی) ہے 196

اخلاص: شرکِ اصغر کی نفی 196

نَرمُ نَرمَکْ گفت شہرِ تو کجاست؟........ 201

تعبیر: روحانی طبیب (مرشد) مرید سے یہ پوچھ رہا ہے کہ "تیری تڑپ کا مرکز کیا ہے؟" کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ روح کس "شہر" (خیال یا تعلق) کی اسیر ہے، اس کی بے قراری کا علاج ممکن نہیں۔........ 203

"علاجِ اہلِ ہر شہری جدا است": انفرادی سلوک 203

کثرت میں وحدت کا ادراک........ 204

حکمت کے ساتھ دعوت دینے کا حکم 204

نبی ﷺ کا تربیتی اسلوب 205

آسانی پیدا کرو، سختی نہیں........ 205

قرآن و سنت کے مطابق، انسان اس دنیا میں ایک اجنبی (Stranger) ہے 209

عہدِ الست: ہماری اصل پہچان........ 210

اصل وطن کی طرف واپسی (The Concept of Home)........ 210

وجودی تنہائی اور "گھر" کی تلاش (Existential Loneliness) 211

دست بر نَبضَش نَہاد و یک بہ یک 212

بیماریوں کی روحانی اور نفسیاتی وجوہات 215

حکمت اور دانائی........ 215

حسنِ سماعت اور ہمدردی (سنتِ نبوی ﷺ)........ 215

چون کسی را خار در پایش جَہَد........ 217

تکلیف کا احساس اور توجہ 218

تکلیف گناہوں کا کفارہ 220

وَزُ سَر سوزن ہَمے جویَد سَرَش 221

تزکیہ نفس اور توجہ (Concentration) 222

عاجزی اور انکساری (Humility) 222

تدبیر اور استقامت (Effort and Persistence) 223

توبہ اور گریہ وزاری کا اثر 223

خار در پا شُد چُنین دشوار یاب 225

دل کے کانٹے سے کیا مراد ہے؟ 226

گناہ کا اثر (سیاہ نکتہ) 228

خود شناسی: پہلا قدم (معرفتِ نفس) 231

خارِ دِل را گر بدیدی ہر خَسی 232

باطنی دکھ کی پوشیدگی 233

ہمدردی کا علاج 233

سماجی پہلو 234

مومنین ایک جسم کی مانند ہیں (حدیثِ رسول ﷺ) 234

دوسروں کی تکلیف کا احساس (قرآنِ کریم) 235

دوسروں کے غم دور کرنے کی فضیلت 235

بے حسی کی مذمت 236

سماجی مدد اور تناؤ کا خاتمہ (Social Support & Cortisol) 238

تجلیِ حق اور ہمدردی کا مقام 239

وحدتِ وجود کا تصور 239

نفسِ امارہ بمقابلہ نفسِ مطمئنہ 239

عشقِ حقیقی کا پہلو 240

کس بہ زیرِ دُمّ خَر خاری نہد 241

۱. صبر اور ثباتِ قدم 242

۲. غصے پر قابو پانا (سنتِ نبوی ﷺ) 242

۳. تدبر اور حکمت (حکمتِ دین) 243

نادان انسان تکلیف پر **جزع وفزع** کرتا ہے، جبکہ دانا شخص صبر، فکر اور اصلاح کا راستہ اختیار کرتا ہے 244

۵ . ادراک کی کمی(Lack of Insight) 245

ا۔ گدھا: ہماری مادی حقیقت (نفسِ امارہ) 246

خلاصہ وجدان 247

۲۔ فخر الدین عراقیؒ: سوزِ عشق اور تسلیم 248

۴۔ علامہ اقبالؒ: ضبطِ نفس اور خودی 248

بَر جَہَد، وان خار مُحکَم تر زَنَد 249

1۔ برائی کی جڑیں وقت کے ساتھ مضبوط ہوتی ہی 250

1. گناہ کا دل پر اثر (کانٹے کا جڑ پکڑنا) 251

2. نفس کی اصلاح اور تزکیہ (کانٹا اکھاڑنا) 252

3. توبہ میں تاخیر اور 'تسویف' کی ممانعت 252

.1 عصبیاتی نقطہ نگاہ(Neurobiology of Habits) 253

.3 نفسیاتی اور حیاتیاتی وراثت(Psychology & Epigenetics) 254

.1 خار (کانٹا): انا اور خودی کا حجاب 255

حاصلِ وجدان (ایک پکار) 256

خَر زِ بَہرِ دَفعِ خار از سوز و درد 258

.3 سائنسی اور منطقی نقطہ نگاہ(Scientific/Logical Perspective) 263

.1 نفسِ امارہ اور گدھے کی تمثیل 263

.2 تدبیرِ جاہلانہ بمقابلہ تسلیم و رضا (وجدانی پہلو) 264

.3 پیرِ کامل کی ضرورت (عرفانی نکتہ) 264

.4 باطنی جراحت(Spiritual Surgery) 264

.3 تدبیرِ نفس بمقابلہ تقدیرِ الٰہی 266

آن حکیمِ خار چین اُستاد بود 267

ا۔ بصیرت اور مہارت (حکیم خار چین) 268

ا . علم اور مہارت کی اہمیت (استادی) 268

۲ . فراستِ مؤمن (بصیرت) 269

زان کَنیزَک بر طریقِ داستان 272

.1 حکمت اور دانائی(Al-Hikmah) 273

.2دل کی مرکزیت(The Heart as the Core) 274
.3نرم گفتگو اور تجسس سے گریز(Gentleness in Counseling) 274
.4ستر پوشی اور پردہ داری(Privacy and Dignity) 274
.1نفسیاتی نقطہ نظر(Psychological Perspective) 275
باحکیم او قصّہ ہامی گفت فاش 278
۱ .اہلِ ذکر سے رجوع (قرآنی حکم) 279
۲ .تزکیہ نفس اور اعترافِ حال 280
۳ .طبیب اور مریض کا رشتہ (شرعی رخصت) 280
۳ .اعترافِ حال اور تخلیہ(Catharsis) 282
۴ .نبضِ عشق کی پہچان 282
۵ .مادی وجود سے ماوراء مقام کی تلاش 283
۱ .طبی تاریخ(Medical History/Anamnesis) 283
۲ .کلامی علاج(The Talking Cure / Psychotherapy) 284
۳ .حیاتیاتی فیڈبیک (Bio-Feedback) اور نبض 284
۴ .سماجی وماحولیاتی اثرات(Social Determinants of Health) 285
سوئے قِصّہ ٔفتَنَش می داشت گوش 289
ذہن اور جسم کا تعلق 289
عشق کی تشخیص 290
مومن کی فراست (بصیرت) 290
ذکر اور قلبی اضطراب 291
"ظاہر (الفاظ) دھوکہ دے سکتا ہے، لیکن باطن (کیفیت / نبض) کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔" 293
طبی تشخیص کا بنیادی طریقہ(Clinical History Taking) 293
تا کہ نَبض از نامِ کہ گردد جَہان 298
ذکرِ الٰہی اور دل کی کیفیت (نبض کا تڑپنا) 299
مقصدِ حیات اور مرکزِ محبت (مقصودِ جاں) 300
اعصابی نظام کا ردِ عمل(Autonomic Nervous System) 301
ابنِ سینا کا "نبض ٹیسٹ" (تاریخی طبی پس منظر) 301
ہارمونز کا کیمیائی کھیل(Biochemistry) 302

جدید جھوٹ پکڑنے والی مشین(Polygraph) 302
روحانی تعبیر :(Spiritual Interpretation) روح کی پکار 303
وجدانی تعبیر :(Intuitive/Ecstatic Interpretation) کیفیتِ جذب و مستی 303
شعری محاسن 304
دوستان و شہر اور ابر شُمرد 310
تشخیصی طریقہ کار 310
دنیاوی وابستگیوں کی پہچان 312
حکیم حاذق (مرشدِ معنوی) کی ضرورت 312
سچائی کا ظہور (صدق) 313
کشفِ اسرار اور فِراستِ مومن 313
روح کی قید اور اس کی اصل کی تلاش 314
نورِ بصیرت کا ظہور 314
جدید نفسیات(Psychology) 318
فزیالوجی اور پولی گراف (Lie Detector) کا اصول 318
نفسیاتی صحت اور 'سائیکو سومیٹک' امراض 321
مادہ پرستی بمقابلہ مقصدیت(Meaning of Life) 322
مصنوعی ذہانت (AI) اور انسانی لمس 322
گفت چون بیرون شُدی از شہر خویش 323
شہر خویش" اور میثاقِ ازل (ہمارا اصل وطن) 324
دنیا بحیثیت مسافر خانہ (غربت اور مسافرت) 325
قوسِ نزول اور قوسِ صعود(The Circle of Existence) 329
زمانِ سرمدی بمقابلہ زمانِ فانی(Eternity vs. Time) 330
ذہنی ہجرت اور بیگانگی(Alienation) 332
نام شہرے گفت وزان ہم دَر گُذشت 341
فراست کیا ہے؟ 344
بصیرت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ 344
قرآن اور شفائے قلوب 345
عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر 345

خواجگان وشہر ہار ایک بہ یَک 346

نان ونمک اور حقوق العباد کا شعور 348

علمِ باطن کی تعبیر(The Esoteric/Batin Perspective) 349

شہرُ شہر وخانہ خانہ قِصّہ کرد 353

شہرُ شہر وخانہ خانہ قِصّہ کردنہ رَگَش جُنبید ونہ رُخ گشت زَرد 353

مرشدِ کامل (طبیبِ روحانی) کی ضرورت 354

دل کا آئینہ اور مخفی علامات 355

دنیاوی علائق (تعلقات) کی جڑیں 356

معرفتِ نفس کی اہمیت 356

نَبُضِ او بر حالِ خود بُد بی گَزند 357

علمِ حقیقی: "علت اور معلول"(Cause and Effect) 360

نَبُضْ جَست وروئ سُرخ وزَرد شُد 362

دل کی کیفیت چہرے اور جسم پر ظاہر ہوتی ہے 363

محبت کا اثر جسم پر—حدیث کی روشنی میں 364

عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سبق 365

رنگوں کی نفسیات(Psychology of Colors) 366

عمرانی اور جغرافیائی استعارہ(Samarkand & Goldsmith) 366

فنی تحقیق: "فرد شد" کی معنویت 367

چون زِرَ نُجور آن حکیم این راز یافت 368

"شِفَاءٌلِّمَافِي الصُّدُورِ" 369

علاج خلیوں (Cells) کا نہیں، انسان (Human) کا ہونا چاہیے۔ 370

منافقین کے حالات اور "باطنی اسکیننگ" 371

علمی و تحقیقی نکتہ: "نفسیاتی بصیرت" 372

گفت: کُوئے او کُدام است در گُذر؟ 373

ہدایت کے لیے وسیلہ اور رہبر 374

نبض شناسی بطور بائیو فیڈ بیک(Biofeedback) 375

گفت دانستم کہ رَنجَت چِیست، زود 376

تزکیہ نفس اور تشخیصِ باطن 377

شاد باش و فارغ و آمِن کہ من 379
منْ غَمِ تو می خورَم، تو غَم مَخور 385
اللہ کی کفالت اور توکل (غم نہ کرنے کی وجہ) 386
اللہ کی شفقت اور والدین کی محبت (تقابلی پہلو) 387
اللہ کی قربت اور خیر خواہی 388
عرفانی تشریح (Gnostic/Mystical Perspective) 389
ہان وہان این راز را با کَس مگو 390
معرفت اور "اسرارِ الٰہی" (خصوصی علم) 392
شاہ (بادشاہ) کے جستجو کرنے کی حکمت 393
گوز خانہ ئے رازِ تو چون دل شود 394
"حسد" سے بچاؤ اور "حکمتِ عملی" 395
گفت پیغامبر کہ ہر کہ سِرّ نَہفت 397
اسوہِ رسول ﷺ اور عملی حکمتِ عملی 400
عربی شعراء اور حکمتِ رازداری 401
فارسی شعراء اور کتمانِ سر 401
ذہنی توانائی کا تحفظ (Conservation of Mental Energy) 403
بیرونی مداخلت اور "منفی فیڈبیک" سے بچاؤ 404
زبان کا چٹخارہ، مقصد کی توانائی کو چاٹ جاتا ہے۔ 404
دانہ چون اَندَر زمین پنہاں شود 406
موت کے بعد زندگی اور حشر (البعث بعد الموت) 407
اخلاص اور پوشیدہ اعمال (The Secret of Sincerity) 408
زَرّ و نُقرہ گر نَبودَندی نُہان 413
"درخت کے نیچے جڑیں چھپی ہوتی ہیں تبھی اوپر پھل نظر آتے ہیں۔" 414
وَعدہ ہا و لُطف ہائے آن حکیم 419
مایوسی کی ممانعت اور امید کی اہمیت 420
سنتِ نبوی ﷺ: مریض کی دلجوئی (تنفیس) 420
کلام میں شفاء (نفسیاتی و روحانی علاج) 422
وَعدہ ہا باشد حقیقی دل پذیر 424

نفس اور شیطان کے وعدے "مجازی اور تاسہ گیر" ہیں 425
وَعدۂ اَہلِ کَرَم، گنجِ رَوان 428
بعد از آن بَر خاست وعَزمِ شاہ کرد 434
عزمِ شاہ (ارادے کی پختگی) 435
عزم اور توکل (عزمِ شاہ کرد) 436
اولوالامر یا رہنما کو باخبر کرنا (شاہ را آگاہ کرد) 436
گفت تدبیر آن بُوَد کان مَرد را 437
مَردِ زَرگر رابخوان زان شہر دور 438
باطل کو ظاہر کرنا (حاضر آریم از پیِ ایں درد) 440
مثنوی مولانا–دفتر اوّل–بخش ۹–فرستادنِ پادشاہ رسولاں بہ سَمَرقند بہ آوردنِ زَرگر 441
چون کہ سُلطان از حکیم آن راشنید 441
حکمت اور دانائی کی اہمیت 442
اہل علم اور ماہرین سے رجوع 443
نصیحت کی قدر (الدین النصیحۃ) 443
پَس فرستاد آن طَرَف یک دو رَسول 445
تزکیۂ نفس اور روحانی معالجہ (تصوف) 447
دعوت و تبلیغ کے اصول (اخلاقیات و فقہ الدعوہ) 447
قاصدوں کی صفات: قوی اور امین (سورہ القصص) 449
اہل اور لائق افراد کا انتخاب (کافیان وحاذ قان) 450
قاصد کی صفات: عقل، حسن اور دیانت (عدول) 451
حکمت اور نفسیاتِ انسانی کا ادراک 451
تا سَمَرقند آمدند آن دو امیر 452
دنیا کی بے ثباتی اور "متاعِ غرور" 453
تدبیرِ الٰہی بمقابلہ انسانی تدبیر 454
قصہ خضرؑ اور لدنی حکمت (باطنی پہلو) 454
آزمائش اور فتنہ 455
حرص اور طمع کا انجام (عاقبت نااندیشی) 456
کِی لَطیف اُستادِ کامِلْ مَعرِفَت 457

لفظ "لطیف" کی علمی گہرائی 457

استادِ کاملِ معرفت "کا تصور 458

(ظہورِ صفات) 458

لطیف" کی حقیقت: تزکیہ اور اخلاقِ الٰہی 459

استادِ کاملِ معرفت": وراثتِ انبیاء کا تسلسل 459

علمِ نافع اور تاثیر 460

نکُ فُلان شَنہ از برائے زَر گری 460

انتخابِ الٰہی 461

"مہتری" اور تکریمِ آدم (Human Excellence) 463

صبغتہ اللہ (اللہ کا رنگ) 463

اینک این خِلعَتِ بگیر و زَرّ و سیم 464

چون بیایی، خاص باشیؔ و نَدیم 464

باطنی و تمثیلی پہلو (نفس کی کشش): 465

فریبِ دنیا اور متاعِ غرور 466

قربِ سلطانی بمقابلہ قربِ الہیٰ 467

باطنی بصیرت کا فقدان 467

مَر دُمال و خِلعَتِ بسیار دید 468

استغنا اور سرکشی (غِرّہ شد) 470

دولت اور ہمدردی کا فقدان (The Empathy Gap) 471

نرگسیت اور انا کا پھیلاؤ (Narcissism and Ego Inflation) 471

کثرت کا پردہ (Veil of Plurality) 473

حقیقی وطن سے بیگانگی (Alienation from the Primordial Home) 473

مورت اور معنی کا ٹکراؤ (Form vs. Essence) 473

نفسِ امارہ کی جادوگری 474

تجلیاتِ الہیہ کا غلط استعمال 474

قدیم عربی شاعری (ابو العتاہیہ - زہد و حکمت کا نمائندہ) 474

قدیم فارسی شاعری (شیخ سعدی شیرازی) 475

حضرت علیؓ کی طرف منسوب کلام (حکمتِ عربی) 476

اَنْدر آمد شادمان در راہِ مَرد 480
دنیا کی زندگی: ایک دھوکا (متاع الغرور) 481
موت کی بے خبری اور حساب کا قریب ہونا 482
شیخ سعدی شیرازی: ظاہر اور باطن کا تضاد 483
عمر خیام: وقت کی بے رحمی اور بے خبری 484
شیخ فرید الدین عطار: حرص کا جال 484
اسپ تازی بَر نشَست وشاذ تاخت 485
روح کا سفر (اسبِ تازی) 486
قرآنِ کریم: نفسِ مطمئنہ کا تصور 487
حدیثِ نبوی ﷺ: اللہ سے ملاقات کا شوق 487
موت بطورِ 'جسر' (پل) 488
تسلیم و رضا کا مقام 488
فارسی شاعری: موت بطورِ 'عرس' (شادی) 489
عربی شاعری: موت بطورِ 'حیاتِ ابدی' 490
ای شدہ اَنْدر سَفَر باصد رِضا 492
علمِ الٰہی اور انسانی بے خبری 493
ادراکِ عقل کی محدودیت (حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کا نقطہ نظر) 495
اسباب کا پردہ اور حقیقتِ قضا 495
در خیالَش مُلک وعزّ ومہتَری 497
طولِ امل (لمبی امیدیں) اور غفلت 498
کثرت کی ہوس اور دنیا کی حقیقت 498
موت کی اچانک آمد اور بے بسی 499
دنیا بطورِ امتحان گاہ 499
چون رَسید از راہْ آن مَردِ غَریب 504
۲. مردِ غریب: "طُوبٰی لِلْغُرَبَاء" کا مصداق 505
۳. علمِ لدنی اور خضرِ راہ کا تصور 506
۴. تزکیہ نفس اور باطنی علاج 506
۱. عجز و انکساری (Humility in Power) 507

٣ . مہمان نوازی اور ادبِ حصولِ علم(Etiquette of Seeking Knowledge) 508

۵ . مآخذ اور ورثے کی حفاظت(Preservation of Ethical Legacy) 508

١ . اپنے اندر کے "بادشاہ" کو بیدار کریں 509

٢" . مردِ غریب" کا انتظار اور پہچان 509

۴ . تسلیم و رضا کا مقام 510

۵ . ماضی اور اصل سے تعلق (شجرہ و جڑیں) 510

سوئے شاہنشاہ بُردَندَش بہ ناز 511

١۔ اللہ کی طرف رجوع اور "جذب" (سُوئے شاہنشاہ بُردَندَش) 512

٢۔ نفس کی قربانی اور فنا (تابِسوزَد) 513

.3 مقامِ احسان اور محویت (بر سَرِ شمع طراز) 513

.1 علمی آبیاری: حقیقتِ علم کی تلاش 514

.2 روحانی آبیاری: تزکیہ اور سپردگی 515

.1 فریدالدین عطار: طلب اور فنا کا سفر 516

شاہ دید او را، بسی تعظیم کرد 517

١ . اہل اللہ اور اہل علم کی تعظیم (تعظیمِ شعائر اللہ) 519

٢ . علم اور ہدایت کے لیے اہل بصیرت کی طرف رجوع 519

٣ . کامل سپردگی اور اطاعت (تسلیم) 519

۴ . دنیا کی بے ثباتی اور ترجیحِ آخرت 520

۴ . محبوب ترین چیز کی قربانی (انفاق) 521

۵ . اللہ کے ولیوں کا رعب اور ہیبت 521

پس حکیمش گفت کی سُلطانِ مِہ 525

.1 اپنی عزیز ترین شے کی قربانی (ایثار) 526

.2 بیماری کی اصل جڑ کا علاج 527

.3 مرشدِ کامل کی اطاعت(Blind Trust) 527

.4 خواہش کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانا 527

" .5 ملکیت" کے وہم سے آزادی 527

1۔ محبوب شے کی قربانی (تزکیہ کا پہلا زینہ) 528

2۔ نفسانی خواہشات پر قابو پانا 528

4۔ مصلحتِ الٰہی پر بھروسہ (حضرت خضر علیہ السلام کا اسوہ) 529

5۔ عشقِ الٰہی بمقابلہ عشقِ مجازی 529

.1 ایثار اور ترکِ ملکیت (قربانی کا فلسفہ) 530

.2 عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر 531

.3 مرشد (حکیم) کی ضرورت اور رہنمائی 531

تا کَنیزک در وِصالَش خَوش شود 533

مجازی سے حقیقت کی طرف: 533

سکونِ قلب اور وصالِ الٰہی 534

محبت کا شرعی اور فطری علاج 534

روح کی پیاس اور آبِ وصال 535

محبتِ رسول ﷺ کی تپش اور تسکین 535

شہ بِدو بَخشید آن مَہ روی را 538

عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر 539

کرداروں کی باطنی علامتیں (Archetypes) 543

تزکیۂ نفس کا حکیمانہ طریقہ (Wisdom of Purification) 544

فنائے خواہش سے بقائے حق تک 544

مرشدِ کامل کی کیمیا گری 544

عشقِ مجازی بطورِ پُل 545

نفسیاتی علاج اور ذہنی صحت (Mental Health) 545

جدید والدین اور تربیتِ اولاد (Parenting) 545

ڈیجیٹل دور کی "زرگری" اور بصیرت 546

رشتوں میں ایثار (Sacrifice in Relationships) 546

مُدّتِ شش ماہ می رانْدَند کام 547

محبت کا علاج نکاح (حدیثِ نبوی ﷺ) 548

دنیاوی لذتوں کی حقیقت اور فنائیت (قرآن) 549

خضرؑ والی حکمت اور مشیتِ الٰہی 549

علمِ تصوف اور سلوک: "مرضِ قلب" کی تشخیص 550

علم النفس (اسلامی نفسیات): کمالِ اعتدال 551

علمِ اخلاق: تدریج اور صبر 551
فقہی و حکیمانہ زاویہ: "اخف الضررین" کا قاعدہ 551
علمِ لدنی اور مشیتِ الٰہی 552
انتھراپولوجیکل نقطہ نظر (Anthropological Perspective) 555
بعد از آن از بَہرِ او شَربَت بِساخت 558
۲. اللہ کی نظر صورت پر نہیں، سیرت پر ہے (حدیث) 560
۳. نفسانی خواہشات کی پیروی سے ممانعت 560
رومیؒ کے اس قصے کا نچوڑ اس آیت میں پنہاں ہے 561
۱. قدیم طبِ یونانی (Humoral Theory) کا تناظر 561
۲. جدید میڈیکل سائنس (Physiological Perspective) 562
۳. نفسیاتی طبی پہلو (Psychosomatic Aspect) 562
۴. حکیم کا "شربت" بطورِ کیمیا 563
۱. رومیؒ کا اپنا دفاع (الٰہی حکم اور خضرؑ کی مثال) 563
۲. تمثیلی اور علامتی اخلاقیات (Symbolic Ethics) 564
چون زِ رَنجوری جَمالِ او نَمانْد 567
.1 ظاہری حسن اور دنیا کی بے ثباتی (Transience of Beauty) 568
.2 اللہ کی نظر: صورت بمقابلہ سیرت 569
.3 غیر اللہ سے وابستگی کا "وبال" 569
.4 کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ (فنا اور بقا کا فرق) 569
.1 اخلاقی لحاظ سے: "صورت" بمقابلہ "سیرت" 570
.2 معاشرتی لحاظ سے: نمائشی معاشرت کا المیہ 570
.3 نفسیاتی اور تعمیری پہلو: "وبال" سے آزادی 571
چون کہ زشت و ناخوش و رُخ زَرد شد 571
1. ظاہری حسن کی فانی حیثیت 572
3. اخلاقی و روحانی سبق (حاصلِ کلام) 572
.1 دنیاوی رونق کی حقیقت (قرآنی نقطہ نظر) 573
.1 عشقِ مجازی کی حقیقت: "کُشتنی" (مار ڈالنے کے لائق) 575
.3 موت کا قبل از وقت مشاہدہ (مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا) 576

.1رشتوں میں "سیرت" کو "صورت" پر فوقیت دینا 577
.3مادی چیزوں سے جذباتی وابستگی کم کرنا 578
" .4فانی" کے بجائے "باقی" کی سرمایہ کاری 578
.5تنقید اور تعریف سے بے نیازی 578
عشق ہائے کَز پیِ رَنگی بُوَد 579
زوالِ حسن اور انجامِ محبت 579
قرآنی حوالہ: "فانی" اور "باقی" کا فرق 580
حدیثِ نبوی ﷺ: معیارِ انتخاب 581
حکیمانہ و ادبی نکتہ (امام غزالیؒ اور دیگر صوفیا) 581
محبت کی بنیاد: اللہ کے لیے محبت (سنت) 582
عارضی اور ابدی کا فرق 583
"بے رنگی" کا راز (The Mystery of Colorlessness) 583
مجاز سے حقیقت تک کا سفر (Bridge of Metaphor) 584
روح کی جلاوطنی اور واپسی (The Soul's Exile) 584
فنا اور بقا کا فلسفہ (Passing and Permanence) 584
کاش کان ہم ننگ بودی یک سَری 587
انسانی علم اور عقل کی محدودیت 588
انسانی عقل بمقابلہ مشیتِ الٰہی 588
قصہ خضر و موسیٰ علیہ السلام (عقل و وحی کی مثال) 589
سنتِ نبویؐ اور عقل کی حقیقت 589
عقل کا حجاب اور انا (Ego) 590
بد داوری: کائنات کو اپنی نظر سے دیکھنا 590
عقلِ جزوی بمقابلہ عقلِ کلی 590
فقر اور فنائیت کا مقام 591
خون دَوید از چَشمِ ہمچون جویِ او 591
الف) حکایتی پس منظر (مور کی مثال) 592
خود پسندی (عُجب) کی ہلاکت 594
قارون کا واقعہ: اپنی خوبی پر ناز کا انجام 595

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ 595
دُشمنِ طاووس آمد پَرِّ او 600
شعری محاسن 607
گفت من آن آہُوَم کَز نافِ من 608
ریخت این صَیّاد خونِ صافِ من 608
نعمت کا "فتنہ" (آزمائش) بننا 609
ای من آن روباہِ صَحرا کَز کَمین 615
دنیاوی زینت اور اس کا فریب 616
شہرت اور دکھاوے (ریاکاری) کی مذمت 617
گمنامی اور اخلاص کی فضیلت 618
ای من آن پیلی کہ زَخمِ پیلُبان 625
آنکہ کُشتَستَم پِیِ مادونِ من 632
بر من است امروز و فردا بر وِیْ است 640
" .2 مقصد" اور "ذریعہ" کی اخلاقی بحث 646
.3 مادیت پرستی کا علاج (Materialism vs. Spirituality) 646
.4 تاریخی شعور اور تسلسل 647
گرچہ دیوار اَفگَنَد سایہ یُ دراز 649
این جہانُ کوہ است و فِعلِ مانِدا 654
.1 کائنات بطور آئینہ (تجلیاتِ الٰہی) 658
این بِگُفت و رفت در دَم زیرِ خاک 659
۴۔ دنیاوی محبت کا انجام (End of Worldly Attachment) 666
زان کہ عشقِ مُردگانُ پایَندہ نیست 667
۱ . کائنات کی فنائیت اور اللہ کی بقا 668
۲ . دنیا کی حقیقت (متاعِ غرور) 668
۴ . عشقِ حقیقی کی دعوت (عشقِ زندہ) 669
۱" . مُردہ" کا صوفیانہ تصور (عدم اور ہستی کا فرق) 670
عشقِ زندہ در رَوان و در بَصَر 673
.1 عشقِ زندہ (محبتِ الٰہی کی ابدیت) 675

.2رَوان و بَصَر (روح اور نگاہ میں عشق کا اثر) 675

.3ہر دمی تازہ تر (ایمان کی تازگی اور مٹھاس) 675

.1روحانی تعبیر: بقاباللہ کا مقام 676

.2وجدانی تعبیر: تجدیدِ امثال (ہر لحہ نئی تجلی) 676

.3 قلبی واردات: حیاتِ جاودانی 677

.1حافظ شیرازی: عشق کی ابدیت (عشقِ زندہ) 678

شعری محاسن 681

عشقِ آن زندہ گُزین کو باقی است 683

1۔ اللہ کی صفتِ بقا اور فانی دنیا (اَلْحَیُّ الْقَیُّوم) 684

2۔ محبتِ الٰہی کی فوقیت (أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ) 685

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ" 685

شرابِ جان فزا اور ساقی (سَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا) 685

عشقِ آن بگزین کہ جُملہ یُ اَنْبیا 690

2۔ انبیاء کی قربانیاں محبتِ الٰہی کا نتیجہ تھیں 691

3۔ رسول ﷺ کی زندگی عشقِ الٰہی کا کامل نمونہ 691

2۔ محبتِ الٰہی انسان کو اللہ کا محبوب بنا دیتی ہے 692

۲۔ عزت اور غلبہ صرف اللہ کے لیے ہے 693

۳۔ اللہ کی دوستی اور کائناتی تصرف 694

.4ذکرِ الٰہی سے دلوں کا سکون اور ثبات 694

.1مادی عروج کے بجائے اخلاقی و روحانی عروج 695

.2نفسیاتی استحکام اور ذہنی سکون 695

.3سوشل میڈیا اور "ظاہر پرستی" کا علاج 696

تو مگو ما را بدان شَہ بار نیست 699

نفس کی نفی اور قربِ الٰہی 704

محبت کا غلبہ اور بیخودی 704

حقیقتِ صفتِ کریمی اور فنا 705

.1نفسیاتی سطح پر: مایوسی اور ڈپیریشن کا علاج 706

.2معاشی سطح پر: توکل اور وسیلہ 706

.3سماجی اور عالمی سطح پر: ظلم کے سامنے ڈٹ جانا.. 706

عملی زندگی میں اس کا خلاصہ (Practical Takeaway) 707



مولانا جلال الدین رومیؒ کے حالات زندگی

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کا نام؛ محمد؛ اور لقب جلال الدین تھا۔ آپ نے مولانا رومؒ کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کے والد کا نام بھی؛ محمد؛ اور لقب بہاؤالدین تھا۔ حضرت محمد بہاؤالدینؒ نابغہ روز گار عالم دین تھے۔ حضرت محمد بہاؤالدینؒ کے حلقہ ارادت میں امام فخر الدین رازی اور محمد خوارزم شاہؒ بھی شامل تھے۔

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کا سلسلہ نسب چند واسطوں کے ذریعے حضرت سیدنا ابو بکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ آپؒ 604ھ میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ حضرت محمد بہاؤالدینؒ کی ملاقات حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ سے بھی ہوئی تھی۔ جس وقت حضرت محمد بہاؤالدینؒ کی ملاقات حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ سے ہوئی اس وقت مولانا رومؒ بھی آپؒ کے ہمراہ تھے جن کی عمر اس وقت صرف چھ سال تھی۔ حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ نے مولانا رومؒ کو دیکھ کر حضرت محمد بہاؤالدینؒ کو تاکید کی کہ وہ اپنے صاحبزادے کی پرورش میں کسی قسم کی کوتاہی نہ برتیں اور اسے دینی علوم سے بہرہ ور فرمائیں۔

حضرت محمد بہاؤالدینؒ کی خصوصی توجہ سے مولانا رومؒ نے دینی علوم اور تمام مروجہ دینی کتب پر عبور حاصل کیا۔ مولانا رومؒ کی عمر مبارک ابھی صرف اٹھارہ برس ہی تھی کہ آپؒ کی شہرت ہر جگہ پھیلتی چلی گئی۔ اس دوران شاہ روم علاؤالدین کیقباد نے آپؒ کی شہرت سن کر آپؒ کو روم آنے کی دعوت دی۔ آپؒ علاؤالدین کیقباد کی دعوت پر روم کے شہر قونیہ تشریف لے گئے اور وہیں قیام پذیر ہوئے۔

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ ان بزرگ ہستیوں میں سے ہیں جن کا قلب غم امت سے فیضیاب ہے اور وصال حق کے لئے بے تاب۔ آپؒ کا دور قتل و غارت گری کا دور تھا۔ آپؒ ابھی گیارہ برس کے ہی تھے تاتاریوں کا فتنہ شروع ہوا۔ آپؒ کے دور میں نوے لاکھ آدمیوں کو قتل کیا گیا اور مذہبی منافرت بہت زیادہ تھی۔ اس دور میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ حضرت شیخ محی الدین عربیؒ اور حضرت بو علی قلندرؒ جیسے نابغہ روز گار اولیا اللہ پیدا ہوئے۔

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کی شادی اٹھارہ برس کی عمر میں گوہر خاتون سے ہوئی گوہر خاتون سمرقند کے ایک با اثر شخص کی بیٹی تھیں۔ ان سے آپ کے دو بیٹے تولد ہوئے۔

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کی خدمت میں بیشمار علماء دین اور طلبا حاضر ہوتے اور آپؒ سے علمی مسائل دریافت فرماتے تھے۔ آپؒ نے قونیہ میں ایک جامع مسجد کی بنیاد رکھی آپؒ کو روحانی تعلق حضرت سید برہان الدینؒ سے حاصل تھا آپؒ جب تقریر شروع کرتے تھے تو ہزاروں لوگوں کا مجمع جمع ہو جاتا تھا۔ لوگ آپؒ کی تقاریر کو تحریر کرتے اور اس کی کتابت کرواتے آپؒ کی

مسجد کی ایک خاصیت اس مسجد سے ملحق مکتب تھا جہاں بیشمار علمی کتابیں موجود تھیں۔ آپؒ کے مکتب میں روزانہ بیشمار کتب آتیں اور بیشمار کتب علمائے کرام لیکر بھی جاتے تھے۔

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کا بڑا علمی کارنامہ مثنوی مولانا روم کی تالیف ہے۔ آپؒ نے اپنی مثنوی کے اشعار مختلف اوقات میں کہے جنہیں آپؒ کے شاگرد لکھتے رہتے تھے اور جنہیں بعد ازاں یکجا کر کے مثنوی مولانا روم کے نام سے ترتیب دیا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک روز حضرت شاہ تبریزؒ بعد نماز عشاء قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے سو گئے تو خواب میں آپؒ نے ایک بزرگ کو دیکھا جن کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ وہ بزرگ آپؒ کے سرہانے کھڑے تھے اور فرما رہے تھے کہ بیٹے! تم اب ظاہری و باطنی وعلوم سے سرفراز ہو چکے اللہ تعالی تم سے ایک بڑا کام لینا چاہتا ہے جس کے لئے تمہیں روم جانا ہو گا اور وہاں پر ایک نامور عالم دین مولانا محمد جلال الدین رومیؒ ہیں جن کو تمہاری راہنمائی کی ضرورت ہے وہ بڑے عالم دین ہیں تم ان کی راہنمائی فرماؤ۔

حضرت شاہ شمس تبریزؒ جب نیند سے بیدار ہوئے تو آپؒ نے اپنے مرشد پاک حضرت بابا کمال الدین جندیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا خواب ان کے گوش گذار کیا۔ حضرت بابا کمال الدین جندیؒ نے خواب سننے کے بعد فرمایا کہ تم ابھی کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ چنانچہ آپؒ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی رات آپؒ کو پھر انہی بزرگ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے پھر آپؒ کو روم جانے کا حکم دیا۔

حضرت شاہ شمس تبریزؒ نے اگلے روز پھر حضرت بابا کمال الدین جندیؒ سے اس خواب کا ذکر کیا۔ حضرت بابا کمال الدین جندیؒ نے فرمایا کہ اگر تم دوبارہ خواب دیکھو تو مجھے بتانا۔ آپؒ حضرت بابا کمال الدین جندیؒ کے کہنے پر ایک مرتبہ پھر رک گئے۔

تیسری شب مسلسل آپؒ کو خواب میں انہی بزرگ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے آپؒ کو روم جانے کا حکم دیا۔ آپؒ نے اگلے روز حضرت بابا کمال الدین جندیؒ سے اپنے اس خواب کا ایک مرتبہ پھر ذکر کیا۔ حضرت بابا کمال الدین جندیؒ نے آپؒ کو روم جانے کی اجازت دے دی۔

حضرت بابا کمال الدین جندیؒ کی جانب سے اجازت ملنے کے بعد آپؒ نے فوراً سفر کی تیاریاں شروع کر دیں اور عازم روم ہوئے۔ قونیہ پہنچنے کے بعد آپؒ نے مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کی تلاش شروع کر دی۔

آپؒ کو معلوم ہوا کہ مولانا محمد جلال الدین رومیؒ قونیہ کی ایک بڑی مسجد کے امام اور عالم دین ہیں۔ ان سے ملنے والوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے اس لیئے ان سے ملاقات ممکن نہیں ہے۔ آپؒ نے فی الحال ان سے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے لئے کسی رہائش کی تلاش شروع کر دی اور پھر بالآخر آپؒ کو ایک سرائے میں رہائش مل گئی۔

حضرت شاہ شمس تبریزؒ نے جس سرائے میں رہائش اختیار کی وہ سرائے برنج فروش کی تھی۔ آپؒ کی ملاقات اس سرائے میں قیام پذیر مزدوروں سے اکثر و بیشتر ہوتی رہتی تھی۔ ان مزدوروں نے ہمیشہ آپؒ کے ہاتھ میں ہمہ وقت قلم اور کتاب کو ہی دیکھا جس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ آپؒ تعلیم یافتہ انسان ہیں اسی لئے غور و فکر میں ڈوبے رہتے ہیں۔

ان مزدوروں میں سے اگر کوئی آپؒ سے گفتگو کر لیتا تو آپؒ کا گرویدہ ہو جاتا۔ ان لوگوں میں دو شخص محمد عمر اور محمد زبیر بھی شامل تھے جن سے آپؒ کی اچھی علیک سلیک ہو گئی۔ ان دونوں نے مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کے بارے میں بیشمار معلومات آپؒ کو دیں۔

ایک روز یہ دونوں شخص آپؒ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپؒ ہمیشہ اپنے حجرہ میں ہی مقیم رہتے ہیں شہر میں ایک بلند چبوترہ موجود ہے جو دریچہ امراء کے نام سے مشہور ہیں جہاں شہر کے نامور علماء اور عمائدین جمع ہوتے ہیں اگر آپؒ ان سے ملنے کی خواہاں ہیں تو ہم آپؒ کو وہاں لئے چلتے ہیں اور لوگوں سے آپؒ کا تعارف کرواتے ہیں۔ مولانا محمد جلال الدین رومیؒ بھی اکثر و بیشتر اس چبوترہ پر تشریف لاتے ہیں ہو سکتا ہے وہیں ان سے بھی ملاقات ہو جائے۔

حضرت شاہ شمس تبریزؒ نے ان کی بات سننے کے بعد ان کے ساتھ جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ آپؒ نے عمدہ لباس زیب تن کیا اور قلم کتاب تھامے ان دونوں کے ساتھ دریچہ امراء روانہ ہو گئے۔

ایک دن درویش شمس تبریزؒ، جلال الدینؒ کے حلقہ درس میں پہنچ گئے اور جلال الدین سے پوچھا کہ تم کیا پڑھا رہے ہو....؟

جلال الدینؒ کو اپنی علمی مجلس میں ایک عام فقیر کا اس طرح سوال کرنا بہت بُرا لگا۔ انہوں نے فقیر کی طرف دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا کہ یہ وہ علم ہے جسے تم نہیں جانتے۔

شمس تبریز صحن میں تالاب کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے عالم جلال الدینؒ کی قلمی کتابیں اٹھا کر پانی سے بھرے ہوئے حوض میں ڈال دیں۔ یہ منظر دیکھ کر جلال الدینؒ نے غصہ میں کہا:

''اے درویش! یہ کتابیں برسوں کی علمی ریاضت سے لکھی گئی تھیں، تو نے میری ساری محنت ایک لمحہ میں برباد کر دی۔''

شمس تبریزؒ نے یہ سنا تو کہا کہ ''فکر کیوں کرتے ہو''.... اپنا ہاتھ حوض میں ڈالا اور تمام کتابیں صحیح سالم باہر نکال کر رکھ دیں۔ کتابوں کے سوکھے اوراق دیکھ کر ظاہری علم کے ماہر جلال الدینؒ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے شمس تبریزؒ سے پوچھا

''یہ کیا علم ہے....؟''

اللہ کے دوست شمس تبریزؒ نے جواب دیا:

"یہ وہ علم ہے جو تم نہیں جانتے۔"

روایات کے مطابق یہ واقعہ 642ہجری کا ہے، اب جلال الدین حضرت شمسؒ کے مرید ہو گئے۔ شمس تبریزیؒ کی تربیت نے رومیؒ کے خیالات وافکار پر گہرا اثر ڈالا۔ حضرت شمس تبریزؒ کی چند روزہ صحبتوں نے مولانا رومؒ کو نیم مجذوب درویش بنا ڈالا تھا۔

مولانا خود فرماتے ہیں:

ہیچ چیزے خود بخود نشد
ہیچ آہن خود بخود تیغے نشد
مولوی ہر گز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزے نشد

چیزیں خود بخود وجود میں نہیں آتی، لوہا خود سے تلوار نہیں بن سکتا اسی طرح مولوی مولائے روم ہر گز نہ بن پاتا اگر شمس تبریز کا غلام نہ بنتا۔

اس کے بعد مولانا جلال الدین رومیؒ کی دنیا ہی بدل گئی، نہ شان وشوکت، نہ وعظ گوئی، نہ علمی مجلسیں و کتابیں۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ کتابوں اور وعظ کے سوا رومی کو کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا یا اب یہ حال ہوا کہ انہوں نے خاموشی اختیار کر لی، زیادہ وقت عالمِ وجد میں رہتے اور اگر کسی وقت بولتے تو منہ سے خوبصورت اشعار نکلتے جو ان کے مرید خاص حسام الدین چلپیؒ لکھتے جاتے۔ یہی اشعار آج ہمارے سامنے ان کے کلام کی صورت میں موجود ہیں۔

رومی کا روشن کلام اسرار و رموز کا ایک خزینہ اور معرفت و عرفان کا ایک گنجینہ ہے۔ آپؒ کی شاعری میں اللہ اور نبی کریم ﷺ سے محبت کا اظہار ہے، پند و نصائح کے موضوعات ہیں، ان میں فلسفیانہ عقائد جھلکتے ہیں، حکمت کا رنگ نمایاں ہے، سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مولانا رومیؒ کا کلام ایک طرف تو حکمت اور اعلیٰ خیالات کا گنجینہ ہے دوسری طرف شاعری کے محاسن

سے پُر ہے۔ اُن کے کلام میں سادگی بھی ہے، سوز و گداز بھی ہے، عشق کی وارفتگی بھی اور وحدت کا اظہار بھی ہے۔ عشقِ نبوی ﷺ کا اظہار بھی، حیات و کائنات کے مسائل کا بیان بھی ہے۔

واقعہ نگاری ہو یا قصہ گوئی، وعظ و نصیحت ہو یا درسِ اخوت و مساوات، ہر فن میں طاق ہیں۔ اُن کے اشعار معنویت کا گہرا دریا ہیں اور تصوف کی نئی جہتوں کے عکاس ہیں۔ رومی نے تصوف کی لگی بندھی راہوں پر چلنے کی بجائے نئے خیالات کو رواج دیا۔

ای نسخہ ئ نامہ ئ الہی کہ توئی

وی آینہ ئ جمال شاہی کہ توئی

بیرون ز تو نیست ہر چہ در عالم ہست

در خود بہ طلب ہر آنچہ خواہی کہ توئی

کیا تم نہیں جانتے، خدا کے پیغام کا اصل نسخہ تم ہی ہو، تم ہی وہ آئینہ ہو جس میں شاہ کا جمال اور صفات نظر آتی ہیں، اِس کائنات میں جو کچھ ہے، تمہارے اندر بھی موجود ہے۔ خود اپنے اندر جھانکو، تم جس کے متلاشی ہو وہ تمہیں مل جائے گا۔

مثنوی کے موضوعات میں شرفِ انسان، تکریم آدم اور علم الاسماء کا ذکر بھی جابجا موجود ہے۔

وجہ آدم آئینہ اسماء کند

عکس خود در صورتش پیدا کند

نقش آدم را رقم نوعي زند

کہ دو عالم را در او پنہان کند

آدمؑ کو اللہ نے اپنے اسماء کا آئینہ یعنی اپنی صفات کا مظہر اور صورت پر تخلیق کیا ہے، آدمؑ کے نقش میں دو عالم پنہاں ہیں۔

رومی انسان کے وجود اور زندگی کی سچائیوں کو سمجھاتے ہیں

اوّل ہر آدمی خود صورت است

بعد ازاں جاں کو جمال سیرت ست

اوّل ہر میوہ جز صورت کے ست

بعد ازاں لذّت کہ معنی ولیست

یعنی انسان کی ابتدا خود صورت ہے اور اس کے بعد یعنی باطن کا جمال ہے، ہر میوے کا جزصورت ہے اس کے بعد لذّت ہے جو اس کے معنی ہیں

علم الاسماء

قرآن کریم کہتا ہے کہ آدمؑ کو جو علم عطا ہوا ہے اس کی بدولت آفاق آدمؑ کے لئے مسخر ہو سکتے ہیں۔

آدم خاکی ز حق آموخت علم

تا بہ ہفتم آسمان، افروخت علم

آدمِ خاکی نے حق تعالیٰ سے جو علم سیکھا ہے، اس علم کی بدولت ساتوں آسمان اس کے سامنے روشن کر دیئے گئے ہیں۔

مثنوی معنوی

مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی (604-672ھ / 1207-1273ء) کی شہرۂ آفاق تصنیف **"مثنوی معنوی"** اسلامی تصوف، فارسی ادب اور عالمی حکمت کا وہ شاہکار ہے جسے صدیوں سے "قرآنِ عجم"، "قرآن در زبانِ پہلوی" اور "دریائے معرفت" جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ خود مولانا نے اسے "اُصولِ اُصولِ دین" اور "فقہِ اکبر" سے تعبیر کیا ہے (مثنوی، دفتر اوّل،

دیباچۂ عربی)۔ یہ مضمون مثنوی کی نمایاں خصوصیات، علمی و روحانی محاسن، عصری ضرورت، ہمہ گیر افادیت اور اس کے بنیادی افکار کو مستند حواشی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

۱۔ مثنوی کی خصوصیات (Characteristics)

مثنوی کی چند امتیازی صفات اسے تمام صوفیانہ منظومات میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں:

۱۔۱ ترکیبی و اسلوبیاتی انفرادیت

مثنوی کی بحر "فاعلاتن فاعلاتن فاعلات" (رمل مسدس محذوف) ہے، جسے مولانا نے تیز رفتار وعظ، تمثیل اور حکایت کے لیے انتہائی موزوں پایا۔ یہ مسلسل ۲۶ ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل چھے دفتر ہیں جن میں حکایات، قرآنی تمثیلات، احادیث، فقہی اشارے اور فلسفیانہ مباحث کو ایک رواں داستانی پیرائے میں باہم پرو دیا گیا ہے۔ رینالڈ اے. نکلسن (Nicholson) لکھتے ہیں:

"مثنوی کا کوئی منظم فلسفیانہ نظام نہیں بلکہ یہ روحانی تجربات کی ایک لہر ہے جو قاری کو اپنی روانی میں بہالے جاتی ہے۔"

)ترجمہ: نکلسن، مثنوی کا انگریزی ترجمہ، جلد ۱، مقدمہ(

۱۔۲ تمثیلی و قصہ گوئی کا منفرد انداز

مولانا قصے کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ ہر حکایت ایک "مثال (allegory) " ہے جو باطنی معانی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً "طوطی اور بقال" (دفتر اوّل) زبان کے غلط استعمال اور روحانی تقلید کے انجام کو بیان کرتی ہے، جبکہ "ہاتھی اور اندھے" (دفتر سوّم) محدود عقلِ انسانی سے ماورا حقیقت کی تمثیل ہے۔ خود مولانا فرماتے ہیں:

پَے بہ بندی، ایں حکایت ہازِ چیست؟

تا کہ غافل، مَردِ معنی رابزِیست

)دفتر اوّل، بیت ۱۰۴(

"اس قصے کے بندھن کا مقصد کیا ہے؟ تا کہ غافل انسان معنی کا مزہ چکھ لے۔"

۱۔۳ قرآن و سنت سے گہرا استناد

مثنوی کا ہر دفتر ایک قرآنی منقبت سے شروع ہوتا ہے اور کلامِ الٰہی کے باطنی اشارات کو حکایات کے ذریعے کھولا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ" (الاحزاب: ۷۲) کی تفسیر دفتر اوّل میں روحِ انسانی کی اس امانت کے حوالے سے کی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے بجا فرمایا:

"مثنوی قرآن کی روح ہے جس نے فارسی کا جامہ پہن رکھا ہے۔"

)جاوید نامہ، صفحہ ۱۳۲(

۱ء۴ تضاد کی وحدت(Coincidentia Oppositorum)

مولانا خیر و شر، جمال و جلال، نور و ظلمت کو ایک ہی حقیقت کے دو رُخ سمجھتے ہیں۔ مثنوی میں ابلیس، فرعون اور نفسِ امّارہ محض ہلاکت کے نشان نہیں بلکہ عین اُسی حق کے مظاہر ہیں جس کی معرفت میں یہ اضداد تحلیل ہو جاتے ہیں۔

۲۔ محاسن(Merits)

مثنوی کے علمی و روحانی محاسن درج ذیل ہیں:

۲ء۱ جامعیت و ہمہ گیری

یہ کتاب فقہ، کلام، فلسفہ، اخلاقیات اور تصوف کے ایسے گہرے مباحث یکجا کرتی ہے کہ اسے "فقہِ اکبر" کہنا بے جا نہ ہو گا۔ مولانا جامیؒ(817-898ھ) کا یہ مصرع اس کی جامعیت کا آئینہ دار ہے:

مثنویِ مولویِ معنوی، ہست قرآن در زبانِ پہلوی

"مولانا روم کی معنوی مثنوی، فارسی زبان میں قرآن ہے۔"

۲ء۲ نفسیاتی بصیرت(Psychological Insight)

جدید ماہرینِ نفسیات جیسے کارل گستاو یونگ (Carl Jung) نے مثنوی میں بیان کردہ "سایہ (Shadow) "اور "فردیت (Individuation) جیسے تصورات کو اپنے نظریات کا ماخذ قرار دیا) دیکھیے: شمل، "The Triumphal Sun"، ص ۲۹۱(۔ مثنوی میں نفس کے سات درجے، تزکیے کی منازل اور "انسانِ کامل "کا نظریہ دراصل روحانی نفسیات (Spiritual Psychology) کا عظیم اثاثہ ہے۔

۲ء۳ عالمی پذیرائی و اثر انگیزی

مثنوی کئی صدیوں سے برصغیر، ترکی، ایران، وسطی ایشیا اور یورپ میں پڑھی جارہی ہے۔ ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ(1746-1824) نے اس کی شرح "فتح العزیز" لکھی تو مغرب میں گوئٹے(Goethe)، ہیگل (Hegel) اور نکلسن جیسے اذہان اس سے متاثر ہوئے۔ آج ایمیزون کی بیسٹ سیلر فہرستوں میں مثنوی کے تراجم مسلسل جگہ پاتے ہیں، جو اس کی لازمانیت کی دلیل ہے۔

۳۔ضرورت(Necessity)

اکیسویں صدی میں مثنوی کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے:

۳ء۱ مادیت اور روحانی خلا کا علاج

جدید انسان ٹیکنالوجی اور استہلاکی تہذیب کے باوجود ایک گہری وجودی بے معنویت (Existential Vacuum) کا شکار ہے۔ مثنوی کا مرکزی سبق "تو خیال و وہم پنداری، و لیکن تو یکی، یک چیز را محتاج نہ"(دفتر سوّم، ۳۶۰۰)انسان کو اس کے الٰہی جوہر کی یاد دلاتا ہے اور مادی اسباب کی پرستش سے آزاد کرتا ہے۔

۳ء۲ بین المذاہب ہم آہنگی

مولانا کا دائرۂ شمولیت مذہبی حدود سے ماورا ہے:

ہفتاد و دو ملت است ایں راراز

زود باشد کایں دو چشمت باز

)دفتر ششم، ۲۵۰(

"یہ سارے بہتر فرقے (72) اسی راز میں ہیں؛ جلد ہی تمھاری دونوں آنکھیں کھل جائیں گی۔"

یہ پیغام مذہبی منافرت اور انتہاپسندی کے خلاف ایک روحانی ڈھال ہے۔

۳ء۳ داخلی انقلاب کی بنیاد

سیاسی و سماجی اصلاحات کی ناکامی کا سبب مولانا کے نزدیک باطنی تبدیلی کا فقدان ہے۔ مثنوی کا مشہور قصہ "شیر و نخچیران"(دفتر اوّل) بتاتا ہے کہ حقیقی آزادی قضاوقدر پر راضی ہونے اور نفس کے بت کو توڑنے میں ہے، نہ کہ محض ظاہری اسباب بدلنے میں۔

۴۔افادیت(Utility)

مثنوی کی عملی افادیت درج ذیل شعبوں میں واضح ہے:

- **تربیتِ نفس :** مولانا نے "جہادِ اکبر" کو مثنوی کی بنیاد بنایا۔ دفتر اوّل میں نفس کو "اژدھائے ہفت سر" کہا گیا ہے جسے صرف شیخِ کامل کی رہنمائی میں زیر کیا جا سکتا ہے۔
- **علاج بالکلام :(Logotherapy)** وکٹر فرینکل (Viktor Frankl) کے "معنی کی تلاش" کے نظریے کو مثنوی کی "طلب" کی منازل پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔
- **تعلیمی نصاب :** پاک و ہند کے مدارس اور جامعات میں مثنوی کو درسِ نظامی کا جز و رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ طالب علم کو بیک وقت زبان، منطق اور روحانیت سکھاتی ہے۔
- **خود شناسی :** نی (بانسری) کا استعارہ دراصل روح کا عالمِ بالا سے فراق اور واپسی کی لازوال تمثیل ہے جو ہر انسان کو اپنی اصل سے جوڑتی ہے۔

۵۔بنیادی افکار(Core Thoughts)

مثنوی کے پیغام کو پانچ مرکزی تصورات میں سمیٹا جا سکتا ہے:

۵ء۱ وحدت الوجود(Unity of Being)

مولانا کا تمام کلام "ہمہ اوست" (سب وہی ہے) کے گرد گھومتا ہے۔ پہلی ہی تمثیل "بادشاہ اور کنیزک" (دفتر اوّل) میں وہ ظاہری عشق کو مجازی پُل بنا کر حقیقی معشوق کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

مَارَاَیْتُ شَیْئًا اِلَّاوَرَاَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ (حدیثِ نبوی کے مفہوم میں) کا عملی اظہار ہے۔

۵ء۲ عشق بطورِ محرکِ وجود

عشق مثنوی میں محض ایک جذبہ نہیں بلکہ تخلیقِ کائنات کا سبب اور ہر حرکت کا جوہر ہے:

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

)دفتر پنجم، ۵۸۶(

"عشق وہ شعلہ ہے کہ جب بھڑکا تو معشوق کے سوا جو کچھ تھا سب جلا کر خاک کر دیا۔"

۵ء۳ انسانِ کامل(Perfect Man)

شیخ، پیر، مرشد کامل کا تصور مثنوی میں مرکزی ہے۔ وہ "آئینۂ حق نما" ہے جس کے بغیر سالک راستہ طے نہیں کر سکتا۔ دفتر اوّل میں حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کا قصہ اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ظاہری علم باطنی حکمت کے سامنے نامکمل ہے۔

۵ء۴ فنا و بقا(Annihilation and Subsistence)

"مرگ پیش از مرگ" (موت سے پہلے موت) مثنوی کا بنیادی نصب العین ہے۔ یہ فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کی وہ تین منازل ہیں جن کا ذکر مثنوی میں جا بجا ملتا ہے۔ مثال کے طور پر دفتر سوّم میں ایک ہندو اور مسلمان کے قتل کی تمثیل بتاتی ہے کہ موت اصل میں وصال کا دروازہ ہے۔

۵ء۵ شریعت، طریقت اور حقیقت کا اتحاد

مولانا کے نزدیک شریعت شمع ہے، طریقت اس کا راستہ اور حقیقت منزل:

شریعت ہمچو شمع ست و طریقت راہِ او

حقیقت منزل است، ایں سہ در یک جاہِ او

)منسوب منظومہ(

مثنوی میں بار بار زاہدِ خشک اور صوفیِ رند کی کشمکش کو دکھا کر یہ دکھایا گیا ہے کہ شریعت کا باطن ہی حقیقت ہے۔

کتابیات(References)

1. **مولانا جلال الدین رومی۔** مثنوی معنوی، تصحیح و مقدمہ: رینالڈ اے. نکلسن، مطبوعہ لندن، ۱۹۴۰-۱۹۲۵۔
2. **بدیع الزماں فروزانفر۔** شرح مثنوی شریف (۳ جلدیں)، تہران، ۱۳۴۵ شمسی۔
3. **عبدالعزیز محدث دہلوی۔** فتح العزیز (شرح مثنوی)، قلمی نسخہ، کتب خانہ ٹیپو سلطان۔
4. **نکلسن، رینالڈ اے۔** رومی: شاعر اور صوفی، ترجمہ: ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور، ۱۹۷۸۔

5. **شمل، این میری**۔ The Triumphal Sun: A Study of the Works of Jalaloddin Rumi، لندن، ۱۹۷۸۔

6. **فرینکلن لیوس**۔ Rumi: Past and Present, East and West، آکسفورڈ، ۲۰۰۰۔

7. **علامہ اقبال**۔ جاوید نامہ، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۳۲۔

8. **جامی، عبدالرحمن**۔ نفحات الانس، مطبوعہ تہران۔

یہ مضمون مثنوی کے اس پیغام کا احاطہ کرتا ہے کہ روحانی بیداری، خودشناسی اور عشقِ حقیقی ہی وہ کنجی ہیں جو انسانیت کو باطنی سلامتی اور سماجی ہم آہنگی عطا کر سکتی ہیں۔

مثنوی دکان وحدت

مولانا کی مثنوی کو "دکانِ وحدت" (وحدت کی دکان) کہا جاتا ہے جہاں ہر حکایت ایک "مثال" ہے جس کے پردے میں "معنی" چھپا ہے۔ خود فرماتے ہیں:

پے بہ بندی، ایں حکایت ہازِ چیست؟

تا کہ غافل، مَردِ معنی رابزیست

(دفتر اوّل، بیت ۱۰۴)

"اس قصے کے بندھن کا مقصد کیا ہے؟ تاکہ غافل انسان معنی کا مزہ چکھ لے۔"

ہم اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے پانچوں بنیادی عنوانات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱. خصوصیات بہ روشنی تمثیل و اشعار

۱٫۱ تمثیلی و اسلوبیاتی انفرادیت — "نے" کی تمثیل

مثنوی کی پہلی اور سب سے مشہور تمثیل "نے" (بانسری) ہے، جو دراصل روحِ انسانی کی وہ داستان ہے جو اپنے اصل (عالمِ ارواح) سے جدا ہو کر مادّی قفس میں نالاں ہے۔ یہ تمثیل مثنوی کے پورے اسلوب کی کنجی ہے:

بشنو از نَے چُوں شِکایَت می کُنَد
از جُدائِی ہا حِکایَت می کُنَد

(دفتر اوّل، بیت ۱)

"بانسری کو سن، کس طرح شکایت کرتی ہے — جدائیوں کی حکایت بیان کرتی ہے۔"

مولانا نہ صرف سنانے والے ہیں بلکہ خود "نے" بن جاتے ہیں، اور یہی خود کو حکایت کا پیکر بنانا مثنوی کی سب سے بڑی اسلوبیاتی خصوصیت ہے۔

۱ء۲ قرآن و سنت سے گہرا استناد — تمثیل "موسیٰ و شبان" (چرواہا)

دفتر دوم میں ایک سادہ دل چرواہا اللہ سے بے تکلف کلام کرتا ہے کہ "میں تیرے جوئیں ماروں، تیری جوتیاں سیوں"۔ حضرت موسیٰؑ اسے ادب سکھانے لگتے ہیں، مگر اللہ موسیٰؑ پر عتاب فرماتا ہے:

تُو بَرائے وَصل کَردَن آمدی
نے بَرائے فَصل کَردَن آمدی

(دفتر دوم، بیت ۱۷۵۴)

"تُو جوڑنے کے لیے آیا تھا، تُوڑنے کے لیے نہیں آیا۔"

یہ حکایت قرآنی آیت "وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ" کی تفسیر ہے اور حدیثِ نبویؐ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ" کی روح کو تمثیل کے ذریعے کھولتی ہے۔

۲. محاسن بہ روشنی تمثیل و اشعار

۲ء۱ جامعیت — تمثیل "پیل اندر خانۂ تاریک" (اندھے اور ہاتھی)

دفتر سوم کی یہ تمثیل بتاتی ہے کہ ہر انسان اپنی محدود حس کے مطابق حقیقت کو جانچتا ہے۔ مولانا تمام مکاتبِ فکر (فقیہ، فلسفی، متکلم) کو اسی اندھے کی مانند دکھاتے ہیں، اور جامع بصیرت صرف "انسانِ کامل" کے پاس ہے:

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ مَن

از درُونِ مَن نَجُست اَسرارِ مَن

(دفترِ سوّم، بیت ۱۲۶۲)

"ہر کوئی اپنے گمان سے میرا دوست بنا—میرے اندر کے اسرار نہ جان سکا۔"

یہی ہمہ گیری مثنوی کا وہ حسن ہے جس نے اسے تمام علوم کے لیے قابلِ قبول بنا دیا۔

۲ء۲ نفسیاتی بصیرت—تمثیل "طوطی وبقال" (طوطا اور بنیا)

دفترِ اوّل میں ایک بنیا کا طوطا اپنی آقا سے محبت میں گرفتار ہے۔ جب وہ اپنے ہم جنسوں کو دیکھ کر "فنا" (مرگِ اختیاری) کا عمل کرتا ہے، تو قفس سے آزاد ہو جاتا ہے:

طُوطِیاں را چُوں خَبَر شُد کَہ چہ کَرد

آں کہ او آزاد و بے زِنداں نگَرد

(دفترِ اوّل، بیت ۱۶۸۹)

"طوطوں کو جب خبر ہوئی کہ اس نے کیا کیا—تب وہ آزاد ہو کر بغیر قفس کے پھرا۔"

جدید نفسیات میں Carl Jung نے جس "انفرادیت (Individuation)" کو زندگی کا ہدف کہا، یہ تمثیل اسی کی صدیوں پہلے صوفیانہ تشریح ہے۔

۳. ضرورت بہ روشنی تمثیل و اشعار

۳ء۱ روحانی خلا کا علاج—"نے" کی تمثیل (دوبارہ)

اکیسویں صدی کا انسان شدید ترین وجودی اضطراب (Existential Vacuum) کا شکار ہے۔ "نے" کی تمثیل دراصل ہر اس انسان کی نمائندگی کرتی ہے جو اپنی اصل (خدا) سے بچھڑ چکا ہے:

هَر کَسے کُو دُور ماند از اَصلِ خوِیش

باز جُوید روز گارِ وَصلِ خوِیش

(دفتر اوّل، بیت ۴)

"جو کوئی اپنی اصل سے دور رہ گیا—وہ پھر سے اپنے وصل کا زمانہ ڈھونڈتا ہے۔"

یہ حکایت آج کے ہر بے چین دل کے لیے ایک روحانی نسخہ ہے کہ علاج مادی ترقی میں نہیں، بلکہ اصل کی طرف رجوع میں ہے۔

۳ء۲ بین المذاہب ہم آہنگی—تمثیل "موسیٰ و شبان"

مذہبی منافرت کے اس دور میں چرواہے کی معصومانہ عبادت کا اللہ کی طرف سے قبول کیا جانا اور موسیٰؑ جیسے برگزیدہ پیغمبر کی سرزنش یہ درس دیتا ہے کہ ظاہری الفاظ نہیں، باطنی اخلاص معیار ہے:

ہِندیان را اَست اِصطِلاحِ مَدحِ ہِند

سِندیان را اِصطِلاحِ مَدحِ سِند

(دفتر دوم، بیت ۱۷۶۳)

"ہندیوں کے پاس ہندی میں مدح کا طریقہ ہے—سندھیوں کے پاس سندھی میں مدح کا طریقہ۔"

یہ تمثیل بتاتی ہے کہ ہر قوم اور مذہب کی عبادت اسی ایک ذات تک پہنچنے کا راستہ ہے، بشرطیکہ خلوص ہو۔

۴. افادیت بہ روشنی تمثیل و اشعار

۴ء۱ تربیتِ نفس—تمثیل "شیر و نخچیران" (شیر اور جانور)

دفتر اول میں جانور شیر کو روزانہ ایک قربانی دیتے ہیں، یہاں تک کہ خرگوش شیر کو کنوئیں میں اپنا عکس دکھا کر مار ڈالتا ہے۔ شیر یہاں "نفسِ امّارہ" ہے، اور خرگوش عقلِ باطنی (یا مرشد) کی علامت:

گفت خرگوش ای جماعت، گویدام
کاین نباشد فعلِ شیریں، ہمّتے

(دفتر اوّل، بیت ۱۱۰۰)

"خرگوش نے کہا: اے جماعت! میں کہتا ہوں — یہ شیریں (پسندیدہ) کام نہیں، کچھ ہمت کرو۔"

یہ تمثیل عملی تزکیہ کے لیے بتاتی ہے کہ نفس کا خاتمہ براہِ راست مقابلے سے نہیں، بلکہ اسے اس کی حقیقت (کنوئیں کا عکس) دکھانے سے ہوتا ہے۔

۲ء۴ علاج بالکلام و علمِ نافع — تمثیل "نحوی و کشتی بان" (نحوی اور ملاح)

دفتر اوّل کا ایک عالمِ نحو کشتی میں سوار ہے اور ملاح سے پوچھتا ہے کہ "صرف و نحو پڑھی ہے؟" ملاح کہتا ہے "نہیں"۔ عالم کہتا ہے "نصف عمر گئی۔" طوفان آتا ہے تو ملاح الٹا پوچھتا ہے "تیرنا جانتے ہو؟" عالم کہتا ہے "نہیں۔" ملاح کہتا ہے:

گفت نحوی را کُلِّ عُمرَت در فَنا
زانکہ کِشتی غَرَق گشت اندر فَنا

(دفتر اوّل، بیت ۲۸۳۲)

"ملاح نے نحوی سے کہا: تیری ساری عمر فنا ہو گئی — کیونکہ کشتی اس فنا میں ڈوب رہی ہے۔"

یہ تمثیل بتاتی ہے کہ ظاہری علوم اسی وقت مفید ہیں جب "فنا" یعنی خود کو مٹا کر حق میں ڈوب جانے کا ہنر بھی آتا ہو — یہی مثنوی کی اصل افادیت ہے۔

۵. بنیادی افکار بہ روشنی تمثیل و اشعار

۵ء۱ وحدت الوجود — تمثیل "دق الباب" (دروازہ کھٹکھٹانا)

دفتر اول میں ایک عاشق معشوق کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ معشوق پوچھتا ہے "کون؟" عاشق کہتا ہے "میں" (من)۔ معشوق جواب دیتا ہے "یہاں دو کا گنجائش نہیں، چلا جا۔" عاشق عشق کی آگ میں جل کر بالکل خالی ہو جاتا ہے اور جب دوبارہ دستک دیتا ہے تو جواب دیتا ہے "تُو"۔ دروازہ کھل جاتا ہے:

گفت: کِی دَر آ ای دَر آں یک بُوَد

نے دُوِی را دَر دَرِیں جارہ بُوَد

(دفتر اوّل، بیت ۳۰۶۰)

"معشوق نے کہا: اب اندر آ، کیونکہ وہ ایک ہے — یہاں دوئی کا کوئی راستہ نہیں۔"

وحدت الوجود کا یہ سب سے عام فہم اور بلند ترین بیان تمثیل کی زبان میں صرف مثنوی میں ہی ملتا ہے۔

۵ء۲ عشق بطورِ محرکِ وجود — تمثیل "پادشاہ و کنیزک" (بادشاہ اور لونڈی)

دفتر اول کی پہلی بڑی حکایت میں بادشاہ ایک کنیز پر عاشق ہو تا ہے، اور یہ مجازی عشق اسے ایک حکیمِ الٰہی (مرشد) تک لے جاتا ہے جو کنیز کا علاج کر کے بادشاہ کو حقیقی عشق سے آشنا کرتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

عشق آں شُعلہ ست کُو چُوں بَر فُروخت

ہَر چہ جُز مَعشُوق بَاقِی جُملہ سُوخت

(دفتر پنجم، بیت ۵۸۶)

"عشق وہ شعلہ ہے کہ جب بھڑکا — تو معشوق کے سوا جو کچھ تھا سب جلا کر خاک کر دیا۔"

اس تمثیل میں بتایا گیا کہ ساری کائنات "عشق" ہی کے طفیل حرکت میں ہے، اور ہر عشقِ مجازی اسی عشقِ حقیقی کا پُل ہے۔

۵ء۳ انسانِ کامل — تمثیل "موسیٰ و خضر"

دفتر اول میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کی وہی قرآنی حکایت آتی ہے، مگر مولانا نے اسے "پیرِ کامل" کی اہمیت کے لیے تمثیل بنا دیا۔ خضرؑ کشتی میں سوراخ کرتے ہیں، بچے کو قتل کرتے ہیں، دیوار سیدھی کرتے ہیں۔ موسیٰؑ بے صبری کرتے ہیں، مگر خضرؑ کے باطن میں حکمت ہوتی ہے:

فعلِ خِضر آں چُنیں آں دَنگ ساخت

کہ بُتِ موسیٰ زِخضر آں رنگ ساخت

(دفتر اوّل، بیت ۲۳۱۰)

"خضر کا وہ کام موسیٰ کو ایسا حیران کر گیا— کہ موسیٰ کا بت (ظاہری عقل) خضر کے اس رنگ میں رنگ گیا۔"

یہ تمثیل مثنوی کے مرکزی فکر "پیر کی ضرورت" کو واضح کرتی ہے کہ شریعت کی ظاہری تعلیم کے لیے موسیٰؑ کافی ہیں، مگر باطنی تربیت (طریقت و حقیقت) کے لیے خضرِ وقت لازم ہے۔

۵ء۴ فنا و بقا— تمثیل "طوطی و بقال" (دوبارہ)

اسی طوطے کی تمثیل میں فنا کا عملی نقشہ ہے۔ جب تاجر ہندوستان سے آکر طوطے کو اپنے ہم جنسوں کی موت کی خبر دیتا ہے، تو طوطا فوراً قفس میں مر جاتا ہے۔ تاجر اسے باہر نکالتا ہے تو وہ اُڑ جاتا ہے اور کہتا ہے:

گفت طُوطی کُو بہ طُوطے داد پَند

کہ بَمُر دَن، سَخت بگشا دَست و بَند

(دفتر اوّل، بیت ۱۷۲۰)

"طوطے نے کہا: اس (ہندوستان کے) طوطے نے مجھے یہ نصیحت دی— کہ مرنے سے ہی سختی کے ہاتھ پاؤں کھلتے ہیں۔"

بقول مولانا: "مرگ پیش از مرگ" (موت سے پہلے مرنا) ہی فنا ہے، اور یہی مثنوی کا سب سے عملی پیغام ہے۔

۵ء۵ شریعت، طریقت، حقیقت کا اتحاد— تمثیل "موسیٰ و شبان"

چرواہے کی بظاہر خلافِ شریعت باتیں اللہ کے نزدیک مقبول ہیں کیونکہ اس کا باطن طریقت کے زیور سے آراستہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

مَاں زِہَر زَنبُورا اَنگبیں خواہیم
نے زِہَر بَر قَند نِشتر ہا خَرِیم

(دفتر دوم، بیت ۱۷٦۰)

"ہم ہر شہد کی مکھی سے شہد چاہتے ہیں—ہم ہر برقی بادل سے کانٹے نہیں خریدتے۔"

یعنی شریعت کا ظاہر تلوار ہے، مگر جب طریقت کا باطن اس میں شامل ہو تو وہی شریعت در حقیقت "حقیقت" کا دروازہ ہے۔ یہ اتحاد مثنوی کا پیغام ہے کہ خشک زاہد اور رند صوفی میں حقیقی ٹکراؤ نہیں۔

نتیجہ

تمثیلاتِ مثنوی محض کہانیاں نہیں، بلکہ ہر ایک "پیمانۂ معنی" ہے جس کے بغیر مثنوی کے محاسن، ضرورت، افادیت اور افکار کو سمجھنا ممکن نہیں۔ نے، طوطی، شیر، ہاتھی، خضر، شبان، عاشق اور دروازہ—یہ سب ایک ایک کر کے مولانا کے باطنی مکتب کے دروازے ہیں، اور ہر دروازہ کھلتے ہی ایک ہی حقیقت سامنے آتی ہے "**: ہمہ اوست** "(سب وہی ہے)۔

کتابیات (منتخب)

1. مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، تصحیح: رینالڈ اے. نکلسن، لندن، ۱۹۴۰-۱۹۲۵۔
2. بدیع الزماں فروزانفر، شرح مثنوی شریف (۳ جلدیں)، تہران۔
3. این میری شمل، The Triumphal Sun: A Study of the Works of Jalaloddin Rumi، لندن، ۱۹۷۸۔
4. عبدالعزیز محدث دہلوی، فتح العزیز (شرح مثنوی)، قلمی نسخہ۔
5. علامہ اقبال، جاوید نامہ۔

معنون

اللہ جل شانہ کے فضل واحسان اور نبی دوجہاں، سر دلبراں، شافع دوجہاں، روحِ زمن، روحِ چمن، روحِ بہاراں سید عالماں نور مجسم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی کرم نوازیوں سے آج تقریباً ایک سال کی کوشش اور تحقیق کے بعد مثنوی مولانا رومؒ کی تشریح وتاویل جدید وقدیم طریقے سے منظر عام پر لائی جارہی ہے۔ اس کا نام "انوار مثنوی" مولانا رومؒ رکھا ہے۔

ہوا یہ کہ بندہ چار فورم پر تحریرات شئیر کرتا ہے۔ جس میں تفسیر وحدیث، علم سیکھیئے، ہاشمی فیملی اور انوار مثنوی۔ ہوا کچھ یوں کہ یہ تحریرات صرف فورم میں شئیرنگ تک تھیں کہ ایک دن عزیز بھانجے ڈاکٹر شفقت رسول صاحب حفظہم اللہ تعالیٰ کہنے لگے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ مل سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ تو بس شئیرنگ تک تھا۔ انہوں نے کچھ ایسے الفاظ ادا کئے کہ انہیں ضائع نہ کریں اور دستاویز کی شکل میں سامنے لائیں اس وقت تک تفسیر سورہ العمران تک ختم ہو چکی تھی لیکن پاس نہیں تھی افسوس ہوا پھر تہیہ کیا کہ انہیں کتابی شکل میں لایا جائے گا اس لئے سورۃ النساء کی تفسیر ای بک بنادی۔ مثنوی کی طرف صوفیٔ باصفا، مرد کامل حکیم عبدالحی قدس سرہ العزیز، رومیٔ عصر مولانا پیر علاؤالدینؒ اور پیر مولانا سردار احمد صاحب کھرپیڑ شریف کے پر مغز بیانات سے مثنوی پر تحقیق شروع کی۔ تو ہمارے ایک کرم فرما ڈاکٹر نسیم صاحب دام برکاتہم! نے خوب حوصلہ افزائی کی اس لئے یہ کتاب عمل میں آئی۔

طرز تحریر کو اگرچہ عام بنانے کی کوشش کی ہے لیکن اسراری زبان کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لئے کچھ فقرات بار بار ملیں گے کسی کو پہلی دفعہ اور کسی کو کئی بار پڑھنے سے واضح ہونگے۔ مشکل الفاظ کے معانی کو بامحاورہ بنایا گیا ہے۔ پہلے کچھ صفحات مشکل ہیں اس لئے ایک دو صفحہ پڑھنے سے لطف برقرار رہے گا ورنہ ثقالت محسوس ہو سکتی ہے۔ اردو زبان میں اتنی جامع تشریح پہلے نہیں ہوئی۔ اس کے لئے ایرانی، فارسی، ترکی، انگلش اور اردو تشریحات سے مدد لی گئی ہے۔

امید واثق ہے اس سے روحانی لذت کے ساتھ ساتھ علمی تشفی بھی ہوگی۔ اللہ کریم اس کاوش کو قبول فرمائے۔ اس کا مقصد افراط وتفریط سے منزیٰ ایک طرز کو اجاگر کرنا ہے۔ اللہ کرے کوئی اس پر اسی طرز سے مزید کام کو آگے بڑھائے۔

صحیح علم تعصب نہیں سکھاتا بلکہ حقائق کی طرف لے جاتا ہے۔ خارج میں علم موجود ہے جو تمام انسانوں کو ان کی استطاعت کے مطابق ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ اس کا ادراک ایسے ہے: جیسے فلاسفہ کہتے ہیں کہ 'انڈا اگر اندر سے ٹوٹے تو حیات ہے اگر باہر سے ٹوٹے تو موت'، علم نافع بھی اندر کے ٹوٹنے سے ہی حیات پاتا ہے۔

دین کو سمجھنے کے لئے عربی، فارسی کا جاننا ضروری ہے۔ اس لئے ایک کوشش ہے کہ اصل معارج کی طرف علماؑ اور اہل علم حضرات کا رخ کیا جائے تا کہ روحِ دین حاصل ہو۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف!

والسلام

بندۂ خاکسار محمد طاہر ہاشمی غفرلہ

ایرانی

خود غریبی در جھانُ چون شَمس نیست
شَمسِ جانِ باقي يي کِشُ اَمُس نیست

پاکستانی

خود غریبے در جان چُون شَمس نیست
شَمسِ جانِ باقیست کورا اَمُس نیست

غریب: مسافر۔۔۔در جہاں: دنیا میں۔۔۔ شمس نیست: سورج کی طرح نہیں۔۔۔ شمس جاں: ذات حق۔۔۔ امس: گذشتہ کل

ترجمہ: بے شک جہاں میں سورج جیسا کوئی مسافر نہیں، اس بات کے بر خلاف کہ آفتاب جان یعنی ذات حق ہمیشہ قائم ہے جس کو کل کی قید کا کوئی امکان نہیں۔

یعنی کہ ظاہری آفتاب تو ہمیشہ سیر گردش میں ہے جو معلومات قیمہ کے موافق دن بھر چلتا رہتا ہے اور رات کو غائب ہو جاتا ہے لیکن وہ جان و ارواح کو منور کرنے والا سورج یعنی حق جل و علاء کبھی غائب نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی ایک ہی شان میں اَلآن کَما کان (اس وقت بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلے تھا، ویسا کا ویسا) جلوہ گر ہے۔

دنیا میں سورج سے زیادہ عجیب اور حیرت انگیز کوئی چیز نہیں، سورج ابدی زندگی ہے اور اس کے لیے آج اور کل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

روشنی اور سورج کا ظہور اور طلوع ہمارے ساتھ ہر صبح ہوتا ہے اور ہمیں توانائی اور برکت دیتا ہے، لیکن ہم اس سے بے خبر ہیں اور چونکہ ہم نہیں سمجھتے، ہم روشنی کو کہیں اور سے تلاش کرنا چاہتے ہیں...

جنابرومیؒ کہتے ہیں کہ یہ روشنی جو کہ بہت ہی حیرت انگیز ہے، عجیب ہے اور اسے کوئی نہیں جانتا!

روح سے جو مراد ہے وہ ابدی وجود ہے جو اس لافانی حقیقت سے روح کے تعلق کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ اس ابدی روح کا موازنہ سورج سے کیا جاتا ہے، جو مادی سورج کے برعکس طلوع یا غروب نہیں ہوتا، بلکہ مسلسل چمکتا رہتا ہے اور کل، آج یا کل موجود نہیں ہے۔ یہ غیر مادی سورج اس مادی دنیا میں بہت عجیب اور نامعلوم ہے کیونکہ ہر کسی میں اسے پہچاننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

شمس ایک ایسا موضوع ہے جو ازلی اور ابدی ہے۔ آج، کوانٹم سائنس بھی ثابت کرتی ہے کہ وقت اور جگہ روشنی میں موجود نہیں ہے...

مولانا رومؒ شمسؒ کی شکل میں اپنے شیخ کو دیکھتے ہیں

مولانا رومؒ شمسؒ کی شکل میں اپنے شیخ کو دیکھتے ہیں جن کی کرنیں ان کی روح کو سیراب کر رہی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے تھوڑا مزید بیان ہو

شمس تبریزؒ نے ایک دفعہ دعا کی کہ مجھے وہ بندہ ملے جو میری صحبت کا متحمل ہو یہ دعا قبول ہوگئی اور قونیہ میں مولانا روم کے پاس پہنچ گئے حضرت شاہ شمس تبریز اپنے عہد کے عظیم روحانی پیشوا تھے۔ حضرت شاہ شمس تبریزؒ ایران میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد بن علی بن ملک داد تھا۔ ان کے والد علی بن ملک داد یا ملک داؤد کپڑے کے تاجر تھے جو خراسان سے تبریز تجارت کی غرض سے آیا جایا کرتے تھے۔ والد چونکہ اکثر سفر میں رہتے تو انہیں معصوم اور خوش شکل ننھے شمس کی طرف سے پریشانی لگی رہتی۔ اس لئے انہیں تبریز لاکر تعلیم کی غرض سے چھوڑ دیا۔ یہیں تبریز میں تعلیم کی غرض سے قیام کیا مگر ابتدائی تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی معلوم نہیں۔ البتہ ابتدا ہی سے روحانیت کی طرف مائل تھے۔ تاریخ کی کتب کے مطابق ابو بکر سلباف کو ان کا پہلا استاد مانا گیا ہے جن سے شمسؒ نے بیس سال کی عمر سے لے کر چونتیس برس تک علم سیکھا۔ شیخ ابو بکر سلباف ٹوکریاں بنا کر اپنی گزر بسر کیا کرتے تھے۔ وہ صوفی منش تو تھے مگر وہ کسی شاگرد کو فقیرانہ یا درویشانہ لباس پہننے کی اجازت نہ دیتے۔ ان کا اندازِ درس و تدریس مختلف تھا کیونکہ وہ ملامت نفس یعنی خود کی خامیوں کو درک کرنا اور فتویٰ یعنی اپنے باطن کو نکھارنے، دلوں

کا احیاء کرنے، انہیں پاک کرنے اور روحانی بیداری کا گہرا احساس پیدا کرنے کی مشق کروایا کرتے تاکہ عجز و انکساری وجود میں سرایت کر جائے۔ شاہ شمس تبریزؒ ان کے ساتھ چودہ سال وابستہ رہے کیونکہ ان کے دروس صرف لفاظی کا شاخسانہ نہ تھے بلکہ ان کا علم و عمل یکساں طور سے ابو بکر سلباف کے وجود سے چھلکا کرتا تھا۔

حضرت شمسؒ اور ان کے دیگر شاگردوں میں ایک واضح فرق یہ تھا کہ شمس ہمیشہ تاجروں کے لباس میں رہتے اور جب کبھی کسی سفر پر جایا کرتے تو خانقاہ جسے ترکی میں tekke کہا جاتا ہے جا کر قیام کرنے کی بجائے کارواں سرائے میں ٹھہرتے۔ ان کی ایک روش دوستوں کو حیران کرتی تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے بکسے اور کمرے کا تالہ مضبوطی سے لگایا کرتے۔ سب حیران ہوتے کہ جب کہ ان کے پاس کچھ بیش قیمتی نہیں ہے تو وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ مگر ان کا یہ طرز عمل کیوں رہا یہ ایک سربستہ راز ہی رہا، بالکل ویسے ہی جیسے ان کی شخصیت کے کئی پہلو۔

چودہ سال کی طویل مدت ابو بکر سلباف کے ساتھ گزارنے کے بعد شمس نے قریہ قریہ حق کی تلاش اور ملاقات کے لئے سرگردانی اختیار کی۔ وہ قلندری سرائوں میں قیام کرتے، سماع کرتے مگر مسافر قلندریوں کی طرح کاسہ لے کر کھانا نہیں مانگا کرتے تھے۔ وہ ملامتی صوفیوں کی فہرست میں شامل تھے جن کا طرز عمل صوفی منش نہیں ہوتا اور جو روایت سے ہٹ کر زندگی گزارتے ہیں اور اپنے عرفانی درجات و منازل کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔

حضرت شاہ شمسؒ مختلف علاقوں جیسے بغداد، دمشق، حلب، قیصریہ، اکسرے، سیواس، ارزورم اور ایرزنکن وغیرہ کا سفر کرتے کرتے کئی شخصیات کے مختلف علوم کے دریاؤں سے سیراب ہوئے۔ اپنے سوالات کے ذریعے بے شمار شیوخ اور علماء کو آزمایا۔ وہ ولایت پر توجہ دینے والوں کو آزمایا کرتے۔ اس طرح وہ جان لیا کرتے کہ کون ابھی تک مکمل طور پر سرنڈر نہیں ہوا۔ ان کی تلاشِ حق میں کمی رہ گئی ابھی اور جستجو کی ضرورت ہے۔ مگر ان تمام راستوں اور ملاقاتوں کے دوران جب کہ ان کی طلب اپنے وقت کے قطب اور ابدال کو جاننا، ان سے گفتگو، روحانی فیض و فضل اور ایک حقیقی دوست پانا تھا، وہ مختلف علوم جیسے تصوف کے علاوہ کیمیا، علم نجوم، ریاضت، الوہیت، حکمت اور منطق وغیرہ سے آشنا ہوئے اور انہیں سیکھا۔

اس دوران ساٹھ برس بیت گئے۔ ایک بے قراری تھی جو دن بدن غالب آ رہی تھی کیونکہ الف اللہ کی بوٹی تو لگی تھی مگر پانی سے سیراب کرنے والا چاہیے تھا۔ وہ کہاں ہے؟ وہ کون ہے؟ اس بات کا جواب چاہیے تھا۔ ایک دن ایک سرائے گئے۔ اس کے مالک سے کہا کہ میں کمرے میں جا رہا ہوں مگر تم اسے باہر سے مقفل کر دو۔ وہ شخص حیران ہوا کہ ایسا کیوں کروں؟ مگر اسے کہا تمہیں اس سے کیا مطلب۔ کہنے لگا تم کھانے پینے کے لئے کیسے جاؤ گے۔ کہا کہ اس بارے میں پریشان نہ ہو۔ کہنے لگا دروازہ کب کھولوں؟ کہا جب تمہارا دل چاہے اور تمہارے اندر سے ایسا کرنے کی آواز آئے۔ خیر اس نے ان کے بے حد اصرار پر دروازہ

باہر سے مقفل کر دیا۔ حضرت شاہ شمسؒ کمرے میں آئے دعا کرنے بیٹھے مگر بے قراری غالب آگئی۔ اللہ ھو اللہ ھو کہتے کہتے کب گول گول گھومنا شروع کیا پتہ ہی نہ چلا۔ جب نڈھال ہو کر زمین پر آگرے اور نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے تو ایسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہے کہ جاؤ! روم جاؤ! وہیں تمہیں وہ دوست ملے گا جو خدا کا ولی ہے! اور جان لو! کہ وہی خدا ہے جو دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے!

وہ اسی لئے اک ندا پر اناتالیہ چلے آئے جہاں شمسؒ نے رومی کو اور رومی نے شمس کو دیکھا تو چند لمحوں میں ہی پہچان لیا کیونکہ دونوں ہی پیاسے تھے اور دونوں ہی کسی ولی کامل کی تلاش میں تھے۔ رومیؒ اور شمس کی ملاقات سے پہلے ہی رومیؒ شعر کہنے لگے تھے جو محبت و الفت میں گندھے تھے مگر کچھ کمی تھی وہ یہ کہ رومیؒ نے فطرت اور ذات الوہیت کے جلووں کا کامل نظارہ اور اسے پالینے کا تجربہ نہیں کیا تھا جو صرف شمس ہی رومی کو کرواسکتے تھے۔

شمسؒ اور رومیؒ کے مابین عارفانہ گفتگو کا سلسلہ چالیس روز تک چلتا رہا۔ ان ایام میں رومیؒ نے شمسؒ کے جمال کو ملاحظہ کیا مگر پھر دوستی اور ولایت کا دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ دور رومیؒ کو جلال دکھلانے کا تھا۔ جلال کسی بھی شکل میں ہو سکتا ہے، تنبیہ کی شکل میں یا دوری کی شکل میں۔ شمسؒ نے دوری کا انتخاب کیا تا کہ رومیؒ جمال کے بعد جلال اور قربت کے بعد فرقت کی لذتوں کے مزے لے سکیں۔ یہ تجربہ ضروری تھا کیونکہ ہر وہ شخص جو خدا کی دوستی کا طالب ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ جب جلالِ خداوندی کا مزہ چکھتا ہے تو جلالِ خدایا آزمائشوں کے لئے بھی آمادہ رہے۔ شمسؒ چاہتے تھے کہ رومیؒ سفر کریں۔۔۔ مجازی عشق سے حقیقی عشق کا سفر! (دنیا سنڈے۔۰۱۔۰۷۔۲۰۲۴)

شاہ شمس کی پہلی کرامت

معروف کرامت معرض وجود میں آئی کہ مولانا جلال الدین رومیؒ اپنے درس میں طالب علموں کو تعلیم دے رہے تھے کہ حضرت شاہ شمس سبزواری تبریزیؒ دورانِ درس تشریف لے گئے جو کہ نہایت سادہ لباس میں تھے اور مولانا رومیؒ کے قریب بیٹھ گئے۔ مولانا رومیؒ کے قریب چند کتابیں پڑی ہیں، حضرت شاہ شمسؒ نے مولانا رومیؒ کی طرف مخاطب ہو کر کتابوں کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا یہ کیا ہے؟ جواب ملا اسے علم کہتے ہیں، جو کہ آپؒ نہیں جانتے۔ آپؒ کو اس سے کیا نسبت؟ حضرت شاہ شمسؒ نے مولانا رومیؒ کا یہ فقرہ سنا تو جلال میں آئے اور وہ تمام کتابیں اٹھا کر پانی کے بھرے حوض میں ڈال دیں۔ مولانا رومیؒ کو آپؒ کے اس عمل سے بڑا قلق ہوا اور غصہ و پریشانی کے عالم میں آپؒ رو پڑے اور کہا: اے درویش! تم نے یہ کیا کر دیا، میری تمام روح کی غذا تم نے ایک لمحے میں ضائع کر دی، کتابیں بڑی نایاب تھیں۔ اب کہیں سے نہیں ملیں گی۔ حضرت شاہ شمسؒ نے جب

مولانا رومیؒ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو فرمایا: تمہاری روح کی غذا اگر تمہیں مل جائے تو؟ مولانا رومیؒ نے کہا کیسے ممکن ہے؟ آپؒ دوبارہ پانی سے بھرے حوض کے نزدیک گئے۔ سب سے پہلے پانی میں سے وہ کتاب نکالی، جس کا مولانا رومیؒ کو زیادہ صدمہ تھا۔ جب حضرت شاہ شمسؒ نے کتاب کو مولانا رومیؒ کے ہاتھوں میں دیا تو کتاب کو پانی کے قطرے نے بھی نہ چھوا تھا۔ مولانا رومیؒ نے آپ حضرت شاہ شمسؒ کا یہ کمال دیکھ کر حیرت سے پوچھا یہ کیا ہے؟ آپؒ نے مولانا رومیؒ کو جواب دیا: یہ وہ علم ہے کہ جسے تم نہیں جانتے۔ اس دوران مولانا رومیؒ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ آپؒ کے دست مبارک پر بیعت ہو گئے۔ آپؒ نے مولانا رومیؒ کو طریقت کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا، تو آپؒ نے اپنی پوری زندگی حضرت شاہ شمسؒ کے نام وقف کر دی۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے لوگوں سے گفتگو ترک کر دی۔ ان معاملات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں حضرت شاہ شمسؒ کے خلاف چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لوگ آپؒ کو دیوانہ کہنے لگے۔ یہاں تک کہ مولانا رومیؒ کے خاص شاگرد بھی حضرت شاہ شمسؒ سے برہم ہونے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ مولانا رومیؒ کی عدم توجہی کا باعث حضرت شاہ شمسؒ ہیں۔ اگر وہ یہاں سے چلے جائیں، تو پھر مولانا رومیؒ کی صحبتوں سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔ حضرت شاہ شمسؒ کو لوگوں کی براہی کا حال معلوم ہوا، تو ایک دن چپکے سے دمشق چلے گئے۔ مولانا رومیؒ نے شاگردوں اور دوسرے لوگوں سے یکسر قطع تعلق کر لیا۔ گوشہ تنہائی دن و رات مرشد کی یاد میں تڑپتے رہتے۔ اس زمانے میں مولانا رومیؒ نے حضرت شاہ شمسؒ کی یاد میں ایسے پر درد اشعار کہے، جنہیں سن کر پتھر دل بھی رو پڑے: مولوی

ہر گز نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریزیؒ نہ شُد

پاکستان کے شہر ملتان میں موجود مزار "شاہ شمس تبریز" کے نام سے مشہور ہے، لیکن تاریخی دستاویزات کے مطابق یہ مخدوم شمس الدین محمد سبزواری کا مزار ہے، جو شمس تبریزی سے مختلف ایک الگ روحانی شخصیت ہیں۔

مولانا جلال الدین محمدؒ بلخی رومی ان سے متاثر تھے۔ دو سال ان کی صحبت میں رہے، کہا جاتا ہے کہ مولانا روم کے مریدوں نے حسد کی وجہ سے قتل کیا۔

ایرانی

شَمس در خارج اگرچہ ھست فَرد

می توان ھم مِثلِ او تَصویر کرد

پاکستانی

شَمس در خارج اگرچہ ہست فرد
مِثلِ او ہم میتواں تَصویر کرد

فرد: اکیلا۔۔۔ مثل او: اس کی مثل۔۔۔ می تواں: ہم کر سکتے ہیں۔۔۔ تصویر: اس سے مراد یہاں تصور ہے۔ یعنی خیال میں لانا

ترجمہ: آسمان کا سورج اگرچہ خارج میں ایک ہی ہے۔ مگر ذہنی طور پر ہم اس جیسے ایک اور سورج کا تصور کر سکتے ہیں۔

یعنی کہ اگرچہ آسمان کا سورج ایک ہی ہے مگر ذہن میں اس جیسے اور اافتابوں کا تصور کر لینا کوئی مشکل نہیں۔ یہ آفتاب ظاہر کا تو ایسا ہو سکتا ہے لین آفتاب حقیقی (ذات حق) کے لئے ناممکن ہے۔

زندگی کا سورج، جو آسمانوں اور حواس کی دنیا کے دائرے سے باہر ہے، اس کا نہ ذہن میں کوئی ہمنوا ہے اور نہ ہی دماغ سے باہر۔

مولاناؒ نے حس کے سورج کا تقابل حق کے سورج سے کیا ہے کیونکہ پہلے کا تصور کیا جا سکتا ہے لیکن دوسرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور انسانی ذہن اور ادراک اس کے لیے ماحول نہیں بنتے اور یہ بات واضح ہے کہ جب تک کسی چیز کا تعین نہ ہو جائے۔ اور ذہن میں پہچانا جاتا ہے، جیسے اور ایک تشبیہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

قول باری ہے

وَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ ﴿١٦٣﴾ بقرہ

تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں وہ بہت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

والھکم الہ واحد (اور تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے) یہاں اللہ سبحانہ کا اپنی ذات کو اس صفت سے موصوف کرنا کہ وہ ایک ہے اپنے اندر کئی معانی رکھتا ہے اور یہ تمام معانی اس لفظ کے اندر مراد ہیں۔ ایک معنی تو یہ ہے کہ اللہ واحد ہے کسی بھی چیز کے اندر اس کی نہ کوئی نظیر ہے نہ شبیہ اور نہ کوئی مثل ہے نہ مساوی۔ اسی بنا پر وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے واحد کی صفت کے ساتھ موصوف قرار دیا جائے۔ -دوم یہ کہ وہ عبادت کے استحقاق نیز الہٰیت کے وصف میں واحد ہے۔ اس میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے۔ سوم یہ کہ وہ ان معنوں میں واحد ہے کہ اس پر تجزی اور تقسیم کا حکم عائد کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ذات کے حصے کیے جاسکتے ہیں۔ اس لئے کہ جس ذات کے حصے کیے جائیں اور اس پر تجزی اور تقسیم کا حکم عائد کرنا جائز ہو وہ ذات حقیقت میں ایک اور واحد نہیں ہو سکتی۔ چہارم یہ کہ وہ وجود کے اعتبار سے واحد ہے۔ وہ قدیم ہے اور قدیم کی صفت میں منفرد ہے۔ وجود کے اندر اس کے ساتھ اس کی ذات کے سوا کوئی اور چیز نہیں تھی۔ اپنی ذات کو واحد کی صفت کے ساتھ موصوف کرنا مذکورہ بالا تمام معانی پر مشتمل ہے۔ (احکام القرآن)

ایرانی

شَمْسِ جان کو خارج آمد از اَثیر
نَبُوَدَش در ذھن و در خارجُ نَظیر

پاکستانی

لیک آں شمسیکہ شد مستش اثیر
نَبُوَدَش در ذھن و در خارجُ نَظیر

لیک آں: اس کی طرح۔۔۔ مست: فریفتہ۔۔۔ اثیر: بلند و عالی۔۔۔ نبودش: اس کی غیر موجودگی۔۔۔ نطیر: مثال

ترجمہ: لیکن وہ آفتاب حق کہ کرۂ نار تک کی عالی مخلوق اس کے لئے مست ہے۔ اس کی مثال نہ ذہن میں ہے نہ خارج میں۔

گویا شمس کی شناسائی اور اس کے بعد مولانا رومؒ سے علیحدگی کا جذبہ رومی کے ذہن جلتی ہوئی محبت میں چھوڑ گیا۔ یہ اچانک غائب ہو گیا۔

فوروز نفر لکھتے ہیں کہ "منطق کی تعریف کے مطابق، شمس ایک عمومی تصور ہے جو تخیل میں زندگی کا سورج رکھا جاتا ہے اور انسانی ذہن اور ادراک اس ماحول کے گرد گھومتا ہے جب تک کہ وہ اس سے ملتی جلتی کسی چیز کا تصور نہ کرے۔

زندگی کا سورج، جو آسمانوں اور حواس کی دنیا کے دائرے سے باہر ہے، اس کا نہ ذہن میں کوئی ہمنوا ہے، نہ دماغ سے باہر۔

جناب رومیؒ نے احساس کے سورج کا موازنہ سچائی کے سورج سے کیا ہے۔ اس لیے کہ "حساس سورج" کا تصور کیا جا سکتا ہے، لیکن "سچائی کے سورج" کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور انسانی ذہن اور ادراک اسے گھیر نہیں سکتے۔ اور یہ واضح ہے کہ جب تک ذہن میں کسی چیز کا تعین اور شناخت نہ ہو جائے۔ مماثلت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ارشاد باری تعالیٰ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۠

وَالشَّمۡسِ :سورج کی قسم وَضُحٰهَا :اور اس کی روشنی

سورج کی قسم! اور اس کی روشنی کی

سورج کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں، برکتیں اور نشانیاں ہیں

الشمس: 1 میں فرمایا: سورج کی قسم! اور اس کی روشنی کی۔ اس آیت میں "ضحی" کا لفظ ہے، مفسرین نے کہا ہے: اس سے مراد سورج کی روشنی اور اس کی حرارت ہے، اللہ تعالیٰ نے سورج میں ایسے اثرات رکھے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی لطیف حکمتوں اور اس کی تدبیر کی باریکیوں اور برکتوں اور اس کی قدرت کی نشانیوں پر دلالت کرتے ہیں۔

(1) سورج میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے عجائبات میں سے یہ ہے کہ سورج کا نور سائے کو ختم کر دیتا ہے اور چاند کے نور سے چھپ جاتا ہے اور ستارے نظر نہیں آتے اور ہوا میں سورج کے نور کے چمکیلے ذرات غبار کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

(2) پھر سورج کی حرارت سے کھیتوں میں سبزیاں، اور دانے پکتے ہیں اور باغوں میں پھل تیارے ہوتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں، اور انسانوں اور حیوانوں کے لیے صالح غذا تیار ہوتی ہے۔ (3)

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکیمانہ تدبیر سے سورج کو زمین سے مناسب فاصلہ پر رکھا ہے، اگر یہ فاصلہ کم ہو تا تو تمام کھیت اور باغات جل جاتے ہیں اور اس کی حرارت کی شدت سے تمام انسان اور حیوان جل کر راکھ ہو جاتے۔

(4) پھر سورج میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی یہ ہے کہ سورج کئی ہزار میل کی مسافت قطع کرتا ہے اور پوری زمین کے گرد ایک چکر لگاتا ہے، پھر سورج سے اللہ تعالیٰ اپنے جود و کرم کا اظہار فرماتا ہے کیونکہ اس کی روشنی اور حرارت ہر ذی روح کو پہنچ رہی ہے، خواہ وہ اللہ کو ماننے والا ہو یا اس کا منکر ہو، اس کا شکر گزار ہو یا ناشکرا ہو، اس کا دوست ہو یا اس کا دشمن ہو۔

(5) سورج کے وجود میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلیل ہے کیونکہ سورج کا ایک مخصوص جسم ہے، اور وہ ایک خاص جگہ سے اور خاص وقت میں طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اور اس کے اس نظام میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، پس ضروری ہوا کہ سورج کو اس مخصوص جسامت میں رکھنے کے لیے اور اس مخصوص نظام کا پابند کرنے کے لیے کوئی خالق ہو اور وہ خالق واجب اور قدیم ہو، ورنہ پھر اس کا بھی کوئی خالق ہو گا اور یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہو گا اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خالق واحد ہو، ورنہ اس کے طلوع اور غروب اور اس کی مخصوص حرکت کے نظام میں یکسانیت نہیں ہو گی اور اس کے نظام کی وحدت، اس پر دلیل ہے کہ اس کا ناظم بھی واحد ہے۔

گویا ہر چیز اس ذات حق کی قدرتوں کے جلووں میں ہے۔ اسی میں مست ہے اور شمس کی تمثیل میں اس کی رعنائیاں روز روشن کی طرح آشکار ہیں۔ اسی کی برکات اور اسی کے جلووں سے آباد ہے وہ سمجھ و شعور سے بالا ہے۔ اور عقل اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اور اگر ان کی شیخ شمس کی شکل میں ظاہر ہوں تو اس سے انکی روح میں ہویدگی ایک لذت آفرینی کا سبب بن جاتی ہے۔

ایرانی

در تَصوّر ذاتِ اوراگُنج کو

تادَر آیَد در تَصوُّر مِثْلِ او؟

پاکستانی

در تَصوّر ذاتِ اوراگُنج کُو

تادَر آیَد در تَصوُّر مِثْلِ اُو؟

اورا:اس کی۔۔۔گنج:گنجائش۔۔۔آید:آنا۔۔مثل او:اس کی مثل

ترجمہ:

اس کی مثل تصور میں کیونکر ہو سکتی ہے۔اس کی ذات پاک کے لئے ہمارے تصور میں اس کی گنجائش کیونکر ہو سکتی ہے؟بھلا کس طرح اس کی نظیر تصور میں آسکے؟

سچائی کا وہ سورج انسان کے تصور میں کہاں فٹ ہوتا ہے کہ وہ اس کے تصور میں آجائے؟

سورج کے بارے میں،جو نظام شمسی کا مرکز ہے اور اس کے کواکب کا رہبر و سالار ہے،دو مباحث ہیں،ایک تو اس کے عظیم ہونے کی بحث کے بارے میں ہم پہلے بحث کر چکے ہیں،اور دوسری بحث اس کی برکتوں اور آثار کے بارے میں ہے،جس کے لئے خلاصہ کے طور پر اس طرح کہا جاسکتا ہے۔

ا۔انسان اور دوسرے موجودات کی زندگی کے لئے پہلے مرحلے میں حرارت اور روشنی کی ضرورت ہے،زندگی کے یہ دونوں امر اس آتشیں کرہ کے ذریعے کامل طور پر اعتدال کے ساتھ مہیا ہوئے ہیں۔

۲۔تمام غذائی اشیاء سورج کی روشنی کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں،یہاں تک کہ وہ موجودات جو سمندروں کی گہرائیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ایسی نباتات سے استفادہ کرتے ہیں،جو سمندروں کی سطح پر نورِ آفتاب کے سائے میں اور پانی کی موجوں کے درمیان پرورش پاتے ہیں نیچے بیٹھ جاتے ہیں،یا اگر زندہ موجودات ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں تو پھر ان میں سے ایک گروہ کی غذا نباتات ہی ہے،جو سورج کی روشنی کے بغیر پرورش نہیں پاتی۔

۳۔وہ تمام رنگ،زیبائیاں اور جلوے،جنہیں ہم عالمِ طبیعات میں دیکھتے ہیں،ایک طرح سے سورج کی چمک کے ساتھ ارتباط

رکھتے ہیں اور یہ معنی مختلف علوم کے ذریعے خصوصاً فزکس میں ثابت ہو چکے ہیں۔

۴۔ حیات بخش بارشیں بادلوں سے برستی ہیں، اور بادل وہی بخارات ہیں جو سمندروں کی سطح پر سورج کے چمکنے سے وجود میں آتے ہیں، اس بناء پر پانی کے تمام منابع جو بارش سے غذا حاصل کرتے ہیں، چاہے وہ دریا ہوں یا چشمے، نہریں ہوں یا کھال، یا گہرے کنویں، سب سورج کی روشنی کی برکات سے ہیں۔

۵۔ وہ ہوائیں جن کا کام فضا کو معتدل کرنا، بادلوں کو مختلف جگہوں تک پہنچانا، نباتات کی تلقیح اور پیوند لگانا، اور گرمی اور سردی کو گرم علاقوں سے سرد علاقوں کی طرف، اور سرد علاقوں سے گرم علاقوں کی طرف منتقل کرنا ہے۔ آفتاب کے نور اور روشنی کے زیر اثر روئے زمین کے مختلف منطقوں کے درجہ حرارت کے بدلنے سے وجود میں آتی ہیں۔ اور اس طرح سے وہ بھی سورج سے سرمایہ حاصل کرتی ہیں۔

۶۔ انرجی پیدا کرنے والے مادے اور منابع، چاہے وہ آبشار ہوں، یا وہ بڑے بڑے بند ہوں، جنہیں کوہستانی علاقوں میں بنایا جاتا ہے، پیٹرول اور تیل کے منابع، اور پتھر کوئلے کی کانیں، یہ سب کے سب ایک طرح سے سورج کے ساتھ پیوند رکھتے ہیں، کہ اگر وہ نہ ہوتا تو ان منابع میں سے کوئی بھی موجود نہ ہوتا اور صفحۂ زمین میں تمام حرکتیں سکوت میں بدل جاتیں۔

۷۔ نظام شمسی کی بقاء جاذبہ و واقعہ کے اعتدال کی بناء پر ہے، جو ایک طرف تو کرّہ آفتاب کے درمیان اور دوسرے ان سیاروں کے درمیان، جو اس کے گردش کرتے ہیں، وجود رکھتا ہے۔ اس طرح سے سورج ان سیروں کے اپنے مداروں میں محفوظ رہنے میں بہت موئثر نقش و اثر رکھتا ہے۔

اس ساری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، کہ اگر خدا نے پہلی قسم کی ابتداء سورج سے کی ہے، تو اس کی کیا وجہ تھی؟
اسی طرح سے چاند اور دن کی روشنی، اور رات کی تاریکی کرّۂ زمین میں سے ہر ایک انسان اور غیر انسان کی زندگی میں ایک اہم نقش و اثر رکھتے ہیں، اسی بناء پر ان کی قسم کھائی گئی ہے اور ان سب سے بڑھ انسان کی روح اور اس کا جسم ہے، جو ان سب سے زیادہ اسرار آمیز اور حیرت انگیز ہے۔

تہذیب نفس کے بارے میں ہم اس سورہ کے آخر میں ایک بحث کریں گے۔

۱۱۔ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰهَآ ۱۲۔ إِذِ انۢبَعَثَ أَشْقٰهَا ۔ ۱۳۔ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۔

۱۴۔ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا ۔ ۱۵۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۔

ترجمہ

۱۱۔ قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی۔

۱۲۔ جب کہ ان کا ایک شقی ترین آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔

۱۳۔ اور خدا کے بھیجے ہوئے رسول (صالح) نے ان سے کہا: اللہ کے ناقے کو اس کے پانی پینے کے لئے چھوڑ دو (اور اس کی مزاحمت نہ کرو)۔

۱۴۔ لیکن انہوں نے اس کی تکذیب کی، اور ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں، اور اسے ہلاک کر دیا، لہٰذا ان کے خدا نے انہیں اس گناہ کی بناء پر جسکے وہ مرتکب ہوئے تھے تباہ کر دیا، اور ان کی زمین کو ہموار کر دیا۔

۱۵۔ اور وہ ہرگز اس کام کے انجام دینے سے نہیں ڈرتا۔

ان سب برکات و نوازشات کے ہوتے ہوئے بھی یہ سورج کی ہویدگی نظام ہستی کا درماں ہے۔ اس کی طرف بظاہر دیکھنا مشکل ہے۔ لیکن بڑی عجیب بات کے جب دور سے یہ عالم ہے تو اسکے بلکل نزدیک کی کیفیت سمجھنا ناممکن۔ یہ تو عام سورج ہے لیکن وہ شمس حق کیونکر عقل میں آ سکے۔ اس کا قرب بھی سمجھ سے باہر اور اس کی دوری بھی عقل کی عقل سے عاری۔

لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ‌ۖ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ‌ۚ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ (103) (الانعام)

آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ تمام آنکھوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہی ہر باریک چیز کو جاننے والا، بڑا خبردار ہے۔

ادراک

اِدراک کے معنیٰ ہیں کہ دیکھی جانے والی چیز کی تمام طرفوں اور حدوں پر واقف ہونا کہ یہ چیز فلاں جگہ سے شروع ہو کر فلاں جگہ ختم ہو گئی جیسے انسان کو ہم کہیں کہ سر سے شروع ہو کر پاؤں پر ختم ہو گیا، اِسی کو اِحاطہ (گھیراؤ) کہتے ہیں۔ اِدراک کی یہی تفسیر حضرت سعید بن مُسیَّب اور حضرت عبداللّٰہ بن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے منقول ہے اور جمہور مفسرین اِدراک کی تفسیر اِحاطہ سے فرماتے ہیں اور اِحاطہ اسی چیز کا ہو سکتا ہے جس کی حدیں اور جہتیں ہوں۔ اللّٰہ تعالیٰ کے لئے حد اور جہت محال ہے تو اس کا ادراک واحاطہ بھی ناممکن۔ یہی اہلِ سنت کا مذہب ہے۔ خارجی اور معتزلہ وغیرہ گمراہ فرقے اِدراک اور رُویت میں فرق نہیں کرتے، اس لئے وہ اس گمراہی میں مبتلا ہو گئے کہ انہوں نے دیدارِ الٰہی کو محالِ عقلی قرار دے دیا، حالانکہ اگر یہ کہا جائے کہ اللّٰہ عَزَّوَجَلَّ کو دیکھا نہیں جا سکتا تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللّٰہ عَزَّوَجَلَّ کو جانا بھی نہیں جا سکتا اور جیسے کائنات میں موجود تمام چیزوں کے برخلاف کیفیت و جہت کے بغیر اللّٰہ عَزَّوَجَلَّ کو جانا جا سکتا ہے ایسے ہی دیکھا بھی جا سکتا ہے کیونکہ اگر دوسری موجودات بغیر کیفیّت و جہت کے دیکھی نہیں جا سکتیں تو جانی بھی نہیں جا سکتیں۔ اس کلام کی بنیاد یہ ہے کہ دیکھنے کے

معنی یہ ہیں کہ بصر (دیکھنے کی قوت) کسی شے کو جیسی وہ ہو ویسا جانے تو جو شے جہت والی ہو گی، اس کا دیکھا جانا جہت میں ہو گا اور جس کے لئے جہت نہ ہو گی اس کا دیکھا جانا بغیر جہت کے ہو گا۔ واللہ ورسولہ اعلم!

ایرانی

چون حَدیثِ روی شَمسُ الدّین رَسید
شَمسِ چارُم آسُمان سَر دَر کَشید

پاکستانی

چون حَدیثِ روئے شَمسُ الدّین رَسید
شَمسِ چارُم آسُمان سَر دَر کَشید

چوں: جیسے ہی۔۔۔ حدیث: بات، تذکرہ۔۔۔ حدیث روئے شمس الدین: شمس الدین تبریزیؒ کے رخ تنویر کا ذکر۔۔۔ شمس چارم: چوتھے فلک کا سورج۔۔۔ سر در کشیدن: منہ چھپالیتا ہے۔

اس شعر میں کنایہ استعمال کیا گیا ہے۔

ترجمہ: جب بھی شمس الدین تبریزیؒ کا ذکر آتا ہے تو آسمان کا سورج اس کی چمک اور خوبصورتی سے شرمندہ ہو کر اپنا چہرہ چھپالیتا ہے۔

(شمس چرم = چوتھا سورج، یہ وہی سورج ہے جسے ہماری زمین کا گلوب اس کے نظام کا ایک حصہ ہے، اور قدیم ماہرین کی تقسیم میں اسے چوتھے آسمان پر رکھا گیا تھا)

اپنے محبوب شمس الدین تبریزی نے چھینک دیا ہے۔ تبریز کے رہنے والے شمس الدین محمد بن علی بن مالک داد تبریز کے لوگوں میں سے تھے، جنہیں طریقت کے بزرگوں نے "کامل تبریزی" اور صاحبدل کے مسافروں نے "شمس پیرندی" کہا تھا، کیونکہ ان کے مسلسل سفر کی وجہ سے۔ پہلے تو وہ تبریز کے شیخ ابو بکرؒ کے شاگرد تھے، جو ایک کپڑا بُننے والے تھے، اور چونکہ ان کے کمالات لوگوں کی سمجھ سے باہر تھے، اس لیے انھوں نے کمال تلاش کیا اور سفر شروع کیا (مناقب العارفین، جلد 1، صفحہ 615)۔

چونکہ احساس کے شمس اور حق کے شمس کے درمیان موازنہ زندگی کا سورج تھا، اس لیے حسام الدین چلبیؒ شمس الدین تبریزیؒ کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب یہ بیان شمس الدین تبریزی تک پہنچا تو سورج ان کی کرنوں سے چھپ گیا۔ چہرہ (شمس تبریزی، علاء الدولہ کی کتاب "المط" کی روایت کے مطابق، وہ تبریزی کے ابو بکر سالباف کے شاگرد تھے اور پھر رکن الدین سوجسی کے شاگرد تھے، جو کہ مولو نارومؒ سے ملنے آئے تھے۔ قونیہ 642 ہجری میں اور مولانا کے ساتھ رہنے کے دوران ان میں زبردست تبدیلیاں آئیں اور وہ ایک متقی اور خطیب بن گئے۔ مسئلہ حل کرنے والا اپنی بلا کا عاشق بن جاتا ہے)۔

قرآنی لفظِ 'سمآء' کے مفاہیم اور سات آسمانوں کی حقیقت

السَّمَآء کا لفظ سَمَا، یَسْمُو سے ہے، جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ لغتِ عرب میں ہے: "سماءُ کلِ شيءٍ اعلاہ" (کسی بھی چیز کے اُوپر جو کچھ ہے وہ اُس چیز کا سمآء ہے)۔ چنانچہ لُغوی اِعتبار سے لفظِ 'سمآء' کا اِطلاق کرۂ ارض کے گرد اگرد موجود تمام کائنات پر ہوتا ہے اور زمین کے علاوہ تمام کائنات اور اَجرامِ سماوِی عالمِ سماوات میں شامل ہیں۔

لُغتِ عرب میں لفظِ سمآء کے معانی کی وُسعت کے پیشِ نظر قرآنِ مجید میں بھی اللہ ربّ العزت نے اِس لفظ کا اِستعمال متعدّد معانی میں کیا ہے۔ کہیں اِس سے مُراد بادل ہیں تو کہیں بارش۔۔۔ کہیں اِس کا اِستعمال کرۂ ہوائی کے معنی میں ہوا ہے تو کہیں بالائی کائنات کے معنی میں۔۔۔ الغرض کرۂ ارضی کی فضائے بسیط سے لے کر عالمِ طبیعی کی آخری حدوں تک وسیع و عریض کائنات کے تمام گوشوں پر لفظِ سمآء کا اِطلاق ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں جن مقامات پر یہ لفظ اِستعمال ہوا ہے وہاں سیاقِ کلام اُس کا

مفہوم واضح کرتا ہے اور ہم آیات کے تسلسل پر غور و فکر کے بعد ہی اُس کے حقیقی معانی اور اللہ ربّ العزت کی غایتِ کلام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں سمآء اور سمٰوٰت کا لفظ 310 مرتبہ آیا ہے جن میں سے بیشتر مقامات پر اُس کا اِطلاق لغتِ اُردو میں استعمال ہونے والے لفظ 'آسمان' کی بجائے بارِش، بادل اور سماوِی طبقات وغیرہ پر ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں لفظ سماء کا سب سے پہلا اِستعمال بادل کے معنی میں ہوا ہے۔

اللہ ربّ العزت کا فرمان ہے:

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ. (البقرہ، 19:2)

یا اُن کی مثال بادل سے برسنے والی بارش کی سی ہے، جس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک (بھی) ہے۔

کسی مخصوص خطۂ ارضی کو اپنے دامن میں لپیٹ لینے والی کالی گھٹاؤں سے جب موسمِ گرما کی دوپہریں بھی نصف شب کا منظر پیش کرنے لگتی ہیں تو اُن بادلوں سے پیدا ہونے والی گرج اور چمک سے لوگوں میں بارِش کی خوشی کے باوُجود بجلی کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی موقع کی منظر نگاری قرآنِ مجید میں اِس مقام پر کی گئی ہے۔ جب لوگ موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ آیتِ کریمہ میں قرآنِ مجید میں وارِد ہونے والا لفظِ 'سمآء' اُردو کے معروف لفظ 'آسمان' کی بجائے 'بادل' کے معنی میں اِستعمال ہوا ہے۔

لفظِ 'سمآء' کے مختلف قرآنی معانی پر غور و فکر کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ 'سمآء' کا معنی ہر جگہ ایسے ٹھوس غلاف نہیں ہیں جنہوں نے اربوں کھربوں نوری سال کی مسافتوں میں بکھری کہکشاؤں کے گروہوں (clusters) کو اپنے دامن میں لپیٹ رکھا ہے اور وہ تمام مادّی عالم کو محیط ہیں۔ بلکہ قرآنِ مجید لغتِ عرب کی وُسعت کے پیشِ نظر اِس لفظ کا اِستعمال جابجا اور بھی بہت سے معانی کے لئے کرتا ہے۔

بطلیموسی نظریہ کے مطابق سیارے سات تھے اور افلاک بھی سات ہی تھے۔ پہلے فلک پر چاند دوسرے پر عطارد، تیسرے پر زہرہ، چوتھے پر سورج، پانچویں پر مریخ، چھٹے پر مشتری اور ساتویں پر زحل ہے۔ ان سات افلاک کو سات سیاروں سے منسوب کیا گیا ہے۔ پھر ان کے اوپر آٹھواں فلک ہے جو کُرسی فلک ہشتم، فلک ثوابت اور فلک البروج بھی کہتے ہیں۔ اس آٹھویں فلک کے دائرہ کو ۱۲ حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ کو ایک برج قرار دیا ہے۔ -۵- بطلیموسی نظریہ کے مطابق صرف سیارے ہی محو

گردش نہیں بلکہ یہ افلاک بھی گردش کرتے ہیں۔ اور ان سیاروں اور افلاک کی گردش کے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ غالب کے درج ذیل شعر سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ -رات دن گردش میں ہیں سات آسمان۔۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا- اس آیت میں سیاروں کے گردش کا تو ذکر موجود ہے لیکن یہ بھی بتلادیا گیا کہ یہ فلک (مدار) گردش نہیں کرتے۔

کائنات سے متعلق سات آسمانوں کا تصوّر

قرآنِ حکیم نے اپنی بہت سی آیات میں سات آسمانوں کا ذِکر کیا ہے۔ گزشتہ 200 سال سے کائنات سے متعلق تحقیقات کے باوُجود سائنس ابھی اِس بارے میں حتمی معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ صرف آخری چند عشروں میں فلکی طبیعیات کے سلسلے میں چند اِنتہائی دِلچسپ دریافتیں ہوئی ہیں اور (اُن سے) معجزۂ قرآن کی حقانیت ثابت ہو گئی ہے۔ سائنس نے جو کچھ بھی دریافت کیا ہے وہ سمندر میں سے فقط ایک قطرہ (کی حیثیت رکھتا) ہے، لیکن پھر بھی اُس نے کم از کم اپنی پچھلی دو صدیوں کی خطاؤں کو تسلیم کرنا شروع کر دِیا ہے۔

(ترکی کے نامور) ڈاکٹر ہلوک نور باقی کے مطابق کائنات متنوّع اور ہم مرکز مقناطیسی تہوں کی عکاسی کرتی ہے۔ (پہلی اور مرکزی تہہ بے شمار ستاروں سے بننے والی کہکشاؤں اور اُن کے گروہوں پر مشتمل ہے۔ اُس کے اُوپر واقع دُوسری تہہ بہت سی مِقناطیسی خصوصیات کی حامل ہے، جو قواسرز (ستاروں کے بیجوں) پر مشتمل ہے۔ اُس کے گرد تیسری مِقناطیسی پٹی ہے جو کائنات کے سِفلی مقامات کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے ہے۔

سب سے اندرونی دائرہ اور خاص طور پر ہمارا اپنا نظامِ شمسی اپنے تمام سیاروں کے خاندان سمیت آسان ترین قابلِ مُشاہدہ علاقہ ہے۔ اس نظام کی اندرونی ساخت تین الگ الگ مِقناطیسی میدانوں پر مُشتمل ہے۔

سب سے پہلے تو ہر سیارہ ایک مِقناطیسی میدان کا مالک ہے، وہ۔۔۔ اگر ہو تو۔۔۔ اُس کی فضا ہوتی ہے۔ وہ سیارے سے متّصل اَطراف سے متعلق ہوتی ہے۔ پھر اُس کے بعد نظامِ شمسی کے اِمتزاج سے تمام سیارے ایک دُوسری مقناطیسی پٹی تشکیل دیتے ہیں۔ مزید برآں ہر نظامِ شمسی اپنی کہکشاں کے ساتھ ایک الگ (وسیع و عریض) مِقناطیسی علاقے کی بنیاد رکھتا ہے۔ (واضح رہے کہ) کم از کم ایک کھرب ستارے یا سورج تو صرف ہماری مِلکی وے نامی کہکشاں میں شامل ہیں۔ مزید اعلیٰ سطح پر آس پاس واقع کہکشائیں کلسٹرز (کہکشاؤں کے گروہ) کے ایک اور مِقناطیسی میدان کا باعث بن جاتی ہیں۔ تبھی تو جب آپ زمین یا کسی

دُوسرے سیارے سے آسمان کی طرف نظر کرتے ہیں تو سات (ایسی) مِقناطیسی پٹیوں میں گھرے ہوئے ہوتے ہیں، جو خلاء کی بیکرانی میں پسپائی اِختیار کر چکی ہوں۔ اگر ہم زمین سے کائنات کی وُسعتوں کی طرف نظر دَوڑائیں تو (سات آسمان اِس ترتیب سے واقع ہیں):

1. پہلا آسمان: وہ خلائی میدان، جس کی بنیاد ہم اپنے نظامِ شمسی کے ساتھ مل کر رکھتے ہیں۔
2. دُوسرا آسمان: ہماری کہکشاں کا خلائی میدان ہے۔ یہ وہ مِقناطیسی میدان ہے جسے مِلکی وے کا مرکز تشکیل دیتا ہے اور وہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔
3. تیسرا آسمان: ہمارے مقامی کلسٹر (کہکشاؤں کے گروہ) کا خلائی میدان ہے۔
4. چوتھا آسمان: کائنات کا مرکزی مِقناطیسی میدان ہے، جو کہکشاؤں کے تمام گروہوں کے مجموعے سے تشکیل پاتا ہے۔
5. پانچواں آسمان: کائناتی پٹی (پر مشتمل ہے) جو قواسرز (Quasars) بناتے ہیں۔
6. چھٹا آسمان: پھیلی ہوئی کائنات کا میدان ہے، جسے رِجعتِ قہقری کی حامل (پیچھے ہٹتی ہوئی) کہکشائیں بناتی ہیں۔
7. ساتواں آسمان: سب سے بیرونی میدان ہے، جو کہکشاؤں کی غیر محدود بیکرانی سے تشکیل پاتا ہے۔

اِن سات تہہ در تہہ آسمانوں کا ذِکر قرآنِ مجید نے (آج سے) 14 صدیاں پہلے واشگاف اَنداز میں کر دِیا تھا۔ (سات آسمانوں سے متعلقہ آیاتِ مبارکہ سابقہ صفحات میں گزر چکی ہیں)

فلکیاتی تہوں کے تناسُب میں سات آسمانوں کا ذِکر

سات آسمانوں کے تصوّر کو اچھے انداز میں سمجھنے کے لئے ہم فلکی طبیعیات سے متعلقہ چند مزید معلومات کا مختصر ذِکر کرنا پسند کریں گے۔

مذکورہ بالا آسمانی تہوں کے درمیان ناقابلِ تصوّر فاصلے حائل ہیں۔

1. پہلی آسمانی تہہ۔۔۔ کم و بیش 65 کھرب کلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہے۔
2. دُوسری آسمانی تہہ۔۔۔ جو ہماری کہکشاں کا قطر بھی ہے۔۔۔ ایک لاکھ 30 ہزار نوری سال (وسیع) ہے۔

3. تیسری آسمانی تہہ۔۔۔جو ہمارا مقامی کلسٹر ہے۔۔۔20 لاکھ نوری سال کی حدُود میں پھیلی ہوئی ہے۔

4. چوتھی آسمانی تہہ۔۔۔جو کہکشاؤں کے تمام گروہوں کے مجموعہ ہے، اور کائنات کا مرکز تشکیل دیتی ہے۔۔۔
10 کروڑ نوری سال قطر پر محیط ہے۔

5. پانچویں آسمانی تہہ۔۔۔ایک ارب نوری سال کی مسافت پر واقع ہے۔

6. چھٹی آسمانی تہہ۔۔۔20 ارب نوری سال دُور ہے۔

7. ساتویں آسمانی تہہ۔۔۔اُس سے بھی کئی گنا آگے ہے (جس کا اَندازہ لگانا محال ہے۔)

ایک آسمان سے دُوسرے آسمان تک کا جسمانی سفر ناممکن ہے، جس کا پہلا سبب بے تحاشار فتار کا عدم حصول اور دُوسرا سبب مِقناطیسی قوّتوں پر (نوعِ اِنسانی کا) حاوِی نہ ہوسکنا ہے۔ اِن آسمانوں کی حدُود سے گزرنے کے لئے ضروری ہے کہ رَوشنی سے زیادہ رفتار حاصل کی جائے، (روشنی کی رفتار کا حصول چونکہ مادّی اَجسام کے لئے قطعاً ناممکن ہے اِس لئے) اِس کا دُوسرا مطلب یہ ہوا کہ 'مادّے کی دُنیا سے نجات' حاصل کی جائے۔

سات آسمانوں کا معنی

السمآء کا لفظ سما، یسمو سے ہے، جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ لغت عرب میں ہے:

سماء کل شی أعلاه.

ہر چیز کے اوپر جو کچھ ہے وہ اس چیز کا سماء ہے۔ (المفردات:427)

لہٰذا کرہ ارض کے اوپر جس قدر کائنات موجود ہے، وہ عالم سماوات ہے، بلکہ خود کرہ ارض کے اندر وہ بالائی طبقۂ فضا جہاں بادل اڑتے ہیں اور ٹھنڈک کے باعث آبی قطرات کی صورت میں بارش بن کر برستے ہیں، بھی ''سماء،، کہلاتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَّأَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً.

اور آسمانوں کی طرف سے پانی برسایا۔ (البقرہ،22:2)

بنابریں زمین کے اوپر کا طبقۂ کائنات عالم طبیعی کی آخری حد تک عالم سماء کہلاتا ہے۔

یہاں مولانا رومؒ نے چوتھے آسمان کو ذکر کیا ہے۔ میرے خیال میں اس شعر میں مولاناؒ نے اس روحانی مقام کا تذکرہ کیا ہے جس کو صوفیائے متصرفین کی زبان میں کچہری کہا جاتا ہے۔

آج ہر شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار نہیں کر سکتا۔۔۔ ان کی آواز کو سن نہیں سکتا۔۔۔ ظاہر اًصحابہ کرام کی طرح اُن کی مجالس میں بیٹھ نہیں سکتا۔۔۔ سوائے اس خوش نصیب کے جسے خواب میں جلوہ نصیب ہو یا اس خوش نصیب کے جنہیں حالتِ بیداری میں کچہری نصیب ہو جائے۔ لہٰذا دنیا کے معمولات و معاملات میں غرق رہنے کی بناء پر کوئی ایسی خوش نصیبی دستیاب نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ کو دیکھ سکیں، آواز کو سن سکیں یا کوئی چیز جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مس کیا تھا، اور وہ اس شکل و ہیت میں موجود ہو اور ہم اس کو چھو سکیں۔ صرف قرآن ہی ایسی نعمت ہے کہ ایک حرف کے بھی فرق کے بغیر اس کے تمام کلمات، آیات، الفاظ حروف، اعراب وہی ہیں جو زبان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکلے تھے اور کتنی خوش نصیب ہے امت محمدی کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھا آج اسی طرح قرآن ہمارے پاس موجود ہے۔ آج ہم قرآن کی کسی بھی آیت کی تلاوت کرتے ہیں تو یہ وہی ترکیب و ترتیب ہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادا کئے تھے۔ گویا ہم تلاوت قرآن کر کے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پڑھے ہوئے کی نقل کر رہے ہیں۔۔۔ یہ وہ قرآن ہے جو اللہ کا کلام ہے جسے اس نے لوح محفوظ میں رکھا، پھر بیت العزت پر اتارا اور پھر 23 سال تک جبرئیل کے ذریعے نازل کرتا رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب اطہر میں محفوظ ہوتا رہا، پھر زبان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ادا ہوتا رہا۔۔۔ گویا یہ وہ چیز ہے کہ 14 صدیاں گزرنے کے باوجود اسی طرح محفوظ ہے۔ یہ قرآن جس کے سینے، فہم، قلب، زبان پر آگیا پس یہ اسی صورت میں آگیا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادا فرمایا تھا۔

قرآن۔۔۔ محبوب حقیقی کا خط

عاشقوں کے نزدیک تو قرآن محبوب حقیقی کے خط کی مانند ہے۔۔۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اللہ کے خطوط ہیں۔ اور لکھی ہوئی شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں عطا کر دیئے۔ پس قرآن، اللہ کے مکتوبات، رسائل کلمات اور پیغامات ہیں۔

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ اللہ کے سب سے زیادہ قریب ہونے کا وظیفہ کیا ہے؟ فرمایا: اللہ کا کلام، اس کو جتنا پڑھو گے اتنا اللہ کے قریب ہو جاؤ گے۔

دنیاوی محبوب کی طرف سے آنے والے خطوط کو عاشق لاتعداد مرتبہ پڑھتا چلا جاتا ہے حالانکہ مضمون وہی ہے مگر عاشق کو محبوب کی طرف سے بھیجے جانے والے پیغام کو دیکھنے، پڑھنے، بار بار دہرانے سے لذت ملتی ہے کیونکہ محبوب کا خط ہے۔ پس اگر اس کلام الٰہی کا معنی و مفہوم نہ بھی آتا ہو تب بھی پڑھنے والے کو اجر و ثواب سے محروم نہیں کیا جاتا اس لئے کہ کلامِ محبوب ہے اور یہ قرآن کی شان ہے، اس لئے کہ اس کی تلاوت کا حکم الگ ہے اور اس کی تعلیم کا حکم الگ ہے۔

يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.

"جو تم پر ہماری آیات تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت و دانائی سکھاتا ہے"۔(البقرہ:151)

تلاوت میں سمجھ آئے یا نہ آئے تلاوت کا اجر و ثواب ہے اور اس کا علم ہو جائے اور سمجھ کر پڑھا جائے تو مزید ثواب ہے۔ لہٰذا تمام احباب قرآن پاک کو اس کے ترجمہ کے ساتھ پڑھنے کو اپنا معمول بنائیں، اگرچہ تھوڑا ہی پڑھیں مگر روزانہ پڑھیں اور یہ تصور لے کر پڑھیں کہ محبوب کے خط پڑھ رہے ہیں جن میں خطاب براہ راست ان سے بھی ہے اور ان خطوط میں لکھا گیا ہے وہ بھی سمجھ رہے ہیں۔

قرآن کی اسی شان کے پیش نظر حضرت فضیل بن عیاض فرماتے ہیں کہ حامل قرآن کی یہ شان نہیں کہ وہ اپنی حاجت دنیا والوں کے پاس لے کر جائے بلکہ اس کی شان یہ ہے کہ اہل دنیا اس کے دروازے پر اپنی حاجات لے کر آئیں۔ اولیاء اللہ فرمایا کرتے ہیں کہ

"بدترین عالم وہ ہے جو طالب بن کر امراء کے دروازے پر پایا جائے، اور بہترین حاکم و امیر وہ ہے جو علماء اور اہل اللہ کے دروازے پر پایا جائے"۔

اہل قرآن کی شان یہ نہیں کہ اہل دنیا کے سامنے طالب اور سائل بنیں، بلکہ دنیا کو چاہئے کہ وہ اہل قرآن کے سامنے طالب و سائل بنیں۔ جس کو اللہ نے قرآن کی دولت عطا کر دی، اگر اس نے قرآن کی دولت کو سمجھ لیا تو وہ کل دنیا و مافیہا کی حاجت مندی سے بے نیاز ہو گیا۔

جناب شمس تبریزیؒ انہی باصفا صوفیاء میں سے تھے۔ جو ان اسرار کو پا چکے تھے اور تصوف کے چوتھے آسمان کے راہی تھے۔ اللہ اللہ!

ایرانی

واجِب آید چون کہ آمد نامِ او

شَرح کردن رَمزی از اِنُعامِ او

پاکستانی

واجِب آمد چونکہ بُردم نامِ اُو

شَرح کردن رَمزے از اِنُعامِ اُو

واجب: ضروری۔۔۔بردم نام او: میں نے اس کا نام لیا۔۔۔شرح کردن: بیان کرنا۔۔۔رمز: اشارہ۔۔

ترجمہ: اب جو میں نے ان کا نام لیا ہے تو واجب ہے کہ ان کے احسانات میں سے کچھ نہ کچھ بیان کروں۔یعنی ان کے احسانات کم ہیں کہ انہوں نے باطنی تربیت کی۔

جناب مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ان اشعار میں میں نے آپ کو شمس الدین کے انعامات اور بخشش کے کچھ راز بتائے تھے۔

مثنوی کی تفصیل میں کسی کے لیے مراقبہ کا رواج نہیں ہے۔لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ مراقبہ چند منٹ کے لیے کریں تا کہ آپ حضرت شمسؒ کو سمجھ سکیں۔

اس مراقبہ میں، میں آپ کو ایک عمومی شکل بتاؤں گا۔اس مراقبہ میں آپ حضرت شمسؓ سے ملاقات کا مشاہدہ کریں گے۔لہذا ان سے بہترین معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کریں۔

ہم جتنا زیادہ مثنوی میں آگے بڑھتے ہیں، اتنے ہی اہم رازوں سے ہم واقف ہوتے ہیں، اور ہر روز مثنوی کے نئے راز ہم پر آشکار ہوتے ہیں۔

روحانی آدمی کا ایک نام اور ایک صفت ہے۔وہ صفت اس نے اپنی ذات میں نہیں دی تھی بلکہ اسے کسی بزرگ یا استاد کے ذریعے عطا ہوئی تھی یا خاص روحانی حالات میں اسے معنوی دنیا میں اس صفت سے پکارا جاتا تھا۔

مثال کے طور پر جناب حافظؒ کا لقب لسان الغیب ہے۔اگر وہ کچھ کہتے ہیں تو وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ غیب کی دنیا سے ہے جس کا اظہار وہ ہم سے کرتے ہیں۔دراصل لفظ حافظ کا مطلب ہی غیب کے رازوں کے سینے کا محافظ ہے۔

اسی طرح جناب سعدیؒ، شیخ اجل کے نام سے مشہور ہیں۔ اجل کا مطلب ہے موت یا وقت۔ اس کا مطلب ہے وہ شخص جو اپنی زندگی اور موت کے کنٹرول میں ہے۔

ان بزرگوں کے لیے جتنے بھی نام اور صفتیں استعمال کی جاتی ہیں ان کا صحیح حساب ہے اور جو لوگ ان کے اشعار اور کاموں کی تفصیل پر بصیرت سے کام لیتے ہیں وہ آج سمجھتے ہیں کہ ان ناموں کا تعلق حقیقی معنوں میں ان بزرگوں کی روحوں سے ہے۔

ہے...

حضرت مولاناؒ کا لقب خموش ہے۔ انہوں نے ساٹھ ہزار سے زائد آیات لکھی ہیں، لیکن وہ خود کو خاموش سمجھتے ہیں!

اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے اور جو کہنا چاہیے وہ خاموشی میں مل جانا چاہیے!

جب آپ مراقبہ میں ذرا ماہر ہو جائیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ باطن میں آپ کو بھی کوئی نام دیا گیا ہے۔ یہ باطنی تربیت کا اثر ہو گا۔

روحانی تربیت یہ علم کا ایک سمندر ہے جس کو کبھی مکمل نہیں کیا جا سکتا نہ ہی کبھی مکمل بیان ہو سکتا ہے لہٰذا میری مقدور بھر کوشش ہوتی ہے کہ اتنا لکھوں جو با آسانی سمجھ آ سکے اور یاد ہو سکے

دل کا معطل کرنا اور خیالات کا بند کر دینا عرفان ہے دل کی مثال پارے جیسی ہے اگر قائم ہو گیا تو اکثیر ہے اس کی قوت بے انتہا ہے چشم زدن میں ہزاروں کوس دور جا کر واپس آ جانا، برسوں کی دیکھی ہوئی چیز کا نقشہ ہو بہو خیال میں بنا دینا (یاداشت قوی ہونا)

توجہ (کشش ثقل) ہمیشہ جسم کے ہر حصے کی طرف کھنچتی رہتی ہے اس لئے دل کی قوت منتشر رہتی ہے اس کو ایک جانب سے روک کر ایک ہی نقطہ پر قائم کرنا ہی عرفانی قوتوں کا اصل راز ہے جس طرح سورج کی شعاعیں آتشی شیشے میں ایک مرکز پر جمع ہو کر آگ لگا دیتی ہیں ویسے کچھ نہیں کر سکتیں انسانی جسم کے مرکز میں صاف خیال جمانے سے روحانی حواس بیدار ہو کر اپنا کام کرنے لگتے ہیں اور غیبی اسرار کا انکشاف کرتے ہیں دنیا کے ہر ایک جسم اور ذرات میں ایک قسم کی قوت مقناطیسی ہوتی ہے جو دوسری چیزوں کو اپنی طرف کھینچی یا ہٹاتی ہے پس جب ہم اپنی روحانی طاقت کو بڑھاتے ہیں تو ہماری کشش بھی قوی تر ہو کر دوسری چیزوں اور تمام مزاحمتوں پر غالب آ جاتی ہے یہ ہی کائنات کی تسخیر ہے۔

اس کے لئے راستبازی، ترک اللحم، صبر، نماز، اور روزہ کو اخیار کرنا چاہئے اور رضائے الٰہی کو ٹھیک سمجھ کر کبھی شکایت نہ کرنا چاہئے خاص طرز میں بیٹھ کر (جس سے جسم کا کوئی حصہ تھکے نہیں کوئی بیزاریت محسوس نہ ہو) دل کو چاروں طرف سے یکسو کرنا اور ایک خاص مرکز پر جانا ہو گا یہ خیال اس قدر مستحکم ہو کہ جسم کی بلکل خبر نہ رہے کہاں بیٹھے ہیں،

یہ یاد رہے کہ روحانی تربیت وہی شخصیت کر سکتی ہے جس کے اندر ضروری شرائط اور اوصاف بدرجہ کمال پائے جائیں۔

اگر یہ اوصاف و شرائط کسی ہستی میں نہ پائے جائیں تو اس سے روحانی تعلق قائم کرنا سرے سے جائز ہی نہیں بلکہ حرام ہے یا دوسری صورت میں اگر شیخ اور مربی میں بعض شرائط پائی جائیں تو بیعت جائز تو ہو جائے گی لیکن اس بیعت سے کچھ فائدہ میسر نہیں آئے گا، بیعت اصل میں وہی ہے جو شرعاً جائز اور روحانی اعتبار سے فائدے اور ترقی کا باعث بھی ہو۔

روحانی تربیت کرنے والے میں درج ذیل گیارہ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے

پہلی شرط: شیخ صاحبِ علم و معرفت ہو۔

دوسری شرط: وہ صاحبِ ورع اور صاحبِ تقویٰ ہو۔

تیسری شرط: وہ منکرات اور شبہات سے سختی سے بچنے والا، عبادت گزار اور صاحبِ مجاہدہ ہو۔

چوتھی شرط: وہ صاحبِ حسن خلق اور نہایت خوش اخلاق ہو۔

پانچویں شرط: وہ صاحبِ اخلاص اور صاحبِ استغناء ہو یعنی اس کا دل دنیاوی مفاد سے بے نیاز ہو۔

چھٹی شرط: وہ اپنے مریدین پر حد درجہ مہربان اور شفیق ہو اور ان سے اولاد جیسا برتاؤ کرے۔

ساتویں شرط: وہ صاحبِ حکمت و بصیرت ہو، مریدوں کو ان کے حسب حال ان کے ظرف، ان کے ظاہر و باطن کے احوال اور ان کی تربیت کے تقاضوں کے پیش نظر ملتا ہو۔

آٹھویں شرط: وہ صاحبِ ہدایت، صاحبِ ارشاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پابند ہو جو مریدوں کو اچھائی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔

نویں شرط: وہ کامل النّسبت ہو۔

دسویں شرط: وہ کامل الطریقت ہو۔

گیارہویں شرط: وہ کامل التوجہ ہو۔

چونکہ مولاناؒ کو یہ سب کچھ جناب شمسؒ سے ملا اس لئے فرمایا کہ ان کے احسانات کا کچھ بیان کرنا واجب ہے۔

ایرانی

این نَفَس جانُ دامَنم بَر تافتہ ست

بوی پیراھانِ یوسُف یافتہ ست

پاکستانی

ایں نَفَس جانُ دامَنَم بَر تافتہ ست
بوئے پیراہانِ یوسُف یافتہ ست

نفَس: سانس۔۔۔ دامن تافتن: دامن سمیٹنا۔۔ بوئے پیر ہن یوسف: یوسفؑ کے لباس کی خوشبو۔۔۔ یافتن: پانا۔

یہاں بوئے پیر ہن یوسف کنایہ ہے شدت اشتیاق کا

ترجمہ: اس وقت میری روح نے میرا دامن سمیٹ دیا ہے کیونکہ اس نے (حضرت سیدنا یعقوبؑ کی طرح) سیدنا یوسفؑ کے پیر ہن کی خوشبو پالی ہے۔

اب حسام الدینؒ، جو میری روح ہے، مجھے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے اور اصرار کے ساتھ چاہتا ہے کہ میں شمس تبریزیؒ کے ساتھ اپنے روحانی تعلق کے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھاؤں۔
نظم کا یہ حصہ جس کا آج ہم جائزہ لے رہے ہیں وہ جناب رومیؒ اور حسام الدین چلبیؒ کے درمیان ہونے والی گفتگو ہے۔

حسام الدین چلبیؒ جناب مولاناؒ کے شاگرد ہیں اور محبت میں گرفتار آدمی ہیں جو اپنے آقا سے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور جناب رومیؒ اُسے علم کا ایک قطرہ دیتے ہیں اور اس سے پراسرار انداز میں بات کرتے ہیں...

اس دوران حسام الدین چلبی کی دماغی حالت بگڑ جاتی ہے اور وہ بار بار رومیؒ سے گزارش کرتا ہے کہ جلدی کرو، بتاؤ کیا ہو رہا ہے!

حسام الدین چلبیؒ کے جذبے کی کیفیت کو ان اشعار میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری زندگی کی ہر سانس ابل رہی ہے اور یوسفؑ کی قمیض کی خوشبو نے مجھ میں بڑا ہیجان پیدا کر دیا ہے! ان کیفیات کا تذکرہ قرآن حکیم میں یوں آیا ہے۔ ایسی کیفیت محبت سبحان اللہ! جو مشام روح کو معطر کر دے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْ لَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ(94) قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ(95)(یوسف)

جب قافلہ مصر سے جدا ہوا یہاں ان کے باپ نے کہا بے شک میں یوسف ؑ کی خوشبو پاتا ہوں اگر مجھے یہ نہ کہو کہ سَٹھ (بہک) گیا بیٹے بولے خدا کی قسم آپ اپنی اسی پرانی خود رفتگی (محبت) میں ہیں

{ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ: اور جب قافلہ وہاں سے جدا ہوا۔} یعنی جب قافلہ مصر کی سرزمین سے نکلا اور کنعان کی طرف روانہ ہوا تو حضرت یعقوب عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اپنے بیٹوں اور پوتوں یا پوتوں اور پاس والوں سے فرمادیا ”بیشک میں یوسف عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی قمیص سے جنت کی خوشبو پارہا ہوں۔ اگر تم مجھے کم سمجھ نہ کہو تو تم ضرور میری بات کی تصدیق کروگے۔ (جلالین مع صاوی، یوسف، تحت الآیۃ:۹۴، ۳/۹۷۹، مدارک، یوسف، تحت الآیۃ:۹۴، ص۵۴۴ملتقطاً)

{قَالُوْا: حاضرین نے کہا۔} حضرت یعقوب عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی بات سن کر حاضرین نے ان سے کہا ”اللّٰہ عَزَّوَجَلَّ کی قسم! آپ اپنی اسی پرانی شدید محبت میں گم ہیں جس کی وجہ سے ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو حضرت یوسف عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے ملنے کی امید لگی ہوئی ہے۔ یہ بات انہوں نے اس لئے کہی کیونکہ وہ اس گمان میں تھے کہ اب حضرت یوسف عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کہاں زندہ ہوں گے اُن کی تو وفات بھی ہوچکی ہو گی۔ (جلالین مع صاوی، یوسف، تحت الآیۃ:۹۵، ۳/۹۸۰، ابو سعود، یوسف، تحت الآیۃ:۹۵، ۳/۱۳۸، ملتقطاً)

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ

ترجمہ:

اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا اگر تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے تو مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا اگر تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے تو مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ بیٹوں نے کہا اللہ کی قسم آپ اپنی اسی پرانی محبت میں مبتلا ہیں۔ پھر جب خوشخبری سنانے والا آیا اور اس نے وہ قمیص اس کے چہرے پر ڈال دی تو وہ فوراً بینا ہو گئے، یعقوب نے کہا کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ بیشک مجھ کو اللہ کی طرف سے ان چیزوں کا علم ہے جن کا تم کو علم نہیں ہے۔ بیٹوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے گناہوں کی بخشش طلب کیجیے، بیشک ہم گنہگار رہیں۔ یعقوب نے کہا میں عنقریب اپنے رب سے تمہاری بخشش طلب کروں گا، بیشک وہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔ (یوسف:۹۴۔۹۸)

بہت فاصلہ سے حضرت یعقوب تک حضرت یوسف کی خوشبو پہنچنے کی توجیہ

ابن ابی الہذیل نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ ابھی حضرت یوسف کا قافلہ حضرت یعقوب سے آٹھ راتوں کی مسافت کے فاصلہ پر تھا کہ حضرت یعقوب کو حضرت یوسف کی خوشبو آگئی۔ ابن ابی الہذیل نے دل میں کہا یہ اتنا فاصلہ ہے جتنا بصرہ سے کوفہ تک کا فاصلہ ہے۔ (جامع البیان، رقم الحدیث: ۱۵۱۱۰، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۹۶۱)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب حضرت یوسف، حضرت یعقوب کے گھر کے قریب کنوئیں میں تھے تو آپ کو حضرت یوسف کی خوشبو نہیں آئی تو پھر اتنے فاصلے سے آپ کو حضرت یوسف کی خوشبو کیسے آگئی؟ اس کے حسب ذیل جوابات ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں حضرت یوسف کا معاملہ حضرت یعقوب سے مخفی رکھا تھا، تاکہ حضرت یوسف مکمل مصیبت میں گرفتار ہوں اور اس پر صبر کرنے سے حضرت یوسف کو اس مصیبت کا اور حضرت یعقوب کو ان کی جدائی کا پورا پورا اجر ملے اور جب مصیبت اور جدائی کے ایام ختم ہو گئے اور کشادگی اور فرحت کا دور آگیا تو اللہ تعالیٰ نے فاصلہ کے زیادہ ہونے کے باوجود ان کو حضرت یوسف کی خوشبو پہنچا دی۔

۲۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا تھا وہ قمیص ایک چاندی کی نلکی میں تھی اور وہ نلکی حضرت یوسف کے گلے میں تھی، جب اس قمیص کو اس نلکی سے نکالا تو جنت کی خوشبوئیں فضا میں پھیل گئیں اور جب وہ مانوس خوشبوئیں ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر حضرت یعقوب تک پہنچیں تو انہوں نے پہچان لیا کہ یہ حضرت یوسف کی قمیص کی خوشبو ہے اور جب حضرت یوسف کنوئیں میں تھے تو وہ قمیص نلکی میں بند تھی اور اس کی ہوائیں حضرت یعقوب تک نہیں پہنچیں تھیں۔

۳۔ صبا (مشرق سے مغرب کی طرف چلنے والی ہوا) نے اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی تھی کہ خوشخبری دینے والے سے پہلے وہ حضرت یوسف کی خوشبو حضرت یعقوب تک پہنچا دے، تو اللہ عزوجل نے اس کو اجازت دے دی، یہی وجہ ہے کہ ہر غم زدہ تک جب باد صبا کے جھونکے پہنچتے ہیں تو اس کی روح کو تازگی محسوس ہوتی ہے۔ (زاد المسیر ج ۴، ص ۲۸۴)

تفندون کے معانی

حضرت یعقوب نے کہا تھا: **لولا ان تفندون**، اس لفظ کے پانچ معنی بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ مقاتل نے کہا: اس کا معنی ہے اگر تم مجھ کو جاہل قرار نہ دو۔

۲۔ عبداللہ بن ابی ہذیل نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے: اگر تم مجھے بیوقوف نہ قرار دو۔

۳۔ سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا: اگر تم مجھے جھوٹا نہ قرار دو۔

۴۔ حسن اور مجاہد نے کہا: اگر تم مجھے بڑھاپے کی وجہ سے زائل العقل نہ قرار دو۔

۵۔ ابن قتیبہ نے کہا: اس کا معنی ہے اگر تم مجھے ملامت نہ کرو۔ (زاد المسیر ج ۴ ص ۲۸۵)

ضلال کے معانی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بیٹوں نے کہا اللہ کی قسم! آپ اپنی ضلال قدیم میں مبتلا ہیں۔

حضرت یعقوب کے بیٹے تو حضرت یوسف کے پاس گئے ہوئے تھے، یہاں بیٹوں سے مراد ان کے پوتے، نواسے اور دیگر مجلس کے حاضرین ہیں۔ ضلال کے اس جگہ تین معانی مراد ہو سکتے ہیں:

۱۔ ضلال کے معنی شقاء ہیں یعنی آپ اپنی اسی پرانی بدبختی اور سختی میں گرفتار ہیں جس کی وجہ سے آپ حضرت یوسف کا غم جھیل رہے ہیں۔ مقاتل نے اس معنی پر اس آیت سے استدلال کیا ہے:

فقالوا ابشرا منا واحدا نتبعه انا اذا لفی ضلال وسعر۔ (القمر: ۲۴) (قوم ثمود نے) کہا کیا ہم اپنوں میں سے ہی ایک بشر کی پیروی کریں گے پھر تو ہم ضرور بدبختی اور عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

۲۔ قتادہ نے کہا: آپ اپنی پرانی محبت میں گرفتار ہیں آپ یوسف کو نہیں بھولتے اور وہ آپ کے دل سے نہیں نکلتا۔ اس معنی پر اس آیت سے استدلال کیا ہے:

انا ابانا لفی ضلال مبین۔ (یوسف: ۸) بیشک ہمارا باپ ضرور محبت کی کھلی وارفتگی میں ہے۔

۳۔ جنون: قتادہ نے کہا: یہ بہت سنگین کلمہ ہے اور ان کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں تھا کہ وہ اللہ کے نبی کی شان میں ایسا کلمہ استعمال کرتے۔ حسن بصری نے کہا: انہوں نے یہ اس لیے کہا کہ ان کے اعتقاد میں حضرت یوسف فوت ہو چکے تھے اور حضرت یعقوب ان کی محبت میں صحیح فکر سے ہٹ چکے تھے اور در حقیقت کہنے والے خود ضلال میں مبتلا تھے۔

حضرت یعقوب کی بینائی کا لوٹ آنا

یہوذا جب حضرت یعقوب کے پاس پہنچا تو اس نے وہ قمیص آپ کے چہرے پر ڈال دی اور آپ اسی وقت بینا ہوئے۔ آپ بہت خوش ہوئے اور آپ کا سارا غم جاتا رہا اور آپ نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے ان چیزوں کا علم ہے جن کا تم کو علم نہیں ہے۔ حضرت یعقوب کو معلوم تھا کہ حضرت یوسف کا خواب سچا ہے اور اس کی تعبیر ضرور پوری ہو گی۔ حضرت یعقوب نے بیٹوں سے پوچھا: یوسف کس دین پر ہے؟ انہوں نے بتایا: وہ دین اسلام پر ہے، تب حضرت یعقوب نے کہا: اب نعمت پوری ہو گئی۔

اپنے مظالم کو دنیا میں معاف کرا لینا

حضرت یعقوب کے بیٹوں نے کہا: اے ہمارے باپ! آپ ہمارے گناہوں کی بخشش طلب کریں، انہوں نے مغفرت کا اس لیے سوال کیا کہ انہوں نے حضرت یوسف پر بہت ظلم کیے تھے اور اپنے باپ کو ان کی جدائی کے رنج و غم میں مبتلا کیا تھا۔

اور جو شخص کسی مسلمان کو ایذا پہنچائے خواہ اس کی جان میں یا اس کے مال میں وہ ظالم ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے مظالم کی تلافی کرے، اس کا جو مال چھینا ہے وہ اس کو واپس کرے اور جو اس کو رنج پہنچایا ہے اس کا ازالہ کرے اور دنیا میں اس سے اپنا قصور معاف کرا لے۔

حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے کسی کی عزت یا اس کی کسی اور چیز پر ظلم کیا ہو اس کو چاہیے کہ وہ اس ظلم کی اس دن آنے سے پہلے تلافی کرے جس دن اس کے پاس کوئی دینار ہو گا نہ درہم ہو گا، اگر اس کے پاس کوئی نیک عمل ہو تو اس کے ظلم کے برابر وہ نیک عمل لے لیا جائے گا اور اس اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ اس کے اوپر لاد دیئے جائیں گے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۴۴۹، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۰۵۸۰)

بیٹوں کے استغفار کو موخر کرنے کی وجوہ

یعقوب نے کہا: میں عنقریب اپنے رب سے تمہاری بخشش طلب کروں گا۔ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب نے اسی وقت اپنے بیٹوں کے لیے دعا کیوں نہیں کی اور اس کو موخر کس وجہ سے کیا؟ اس کے حسب ذیل جوابات ہیں:

ا۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عطااور عکرمہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میرے بھائی یعقوب نے کہا تھا کہ میں عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش طلب کروں گا، ان کا مطلب یہ تھا کہ حتی کہ جمعہ کی رات آجائے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۵۱۴۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت علی بن ابی طالب آئے اور انہوں نے کہا: آپ پر میرے ماں اور باپ فدا ہوں، میرے سینہ سے قرآن نکل جاتا ہے اور میں اس کو یاد رکھنے پر قادر نہیں ہوں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے ابو الحسن! کیا میں تم کو ایسے کلمات نہ سکھاؤں جو تم کو نفع پہنچائیں اور جن کو تم وہ کلمات سکھاؤ ان کو بھی وہ کلمات نفع پہنچائیں، اور جو کچھ بھی تم یاد کرو وہ تمہارے سینہ میں محفوظ رہے۔ میں نے کہا ہاں! یارسول اللہ، آپ سکھایئے۔ آپ نے فرمایا: جب جمعہ کی شب ہو اگر تم سے ہو سکے تو رات کے آخری تہائی حصہ میں قیام کرو، کیونکہ اس وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں، اور اس وقت دعا قبول ہوتی ہے اور میرے بھائی یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا میں عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش طلب کروں گا۔ (یوسف: ۹۸) ان کی مراد یہ تھی کہ حتی کہ جمعہ کی رات آجائے، اگر تم سے ہو سکے تو اس رات کے وسط میں قیام کرو اور اگر تم سے یہ نہ ہو سکے تو اس رات کے اول میں قیام کرو، اور چار رکعات نماز پڑھو، پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ یسین پڑھو اور دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ حم الدخان پڑھو اور تیسری رکعت میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ الم السجدہ پڑھو اور چوتھی رکعات میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ تبارک الذی پڑھو، اور جب ان رکعات سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ کی حمد اور ثنا کرو اور مجھ پر اور باقی انبیاء پر اچھی طرح درود شریف پڑھو، اور تمام مومنین اور مومنات کے لیے استغفار کرو اور اپنے فوت شدہ مسلمان بھائیوں کے لیے دعا کرو پھر آخر میں یہ دعا کرو: اے اللہ! جب تک تو مجھے زندہ رکھے مجھے ہمیشہ گناہوں سے بچا کر مجھ پر رحم فرما اور فضول کاموں کی مشقت سے بچا کر مجھ پر رحم فرما، تو میرے جن کاموں سے راضی ہو مجھے ان میں حسن نظر عطا فرما۔ اے اللہ! آسمانوں اور زمینوں کو ابتداً پیدا کرنے والے، اے جلال، اکرام اور غیر متصور غلبہ کے مالک، اے اللہ! اے رحمن! میں تیرے جلال اور تیری ذات کے نور کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں کہ تو اپنی کتاب کے حفظ کرنے پر میرے دل کو لازم کر دے جیسا کہ تو نے مجھے اس کتاب کی تعلیم دی ہے اور مجھے اس طرح اس کی تلاوت کی توفیق دے جس طرح تو راضی ہو، اے اللہ! آسمانوں اور زمینوں کو ابداً پیدا کرنے والے۔ اے جلال، اکرام اور غیر متصور غلبہ کے مالک! اے اللہ! اے رحمن! میں تیرے جلال اور تیری ذات کے نور سے سوال کرتا ہوں کہ تو اپنی کتاب کے پڑھنے کے ساتھ میری آنکھوں کو منور کر دے اور اس کی تلاوت سے میری زبان کو رواں کر دے اور اس سے میرے دل میں کشادگی کر دے اور اس سے میرے سینے کو کھول دے اور اس سے میرے بدن کو صاف کر دے، کیونکہ

تیرے سوا میری حق پر کوئی مدد نہیں کر سکتا، اور نہ تیرے سوا کوئی حق کو لا سکتا ہے اور گناہوں سے پھرنا اور نیکیوں کو کرنا اللہ بلند و برتر کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے، اے ابو الحسن! تم تین یا پانچ یا سات جمعہ تک یہ عمل کرنا، اللہ کے اذن سے تمہاری دعا قبول ہو گی، اس ذات جس کی قسم! جس نے مجھے حق دے کر بھیجا ہے یہ دعا کسی مومن سے تجاوز نہیں کرے گی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم! پانچ یا سات جمعہ گزرے تھے کہ حضرت علی ایسی ہی ایک مجلس میں آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ! پہلے میں چار یا پانچ آیتیں بہ مشکل یاد کرتا تھا، جب میں ان کو یاد کرتا تو وہ میرے سینے سے نکل جاتی تھیں اور اب میں چالیس یا اس سے زیادہ آیتیں حفظ کر لیتا ہوں اور جب میں ان کو زبانی پڑھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میرے سامنے کتاب اللہ موجود ہے، اور پہلے میں حدیث سنتا تھا تو میرے سینہ سے نکل جاتی تھی اور اب میں احادیث سنتا ہوں اور پھر ان کو بیان کرتا ہوں تو ان سے ایک لفظ بھی کم نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا: رب کعبہ کی قسم! اے ابو الحسن! میں اس پر یقین کرتا ہوں۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۷۰، مطبوعہ دار الجیل بیروت، ۱۹۹۸ء)

۲۔ ان سے جلدی دعا کرنے کا وعدہ کر کے ان کو اٹھا دیا، عطا خراسانی نے کہا: بوڑھوں کی بہ نسبت جوانوں سے حاجت جلد پوری ہو جاتی ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ حضرت یوسف نے کہا: آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے اور حضرت یعقوب نے کہا: میں عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش طلب کروں گا۔

۳۔ شعبی نے کہا: حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کے لیے دعا کو اس لیے موخر کر دیا تھا تاکہ وہ حضرت یوسف سے پوچھ لیں، اگر انہوں نے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا تو وہ ان کے لیے استغفار کریں گے اور حضرت انس بن مالک نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اے ہمارے باپ! اگر اللہ نے ہمیں معاف کر دیا تو فبہا ورنہ اس دنیا میں ہمارے لیے کوئی خوشی نہیں ہے۔ پھر حضرت یعقوب نے دعا کی اور حضرت یوسف نے آمین کہی، پھر بیس سال تک ان کی دعا قبول نہیں ہوئی، پھر حضرت جبرئیل آئے اور کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد کے متعلق آپ کی دعا قبول کر لی ہے۔ اور ان کی خطاؤں کو معاف کر دیا ہے، اور اس کے بعد ان سے نبوت کا عہد لیا گیا۔ (صحیح یہ ہے کہ حضرت یوسف کے بھائی نبی نہیں تھے، کیونکہ اعلان نبوت سے پہلے اور بعد تمام صغائر اور کبائر سے عمداً اور سہواً معصوم ہوتا ہے۔ سعیدی غفرلہ) (زاد المسیر ج ۴ ص ۲۷۷، ۲۷۸، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

تبیان القرآن – سورۃ نمبر 12 یوسف آیت نمبر 94

ایرانی

کَزْ برایِ حَقِّ صُحبَت سال ها

باز گو حالی از آن خوش حال ها

پاکستانی

کَزْ برائے حَقِّ صُحبَت سالہا

باز گُو رَمزے آزاں خُوش حالہا

حق صحبت: ساتھ رہنے کا حق۔۔۔ باز گو: دہرائیں۔۔۔ رمزے: اسرار و راز۔۔۔ خوش حالہا: اچھے دنوں کی باتیں، خوش کن کیفیات

ترجمہ: میری روح اس لئے مجھے مستعد کر رہی ہے کہ سالہا سال کے حق صحبت کے لئے ان مبارک حالات میں سے کچھ نہ کچھ بیان کروں۔

جیسا کہ ہم نے پچھلے حصے میں پڑھا تھا، شمس کا نام آتے ہی جناب رومیؒ بے چین ہو جاتے ہیں اور پھر بھی اسے ڈھونڈنے کی امید کرتے ہیں۔

جناب شمس الدینؒ کی یاد رومیؒ کی آنکھوں میں پورے وجود کو مسرور اور مسکراہٹ بناتی ہے اور استدلال کی قوت اور ان کی روح و بصارت کی وسعت کو سو گنا بڑھا دیتی ہے۔

کیونکہ اللہ تبارک و تعالی نے انسان کو ایک معاشرتی اور سماجی مخلوق بنایا ہے، وہ سماج اور معاشرہ سے کٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔

احتیاج و مجبوری اس کی فطرت کا خاصہ ہے؛ اس لیے وہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنے ابنائے جنس کی ضرورت محسوس کرتا ہے؛ اس لیے ایک صالح انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات استوار اور مستحکم ہوں۔

اسلامی تعلیمات کا اگر ہم جائزہ لیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلام نے جس طرح انسانی رشتوں اور سماجی رابطوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے کسی دوسرے مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اسلام نے انسانوں کے باہمی تعلقات اور سماجی رشتوں کی اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے کہ اسلام کا پورا فلسفۂ اخلاق اسی ایک محور کے گرد گھومتا نظر آتا ہے؛ چنانچہ اگر آپ اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر ایک نظر ڈالیں جس کی روح انسانوں کے ساتھ محبت و خیر خواہی، عدل و مساوات اور انسانیت کا احترام ہے تو بخوبی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان تعلیمات کا مقصد ایک ایسے صالح معاشرہ کی تشکیل ہے جس میں انسانوں کے درمیان کامل ربط و اتحاد اور موافقت و ہم آہنگی پائی جائے۔ اخلاقِ حسنہ پر اگر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کا مقصد انسانی رشتوں کا استحکام اور تحفظ ہے۔ اخلاقِ ذمیمہ مثلاً حسد، کینہ، تکبر، غیبت و چغل خوری، قطع رحمی اور بدگمانی وغیرہ سے بھی اس لیے سختی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے کہ یہ چیزیں باہمی تعلقات اور آپسی رشتوں پر منفی اثر ڈالتی ہیں اور معاشرے میں فساد اور بگاڑ کا باعث ہوتی ہیں۔

معاشرتی اور سماجی رشتوں کی اہمیت کے پیشِ نظر ہی رسولِ خدا ...نے ارشاد فرمایا: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مَيْمُونٍ الرَّقِّيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ بْنُ صَالِحٍ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ يُوسُفَ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ يَحْيَى بْنِ وَثَّابٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ، وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ، أَعْظَمُ أَجْرًا مِنَ الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ، وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ» ”وہ مومن جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرے اور ان کی طرف سے پیش آنے والی تکالیف پر صبر کرے وہ اس مومن سے بہتر ہے جو خلوت نشینی اور دنیا سے بے تعلقی کی زندگی گذارے اور لوگوں کی تکالیف پر صبر نہ کرے“ (رقم الحدیث ۳۸۳، الادب المفرد للبخاری ۴۰۳۰، ابن ماجہ ۴۸۷۵، مسند احمد)

حضرت علی کے اقوالِ حکمت میں ہمیں یہ قول بھی نظر آتا ہے: ”أعجزُ الناسِ مَنْ عَجِزَ عن اكتسابِ الْاخْوانِ وَأعجزُ منه مَنْ ضَيّعَ مَنْ ظَفِرَ به منهم “نہایت کمزور اور عاجز ہے وہ شخص جو کسی کو اپنا دوست نہ بنا سکے اور اس سے بھی زیادہ عاجز وہ شخص ہے جو پرانے دوستوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

انسانی طبیعت پر ماحول کا اثر

انسانی تعلقات اور سماجی رشتوں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے گردوپیش اور ماحول سے جس قدر متاثر ہوتا ہے۔ اتنا زیادہ وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا۔ گردوپیش کی فضا اور ماحول کا اثر صرف انسان پر نہیں پڑتا؛ بلکہ بعض اوقات عام حیوانات بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں، عِلْمُ العُمران کے ماہر علامہ ابنِ خلدون کے بہ قول وہ جانور جو صحرا میں رہتے ہیں ان کی کھال میں خشونت و سختی نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے، ان کے بالمقابل انسانی آبادی میں رہنے والے جانوروں کی کھالیں نرم ہوتی ہیں، ان میں توحش و درندگی بھی ویسی نہیں پائی جاتی جیسی صحرائی جانوروں میں ہوتی ہے۔

گرد و پیش کا ماحول جیسا ہوتا ہے انسان کی طبیعت پر عموماً ویسے ہی اثرات مرتب ہوتے ہیں، چنانچہ معاشرے میں اگر صلاح و خیر کا عنصر غالب ہو تو انسان میں صلاح و تقویٰ کے آثار نمایاں ہوں گے اور اگر معاشرہ اخلاقی اور عملی بگاڑ کا شکار ہو تو وہ فسق و فجور اور گناہ و معصیت کا خوگر ہوگا۔

رسولِ خدا… کے اس ارشادِ گرامی میں اسی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے: ”كلُّ مولودٍ يُوْلَدُ على الفطرةِ، فأبَوَاهُ يُهَوِّدانِه أويُنَصِّرَانِه أويُمَجِّسَانِه كما في البهيمة تُنْتِجُ البهيمةَ هل تَرَى فيها جَدْعَاءَ“(رقم الحدیث ۱۳۳۰ صحیح البخاری ۴۸۰۹)

ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے جانور کا بچہ صحیح سالم پیدا ہوتا ہے، کیا تم دیکھتے ہو کہ ان میں کوئی ایسا بچہ بھی پیدا ہوتا ہے جس کے اعضاء ناتمام ہوں۔

ظاہر کا اثر باطن پر

انسان اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حالات سے کس درجہ متاثر ہوتا ہے اس کو ایک اور مثال سے یوں سمجھیے کہ بعض اوقات انسان کے ظاہری اعمال کا ثر اس کے باطن پر بہت گہرا ہوتا ہے؛ چنانچہ اگر اس کا ظاہر پاک اور صاف ستھرا ہو تو کوئی عجب نہیں ہے کہ اس کی ظاہری نظافت و پاکیزگی اس کے باطن کے غبار کو بھی دھل دے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نظافت و پاکیزگی کو ایمان کا نصف قرار دیا ہے۔

دوسری قوموں سے تشبہ اختیار کرنے سے سختی سے روکا گیا اور ان کے رسم و رواج، تمدن اور کلچر کے بہ جائے اسلامی تمدن اور اسلامی تہذیب کو ایک مسلمان کی زندگی کا دستور العمل قرار دیا گیا۔

آپ… کا ارشاد ہے: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (ابو داؤد)

بعض اعمال ظاہری جذبہ اور ظاہری کیفیت کے ساتھ انجام دیے جاتے ہیں؛ لیکن اجر و ثواب کے اعتبار سے ان کا درجہ خدا تعالیٰ کے یہاں ان اعمال کا سا ہوتا ہے جو اخلاص سے کیے جاتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: ”فَاِنْ لَمْ تَبْكُوْ فَتَبَاكُوا“ اگر دعا میں رونا نہ آئے تو رونے کی سی صورت اختیار کر لو۔

غزوۂ حنین سے واپسی کے موقع پر آپ… نے ایک مقام پر نماز کے لیے پڑاؤ ڈالا حضرت بلال نے اذان کہی تو مشرکین کے کچھ بچے جو وہاں کھیل کود میں مصروف تھے اذان کا مذاق اڑانے لگے، ان بچوں میں حضرت ابو محذورہ بھی تھے آپ… نے ان کو اپنے قریب بلایا اور دوبارہ اذان کے کلمات کہلوائے ابو محذورہ کی عمر اس وقت سولہ برس تھی ان کلمات کا مفہوم وہ خوب سمجھتے تھے یہ ان کے مشرکانہ عقیدے سے متصادم تھا؛ اس لیے انھوں نے جھجکتے ہوئے شہادت کے الفاظ کہے؛ مگر اِسے ان الفاظ کی تاثیر کہیے یا اعجازِ مسیحائی کہ اس کا اثر ان کی روح میں اترتا چلا گیا۔

ماحول کی اثر انگیزی حکومت کے قوانین سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے؛ چنانچہ حدود و تعزیرات کے ذریعے اس طرح جرائم پر قابو نہیں پایا جاسکتا جس طرح اچھی تربیت انسان کو جرائم سے باز رکھ سکتی ہے۔ تعزیرات اور سزائیں گناہوں کا خوف تو دل میں پیدا کر سکتی ہیں؛ لیکن گناہوں کی نفرت دل میں نہیں بٹھا سکتیں؛ اس لیے اسلام نے معاشرہ کی اصلاح پر بہت زور دیا ہے ،جب تک ایک اچھا ماحول پیدا نہ ہو جائے کوئی صالح معاشرتی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ...نے بچوں کے والدین کو حکم فرمایا کہ: "مُرُوْا أولادكم بالصلاةِوَهُمْ أبناءُسَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أبناءُ عَشْرٍ "(رواہ احمد ۲/ ۱۸۰ وابو داؤد ا/ ۱۳۳)

ترجمہ: اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہوں اور ترکِ نماز پر ان کو مارو جب وہ دس برس کے ہو جائیں۔

تاکہ ابتدا سے انہیں اچھا اور بہتر ماحول ملے اور آگے چل کر ان کی شخصیت کی تعمیر صحیح خطوط پر ہو سکے۔

نیک صحبت کی اہمیت

قرآن و سنت میں بار بار تاکید کے ساتھ صالحین کی صحبت اختیار کرنے، مجالسِ خیر میں بیٹھنے اور بری صحبت سے گریز کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله و كونوا مع الصادقين (توبہ ۱۱۹) اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

ایک موقع پر آپ...نے ارشاد فرمایا کہ "لَاتُصَاحِبْ اِلّا موٴمنًا وَلاَيأكُلُ طَعَامَكَ الّا تَقِيٌّ"(ابو داؤد) تم مومن کے علاوہ کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ اور تمہارا کھانا صرف متقی لوگ کھائیں۔

یہ ہے اسلام کا تصورِ محبت و دوستی، دوستوں کے عقائد و اعمال اور افکار و نظریات انسان پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں؛ اس لیے دوست کے انتخاب سے پہلے بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔

آپ...نے ارشاد فرمایا: "المرءُ عَلى دِينِ خَلِيْلِه فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ "(مسند احمد، ترمذی) انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے؛ اس لیے تم میں سے ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔

جس طرح اہلِ صدق و اہلِ تقویٰ کی صحبت انسان کی زندگی پر مثبت اثر ڈالتی ہے، اسی طرح برے لوگوں کی صحبت و ہم نشینی کے منفی اثرات بھی زندگی پر پڑتے ہیں، رسول...نے ایک دل نشیں مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ برے ہم نشیں اور اچھے ساتھی کی مثال عطار اور لوہار کی سی ہے۔ اچھا ساتھی عطر فروش کی طرح ہے کہ یا تو وہ تمہیں عطر

تحفت دیگا یا تم اس سے عطر خرید کرو گے یا کم از کم تم اس کے پاس اس کی پاکیزہ خوشبو سے لطف اندوز ہو گے۔ برا ساتھی بھٹی میں دھونکنے والے کی طرح ہے جو یا تو تمہارے بدن اور کپڑے کو جلا دے گا یا تم اس کی بدبو پاو گے۔

ابن عباس فرماتے ہیں: "لَا تُجَالِسْ أَهلَ الأَهواءِ فَانّ مُجَالَسَتَهُمْ مُمَرِّضَةٌ لِلقلبِ" بروں کی صحبت میں نہ بیٹھو؛ اس لیے کہ ان کی صحبت دل اور روح کو بیمار کر دیتی ہے۔

بروں کی صحبت دین و ایمان کو تباہ کر دیتی ہے اور انسان کو راہِ حق سے منحرف کر دیتی ہے، بروں کو دوست رکھنے والا قیامت میں پشیمان اور شرمندہ ہو گا، وہ کہے گا کہ اے کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا، اس نے مجھے حق حاصل ہونے کے بعد راہِ حق سے پھیر دیا۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ يَالَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلاً يَاوَيْلَتَى لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَاناً خَلِيلاً لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي (الفرقان:۲۷-۲۹)

ترجمہ: اور جس دن ناعاقبت اندیش ظالم اپنے ہاتھ کاٹ کھائے گا اور کہے گا کہ اے کاش میں نے پیغمبر کے ساتھ رشتہ اختیار کیا ہوتا۔ اے کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا، اس نے مجھ کو کتاب نصیحت کے میرے پاس آنے کے بعد بہکا دیا۔

حدیث مبارکہ میں اس کی اہمیت اور کیفیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

حَدَّثَنِي مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ، حَدَّثَنَا أَبُو بُرْدَةَ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا بُرْدَةَ بْنَ أَبِي مُوسَى، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَثَلُ الْجَلِيسِ الصَّالِحِ، وَالْجَلِيسِ السَّوْءِ، كَمَثَلِ صَاحِبِ الْمِسْكِ، وَكِيرِ الْحَدَّادِ، لَا يَعْدَمُكَ مِنْ صَاحِبِ الْمِسْكِ، إِمَّا تَشْتَرِيهِ أَوْ تَجِدُ رِيحَهُ، وَكِيرُ الْحَدَّادِ يُحْرِقُ بَدَنَكَ أَوْ ثَوْبَكَ، أَوْ تَجِدُ مِنْهُ رِيحًا خَبِيثَةً." (صحیح بخاری: حدیث نمبر 2101)

ہم سے موسیٰ بن اسماعیل نے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ ہم سے عبد الواحد نے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ ہم سے ابوبردہ بن عبد اللہ نے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ میں نے ابوبردہ بن ابی موسیٰ سے سنا اور ان سے ان کے والد موسیٰ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نیک ساتھی اور برے ساتھی کی مثال کستوری بیچنے والے عطار اور لوہار کی سی ہے۔ مشک بیچنے والے کے پاس سے تم دو اچھائیوں میں سے ایک نہ ایک ضرور پالو گے۔ یا تو مشک ہی خرید لو گے ورنہ کم از کم اس کی خوشبو تو ضرور ہی پا سکو گے۔ لیکن لوہار کی بھٹی یا تمہارے بدن اور کپڑے کو جھلسا دے گی ورنہ بدبو تو اس سے تم ضرور پالو گے۔

صحبتِ صالح کے ثمرات

اس کے بر خلاف نیکوں کی صحبت بگڑے ہوؤں کو سنوار دیتی ہے، ان کی نگاہ کا فیض مِسِ خام کو کُندن بنادیتا ہے۔ قتل وغارت گری کے خوگر اور انسانیت کے دشمن جب ان کی صحبت میں بیٹھتے ہیں تو امن کے سفیر اور حق کے پرستار بن کر نکلتے ہیں۔

نبی...کے فیضِ تربیت نے حضراتِ صحابہ کو آسمانِ ہدایت کا درخشندہ ستارا بنادیا۔ یہ آپ کی صحبت کا فیض تھا کہ ذرے آفتاب وماہتاب بن گئے، جو گم کردہ راہ تھے وہ اوروں کے ہادی بن گئے۔

مدرسۂ نبوت کے خوشہ چینوں سے جنھوں نے اکتسابِ فیض کیا، انہیں تابعی ہونے کا شرف حاصل ہوا، انھوں نے نبوت سے قریب کا زمانہ پایا تھا؛ اس لیے وہ اخلاص وللّٰہیت، دیانت وتقوی اور انابت الیٰ اللہ میں صحابہ کی ہو بہو تصویر تھے۔

حضراتِ تابعین کی نگاہِ لطف ومحبت نے تبعِ تابعین کو اخلاق واخلاص کا گوہرِ نایاب بنادیا۔

یہ سب کرشمے تھے اہلِ سعادت کی صحبت وہم نشینی کے۔

جمال ہم نشیں در من اثر کرد　　　　و گرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

صحبتے با اولیاء

لیکن یہ تو ان زمانوں کا ذکر ہے جن کے خیر اور تمام زمانوں سے بہتر ہونے کی خبر خود رسول اللہ...نے دی ہے، ظاہر ہے کہ قیامت تک کے زمانوں تک ان کا امتداد نہیں ہو سکتا تھا۔

چنانچہ حضرات صحابہ وتابعین اور اتباع تابعین کے بعد انسانوں کی اخلاقی وعملی تربیت اور روحانی اصلاح کا کام بزرگان دین اور روحانی پیشواؤں نے انجام دیا۔ انھوں نے انسانوں کو محبت وانسانیت اور خدا ترسی کا درس دیا، گم کردہ راہوں کو منزل سے آشنا کیا۔ وہ دلوں کے چاک کو سینے اور بکھرے انسانوں کو ایک رشتہ میں پرونے کا کام کرتے رہے۔ ان کے وجود سے یہ دنیا کبھی خالی نہیں رہی۔ ان کی سیرت کا اعجاز اور ان کے اخلاق کی پاکیزگی ہمیشہ غفلت شعار انسانوں کے لیے مہمیز کا کام کرتی رہی۔

ان کی صحبت وہم نشینی کے بغیر نیکیوں کی طرف دل کا رجحان ومیلان نہیں ہو سکتا اور نہ گناہوں کی نفرت دل میں پیدا ہو سکتی ہے؛ اس لیے قرآنِ مجید نے اہلِ ایمان کو مخاطب کرکے کہا: "يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ایسے لوگوں کی معیت وصحبت اختیار کرو جو اپنے اقوال وافعال اور ایمان میں سچے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ" اے نبی اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھیے جو شب و روز خدا کی طاعت و عبادت میں مصروف رہتے ہیں، جو فقط خدا کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اس کی مرضی پر رضامند رہتے ہیں۔

مولانا روم نے صالحین کی صحبت کے اثرات کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

ہر کہ خواہی ہم نشینی با خدا

او نشینید صحبتے با اولیاء

اولیاء کرام کی صحبت میں گذارے ہوئے لمحات سو سالہ بے ریا عبادت سے بھی بڑھ کر ہیں۔ جو اللہ تعالی کی قربت کی تمنا اور آرزو رکھتا ہے اسے چاہیے کہ صالحین کی صحبت اختیار کرے۔

بعض عارفین کا قول ہے: "کونوا مع اللہ فان لم تقدروا فکونو مع من یکون مع اللہ"

ترجمہ: اللہ کی معیت اختیار کرو اگر اس کی قدرت نہ ہو تو اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔

یہ وہ بات تھی جس کی وجہ سے جناب رومیؒ، اپنے شیخ و مربی جناب شمسؒ کو بار بار یاد فرماتے ہیں۔

ایرانی

تا زمین و آسمان خندان شود

عقل و روح و دیدہ صد چندان شود

پاکستانی

تا زمین و آسمان خنداں شود

عقل و روح و دیدہ صد چنداں شود

خنداں شود: ہنسنے لگیں۔۔۔ دیدہ: دل۔۔۔ صد چنداں شود: سو گنا زیادہ روشن ہو جائیں

ترجمہ: تاکہ زمین و آسمان والے خوشی سے ہنسنے لگیں اور عقل و روح اور دل والے سو گنا روشن ہو جائیں۔

زمین و آسمان دنیا کی طرف اشارہ ہیں اور مسکرانے کے معنی خوشحالی کے ہیں۔

تاکہ مولانا رومؒ کی جو روحانی حالت شمسؒ کے ساتھ تھی اس کے بیان سے زمین و آسمان خوش ہو جائیں اور دماغ، روح اور قلب کی بصارت میں سو گنا اضافہ ہو جائے۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر آپ روحانی حالات اور توحید کے راز کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت کر دیں تو دنیا میں خوشحالی پیدا ہو جائے گی کیونکہ سب کی توجہ اللہ کی طرف ہے اور اللہ کی طرف توجہ کرنا روح کی تازگی کا سبب ہے اور آخر کار۔ روحانی ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔

حسام الدین چلبیؒ جناب رومیؒ سے کہتے ہیں:

علم شمس کے بارے میں تھوڑا سا بتاؤ، تاکہ زمین و آسمان خوش ہو جائیں!

جب صوفی خوش ہوتا ہے تو زمین و آسمان خوش ہوتے ہیں۔

کیونکہ باہر کی دنیا اندر کی دنیا کا عکس ہے۔

جب میں خوش ہوں اور دنیا کو خوبصورت دیکھوں تو زمین و آسمان بھی خوش ہوتے ہیں...

اس بند میں ایک بہت اہم کلیدی نکتہ ہے "عقل، روح اور بصارت کو سو گنا بڑھایا جائے"۔

سب سے پہلے تذکرہ کے عنوان کے ساتھ کوئی کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ صوفیاء کی سوانح ہے۔

تذکرہ کتب کا مطالعہ ضرور کریں کیونکہ ان کتابوں میں صوفیاء کی سیرت اور ان کے فضائل کو خوب بیان کیا گیا ہے۔

عصری کتب میں سے کتاب "تذکرے اور صحبتیں، تذکرۃ الاولیاء وغیرہ میں کئی دوسرے صوفیاء کی سوانح حیات بھی بتائی گئی ہے۔

جب بھی آپ ان کتابوں کو پڑھیں گے، آپ کو اندازہ ہو گا کہ ان بزرگوں میں کیا صلاحیتیں اور علم تھا، اور آپ کی زندگی پر مسرت ہو گی اور آپ کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو گا اور اس سے آپ کی روحانی ذہانت میں اضافہ ہو گا!

جب آپ ایسی کتابیں پڑھتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ انسان کیا حیرت انگیز صلاحیتیں اور طاقتیں حاصل کر سکتا ہے، اور آپ کی ذہنی حد ٹوٹ جاتی ہے اور آپ زندگی کے نچلے درجے کے مسائل میں نہیں پھنستے، اور آپ سمجھتے ہیں کہ بہتر زندگی گزارنا ممکن ہے۔

راز توحید تو ایک اعلیٰ ترین سر ہے۔ لیکن علمی طور پر دیکھتے ہیں محرم راز رومیؒ جناب علامہ اقبالؒ کے مطابق یہ کیا ہے؟

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ اسلام کے تمام تعلیمات کا آغاز لا الہ الا اللہ سے ہوتا ہے۔ تمام دینی تعلیمات کا محور عقیدۂ توحید ہے۔ توحید الٰہی کے ایمان میں ہر شے کا مفاد مضمر ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توحید پر ایمان رکھنا انسانوں کو ان کی عزت، ان کی پہچان اور اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بخشتا ہے۔ توحید کا عقیدہ انسان کو انسان کی غلامی اور بندگی سے نجات دلاتا ہے، اور انہیں ایک خدا-جو تمام کائنات کا خالق ہے، کی عبادت کی طرف لے جاتا ہے۔

عقیدۂ توحید اسلام کے ارکان خمسہ میں سے ایک رکن ہے۔ اس کے تقاضوں کے مطابق انسان کا یہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ایک ہے اور وہ ذات، اسماء اور صفات میں بھی منفرد اور بے نظیر ہے۔ تمام نوع انسانیت کو یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ہر قسم کی عبادت کا مستحق صرف اللہ ہی ہے، اس کے علاوہ دوسرا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ زمین و آسمان اور دیگر تمام چیزوں کا خالق و مالک صرف اللہ ہی ہے۔ وہی سب کو رزق دیتا ہے۔ پوری کائنات خدا کی سلطنت میں ہے اور اس میں کوئی دوسرا خدا کا حصہ دار نہیں ہو سکتا۔

توحید پر ایمان رکھنا ایک انسان کو دوسرے انسان سے جوڑتا ہے۔ نوع انسانیت میں اخوت اور محبت کو فروغ دیتا ہے۔ عقیدۂ توحید سے ہی انسانوں کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سورۃ التوبہ آیت 51 میں ارشاد فرماتا ہے۔ "قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا" "اے محبوب ﷺ آپ فرما دیجئے کہ ہمیں ہرگز کوئی برائی یا بھلائی نہیں پہنچتی مگر وہ جو اس نے ہمارے لئے لکھ دی ہے'۔

كل ما في الوجود من الخالق و المخلوقات له اعتبارات و مشاهدات كثيرة مختلفة، فهو باعتبار واحد من الاعتبارات واحد، وباعتبارات اخر سواء كثير، وبعضها اشد كثرة من بعض (احياء العلوم: ص 1605)

"جتنی بھی موجودات ہیں، چاہے خالق ہوں یا مخلوق، سب کے لئے متعدد اعتبارات ومشاہدات ہیں، کسی ایک اعتبار سے وہ واحد ہوتی ہیں تو کسی دوسرے اعتبار سے وہ کثیر، اور بعض (اعتبارات سے پیدا ہونے والی مشاہداتی) کثرت بعض (دیگر اعتبارات سے پیدا ہونے والی مشاہداتی) کثرت سے زیادہ ہوتی ہے"

کائنات میں فاعل حقیقی ایک ہی ہے "کا منطقی نتیجہ ہے کہ "کائنات میں وجود حقیقی بھی صرف ایک ہی ہے"۔ حقیقی وجود کیا ہے؟ وہ وجود جو قائم بالذات ہو۔ امام غزالی کہتے ہیں:

القائم بنفسه هو الذى لو قدر عدم غيره بقى موجودا (احياء العلوم: ص1427)

"قائم بالذات ہستی وہ ہے کہ اگر اس کا غیر (other) معدوم ہو جائے تو بھی اس کا وجود باقی رہے"

یعنی خود اپنی ذات سے قائم وجود وہ ہوتا ہے کہ اگر اس کے سواء باقی سب وجود ختم ہو جائیں تب بھی اس کا وجود برقرار رہے۔ ایسا وجود صرف اور صرف خدا ہی کی ذات کو حاصل ہے۔ یعنی سب مخلوقات ھلاک ہو جائیں وہ تب بھی موجود ہو گا، ایسا وجود کسی کو حاصل نہیں۔ مشاہداتی وجود کے اس تناظر میں تمام مخلوقات ہوتے ہوئے بھی غیر موجود ہو جاتی ہیں۔

امام غزالیؒ کا بیان کردہ توحید کا درجہ یہی مشاہداتی توحید ہے جسے وہ یوں بیان کرتے ہیں:

والرابعة: ان لا يرى فى الوجود الا واحدا، وهى مشاهدة الصديقين وتسمية الصوفية الفناء فى التوحيد لانه من حيث لا يرى الا واحد فلا يرى نفسه ايضا، واذا لم ير نفسه لكونه مستغرقا بالتوحيد كان فانيا عن نفسه فى توحيده، بمعنى انه فنى عن رؤية نفسه والخلق (احياء العلوم: ص1404)

"اور چوتھا درجہ یہ ہے کہ انسان صرف ذات واحد کا مشاہدہ کرے اور یہ صدیقین کا مشاہدہ ہے اور صوفیاء اسے توحید میں فنا ہو جانا کہتے ہیں کیونکہ اس مقام پر وہ اس ذات کے سواء کچھ نظر نہیں آتا یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کو بھی نہیں دیکھ پاتے، اور جب انسان توحید میں استغراق کے سبب خود اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ پاتا تو دراصل وہ توحید میں اپنے نفس سے بھی فنا ہو جاتا (یعنی اس کی نفی کرتا) ہے، ان معنی میں کہ وہ اپنے آپ اور دیگر مخلوقات کو دیکھنے سے قاصر ہو جاتا ہے"

گویا توحید کا آخری درجہ یہ ہے کہ انسان کے مشاہدے میں صرف ایک ہی ذات رہ جائے، باقی سب فنا ہو جائے، وہ جب کسی شے کو دیکھے تو صرف وجود واحد اور حقیقی کے تناظر میں دیکھے۔ جب بندہ اس تناظر میں مشاہدہ کرتا ہے تو ہر موجود کے مشاہدے میں صرف خدا ہی باقی بچ رہتا ہے، جو نظر کے سامنے ہوتا ہے اس کے وجود نہیں بلکہ "ہلاک وفنا" ہونے کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ

اس تناظر سے قائم ہونے والے مشاہداتی تناظر میں سب وجود فناولایعنی ٹھہرتے ہیں، اس مشاہداتی تناظر میں خدا کے سواء ہر شے دیکھ کر انسان یہی پکارتا ہے: "یہ تو فنا ہو جانے والی ہے"، [1] یعنی اس کی کوئی وقعت نہیں، وقعت تو بس اس کی ہے جو وجود حقیقی ہے، جو از خود قائم ہے، امام غزالی لکھتے ہیں:

وانما الوجود هو القائم بنفسه، والقائم بنفسه هو الذی لو قدر عدم غیره بقی موجودا (احیاء العلوم: ص1427)

"بیشک وجود وہ ہے جو قائم بالذات ہو، اور قائم بالذات ہستی وہ ہے کہ اگر اس کا غیر (other) معدوم ہو جائے تو بھی اس کا وجود باقی رہے"

اس وجود حقیقی اور عام انسانوں کے وجود میں جو فرق ہے نیز اس سے شرک کا خطرہ کس طرح ختم ہو جاتا ہے، اسے وہ یوں بیان کرتے ہیں:

والخاصیة الالھیة انه الموجود الواجب الوجود بذاته، الذی عنه یوجد کل ما فی الامکان وجوده علی احسن وجود النظام و الکمال۔ وهذة الخاصیة لایتصور فیها مشارکة البتته، ولمماثلة بها لا تحصل۔ فکون العبد رحیما، صبورا، شکورا لا یوجب الممثلة ککونه سمیعا، بصیرا، عالما، قادرا، حیا، فاعلا (المقصد الاسنی فی معانی اسماء الحسنی: ص49)

"خاصیت الہی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے قائم واجب الوجود ہستی ہے، جس کی ذات سے عالم امکان میں تمام موجودات نہایت عمدہ و کامل نظم کے ساتھ وجود میں آتے ہیں، اور یہ وہ خاصیت ہے جس میں (کسی کی) شرکت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پس ایک بندہ رحیم، صبور و شکور ہو سکتا ہے لیکن اس سے (خدا کی صفات کے ساتھ) مماثلت لازم نہیں آتی جیسے بندہ سمیع، بصیر، عالم، قادر، حی اور فاعل ہوتا ہے"

ایرانی

لا تُکَلِّفنی فَاِنّی فی الفَنا

کَلَّت اَفہامی فَلا اُحصی ثَنا

پاکستانی

لَا تُكَلِّفْنِی فَاِنِّی فِی الْفَنا
كَلَّتْ اَفْهامی فَلا اُحْصی ثَناء

لا تکلفنی: مجھے مجبور نہ کریں۔۔۔ فانی: بے شک میں۔۔۔ فنا: بیخودی، نیستی۔۔۔ افہام: فہم کی جمع۔۔۔ لا احصی: میں شمار نہیں کر سکتا۔۔۔ ثناء تعریف

ترجمہ: مجھے مدح کرنے پر مجبور نہ کرو کیونکہ میں بے خودی کی حالت میں ہوں۔ میرے ہوش و حواس بیکار ہو رہے ہیں۔ پس میں اس کی پوری تعریف نہیں کر سکتا۔ اس شعر میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ روح جو مجھے مدح شیخ پر مجبور کر رہی تھی اس بات سے عذر کرتے ہیں کہ میں سوز فراق سے بے خود ہو رہا ہوں۔ کیونکہ ہوش و حواس ٹھکانے نہیں۔ کیا کر سکتا ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ شاعر اس شعر میں اپنی دوری کا اظہار کر رہا ہے، کیونکہ ہر انسان کی زندگی ایک ہی ہے اور گویا وہ اپنے عذر کا اظہار کر رہا ہے کہ جب میں خود جدائی کے درد میں مبتلا ہوں تو کیا کہوں؟! عربی شعر کا مفہوم یہ بھی ہے کہ تم مجھ پر بوجھ نہ ڈالو، کیونکہ میں بے نیاز ہوں اور تصوف کی وجہ سے میری سمجھ میں کمی آئی ہے، اس لیے میں اپنے مرشد کے بارے میں اور خدا اور دنیا کے رازوں کے بارے میں بات کرنے کے قابل نہیں ہوں۔

یہاں، جناب رومیؒ پرجوش ہو جاتے ہیں اور نظم کی زبان عربی میں بدل دیتے ہیں اور حسام الدین چلپی کے جواب میں کہتے ہیں:

مجھ پر اتنا بوجھ مت ڈالو اور مجھ سے مت پوچھو! میں فنا میں ہوں اور بے حسی کو پہنچ گیا ہوں اور میرے پاس اپنے الفاظ نہیں ہیں۔ میں بولنے کی صلاحیت کھو چکا ہوں اور میں شمس تبریزیؒ کی تعریف نہیں کر سکتا!

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرحمن کی آیت نمبر 26 میں فرمایا کہ "ہم سب فنا ہونے والے ہیں" (جو کچھ بھی ہے اور جو بھی زمین پر نہیں ہے وہ فنا ہے)، فنا "فان" سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے نابود، فنا ہونے والا، اور اس کی کوئی بے حساب تعریف نہیں۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (26) وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ (الرحمٰن)

زمین پر جتنی مخلوق ہے سب فنا ہونے والی ہے۔ اور تمہارے رب کی عظمت اور بزرگی والی ذات باقی رہے گی

غنی زمین پر جتنے جاندار ہیں سب ہلاک ہونے والے ہیں کیونکہ دنیامیں انسان)اور دیگر جانداروں (کاوجود عارضی ہے لہٰذاوہ باقی نہیں رہے گااور جو چیز باقی نہ رہے وہ فانی ہوتی ہے۔)خازن، الرحمٰن، تحت الآیۃ :۲۶، ۴ / ۲۱۰(

فنا ہونا بھی ایک اعتبار سے نعمت ہے

حضرت عبداللہ بن احمد نسفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں ’’فنا ہونااس اعتبار سے نعمت ہے کہ ایمان والے موت کے بعد اَبدی اور سَرمدی نعمتوں کوپائیں گے۔(مدارک، الرحمٰن، تحت الآیۃ: ۲۸، ص۱۱۹۳)

جیسا کہ حضرت ابو قتادہ بن ربعی انصاری رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے پاس سے ایک جنازہ گزراتو آپ نے فرمایا: ’’مُسْتَرِیْحٌ وَمُسْتَرَاحٌ مِنْہُ‘‘ صحابۂ کرام رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمْ نے عرض کی: یا رسولَ اللہ! صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، مُسْتَرِیْحٌ اور مُسْتَرَاحٌ مِنْہُ سے کیامراد ہے؟ارشاد فرمایا:’’مومن بندہ جب مرتا ہے تووہ مصیبتوں سے نجات پا کر اللہ تعالٰی کی آغوشِ رحمت میں جاناچاہتا ہے اور بدکار آدمی جب مرتا ہے تو اس کے مرجانے سے اللہ تعالٰی کے بندے، شہر، درخت اور جانور بھی راحت پاناچاہتے ہیں۔(بخاری، کتاب الرقاق، باب سکرات الموت، ۴ / ۲۵۰، الحدیث: ۶۵۱۲)

اور حضرت یحیٰ بن معاذ رازی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں ’’موت کوخوش آمدید ہو کیونکہ یہ وہ چیز ہے جو حبیب کو حبیب کے قریب کردیتی ہے۔(مدارک، الرحمٰن، تحت الآیۃ: ۲۸، ص۱۱۹۳)

قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اولاً توپیدائش عالم کا ذکر فرمایا پھر ان کی فنا کا بیان کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک منقول دعا میں یہ بھی ہے » یاحی یاقیوم یابدیع السموات والارض یاذا الجلال والا کرام لا الہ الا انت برحمتك نستغیث اصلح لنا شاننا کله ولا تکلنا الی انفسنا طرفته عین ولا الی احد من خلقك « یعنی اے ہمیشہ جینے اور ابد الآباد تک باقی اور تمام قائم رہنے والے اللہ! اے آسمان وزمین کے ابتداءًپیدا کرنے والے۔ اے رب جلال اور بزرگی والے پروردگار تیرے سوا کوئی معبود نہیں، ہم تیری رحمت ہی سے استغاثہ کرتے ہیں ہمارے تمام کام تو بنادے اور آنکھ جھپکنے کے برابر بھی تو ہماری طرف نہ سونپ اور نہ اپنی مخلوق میں سے کسی کی طرف۔(ابن کثیر)

فنا ایک کیفیت ہے یا ایک حال ہے

،جو اپنی حقیقت کو ذات خداوندی کے سامنے حاضر کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

لغت میں "فنا" نابودی اور نیستی کے معنی ہے-اس کے مقابل میں "بقا" باقی رھنے کے معنی میں ہے-مثال کے طور پر خداوند متعال بقاکے ذمرہ میں سے ہے اور دوسری تمام مخلوقات نابودی اور فناکے زمرہ سے ھیں-

اصطلاح میں، "فنا" خود کو نہ دیکھنے اور نہ پانے کے معنی میں ہے-البتہ اپنے آپ سے بے خبری کے معنی میں نھیں ہے، بلکہ انسان خداوند متعال کے حضور میں اپنے آپ کو کچھہ بھی نھیں دیکھتاہے اور جو کچھہ غیر خدا ہے اس سے اپنادل خالی رکھتاہے-

عرفان میں مقام فنا

منزل و مرتبہ کو مقام کہتے ہیں کہ عارف برسوں کے رنج وتکلیف اور تہذیب نفس کے بعد اس مقام کو حاصل کرتا ہے-اس بناپر کسی چیز کا تغیر اور زوال جو مشکلات سے طے ہوتا ہے، عادتاً اور غالباًوہ چیز آسانی کے ساتھ ہاتھ نہیں آتی ہے اور وہ پائدار اور باقی رہنے والی ہے-

فناکے مقام پر، انسان خود کو اور اپنی بندگی کو، اپنے رجحانات اور تمناوں کو اور اطراف کی دنیا کو خداوند متعال کے مقابلے میں کچھ نہیں پاتا اور صرف خداوند متعال پر نظر ڈالتاہے-اولیائے الٰہی جس چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ حق ہے خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ یابلواسطہ، کبھی وہی اسماء وصفات الٰہی ہیں اور صاحبان سلوک و معرفت کے لئے، یہ نوری پردے بھی ہٹ جاتے ہیں:"

الھی ھب لی کمال الانقطاع الیك...حتی تخرف البصار القلوب حجب النور---

"بیشک یہ فناکی آخری منزل ہے، کہ اس کے بعد انسان کلی طور پر محو ہو جاتاہے اور چہرے سے مکمل اضمحلال مترشح ہوتا ہے- یہاں پر انسان حقیقت کے کانوں سے سنتاہے، حقیقت کی آنکھوں سے دیکھتاہے اور حقیقت کی زبان سے بولتاہے-یہ مطلب اصل ذات حق تعالیٰ کو نہ جاننے سے کوئی منافات نہیں رکھتاہے، کیونکہ اصل ذات حق تعالیٰ خود ذات حق کے علاوہ کسی کے لئے معلوم نہیں ہے-

اعلیحضرت کے جدّ مرشِد حضرت سیّد شاہ آلِ احمد اچھے میاں ‘‘آدابِ سالکین’’ میں ارشاد فرماتے ہیں!

فنا کے تین درجے ہیں

(1) فَنَافِی الشّیخ

(2) فَنَافِی الرّسول صَلّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلّم

(3) فَنَافِی اللّٰہ عَزّوَجَلّ آپ مولانا عبد الرحمٰن جامی کی "نفحات الانس" کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں کہ عام ولایت تو تمام ایمان والوں کو حاصل ہے مگر خاص ولایت، (اہلِ طریقت) میں ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ جو فَنَافِی الشّیخ کے ذریعے فَنَافِی الرّسول صَلّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلّم ہو کر فَنَافِی اللّٰہ ہو گئے۔

فنا سے جڑی ہوئی کیفیت بقاء بھی ہے جیسے فنا عن المعاصی۔ اور بقا الطاعتہ گناہوں سے فانی ہو جانا اور اطاعت پر باقی رہنا یا جہالت سے فنا حاصل کرنا اور الٰہی معرفت سے بقا حاصل کرنا متکلمین اسلام کے مطابق فنا اس کارروائی کا نام ہے جس میں شے کے اوصاف معدوم ہو جاتے ہیں اور بقا انہی اوصاف میں دوام حاصل کرنا ہے۔ فنا اس بات سے عبارت ہے کہ باطن پر ذات حق کے غلبہ ظہور کے سبب ہمارے پاس اس کی ذات کے سوا کوئی شعور باقی نہ رہے اور فنا کے باقی نہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس عالم بے شعوری کا شعور بھی نہ رہے۔

اب یہ حالت چونکہ مولانا رومؒ کی ہو چکی تو اس کیفیت سے گذرتے زبان عربی ہو گئی اور اس میں اظہار فرمایا کہ اب میں شیخ کو کیا نظر کروں؟ حالت ہی بدل گئی!!!!!!

ایرانی

كُلُّ شَيْءٍ قَالَهُ غَيْرُ الْمُفِيق

اِنْ تَكَلَّفَ اَوْ تَصَلَّفَ، لَا يَلِيق

پاکستانی

كُلُّ شَئٍ قالَهُ غَيْرُ الْمُفِيق
اِنْ تَكَلَّفَ اَوْ تَصَلَّفَ، لَا يَلِيق

کل شئٍ: ہر چیز۔۔۔ قالہ: کہے گا۔۔۔ غیر مفیق: بغیر ہوش کے، غیر ذی ہوش۔۔۔۔ ان تکلف: اگر تکلف کرے گا۔۔۔ تصلف: لاف زنی کرے۔۔۔ لا یلیق: لائق نہیں۔

ترجمہ: غیر ہوش والا جو بات کہے گا اگر اس میں تکلف کرے یا خلاف کہے گا تو یہ لائق نہیں۔

اس شعر میں تکلف اور تصلف میں تجنیس لاحق ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں:

جو کچھ بھی کہا جائے نادانستہ کہا جاسکتا ہے۔ اگر میں زبردستی کچھ کہوں یا شیخی بگھارنا چاہوں تو شمس کے لائق نہیں۔

میں جو بھی کہتا ہوں وہ صحیح نہیں ہو سکتا!

جو آدمی نشے کی حالت میں پڑھتا ہے تو کیا وہ بیدار ہوتا ہے؟، اس کا مطلب یقیناً سمجھ میں نہیں آتا، اور اگر کوئی شخص اس معنی کو تکلف یا سلف سے معلوم کرنے کی کوشش کرے تو ایسا شخص اس کی صحیح تفہیم کے لائق اور مستحق کبھی نہیں ہو گا۔ متذکرہ آیت میں شاعر نے ذکر کیا ہے کہ جب انسان کی طبیعت تیار نہ ہو تو صحیح موضوع اور منطقی تقریر کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ تو وہ کہتا ہے مجھے "کہنے" سے معاف کر دو۔

حسام الدینؒ کی درخواست کے جواب میں جناب رومیؒ کہتے ہیں: وہ مجھے پریشانی میں ڈال رہے ہیں کیونکہ میں غائب ہو رہا ہوں، اور اس صورت میں میری سمجھ اور عقل ناکارہ ہو گئی ہے کیونکہ یہ میری نہیں ہے، اور اس لیے میرے پاس اظہار خیال نہیں ہے، نتیجہ، میں کسی کی تعریف نہیں کر سکتا۔ جذب ہونے کے دوران کہے جانے والے ہر قول کو ہوش و حواس میں نہیں سمجھا جا سکتا اور اگر وہ ان باتوں کو خود تعریف کے ساتھ سمجھے تو مکروہ نہیں ہو گا۔

حدیث پاک میں ارشاد فرمایا کہ

وعن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كل طلاق جائز إلا طلاق المعتوه والمغلوب على عقله. رواه الترمذي وقال: هذا حديث غريب وعطاء بن عجلان الراوي ضعيف ذاهب الحديث

دیوانے کی طلاق واقع نہیں ہوتی

اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہر طلاق واقع ہو جاتی ہے مگر بے عقل اور مغلوب العقل کی طلاق واقع نہیں ہوتی امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی عطاء بن عجلان روایت حدیث میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں کیونکہ ان کے حافظہ میں حدیث محفوظ نہیں رہتی تھی۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک اس حدیث کے مطابق ہے کیونکہ ان کے نزدیک کبھی دیوانے کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ یہاں حدیث میں معتوہ سے دیوانہ مراد ہے یعنی وہ شخص جو کبھی تو مسلوب العقل رہتا ہو اور کبھی اس کی عقل ٹھکانے رہتی ہو قاموس میں لکھا ہے کہ عتہ جو معتوہ کا مصدر ہے کے معنی ہیں کم عقل ہونا مدہوش ہونا اور صراح میں لکھا ہے کہ معتوہ الٹے ہوئے ڈول اور بے عقل شخص کو بھی کہتے ہیں چناچہ فقہ کی کتابوں میں اس کے یہی معنی بیان کئے گئے ہیں اس اعتبار سے حدیث کا یہ جملے سے یہ ثابت ہوا کہ جب معتوہ کی طلاق واقع نہیں ہوتی تو مجنون مطلق یعنی پاگل شخص کہ جو سرے سے عقل و شعور رکھتا ہی نہیں اس کی طلاق بطریق اولی واقع نہیں ہو گی۔ تو مولانا رومؒ کے بیان کہ میں گویا حالت سکر میں ہوں۔

فقیر یا درویش پر 2 کیفیات طاری ہوتی ہیں

1۔ حالتِ سُکر

2۔ حالت صحو حالتِ صحو میں فقیر اپنے ہوش و حواس میں ہوتا ہے، اِسے اپنی ذات اور ذہن پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے۔ سالک حالتِ صحو میں رہتا ہے زندگی میں دو چار بار ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ حالتِ سُکر میں چلا جائے۔

حالتِ سُکر وہ ہے کہ جب فقیر کا اپنے ذہن پر کنٹرول ختم ہو جائے تو پھر ہوش و حواس میں نہ ہونے کی وجہ سے اُسے یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جب فقیر حالتِ سُکر میں ہو تو اُس سے دور رہنا زیادہ مُناسب ہے کیونکہ حالت صحو میں تو وہ سوچ سمجھ کر بات کرتا ہے جِس کا نقصان نہیں ہوتا لیکن حالتِ سُکر میں کہی گئی بات ٹلے گی نہیں بلکہ فوری طور پر پوری ہو جائے گی۔ فقیر حالتِ سُکر میں چونکہ جوش میں ہوتا ہے اور اُس کی زُبان سے عموماً ایسے الفاظ نکلتے ہیں جِن سے نقصان ہی ہوتا ہے۔

ہم بزرُگوں سے سُنا کرتے تھے کہ فقیر سے دور رہنا بہتر ہے کیونکہ پتا نہیں چلتا کہ وہ اِس وقت کِس حالت میں ہے۔ عقل مند لوگ فقیر سے دور رہتے ہیں کہ کہیں وہ چڑ نہ جائے اور حالتِ سُکر میں جا کر کُچھ کہہ نہ دے۔ حالت سکر میں تو طلاق بھی نہیں ہوتی کیونکہ اس سے اطلاق شریعت اٹھ جاتی ہے۔ تو میں کیا کہوں اب اسی عالم میں چلا ہوں۔

یہاں مجھے اپنے شیخ الشیوخ حضرت سری سقطیؒ کے آخری وقت کی کیفیت کا تذکرہ بھی یاد آیا تو وہ بھی لکھ دوں تا کہ کیفیت نصیب ہو

سیدنا جنیدؒ فرماتے ہیں میرے نزدیک سیدنا سری سقطیؒ سے بڑا کوئی عابد نہیں 92 سال وہ زندہ رہے لیکن مرض الموت کے علاوہ میں نے انہیں لیٹا ہوا نہیں دیکھا۔ جنیدؒ کا قول ہے کہ ایک مرتبہ میں انکی عیادت کے لیے گیا تو میں نے طبیعت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ایک شعر پڑھا كَيْفَ أَشْكُوْ إِلَى طَبِيْبِيْ مَا بِيْ وَالَّذِيْ بِيْ أَصَابَنِيْ مَنْ طَبِيْبِيْ "-کہ میں اپنی بیماری کی اپنے معالج کو کیسے شکایت کروں اور جو مرض طبیب کی جانب سے پیدا ہوا ہو اس سے کیا شکایت کروں" جنیدؒ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہوا کے لیے میں ان پر پنکھا چلانا شروع کیا تو انہوں نے فرمایا جو شخص اندر سے جل کر ختم ہو گیا ہو اس کو یہ پنکھا کیا فائدہ دے گا پھر انہوں یہ اشعار پڑھے۔ "دل جل رہا ہے اور آنسو جاری ہیں اور مصائب جمع ہیں اور صبر کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے۔ ان کاموں کے نتیجے میں جو اس نے خواہش نفس اور شوق سے کیے ہوں، کیا سکون ملے گا جس کا اپنا گھر نہ ہو۔ اے خدا اگر میرے مقدر میں کچھ سکون ہے تو موت تک مجھے وہ عطا کر دے۔ " جنیدؒ فرماتے ہیں میں نے ان سے نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا کہ غلط لوگوں کی صحبت مت اختیار کرو اور اچھے لوگوں کی صحبت میں رہنے کے وقت بھی اللہ کو مت بھولو۔ سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے معروف کرخیؒ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: جس نے اللہ کے مقابلے میں بڑائی چاہنے کا ارادہ کیا تو وہ اُسے بری طرح پچھاڑ دے گا، جس نے اس سے لڑائی کا ارادہ کیا تو وہ اسے ذلیل کر دے گا، جس نے اس کو دھوکا دینا چاہا تو وہ اسے اس کی سزا دے گا اور جس نے اس پر بھروسا کیا تو وہ اسے نفع دے گا اور جس نے اس کے لیے عاجزی کی تو وہ اُسے بلند رتبہ عطا فرمائے گا۔ معروف کرخیؒ کی بارگاہ میں عرض کی گئی: دل سے دنیا کی محبت نکالنے کا نسخہ کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: اللہ عَزَّوَجَلَّ سے سچی محبت اور لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور

خالص محبت کی علامات تین ہیں

1. ــــــ وعدہ پورا کرنا
2. ــــــ بغیر سوال کے عطا کرنا اور
3. ــــــ کوئی سخاوت نہ کرے پھر بھی اس کی تعریف کرنا

مُحِبِّین کی علامات بھی تین ہیں

1. ۔۔۔۔۔۔رضائے الٰہی عَزَّوَجَلَّ کی جستجو میں رہنا

2. ۔۔۔۔۔۔اسی کی ذات میں مشغول رہنا اور

3. ۔۔۔۔۔۔ہمیشہ اسی کی پناہ طلب کرنا۔

ابو عبیدہ بن حریوبہ کا قول ہے کہ سری سقطیؒ کے انتقال کے بعد میں نے انہیں خواب میں دیکھا میں نے ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کیا معاملہ کیا انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری اور میرے جنازہ میں حاضرین کی بخشش فرمادی۔ میں نے عرض کیا کہ میں بھی آپ کے جنازہ میں شریک ہوا تھا یہ سن کر انہوں نے ایک رجسٹر نکالا لیکن اس میں میرا نام نہیں تھا میں نے کہا میں واقعتاً آپ کے جنازہ میں تھا تو اس کے حاشیہ میں میرا نام نکل آیا۔ ابن خلکان کہتے ہیں کہ سری سقطیؒ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔ "جب میں نے محبت کا دعویٰ کیا تو محبوب نے کہا کہ جھوٹ ہے کیونکہ آپ کے اعضاء پر گوشت موجود ہے۔ جب تک جسم پر گوشت ہے اس وقت تک محبت کا دعویٰ غلط ہے اور اسی طرح جب تک اتنا مدہوش نہ ہو جائے کہ کسی بھی پکارنے والے کا جواب نہ دے اس وقت تک محبت کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں"۔

ایرانی

من چہ گویم یک رَگَم هُشیار نیست

شَرحِ آن یاری کہ اورا یار نیست

پاکستانی

من چگویم یک رَگم ہُشیار نیست
شَرحِ آں یاریکہ انرا یار نیست

من چِگُویَم: میں کیا بیان کروں۔۔۔ یک رگم: میری ایک رگ۔۔۔ ہشیار نیست: ہوش میں نہیں۔۔۔ یار: پہلے کا معنی محبوب۔ دوسرے کا معنی شریک، نظیر۔

ترجمہ: میری تو ایک رگ بھی ہوش میں نہیں تو میں اس محبوب حقیقی کا تفصیلی ذکر کیونکر سناؤں جس کا کوئی شریک نہیں۔

یعنی پہلے عذر کرتے آئے ہیں کہ میں ہوش میں نہیں۔ تو مرشد کی مدح اور اسکے انعام کی تفصیل کیا کروں؟

پچھلے شعر میں ذکر کیا گیا تھا کہ مرشد کی عطا سے مراد وجود کی وحدت کے اسرار ہیں جن میں خدائی کمالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

ہوش میں نہ ہونا ایک کیفیت ہے جسے جذب کہتے ہیں۔

جذب و سلوک کیا ہے؟

جذب کا معنی

جذب کا معنی کشش (attraction) ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا بندے کو اپنی طرف کھینچ لینا۔ مجذوب وہ ہے جس پر اللہ کی طرف سے ایسا جذبہ طاری ہو جائے کہ بلا کسب و مجاہدہ محض اللہ کے فضل سے اس کے باطنی مقامات طے ہو جائیں اور واصل باللہ ہو جائے لیکن بقابعد الفنا کے مرتبے تک نہ پہنچ سکے۔

جذبہ)عربی :مشاعر، انگریزی (Emotion :اردو میں عربی سے ماخوذ لفظ ہے جس کے معنی کشش، کھنچاؤ کے ہیں۔ جذبات جمع ہے جذبہ کی اور جذبہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بیرونی عوامل انسانی شعور کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اس کو ہم ایک مثال سے واضح کر دیتے ہیں مثلاً عشق ایک جذبہ ہے یہ اس وقت تک اپنا صحیح اثر نہیں دکھا سکتا جب تک کہ یہ انسانی شعور کو اپنے اندر جذب نہ کر لے، جذبات کسی قاعدے اور قانون کے پابند نہیں ہوتے کیونکہ قواعد و قوانین کا تعلق انسانی شعور سے ہے جبکہ جذبات اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتے جب تک کہ یہ انسانی شعور کو اپنے اندر جذب نہ کر لیں، جذبات بہت کم مواقع پر سومند ثابت ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل دانش عموماً جذبات سے پرہیز ہی کرتے ہیں۔

اقسام جذبہ

جذبہ کی دو قسمیں ہیں

جذبہ صوری

وہ جذبہ جو سیر فی اللہ سے قبل ابتدائے سلوک میں تصفیہ لطائف سے پہلے حاصل ہوتا ہے اور صرف تسہیل منازل سلوک کے لیے عطا کیا جاتا ہے اس کو جذبہ صوری کہتے ہیں اس کو جذبہ بدایت یا جذبہ اولیٰ بھی کہا جاتا ہے۔

جذبہ حقیقی

وہ جذبہ جو سیر فی اللہ کے دوران انتہائے سلوک میں حاصل ہوتا ہے اس کو جذبہ حقیقی کہتے ہیں اس کو جذبہ نہایت یا جذبہ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ جذبہ حقیقی بلا امتیاز تمام سلاسل طریقت میں موجود ہے۔

ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات،فتعرضوا لہ لعلہ ان یصیبکم نفحۃ منھا فلا تشقون بعدھا ابدا ۔

اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے زمانے ہی کے دنوں میں نفحات آتے ہیں، ان کو تم تلاش کرو، اگر ان کو پا گئے تو اس کے بعد تم کبھی بد نصیب نہیں ہو گے۔ تمہاری شقاوتِ ازلی سعادتِ ابدی سے تبدیل ہو جائے گی یعنی دائمی خوش نصیبی نصیب ہو جائے گی۔ نفحات کے کیا معنیٰ ہیں؟ دیہاتی زبان میں اس کا ترجمہ ہے:”اللہ پاک کی رحمت کی ہواؤں کے جھونکے“اور ”شہری زبان میں اللہ تعالیٰ کی نسیم کرم“ اور بزبان محدث عظیم ملا علی قاری رحمہ اللہ شرح مشکوٰۃ میں نفحات کے معنیٰ ہیں:”جذبات “یعنی اللہ کی جذب کرنے کی تجلیات۔ ”

اللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ"۔

(الشوریٰ:13)

یہاں وہ جذبات مراد ہیں۔ یہ حدیث اس آیت کی شرح ہے۔

"الاجتباء من الجبی والجبی ھو الجذب" جبی کے معنیٰ "جذب" کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، مقناطیس کا خالق ہے۔ جو اتنا زبردست مقناطیس پیدا کر سکتا ہے کہ زمین کا چوبیس ہزار میل کا گولہ جس کے نیچے کوئی کالم نہیں فضاؤں میں معلق ہے۔

ارض و سماء کیسے ہیں معلق کوئی ستوں ہے اور نہ کوئی تھم

سارا عالم ہے بے کالم واہ رے میرے رب العالم

اسی طرح بے شمار عالم سیارات و نجوم اور ہزاروں شمس و قمر سب بلا ستون فضاؤں میں معلق ہیں اور اپنے راستوں میں تیر رہے ہیں۔ تو اتنا زبردست مقناطیس پیدا کرنے والا جس کو کھینچے گا وہ کیسے بغیر کھنچے رہ سکتا ہے۔ بندے کو جذب کرنا ان کے لیے کیا مشکل ہے۔ تو نفحات کے معنی ہیں: جذبات یعنی کھینچنے کی مقناطیسی لہریں۔ التجلیات المقربات۔ اللہ کی وہ تجلیات جو بندوں کو اللہ سے قریب کر دیتی ہیں۔ وہ تجلیات جو بندہ پر پڑ جائیں تو وہ اللہ کا پیارا اور مقرب ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ان تجلیات کا زمانہ تو معلوم ہو گیا، لیکن مکان بھی تو معلوم ہو کہ ان تجلیات کو کہاں ڈھونڈیں، کدھر جائیں؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے میرے قلب کو عطا فرمایا کہ ان کا مکان بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ "ھم الجلساء لا یشقیٰ جلیسھم" ہمارے پیارے اور خاص بندوں کی یعنی ہمارے اولیاء کی شان یہ ہے کہ جو ان کے پاس بیٹھ جاتا ہے، جو ان کا جلیس و ہم نشین ہوتا ہے کبھی شقی اور بدنصیب نہیں رہ سکتا، اپنے پیاروں کے صدقہ میں ہم اس کی شقاوت کو سعادت سے بدل دیتے ہیں، شقی کو سعید کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اہل اللہ کی صحبت اور مجالس ان تجلیات کا مکان ہیں۔ شقاوت کو دور کرنے کے لیے اور سعادت دائمی حاصل کرنے کے لیے اہل اللہ کی صحبت میں یہ ہوائیں ملتی ہیں جہاں یہ تجلیات نازل ہوتی ہیں۔

(مواہب ربانیہ ص 361 تا 363)

سلوک کا معنی

سلوک کا معنی ہے راستہ (usage) یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب اور وصل کے راستے پر چلنا۔ سالک وہ ہے جو قرب حق کے راستوں اور طریقت کی منزلوں کو مجاہدات و ریاضات اور اتباع سنت و شریعت کے ذریعے طے کر کے مقصود تک پہنچے۔ {تصوف} طلب قرب حق، فنائے بشریت اور بقائے الوہیت، حق تعالیٰ کا قرب چاہنا۔

طریق سلوک

سالکین کو کبھی وصول الی اللہ پہلے حاصل ہوتا ہے پھر شوق عبادت اور ذوق ریاضت اس کے بعد پیدا ہوتا ہے اس کو طریق جذب کہتے ہیں اور کبھی مجاہدہ و ریاضت کا شوق پہلے پیدا ہو جاتا ہے اور وصول الی اللہ بعد میں میسر ہوتا ہے اس کو طریق سلوک کہتے ہیں۔

نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ کو ذوقِ عریانی

کوئی کھینچے لیے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

ایک تابعی جن کا نام زاذان ہے۔ یہ پہلے لکڑی بجابجا کر گانا گاتے تھے مگر آواز غضب کی تھی۔ ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت عبد اللہ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس طرف سے گزرے تو یہ لکڑی بجابجا کر گا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا مَا اَحْسَنَ هٰذَا الصَّوْتَ کیا ہی اچھی آواز ہے! کاش کہ اس آواز سے یہ قرآن پڑھتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آواز اس کے کانوں تک پہنچادی جب کہ تماشائیوں کا مجمع لگا ہوا تھا اور واہ واہ مرحبا مرحبا کے نعرے بلند ہو رہے تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے تو خود راستے کھول دیتا ہے۔

سُن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں

گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

بس آواز کا پہنچنا تھا کہ انہوں نے گانا چھوڑ کر پوچھا کہ مَنْ ھٰذَا یہ کون ہے۔ تماشائیوں نے کہا ھٰذَا صَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰہِ یہ اللہ کے رسول کے ساتھی ہیں۔ یہ ہے صحبت کا مقام۔ ساتھ رہنے سے یہ انعام ملتا ہے، صحابہ کا لفظ قرآن و حدیث میں ہمیشہ باقی رہے گا اور صحبت کی اہمیت کو ظاہر کرتا رہے گا۔ جو بنا ہے صحبت سے بنا ہے۔ نبی کا صحبت یافتہ صحابی ہوتا ہے، صحابی کی صحبت اٹھانے والا تابعی اور تابعی کی صحبت اٹھانے والا تبع تابعی۔ اتنی اہمیت تھی صحبت کی کہ لوگ صحابہ کو دیکھ کر کہتے تھے ھٰذَا صَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰہِ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں۔ جو اللہ والوں کے ساتھ رہتا ہے سنتِ صحابہ ادا کر رہا ہے۔

پوچھا کہ ان کا کیا نام ہے؟ بتایا عبد اللہ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ پوچھا اَیْشَ قَالَ انہوں نے کیا کہا؟ تماشائیوں نے بتایا کہ انہوں نے فرمایا کہ کاش اس پیاری آواز سے یہ قرآن شریف کی تلاوت کرتا، بس یہ سننا تھا کہ

جی اٹھے مردے تری آواز سے

اسی وقت لکڑی توڑی اور عبد اللہ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قدموں میں آگئے اور قدموں سے لپٹ کر رونے لگے اور عبد اللہ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی رونے لگے۔ کسی نے عرض کیا کہ آپ کیوں روتے ہیں فرمایا کہ جس گناہ گار نے توبہ کرلی وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے:

اَلتَّائِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ (المغنی عن حمل الاسفار، کتاب التوبۃ)

اللہ کا محبوب اور دوست روئے اور میں نہ روؤں اور جس سے اللہ محبت کرے اس سے میں محبت نہ کروں! پھر یہ حضرت عبد اللہ ابنِ مسعود کی خدمت میں رہ پڑے اور بہت بڑے عالم اور اللہ والے ہوئے۔ ذرا سی دیر میں دل کا رخ بدل جاتا ہے

جوش میں آئے جو دریا رحم کا
گبر صد سالہ ہو فخر اولیاء

جب اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں جوش آتا ہے تو سو برس کا کافر ولی اللہ نہیں ہوتا سیکنڈوں میں فخر اولیاء بن جاتا ہے۔ ہندوستان کا ایک کافر اپنے بُت کے سامنے نوے سال سے صنم صنم کہہ رہا تھا ایک دن اچانک غلطی سے منہ سے صمد نکل گیا۔ صمد اللہ کا نام ہے جس کی تفسیر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فرمائی ہے کہ

صمد کے معنیٰ ہیں اَلْمُسْتَغْنِیْ عَنْ کُلِّ اَحَدٍ وَالْمُحْتَاجُ اِلَیْہِ کُلُّ اَحَدٍ

(روح المعانی:30/274 ،الاخلاص(2)،داراحیاءالتراث، بیروت)

صمد وہ ذات ہے جو سارے عالم سے بے نیاز ہو، کسی کا محتاج نہ ہو اور سارا عالم اس کا محتاج ہو۔ بس منہ سے صمد کا نکلنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَبَّیْکَ میں تو حاضر ہوں اے بندے۔ اس کافر نے اسی وقت ڈنڈے مار مار کر بت کو توڑ دیا اور کلمہ پڑھا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اور ہندوؤں سے کہا کہ ظالمو! نوے سال کا کافر ہوں، نوے سال تک اس بت کو پکارا لیکن کوئی جواب نہیں آیا، آج غلطی سے مسلمانوں کے خدا کا نام منہ سے نکل گیا تو آسمان سے فوراً آواز آگئی لَبَّیْکَ اے میرے بندے میں تو حاضر ہوں تو ہی مجھ کو چھوڑ کر پتھروں کو پکار رہا ہے جو اندھے گونگے بہرے ہیں۔

تو مولانا رومؒ اسی جذبہ و سلوک کی بات اس شعر میں فرما رہے ہیں۔

ایرانی

شَرحِ ایں ھجُران واین خونِ جگَر

این زمانُ بگُذار تاوَقتِ دِگر

پاکستانی

شَرحِ این ہجُراں وایں خونِ جگَر

اِین زَماں بُگذار تاوَقتِ دِگر

ہجر: فراق۔۔۔خون جگر: سخت محنت و کاوش، رنج اٹھانا۔۔۔ایں زماں: یہ وقت۔۔۔ بگزار: ڈال، ملتوی کر۔۔۔ تاوقت دیگر: دوسرے وقت تک

ترجمہ: اس ہجر و فراق اور خون جگر پلانے والی شرح عشق کو اب دوسرے وقت تک موئخر رکھو۔

ہجر سے تاب (طاقت، روشنی و برداشت) اور خونِ جگر اتحاد کا راز ہے کیونکہ اتحاد کی فتح کے ساتھ ہی عشقِ الٰہی ظاہر ہوا، پھر یہی محبت صوفی کے جگر کو لہولہان کر دیتی ہے اور وہ مرحلہ آئے گا جب صبر و تحمل سے کام نہیں چلے گا۔ اور سالک مسلسل روحانی فضیلت اور ترقی کا متلاشی رہتا ہے، اپنے دوست اور محبوب کی ہجرت اور جدائی کو ختم کرنا اس پر منحصر ہے، لہٰذا خونِ جگر سے رازِ الٰہی کی تشریح صحیح اور مناسب تشریح ہے۔

جناب رومیؒ اب بھی شمس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتے اور حسام الدین چلبی سے کہتے ہیں کہ وہ شمس کے بارے میں بات کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دے اور وہ جواب دینے سے گریز کرتے ہیں۔

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چوں عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں (خسرو)

ہجر عربی زبان کا لفظ ہے

اسے اردو ادب خصوصاً شاعری میں محبوب سے جدائی کے معنوں میں بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے لیے برہ کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے انگریزی زبان میں Separation یا Detachment کہا جاتا ہے۔ ہجر کا متضاد وصال ہے۔

ہجر اچھا ہے نہ وصلِ وصال اچھا ہے

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے (تسکین)

ایک اور شاعر نے منظر کچھ یوں کھینچا

ہجر و وصالِ یار کا موسم نکل گیا

اے دردِ عشق! جاگ، زمانہ بدل گیا

کب تک یہ روزِ حشر سن اے شامِ انتظار

کیارات اب نہ آئے گی سورج تو ڈھل گیا

اب کے کہاں سے آئے ہو ساون کے بادلو

دیکھو تو سارا باغ ہی برکھا سے جل گیا

جاؤں کہاں، کہ تاب نہیں عرضِ نغمہ کی

پانی میں آگ لگ گئی، پتھر پگھل گیا

ساتوں سُروں کے راگ سے جلتی ہے دل کی آگ

بادِ فنا میں بھی مرا شعلہ سنبھل گیا

اُس کی صدا سے راگ نکالے شہاب نے

اک شب لگی وہ آگ کہ نادان جل گیا

(شہاب جعفری)

یہاں مولانا جامیؒ سے بھی ذرا پوچھ لیتے ہیں کہ یہ کیفیت کیا ہے؟

فرماتے ہیں:

تنم فرسودہ جاں پارہ، ز ہجراں، یارسول اللہ

دِلم پژمردہ آوارہ، زِ عصیاں، یارسول اللہ

(یارسول اللہ آپ کی جدائی میں میرا جسم بے کار اور جاں پارہ پارہ ہو گئی ہے۔ گناہوں کی وجہ سے دل نیم مردہ اور آورہ ہو گیا ہے)

چوں سوئے من گذر آری، منِ مسکیں زِ ناداری

فدائے نقشِ نعلینت، کنم جاں، یارسول اللہ

(یارسول اللہ اگر کبھی آپ میرے جانب قدم رنجہ فرمائیں تو میں غریب وناتواں۔ آپ کی جوتیوں کے نشان پر جان قربان کر دوں۔)

ز جام حب تو مستم، باز نجیر تو دل بستم

نمی گویم کہ من بستم سخن دا، یارسول اللہ

(آپ کی محبت کا جام پی چکاہوں، آپ کی عشق کی زنجیر میں بندھاہوں۔ پھر بھی میں نہیں کہتا کہ عشق کی زبان سے شناساہوں، یا رسول اللہ)

زِ کردہ خویش حیرانم، سیہ شُد روزِ عصیانم

پشیمانم، پشیمانم، پشیماں، یارسول اللہ

(میں اپنے کیے پر حیران ہوں اور گناہوں سے سیاہ ہو چکاہوں۔ پشیمانی اور شرمندگی سے پانی پانی ہو رہاہوں، یارسول اللہ)

چوں بازوئے شفاعت را، کُشائی بر گنہ گاراں

مکُن محروم جامی را، درا آں، یارسول اللہ

(روز محشر جب آپ شفاعت کا بازو گناہ گاروں کے لیے کھولیں گے۔ یارسول اللہ اُس وقت جامی کو محروم نہ رکھیے گا)

طب میں بھی جگر کی کیفیات ہیں:

ہمارے ہاں جگر کی دو قسمیں ہیں۔

سفید جگر اور کالا جگر

سفید جگر سے مراد پھیپھڑے ہیں اور کالا جگر جگر ہے۔

ایک بہت ہی دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگوں کی ذہنی کیفیت کا ان کے جگر سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

وہ لوگ جو لاوارث ہیں اور ان کے ساتھ محبت نہیں کی جاتی ہے۔ ان کے جگر کو نقصان پہنچا ہے۔

جو لوگ بہت گہری محبت اور دوستی رکھتے ہیں یا فن اور نرمی کے لوگ ہیں اور کمزور جذبہ رکھتے ہیں ان کا جگر زیادہ کمزور ہوتا ہے۔

یہاں تک کہ نقصان جگر کی ظاہری شکل کو متاثر کرتا ہے اور جگر جسمانی طور پر بدل جاتا ہے۔ مثلاً اس میں چھالے پڑ جاتے ہیں یا اس پر غدود جمع ہو جاتا ہے یا جگر کی شکل بدل جاتی ہے۔ ایک کام جو نفسیاتی، جارحانہ اور بد اخلاق لوگ کر سکتے ہیں وہ ہے جگر کو ٹھنڈا کرنا۔ ٹھنڈا نمکین پانی جگر کو ٹھنڈا کرتا ہے اور انسان کو نیک فطرت بناتا ہے اور پاؤں یا ہتھیلیوں کے تلووں سے سیاہ، منفی اور گرم توانائیوں کو دور کرنے میں مدد کرتا ہے۔ چنانچہ جب لوگ بہت پیاسے اور سحر زدہ ہوتے ہیں تو ان کے دل میں جلن ہوتی ہے اور یہ نفسیاتی کیفیت جسمانی طور پر جگر کو متاثر کرتی ہے۔

ایرانی

قالَ اَطْعِمْنی فَاِنّی جائِعُ

وَاعْتَجِلْ فَالْوَقْتُ سَیْفٌ قاطِعُ

پاکستانی

قالَ اَطْعِمْنی فَاِنّی جائِع"

فَاعْتَجِلْ فَالْوَقْتُ سَیْفٌ قاطِع"

قال: کہا، فرمایا۔۔۔ اطعمنی: مجھے کھلائے۔۔۔ جائع: بھوکا۔۔۔ اعتجل: عجلت کر۔۔۔ سیف قاطع: کاٹنے والی تلوار

ترجمہ: روح بولی۔ مجھے (سر وحدت کی) غذا دے کیونکہ میں (اسرار کے سننے کی) بھوکی ہوں تو اب جلدی کر۔ کیونکہ وقت کاٹنے والی تیز تلوار کی طرح گذرا جارہا ہے۔

شاعر کی روح اصرار سے کہتی ہے: یہ راز بتاؤ کیونکہ یہ میرا کھانا ہے اور میں بھوکا ہوں، جلدی کرو کیونکہ وقت تیز تلوار کی طرح تیزی سے گزر جاتا ہے۔ وقت کو غنیمت سمجھ کر اس کا حق، الٰہی راز بتا کر ادا کرو۔ میری گزارش بس یہ ہے۔

یہاں حسام الدین چلبی جو کہ دولسانی بھی تھے پرجوش ہو گئے اور عربی میں بولنا شروع کر دیا۔

یہ مکالمہ دو لوگوں کے درمیان ہوتا ہے جن میں سے ایک معلومات رکھتا ہے اور دوسرا علم کا پیاسا ہے۔

جب بھی آپ پیاس کی اس سطح پر پہنچیں گے، آپ اچھا علم حاصل کر سکتے ہیں۔ کوئی شخص روحانی طرز عمل میں پیاسا ہونے سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب برتن بیداری سے بھر جاتے ہیں۔

حسام الدینؒ جناب رومیؒ سے یہاں کہتے ہیں: میں پیاسا اور بھوکا ہوں۔ جلدی کریں اور مجھے شمس کے بارے میں بتائیں۔

وقت میرے لیے جیتی ہوئی تلوار کی طرح ہے (یعنی میری زندگی تیزی سے گزر رہی ہے)

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کائنات کے رازوں میں سے کسی ایک کو سمجھنا چاہتے ہیں یا آپ کسی علم سے واقف ہیں اور آپ اسے سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ جب آپ جذبے کی وجہ سے سو نہیں پاتے اور وقت آپ کا قاتل بن جاتا ہے۔

اس معاملے میں، پروفیسر آپ کو جواب دے یا نہ دے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن یہ جذبہ آپ کو جواب دے گا!

اگر آپ اتنے پرجوش ہیں کہ آپ سو نہیں سکے اور جوش کی وجہ سے آنکھیں بند کرلیں تو یہ کیفیت یقینی طور پر ہوش میں ہی ختم ہو جائے گی۔

اسلامی نظریہ کے مطابق دن، مہینے اور سال، سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں اس لئے نہ کوئی دن، نہ مہینہ اور نہ سال اپنی ہیئت میں منحوس ہوتا ہے نہ مبارک ہوتا ہے۔ سب کے اچھے یا برے ہونے میں خدا کے حکم اور انسانی اعمال کا دخل ہے۔ اس بارے میں کسی کو کوئی وہم نہیں ہونا چاہئے جو کچھ سعد یا قبیح پیش آتا ہے، پہلے سے مقدر ہو جاتا ہے، اِسی لئے اسلام نے تمام واہموں کی نفی کی ہے اور انسانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ اچھا عمل کرو اور رحمتِ خداوندی سے مایوس نہ ہو، مصیبت آئے تو صبر کرو اور اپنے مالکِ حقیقی سے دعا کرو کہ ناخوشگوار دن جلد دور ہو جائیں، راحت ملے تو شکر بجالاؤ، انسان کے ساتھ قضا و قدر لگے ہوئے ہیں، دکھ اور سکھ سب انسانوں کے لئے ہیں اور ان کو عمل کی طاقت عطا کر کے اپنی زندگی کو اچھا یا برا بنانے کا مجاز بنا دیا گیا ہے۔

بقول مولانا شبیر احمد عثمانی:

” انسان کا اِس سے بڑھ کر نقصان کیا ہوگا کہ برف بیچنے والے دکاندار کی طرح اس کی تجارت کا راس المال جسے ”عمر عزیز“ کہتے ہیں دم بدم کم ہوتا جارہا ہے، اگر اس رواروی میں انسان نے کوئی اچھا کام نہ کر لیا، جس سے کہ یہ عمر رفتہ ٹھکانے لگ جائے اور ایک ابدی اور غیر فانی متاع بن کر ہمیشہ کے لئے کارآمد بن جائے تو پھر خسارہ کی کوئی انتہا نہیں۔ زمانہ کی تاریخ پڑھو اور خود

اپنی زندگی کے واقعات پر غور کرو تو ثابت ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے انجام بینی سے کام نہ لیا اور مستقبل سے بے پرواہ ہو کر محض خالی لذتوں میں وقت گزار دیا وہ آخر کار ناکام ونامراد بلکہ تباہ وبرباد ہو کر رہ گئے۔ آدمی کو چاہئے کہ وقت کی قدر پہچانے اور عمر عزیز کے لمحات کو یونہی غفلت وشرارت یالہوولعب میں نہ گنوادے، جو اوقات، تحصیل شرف ومجد اور اکتسابِ فضل وکمال کی گرم بازاری کے ہیں، اگر غفلت ونسیان میں گزار دیئے گئے تو سمجھو کہ اس سے بڑھ کر آدمی کا کوئی خسارہ نہیں۔ بس خوش نصیب اور اقبال مند انسان وہی ہیں جو اِس عمر فانی کو باقی اور ناکارہ زندگی کو کارآمد بنانے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں—"۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (18) (النحل)

اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انہیں شمار نہیں کر سکو گے، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں اللہ رب العالمین نے انسان کو احساس دلایا ہے کہ اس کی نعمتیں لاتعداد ہیں تم ان کو شمار نہیں کر سکتے لہذا جو نعمتیں انسان کو دی گئی ہیں ان کی حفاظت کرنا اس کی ذمہ داری ہے، اسلیے کہ آخرت میں ان نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (8) (التکاثر)

ان نعمتوں میں سب سے عظیم نعمت وقت ہے۔ یہ ایک ایسی نعمت ہے جو تمام انسانوں یکساں دی گئی ہے۔ یہ امیر غریب، عالم جاہل، بادشاہ فقیر سب کے پاس برابر ہے۔

بعض علمانے فرمایا "**الوقت هو الحياة**" یعنی وقت ہی زندگی ہے۔ قرآن مجید میں وقت کو مختلف اوقات میں تقسیم کیا گیا ہے جس کا ایک بڑا مقصد اہل ایمان کو وقت کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے اوقات کو منصوبہ بندی کے تحت گزارنے کی تعلیم دی ہے۔ اسی طرح اللہ رب العالمین نے جو عبادات فرض کی ہیں انہیں معین وقت میں ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم صرف ارکان اسلام پر نظر دوڑاتے ہیں۔

نماز۔ پنج وقتہ نمازیں مخصوص اوقات میں فرض کی گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مؤمنین پر مقررہ وقت میں نماز فرض کی گئی ہیں۔(النساء103)

زکوٰۃ۔ صاحب نصاب پر ایک معین وقت گزرنے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی فرض کی گئی ہے۔

روزہ۔ سال میں ایک دفعہ ماہ رمضان کے روزے فرض کیے گئے ہیں۔

حج۔ حج کا فریضہ بھی ذالحجہ کی 7،8،9 تاریخوں میں ادا کیا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے قول اور عمل کے ذریعے اپنی امت کو وقت کی حفاظت کا درس دیا ہے۔ امام ابو داوَدؒ جن کی سنن ابو داوَد صحاح ستہ میں شامل ہے، انہوں نے اپنی سنن سے اسلامی زندگی کے دستور کی جامعیت پر بطور نمونہ چار احادیث کا انتخاب کیا ہے۔ ان چار احادیث میں ایک حدیث یہ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا

مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ۔ «

اسی طرح آپ ﷺ نے پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے قبل غنیمت جاننے کی تعلیم دی ہے ان میں سے ایک فراغت کو مشغولیت سے پہلے غنیمت سمجھنا ہے۔

امام بخاریؒ نے کتاب الرقاق میں اور امام ترمذی نے کتاب الزہد میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ غفلت برتتے ہیں۔ ایک صحت دوسری فراغت۔

علامہ سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر روز صبح کو جب آفتاب طلوع ہوتا تو اس دن یہ اعلان کرتا ہے، جو نیک عمل کرنے کی استطاعت رکھتا ہے وہ نیک عمل کرلے میں پھر کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے ہمیں بامقصد زندگی گزارنے کا سبق ملتا ہے

اسی طرح اگر ہم صحابہؓ کی زندگی پر نظر دوڑائیں تو وہاں بھی ہمیں اپنے اوقات کے محافظ نظر آئیں گے اور اپنے رب سے اپنے اوقات میں برکت کی دعائیں کرتے ہوئیں نظر آئیں گے۔

حضرت عمرؓ یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ ہم تجھ سے زندگی کے لمحات کی بہتری اور اوقات میں برکت کا سوال کرتے ہیں.

حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے: یہ ایام تمہاری عمروں کے صحیفے ہیں اچھے اعمال سے ان کو دوام دو۔

حقیقت یہ کہ دنیامین آج تک بڑے کارنامے انہی شخصیات نے انجام دیئے ہیں جو اپنے وقت کے قدردان تھے۔

علامہ ابن جوزیؒ ابو الوفا عقیل کے بارے میں کہا ہے کہ اللہ کے اس بندے نے اس (80) فنون کے بارے میں کتابیں لکھیں، ان کی ایک کتاب آٹھ سو جلدوں میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ دنیا میں لکھی جانے والی کتابوں میں یہ سب سے بڑی کتاب ہے۔ خود علامہ ابن جوزی نے ؒ اسلامی فنون میں تقریباً ہر فن میں کتابیں لکھیں۔ ان کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ

جب ان کی وفات ہوئی تو ان ان کو غسل دینے کے لیے وہ برادہ ہی کافی تھا جو صرف احادیث لکھتے ہوئے قلم تراشنے میں جمع ہو گیا تھا۔

ہمارے اسلاف کی زندگی سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ ہم بھی اپنے وقت کی قدر کریں جب ہم اپنے وقت کی قدر کریں گے۔ اللہ رب العالمین ہمیں دنیا اور آخرت میں کامیاب کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں وقت کا قدر داں بنائے۔ آمین

اسی روز شب میں الجھ کر نہ رہ جا

کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

واقعہ یہ ہے کہ انسان کا اصل سرمایہ اس کا وقت ہی ہے اور دنیا حقیقت میں عمل کرنے کی جگہ ہے۔ جو شخص یہاں جیسا عمل کرے گا، جو کمائے گا موت کے بعد آخرت کی زندگی میں اس کو ویسا ہی بدلہ ملے گا۔ اسی لئے بزرگوں کا قول ہے کہ ''وقت کی قدر ہر سعادت و برکت کا دروازہ کھولتی ہے اور اس کی ناقدری پریشانیوں اور ناکامیوں کو دعوت دیتی ہے''۔

مولانا رومؒ اسی بھوک اور غذا کی بات کر رہے ہیں کہ جس سے طلب مراد بھر آئے۔ اور روح کی کیفیت اضطراب کا علاج گوناں گو ہو جائے۔

ایرانی

صوفی اِبْنُ الْوَقت باشد ای رَفیق

نیست فردا گفتن از شَرطِ طَریق

پاکستانی

صوفی اِبنُ الوَقت باشد اے رَفیق
نیست فردا گُفتن از شَرطِ طَریق

الفاظ کے معانی؛

صوفی

الصوفی من لبس الصوف علی الصفا واذاق الھویٰ طعم الجفا ولزم طرق المصطفیٰ و کانت الدنیا منه علی القفاء

”صوفی وہ ہے جو قلب کی صفائی کے ساتھ صوف پوش (سادہ لباس) ہو اور نفسانی خواہشات کو (زہد کی) سختی دیتا ہو اور شریعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو لازم پکڑتا ہو اور دنیا کو پس پشت (غیر مقصود) ڈال دیتا ہو۔“

ابن الوقت

صوفی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک مغلوب الحال کہ ان پر جو حالت و کیفیت وارد ہوتی ہے اس میں مگلوب ہا جاتے ہیں۔ اظہار سرہ، وقوع خوارق، مخالفت احکام ظاہری ان سے ممکن ہوتا ہے۔ ایسے صفیاء کو ابن الوقت کہتے ہیں۔ (اصطلاح صوفیاء)

باشد اے رفیق: رہنے دو، میرے دوست۔۔۔ نیست فردا گفتن: کل کوئی بتانے والا نہیں۔ شرط طریق: طریقت و سلوک کا راستہ

ترجمہ:

اے دوست! صوفی تو ابن الوقت (یعنی وقت کے موافق کام کرنے والا) ہوتا ہے۔ (آج کا کام) کل پر ڈالنا شرط طریقت نہیں۔ یعنی جو کام وقت پر کیا جائے وہی غنیمت ہے۔

اس شعر میں صوفی اور ابن الوقت دو اصطلاحات ہیں۔ ان پر روشنی ڈلنے سے پہلے قرآن کریم کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ مومن و مسلم کے لئے باطنی صفات و خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن و سنت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن وحدیث میں مؤمنین کو مخاطب کرنے والے الفاظ

قرآن وحدیث میں مؤمنین کو مخاطب کرنے کے لیے کئی الفاظ (باطنی صفات وخصوصیات) استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً:
(1) ذاکرین (2) صابرین (3) خاشعین (4) صادقین (5) قانتین (6) موقنین (7) مخلصین (8) محسنین (9) خائفین (10) وجلین (11) عابدین (12) متوکلین (13) متقین (14) مقربین (15) ابرار (16) فقراء (17) عباد (18) اولیاء۔
[تفصیلی دلائل نیچے ملاحظہ فرمائیں]

امام حاکمؒ نے فرمایا: "رسول اللہ ﷺ نے اس گروہ کو اسی کے ساتھ بیان کیا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان صفات (خصوصیات) والے گروہوں میں سے مخصوص کیا ہے۔ لہٰذا جس میں یہ صفات پائی جائیں وہ اس نام تصوف کا مستحق ہے۔

حوالہ

قال الحاكم: «وقد وصف رسول الله صلى الله عليه وسلم هذه الطائفة بما خصهم الله تعالى به من بين الطوائف بصفات فمن وجدت فيه تلك الصفات استحق بها اسم التصوف»
[المستدرک علی الصحیحین للحاکم (م405ھ)- ط العلمية: حدیث نمبر 4293]

(1) ذاکرین

(ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے)

حوالہ:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَا: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنِ اسْتَيْقَظَ مِنَ اللَّيْلِ وَأَيْقَظَ امْرَأَتَهُ فَصَلَّيَا رَكْعَتَيْنِ جَمِيعًا كُتِبَا مِنَ الذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ".

ترجمہ:

ابوسعید خدری اور ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو رات کو بیدار ہو اور اپنی بیوی کو جگائے پھر دونوں دو دو رکعتیں پڑھیں تو وہ کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مردوں اور ذکر کرنے والی عورتوں میں لکھے جائیں گے۔
[سنن ابن ماجه:1335، سنن أبي داود:1451]

القرآن:

اور (اے پیغمبر) دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو۔ یقینا نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ ایک ذکر (نصیحت) ہے ان لوگوں کے لیے جو ذاکرین (یعنی نصیحت یاد رکھنے ماننے والے) ہیں۔

[سورۃ ھود:114]

بیشک فرمانبردار مرد ہوں یا فرمانبردار عورتیں، مومن مرد ہوں یا مومن عورتیں، عبادت گزار مرد ہوں یا عبادت گزار عورتیں، سچے مرد ہوں یا سچی عورتیں، صابر مرد ہوں یا صابر عورتیں، دل سے جھکنے والے مرد ہوں یا دل سے جھکنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد ہوں یا صدقہ کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد ہوں یا روزہ دار عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد ہوں یا حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد ہوں یا ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور شاندار اجر تیار کر رکھا ہے۔

[سورۃ الاحزاب:35]

(2) صابرین

(اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمابرداری میں ہر مشکل و کٹھن دور سے گذر کر اس کی رضا و خشنودی حاصل کرنے والے)

حوالہ:

الصّٰبِرِينَ وَالصّٰدِقِينَ وَالقٰنِتِينَ وَالمُنفِقِينَ وَالمُستَغفِرِينَ بِالأَسحارِ {3:17}

ترجمہ:

یہ لوگ بڑے صبر کرنے والے ہیں، سچائی کے خوگر ہیں، عبادت گزار ہیں (اللہ کی خوشنودی کے لیے) خرچ کرنے والے ہیں، اور سحری کے اوقات میں استغفار کرتے رہتے ہیں۔

[سورۃ آل عمران:17]

(3) خاشعین

(عاجزی وانکساری کرنے والے)

حوالہ:

وَاستَعِينوا بِالصَّبرِ وَالصَّلوٰةِ وَإِنَّها لَكَبيرَةٌ إِلّا عَلَى الخٰشِعينَ {2:45}

ترجمہ:

اور صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو نماز بھاری ضرور معلوم ہوتی ہے مگر ان لوگوں کو نہیں جو خشوع (یعنی دھیان اور عاجزی سے پڑھنے) والے ہیں۔

[سورۃ البقرۃ:45]

(4) صادقین

(سچ بولنے والے)

حوالہ:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصّٰدِقِينَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ رَّضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ {5:119}

ترجمہ:

اللہ کہے گا کہ: یہ وہ دن ہے جس میں سچے لوگوں کو ان کا سچ فائدہ پہنچائے گا۔ ان کے لیے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، جن میں یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش ہے اور یہ اس سے خوش ہیں۔ یہی بڑی زبردست کامیابی ہے۔

[سورۃ المائدۃ:119]

يٰأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ {9:119}

ترجمہ:

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔

[سورۃ التوبۃ:119]

(5) قانتین

(اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے)

حوالہ:

حٰفِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلوٰةِ الْوُسْطىٰ وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ {2:238}

ترجمہ:

تمام نمازوں کا پورا خیال رکھو، اور (خاص طور پر) بیچ کی نماز کا، اور اللہ کے سامنے باادب فرمانبردار بن کر کھڑے ہوا کرو۔

[سورۃ البقرۃ:238]۔

الصّٰبِرِينَ وَالصّٰدِقِينَ وَالقٰنِتِينَ وَالمُنفِقِينَ وَالمُستَغفِرِينَ بِالأَسحارِ {3:17}

ترجمہ:

یہ لوگ بڑے صبر کرنے والے ہیں، سچائی کے خوگر ہیں، عبادت گزار ہیں (اللہ کی خوشنودی کے لیے) خرچ کرنے والے ہیں، اور سحری کے اوقات میں استغفار کرتے رہتے ہیں۔

[سورۃ آل عمران:17]

(6) موقنین

(اللہ تعالیٰ پر یقین و بھروسہ کرنے والے)

حوالہ:

قالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالأَرضِ وَما بَينَهُمَا إِن كُنتُم موقِنينَ {26:24}

ترجمہ:

موسیٰ نے کہا: وہ سارے آسمانوں اور زمین کا، اور ان ساری چیزوں کا پروردگار ہے جو ان کے درمیان پائی جاتی ہیں، اگر تم کو واقعی یقین کرنے والے ہو۔

[سورۃ الشوریٰ:26]

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالأَرضِ وَما بَينَهُمَا إِن كُنتُم موقِنينَ {44:7}

ترجمہ:

جو سارے آسمانوں اور زمین کا اور ان کے درمیان ہر چیز کا رب ہے، اگر تم واقعی یقین کرنے والے ہو۔

[سورۃ الدخان:7]

(7) مخلصین

(خالص اللہ ہی کی عبادت کرنے والے)

حوالہ:

إِلّا عِبادَكَ مِنهُمُ المُخلَصينَ

{38:83}{37:169}{37:160}{37:128}{37:74}{37:40}{15:40}

ترجمہ:

سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے تو نے اپنے لیے مخلص برگزیدہ بنالیا ہو۔ (ان پر شیطان کا زور نہیں چلتا)

[سورۃ الحجر:40، سورۃ الصافات:40،74،128،160،169، سورۃ ص:83]

(8) محسنین

(خوب اچھی طرح عبادت کرنے والے)

حوالہ:

فَآتاهُمُ اللَّهُ ثَوابَ الدُّنيا وَحُسنَ ثَوابِ الآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ المُحسِنينَ {3:148}

ترجمہ:

پھر دیا اللہ نے ان کو ثواب دنیا کا اور خوب ثواب آخرت کا اور اللہ محبت رکھتا ہے نیک کام کرنے والوں سے.

فَأَثابَهُمُ اللَّهُ بِما قالوا جَنّٰتٍ تَجري مِن تَحتِهَا الأَنهٰرُ خٰلِدينَ فيها ۚ وَذٰلِكَ جَزاءُ المُحسِنينَ {5:85}

ترجمہ:

پھر انکو بدلے میں دیے اللہ نے اس کہنے پر ایسے باغ کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی اور یہ ہے بدلا نیکی کرنے والوں کا

لَيسَ عَلَى الَّذينَ ءامَنوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُناحٌ فيما طَعِموا إِذا مَا اتَّقَوا وَءامَنوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوا وَءامَنوا ثُمَّ اتَّقَوا وَأَحسَنوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ المُحسِنينَ {5:93}

ترجمہ:

جو لوگ ایمان لائے اور کام نیک کئے ان پر گناہ نہیں اس میں جو کچھ پہلے کھا چکے جب کہ آئندہ کو ڈر گئے اور ایمان لائے اور عمل نیک کئے پھر ڈرتے رہے اور یقین کیا پھر ڈرتے رہے اور نیکی کی اور اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو.

وَلا تُفسِدوا فِي الأَرضِ بَعدَ إِصلٰحِها وَادعوهُ خَوفًا وَطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحمَتَ اللَّهِ قَريبٌ مِنَ المُحسِنينَ {7:56}

ترجمہ:

اور مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور پکارو اس کو ڈر اور توقع سے، بیشک اللہ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے۔

وَاصبِر فَإِنَّ اللَّهَ لا يُضيعُ أَجرَ المُحسِنينَ {11:115}

ترجمہ:

اور صبر کر البتہ اللہ ضائع نہیں کرتا ثواب نیکی کرنے والوں کا.

وَلَمّا بَلَغَ أَشُدَّهُ ءاتَينٰهُ حُكمًا وَعِلمًا ۚ وَكَذٰلِكَ نَجزِى المُحسِنينَ {12:22} {28:14}

ترجمہ:

اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو دیا ہم نے اسکو حکم اور علم، اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی والوں کو.

لَن يَنالَ اللَّهَ لُحومُها وَلا دِماؤُها وَلٰكِن يَنالُهُ التَّقوىٰ مِنكُم ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرَها لَكُم لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلىٰ ما هَدىٰكُم ۗ وَبَشِّرِ المُحسِنينَ {22:37}

ترجمہ:

اللہ کو نہیں پہنچتا اُن کا گوشت اور نہ اُن کا لہو لیکن اُسکو پہنچتا ہے تمہارے دل کا ادب، اسی طرح اُنکو بس میں کر دیا تمہارے کہ اللہ کی بڑائی پڑھو اس بات پر کہ تم کو راہ سجھائی اور بشارت سنا دے نیکی والوں کو.

(9) خائفین

(اللہ تعالیٰ کے غیض و غضب سے ڈرنے والے)

حوالہ:

اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ کی مسجدوں پر اس بات کی بندش لگا دے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے، اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان (مسجدوں) میں داخل ہوں سوائے خائفین (خوف رکھنے والوں) کے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور انہی کو آخرت میں زبردست عذاب ہو گا۔

[سورۃ البقرۃ:114]

عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ، صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "وَمَنْ قَرَأَ سُورَةَ الزُّمَرِ لَمْ يَقْطَعِ اللَّهُ رَجَاهُ، وَأَعْطَاهُ ثَوَابَ الْخَائِفِينَ الَّذِينَ خَافُوا اللَّهَ، عَزَّ وَجَلَّ".

ترجمہ:

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں: اور جو شخص پڑھے سورۃ الزمر ہرگز نہ توڑے گا اللہ امید اس کی، اور عطا کرے گا اسے ثواب خائفین کا جو خوف رکھتے ہیں اللہ عزوجل کا.

[الوسيط في تفسير القرآن المجيد » تفسير سورة الزمر... رقم الحديث:793]

(10)وجلین

(اللہ تعالیٰ کے ڈر خوف سے کپکپا جانے والے)

حوالہ:

مومن تو وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

[سورۃ الانفال:2]

(11)عابدین

(اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے)

القرآن :

(اے پیغمبر) کہہ دو کہ: اگر خدائے رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلا عبادت کرنے والا میں ہوتا۔

[سورۃ نمبر 43 الزخرف، آیت نمبر 81]

بیشک اس (قرآن) میں عبادت گزار لوگوں کے لیے کافی پیغام ہے۔

[سورۃ نمبر 21 الأنبياء، آیت نمبر 106]

اور ان سب کو ہم نے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، اور ہم نے وحی کے ذریعے انہیں نیکیاں کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی تھی، اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

[سورۃ نمبر 21 الأنبياء، آیت نمبر 73]

(12)متوکلین

(اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنے والے)

القرآن :

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے (ان سے) کہو کہ: "ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ تم اللہ کو چھوڑ کر جن (بتوں) کو پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ کر لے تو کیا یہ اس کے پہنچائے ہوئے نقصان کو دور کر سکتے ہیں؟ یا اگر اللہ مجھ پر مہربانی فرمانا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟" کہو کہ "میرے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ بھروسہ رکھنے والے اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔"

[سورۃ نمبر 39 الزمر، آیت نمبر 38]

اور آخر ہم کیوں اللہ پر بھروسہ نہ رکھیں، جبکہ اس نے ہمیں ان راستوں کی ہدایت دے دی ہے جن پر ہمیں چلنا ہے؟ اور تم نے ہمیں جو تکلیفیں پہنچائی ہیں، ان پر ہم یقیناً صبر کریں گے، اور جن لوگوں کو بھروسہ رکھنا ہو، انہیں اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

[سورۃ نمبر 14 ابراھیم ، آیت نمبر 12]

(13) متقین

(گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے پرہیز کرنے والے)

حوالہ:

القرآن:

یہ کتاب ایسی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں یہ ہدایت ہے ان ڈر رکھنے والوں کے لئے۔ جو بے دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے (اللہ کی خوشنودی کے کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔

[سورۃ نمبر 2 البقرۃ ، آیت نمبر 2-]

(14) مقربین / مقربون

(اللہ تعالیٰ کے وہ خاص بندے کہ جن کو قریب کیا گیا ہو)

القرآن :

اور جو سبقت لے جانے والے ہیں، وہ تو ہیں ہی سبقت لے جانے والے۔ وہی ہیں جو اللہ کے خاص مقرب بندے ہیں۔

[سورۃ نمبر 56 الواقعۃ ، آیت نمبر 10]

اس سے مراد انبیاء کرام اور وہ اعلیٰ درجے کے پاکباز حضرات ہیں جنہوں نے تقویٰ کا سب سے اونچا مقام پایا ہو گا۔

القرآن:

پھر اگر وہ (مرنے والا) اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہو۔ تو (اس کے لیے) آرام ہی آرام ہے، خوشبو ہی خوشبو ہے، اور نعمتوں سے بھرا باغ ہے۔

[سورۃ نمبر 56 الواقعۃ، آیت نمبر 88]

(15) ابرار

(اللہ تعالیٰ کے نیک بندے)

القرآن:

یقین رکھو کہ نیک لوگ یقیناً بڑی نعمتوں میں ہوں گے۔

[سورۃ نمبر 82 الإنفطار، آیت نمبر 13]

[سورۃ نمبر 83 المطففین، آیت نمبر 22]

القرآن:

خبردار! نیک لوگوں کا اعمال نامہ علیّین میں ہے۔

[سورۃ نمبر 83 المطففین، آیت نمبر 18]

علیین کے لفظی معنی بالا خانوں کے ہیں۔ یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں مومنوں کی روحیں مرنے کے بعد بھیجی جاتی ہیں اور وہیں پر ان کا اعمال نامہ بھی رہتا ہے۔

القرآن:

بیشک نیک لوگ ایسے جام سے مشروبات پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہو گی۔

[سورۃ نمبر 76 الانسان، آیت نمبر 5]

(16) فقراء

(اللہ تعالیٰ ہی کے بھکاری بندے)

القرآن:

(مالی امداد کے بطور خاص) مستحق وہ فقراء ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں اس طرح مقید کر رکھا ہے کہ وہ (معاش کی تلاش کے لیے) زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔ چونکہ وہ اتنے پاک دامن (حیاءدار) ہیں کہ کسی سے سوال نہیں کرتے، اس

لیے ناواقف آدمی انہیں مال دار سمجھتا ہے، تم ان کے چہرے کی علامتوں سے ان (کی اندرونی حالت) کو پہچان سکتے ہو (مگر) وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اور تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

[سورۃ نمبر 2 البقرۃ، آیت نمبر 273]

الحدیث:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، قَالَ: اشْتَكَى فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِينَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ عَلَيْهِمْ أَغْنِيَاءَهُمْ، فَقَالَ: «يَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ أَلَا أُبَشِّرُكُمْ أَنَّ فُقَرَاءَ الْمُؤْمِنِينَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ قَبْلَ أَغْنِيَائِهِمْ بِنِصْفِ يَوْمٍ، خَمْسِمِائَةِ عَامٍ»، ثُمَّ تَلَا مُوسَى هَذِهِ الْآيَةَ: {وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ} [الحج:47]

ترجمہ:

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ فقیر مہاجرین نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات کی شکایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالداروں کو ان پر فضیلت دی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے فقراء کی جماعت! کیا میں تم کو یہ خوشخبری نہ سنادوں کہ غریب مومن، مالدار مومن سے آدھا دن پہلے جنت میں داخل ہوں گے، (پانچ سو سال پہلے) پھر موسیٰ بن عبیدہ نے یہ آیت تلاوت کی: اور بیشک ایک دن تیرے رب کے نزدیک ایک ہزار سال کے برابر ہے جسے تم شمار کرتے ہو۔ [سورۃ الحج:۴۷]

[سنن ابن ماجه:4124، صحيح الجامع الصغير:7976]

[صحیح کنوز السنۃ النبویۃ: ص29]

(17) عباد

(اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرنے والے)

حوالہ:

یقین رکھو کہ جو میرے بندے ہیں، ان پر (اے ابلیس!) تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، سوائے ان گمراہ لوگوں کے جو تیرے پیچھے چلیں گے۔

[سورۃ نمبر 15 الحجر، آیت نمبر 42]

میرے جو بندے ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ وہ نماز قائم کریں، اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں سے پوشیدہ طور پر بھی اور علانیہ بھی (نیکی کے کاموں میں) خرچ کریں (اور یہ کام) اس دن کے آنے سے پہلے پہلے (کرلیں) جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی، نہ کوئی دوستی آئے گی۔

[سورۃ نمبر 14 ابراھیم ، آیت نمبر 31]

یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اس کو بنائیں گے جو متقی ہو۔

[سورۃ نمبر 19 مریم ، آیت نمبر 63]

میرے بندوں میں سے ایک جماعت یہ دعا کرتی تھی کہ: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں، پس ہمیں بخش دیجیے، اور ہم پر رحم فرمایے، اور آپ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والے ہیں۔

[سورۃ نمبر 23 المؤمنون ، آیت نمبر 109]

اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو (1) زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں (2) اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں۔ (3) اور جو راتیں اس طرح گزارتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے آگے (کبھی) سجدے میں ہوتے ہیں، اور (کبھی) قیام میں۔ (4) اور جو یہ کہتے ہیں کہ: ہمارے پروردگار! جہنم کے عذاب کو ہم سے دور رکھیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا عذاب وہ تباہی ہے جو چمٹ کر رہ جاتی ہے۔ یقیناوہ کسی کا مستقر اور قیام گاہ بننے کے لیے بدترین جگہ ہے۔ (5) اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط و تفریط) کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے۔ (6) اور جو اللہ کے ساتھ کسی بھی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے، (7) اور جس جان کو اللہ نے حرمت بخشی ہے، (8) اسے ناحق قتل نہیں کرتے، (9) اور نہ وہ زنا کرتے ہیں، (10) اور جو شخص بھی یہ کام کرے گا، اسے اپنے گناہ کے وبال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

[سورۃ نمبر 25 الفرقان، آیت نمبر 63-68]

القرآن:

یہ مشروبات ایک ایسے چشمے کے ہوں گے جو اللہ کے (نیک) بندوں کے پینے کے لیے مخصوص ہے، وہ اسے (جہاں چاہیں گے) آسانی سے بہا کر لے جائیں گے۔

[سورۃ نمبر 76 الانسان، آیت نمبر 6]

تفسیر:

اللہ تعالیٰ جنتیوں کو یہ اختیار عطا فرمائیں گے کہ وہ اس چشمے کو جہاں چاہیں لے جاسکیں گے، جس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اسی نہر کی شاخیں آسانی سے جہاں چاہیں نکال لیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جس جگہ چاہیں زمین سے وہ چشمہ جاری کر دیں۔

(18)اولیاء

(اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے)

حوالہ:

اللہ پاک نے فرمایا:

یادرکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں۔ جو ایمان لاتے اور (نافرمانی سے) پرہیز کرتے ہیں۔

[سورۃ یونس:62،63]

اللہ کے پیغمبر ﷺ نے فرمایا:

قرآن والے، اللہ والے اور اس کے خاص (بندے) ہیں۔

[ابن ماجہ:215]

جنہیں جب بھی دیکھو اللہ کا ذکر (باتیں) کرتے رہتے ہیں۔

[کتاب الأولیاء (امام) ابن ابی الدنیا: حدیث #15]

خبردار! اولیاء اللہ (وہ) نمازی ہوتے ہیں۔ جو 5 نمازیں قائم کرتا ہو جو اس پر فرض کی گئی ہیں، اور رمضان کے روزے رکھتا ہو، اور اپنے روزے پر ثواب کی امید رکھتا ہو، اور وہ یوں سمجھتا ہو کہ اس پر یہ حق ہے، اور زکوۃ ادا کرتا ہو اور اس پر ثواب کی امید رکھتا ہو، اور ان کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔۔۔

[حاکم:7666، طبرانی:101، بیہقی:6723]

۔۔۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو محض اللہ کی رضا کیلئے آپس میں محبت کرتے ہوں گے حالانکہ ان کا آپس میں کوئی رشتہ نہ ہو گا اور نہ ہی آپس میں مالی لین دین ہو گا، اللہ کی قسم ان کے چہروں سے نور چمک رہا ہو گا اور وہ نور (کے منبروں) پر ہوں گے، جب لوگ خوفزدہ اور غمزدہ ہوں گے انہیں کوئی خوف اور غم نہ ہو گا۔

[ابوداؤد:3527]

اپنے نفس و باطن کا تصفیہ والے مومنوں کو، جو ان اچھی صفات و خصوصیات کے حامل ہوں، صوفی کہا جانے لگا۔

حوالہ

وَقَالَ بعَضُهُم: نِسبَةٌ إلی لِبْسِ الصوّف، وهذا صحَيحٌ من حَيْثُ اللّغَة

ترجمہ:

اور ان میں سے بعض نے کہا: اُون (کا لباس) پہننے کی طرف نسبت میں (صوفی کہا جانے لگا)، اور یہ زبان کے لحاظ سے صحیح ہے۔

[الموفي بمعرفة التصوف والصوفي - كمال الدين الأدفوي (م748ھ): صفحہ 40]

صُوفیاء کے لفظِ صُوف (اُون) کی اصل

(1) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«كَانَ عَلَى مُوسَى يَوْمَ كَلَّمَهُ رَبُّهُ كِسَاءُ صُوفٍ، وَجُبَّةُ صُوفٍ، وَكُمَّةُ صُوفٍ، وَسَرَاوِيلُ صُوفٍ، وَكَانَتْ نَعْلَاهُ مِنْ جِلْدِ حِمَارٍ مَيِّتٍ»۔

ترجمہ:

جس دن موسیٰ (علیہ السلام) سے ان کے رب نے گفتگو کی اس دن موسیٰ (علیہ السلام) کے بدن پر پرانی چادر، اونی جبہ، اونی ٹوپی، اور اونی سراویل (پائجامہ) تھا اور ان کے جوتے مرے ہوئے گدھے کے چمڑے کے تھے۔

[سنن الترمذي:1734]

[وابن عرفة في جزئه (39)، والبزار (2031)، وأبو يعلى (4983)، والآجرى (688) والحاكم (1/28) و(2/379)]

قَالَ الْحَاكِمُ: وَهَذَا حَدِيثٌ كَبِيرٌ فِي التَّصَوُّفِ۔

ترجمہ:

امام حاکم نے کہا: یہ تصوف پر ایک عظیم حدیث ہے۔

[المستدرک علی الصحیحین للحاکم - ط العلمیۃ:76]

تشریح:

لعدم وجدانه مَا هُوَ أرفع أَو لقصد التَّوَاضُع وَترك التنعم أَو أَنه إتفاقي۔

ترجمہ:

اس لیے کہ اس نے اسے برتر نہیں پایا، یا اس لیے کہ اس نے عاجزی کا ارادہ کیا اور نفس کے لطف اندوز ہونے کو نظر انداز کیا، یا اس لیے کہ یہ ایک اتفاق ہے۔

[التيسير بشرح الجامع الصغير - المناوي:2/204]

قال ابن العربي: إنما جعل ثيابه كلها صوفا لأنه كان بمحل لم يتيسر له فيه سواه فأخذ باليسر وترك التكليف والعسر وكان من الاتفاق الحسن أن آتاه الله تلك الفضيلة وهو على تلك اللبسة التي لم يتكلفها. وقال الزين العراقي: يحتمل كونه مقصودا للتواضع وترك التنعم أو لعدم وجود ما هو أرفع ويحتمل أنه اتفاقي لا عن قصد بل كان يلبس كل ما يجد كما كان نبينا يفعل.

ترجمہ:

ابن العربی کہتے ہیں: اس نے اپنے تمام کپڑوں کو اون بنایا، کیونکہ وہ ایسی جگہ پر تھا جہاں اسے کچھ نہیں ملتا تھا، اس لیے اس نے آسانی اختیار کی اور ذمہ داری اور مشقت کو چھوڑ دیا۔ امام الزین العراقی نے کہا: ممکن ہے کہ اس کا مقصد عاجزی اور لذت کو ترک کرنا ہو یا کسی اعلیٰ چیز کی عدم موجودگی کے لیے ہو۔

[فیض القدیر-المناوي:6203(4/583)]

بأنّهُ الغالِب عَلَى مَنْ طلبَ خُشَونَةَ العَيْشِ والتَّقَلُّلِ مِنَ الدُّنيا. والتَّقَشفِ فيها. من تركَ الناعمَ من الثيابِ، ويَقنَعُ بالخَشِنِ منها. ولبس الصوفِ والقطنِ غالبٌ في هذه الحالةِ. والصوفُ أغلبُ لعمومِ وجودِهِ، وخشونتُه أكثر من خشونةِ القطنِ.

ترجمہ:

کہ یہ ان لوگوں پر غالب ہے جو تنگ زندگی اور دنیا سے کم تر چاہتے ہیں۔ اور اس میں کفایت شعاری. جس نے عمدہ لباس کو ترک کیا اور موٹے لباس سے مطمئن ہو گیا۔ اور اس معاملے میں اون اور سوتی پہننا غالب ہے۔ اون اس کے وجود میں سب سے زیادہ عام ہے، اور اس کی کھردری روئی کی کھردری سے زیادہ ہے۔

[الموفي بمعرفة التصوف والصوفي-كمال الدين الأدفوي (م748ھ): صفحہ 40]

(2) حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور حسن بصریؒ سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرماتے ہیں:

كان يركَبُ الحمارَ، ويخصِفُ النعلَ، ويرقَعُ القميصَ، ويلبَسُ الصوفَ، ويقولُ: من رغِبَ عن سنَّتِي فليسَ منِّي.

ترجمہ:

گدھے پر سواری کرتے، جوتا گانٹھ لیتے، قمیص کو پیوند لگاتے، اُون کا لباس پہنتے اور فرماتے: جس نے میرے طریقے سے بے رغبتی کی وہ میرا (امتی) نہیں۔

[سلسلۃ الأحاديث الصحيحۃ:2130، صحيح الجامع الصغير:4946]

مریضوں کی عیادت فرماتے، جنازہ کے پیچھے چلتے اور غلاموں (مسکین نوکروں) تک کی دعوت قبول فرمالیتے تھے۔

[مسند ابن الجعد:848 ترمذی:1017 ابن ماجہ:4178]

زمانہ حال اور زمانہ حال دو ایسے الفاظ ہیں جو مکمل طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور یہ فارسی زبان کی نرمی اور حکمت کی وجہ سے ہے، جو لفظ حل کو اچھے اور خوش ہونے کے معنی میں استعمال کرتا ہے اور اس کے لیے بھی۔ موجودہ وقت!

Eckhart Tele کی کتاب The Power of the Present بھی یہی بات کہتی ہے۔

جو حال میں ہے وہ زمانے کا بیٹا ہے۔

تمام متلاشیوں کی طرح۔ اور جو اس مقام تک پہنچا ہے وہ ابو الوقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسلسل کنکشن کی حالت میں ہے... یہاں حسام الدین چلبی کہتے ہیں کہ میں ابھی تک پھنسا ہوا ہوں اور پوزیشن پر نہیں پہنچا۔ مجھے کل تک مت چھوڑنا کیونکہ یہ تمہارے راستے کی شرط نہیں ہے!

ایرانی

صوفی ابن الحال باشد در مثال

گرچه هر دو فارغ اند از ماه و سال

پاکستانی

صُوفِی اِبنُ الحَال بَاشَد دَرِ مِثَال

گَرچِہ ہَر دو فَارِغ اَند از مَاہ و سَال

حال: حالت، وقت، وجدانی کیفیت، وارداتِ قلب۔۔۔ ابن الحال: ابن الوقت۔۔۔ گرچہ: اگرچہ۔۔۔ ہر دو: دونوں۔۔۔ فارغ: مبرا

ترجمہ: صوفی ابن الحال بطور تمثیل کہلاتا ہے۔ اگرچہ (صوفی اور وقت) دونوں ماہ و سال سے مبرا ہیں۔

وضاحت: حال اور وقت دونوں مترادف ہیں۔ پچھلے شعر میں کہا گیا تھا کہ صوفی کا ابن الوقت ہونا ضروری ہے۔ اب اس میں شک پیدا ہو سکتا ہے کہ "وقت" سے جو مراد ہے اس کے لغوی معنی ہیں۔

اس شعر میں شاعر اس شبہ کو دور کرتا ہے کہ صوفی کو ابن الوقت یا ابن الحال ماننا علامتی ہے، ورنہ صوفی اور وقت دونوں مہینے اور سال سے مبرا ہیں۔ یعنی وہ وقت سے آزاد ہیں۔ اس لیے حالت اور وقت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ "وقت" کا حصہ ہیں، بلکہ ان

کے اصطلاحی معنی مراد ہیں، بلاشبہ ان کے معاملے میں وقت کے تصور کا کوئی معنی یا تصور نہیں ہے کیونکہ ان کی حالتیں اور ارادے دل کی واردات ہیں۔

صوفی وہ ہے جو اپنے کو غیر حق سے محفوظ رکھے اور آج کا کام کل پر نہ چھوڑے۔

صوفی بھی دو طرح کے ہوتے ہیں

ایک وہ جن پر تجلیات و کیفیات وارد ہوتی ہیں تو اس میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ ان کو خود اپنا پتہ نہیں ہوتا۔ ایسے حضرات رند و قلندر کہلاتے ہیں ۔

دوسرے صوفی وہ ہیں جو اپنے دل میں، زبان میں اور قوی میں آداب شریعت و طریقت کے پابند ہوتے ہیں۔ اپنی روح (نفس) پر قابو رکھتے ہیں۔ خوارق کا اظہار بہت کم کرتے ہیں اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق زندگی گزارتے ہیں " ۔

پھر فرماتے ہیں۔

بعض حضرات صرف لباس میں صوفی رہتے ہیں لیکن یہ لوگ تصوف اور صوفیاء کو بدنام کرتے ہیں۔ (اظہار المنظوم ترجمہ منظوم وشرح مثنوی مولانا روم۔ دفتر اول صفحہ ۸۷ مترجم و شارح حضور شیخ اعظم علیہ الرحمہ (بحوالہ حضرت مولانا عبد الخالق اشرفی راج محلی)

ابا علی دقاقؒ کہتے ہیں: وقت وہ ہے جس میں تم ہو، اور اگر یہ دنیا ہے تو یہ دنیا کا وقت ہے، اور اگر وہ پیچھے ہے تو تمہارا وقت پیچھے ہے، اگر تم خوش ہو تو تمہارا وقت خوش کن ہے۔۔

اگرچہ وقت کا تصور ہر کسی کے لیے عیاں نظر آتا ہے، لیکن تصوف میں یہ بہت اہم ہے، اور ساتھ ہی اس کا تصور بہت پیچیدہ اور مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہے، اور اس کی وجہ کو سمجھنا آسان نہیں ہے، کیونکہ ہر ایک تصوف کا انحصار اس حالت پر ہے جس میں وہ ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صوفی بھی مختلف حالات میں اس کے بارے میں مختلف تاثرات اور اظہارات رکھتا ہے۔

تصوف میں ہر عمل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے

ا۔ ظاہری، ۲۔ باطنی۔ علم کی دو اقسام بیان کی جاتی ہیں، ا۔ ظاہری ۲۔ باطنی۔ جبکہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو کچھ تھا ظاہر ہی تھا؟

جواب۔ ظاہر اور باطن اہل تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔ پہلے اس کا مفہوم سمجھ لینا چاہئے۔ علم ظاہر سے مراد ان باتوں کا علم یا ان اعمال کا علم ہے جن کا تعلق انسان کے ظاہری اعضاء سے ہے اور علم باطن سے مراد ان احکامات کا علم ہے جن کا تعلق باطنی اعضاء سے ہے، اور دونوں انواع کے احکامات قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں کثرت سے ہیں۔ مثلاً رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے ریا، بغض اور حسد رکھنے سے سختی سے منع فرمایا ہے، جبکہ ان باتوں کا تعلق صرف اور صرف انسان کے دل سے ہے۔ خود اللہ پاک نے اپنے کلام مقدس میں فرمایا

یوم لا ینفع مال و لا بنون۔ الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔ (الشعراء)

"جس دن یہ مال کام نہیں آئے گا مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہو اسلامت دل لیکر۔"

قد افلح من تزکیٰ۔ و ذکر اسم ربہ فصلّی۔ (الاعلیٰ)

"بیشک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا اور اپنے رب کا نام لیکر نماز پڑھی۔"

وغیرہ، تو ان باتوں کا تعلق صرف اور صرف باطن سے ہے۔ اہل تصوف کے پاس ان اعمال کا علم جن کے ذریعے قلب سلیم اور تزکیۂ نفس حاصل ہو علم باطن کہا جاتا ہے۔ بعض اعمال ایسے ہیں جو اپنے اندر دو پہلو رکھتے ہیں، ایک کا تعلق ظاہر سے اور دوسرے کا تعلق باطن سے ہوتا ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز پڑھتے وقت اپنا منہ کعبۃ اللہ کی طرف کریں، کپڑے پاک رکھیں وغیرہ، ان احکامات کا تعلق صرف ظاہری اعضاء کے ساتھ ہے اور نماز کے متعلق ہی نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں ریا نہ ہو اور فرمایا "صل کانک تراہ" خدا کی عبادت ایسے کرو کہ گویا تم خدا کو سامنے دیکھ رہے ہو۔ ان احکام کا تعلق باطن سے ہے۔ اب صوفیاء کرام کا خیال یہ ہے کہ انسان کے باطن کی اتنی ترقی ہو کہ وہ "صل کانک تراہ" کے مقام کو حاصل کر سکے۔ اب ہر ذی شعور خود فیصلہ کرے کہ علم باطن بھی شرعی علم ہے کہ نہیں۔ یہ کیفیات باطنی دراصل واردات دل ہیں۔ اور ان کا تعلق وقت سے بہت گہرا ہے چنانچہ اس بات کو ذہن نشین کرنے کے لئے آئیں ایک حدیث پاک کا مطالعہ کرتے ہیں۔

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ صَالِحٍ، حَدَّثَنِي مُعَاوِيَةُ بْنُ صَالِحٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ، عَنْ أَبِيهِ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ، عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ، قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَشَخَصَ بِبَصَرِهِ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ قَالَ: هَذَا أَوَانُ يُخْتَلَسُ الْعِلْمُ مِنَ النَّاسِ حَتَّى لَا يَقْدِرُوا مِنْهُ عَلَى شَيْءٍ، فَقَالَ زِيَادُ بْنُ لَبِيدٍ الْأَنْصَارِيُّ: كَيْفَ يُخْتَلَسُ مِنَّا وَقَدْ قَرَأْنَا الْقُرْآنَ؟ فَوَاللّٰهِ لَنَقْرَأَنَّهُ، وَلَنُقْرِئَنَّهُ

نِسَاءَنَا، وَأَبْنَاءَنَا، فَقَالَ: ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا زِيَادُ إِنْ كُنْتُ لَأَعُدُّكَ مِنْ فُقَهَاءِ أَهْلِ الْمَدِينَةِ، هَذِهِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيلُ عِنْدَ الْيَهُودِ، وَالنَّصَارَى فَمَاذَا تُغْنِي عَنْهُمْ، قَالَ جُبَيْرٌ: فَلَقِيتُ عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ، قُلْتُ: أَلَا تَسْمَعُ إِلَى مَا يَقُولُ أَخُوكَ أَبُو الدَّرْدَاءِ؟ فَأَخْبَرْتُهُ بِالَّذِي قَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ، قَالَ: صَدَقَ أَبُو الدَّرْدَاءِ إِنْ شِئْتَ لَأُحَدِّثَنَّكَ بِأَوَّلِ عِلْمٍ يُرْفَعُ مِنَ النَّاسِ الْخُشُوعُ يُوشِكُ أَنْ تَدْخُلَ مَسْجِدَ جَمَاعَةٍ فَلَا تَرَى فِيهِ رَجُلًا خَاشِعًا، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ، وَمُعَاوِيَةُ بْنُ صَالِحٍ ثِقَةٌ عِنْدَ أَهْلِ الْحَدِيثِ، وَلَا نَعْلَمُ أَحَدًا تَكَلَّمَ فِيهِ غَيْرَ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ الْقَطَّانِ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ صَالِحٍ نَحْوُ هَذَا، وَرَوَى بَعْضُهُمْ هَذَا الْحَدِيثَ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(قال الشيخ الألباني: صحيح تخريج اقتضاء العلم العمل (89) صحيح وضعيف سنن الترمذي الألباني: حدیث نمبر 2653)

"ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، اچانک آپ نے اپنی نظریں آسمان پر گاڑ دیں، پھر فرمایا: "ایسا وقت (آگیا) ہے کہ جس میں لوگوں کے سینوں سے علم اچک لیا جائے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے پاس کچھ بھی علم نہیں ہو گا، زیاد بن لبید انصاری نے کہا: (اللہ کے رسول!) علم ہم سے کس طرح چھین لیا جائے گا جب کہ ہم قرآن پڑھتے ہوں گے۔ قسم اللہ کی! ہم ضرور اسے پڑھیں گے اور ہم ضرور اپنی عورتوں کو اسے پڑھائیں گے اور اپنے بچوں کو سکھائیں گے۔ آپ نے فرمایا: "اے زیاد تمہاری ماں تمہیں کھو دے! میں تو تمہیں اہل مدینہ کے فقہاء میں سے شمار کرتا تھا۔ یہ تورات اور انجیل بھی تو پاس ہے یہود و نصاریٰ کے کیا کام آئی ان کے؟" (کیا فائدہ پہنچایا تورات اور انجیل نے ان کو؟)۔ جبیر (راوی) کہتے ہیں: میری ملاقات عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو میں نے ان سے کہا: کیا آپ نہیں سنتے کہ آپ کے بھائی ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کیا کہتے ہیں؟ پھر ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے جو کہا تھا وہ میں نے انہیں بتا دیا۔ انہوں نے کہا: ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے سچ کہا۔ اور اگر تم (مزید) جاننا چاہو تو میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ پہلے پہل لوگوں سے اٹھا لیا جانے والا علم، خشوع ہے۔ عنقریب ایسا وقت آئے گا کہ تم جامع مسجد کے اندر جاؤ گے لیکن وہاں تمہیں کوئی (صحیح معنوں میں) خشوع خضوع اپنانے والا کوئی ایک شخص دکھائی نہ دے گا"۔

حدیث مبارکہ سے یہ سمجھ آئی کہ علم کی حقیقت خشیّت الٰہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں علم صرف قال کا نام نہیں ہے بلکہ حال بھی ضروری ہے۔ محض حروف و الفاظ کو جان لینا علم نہیں بلکہ علم خشیت الٰہی کا نام ہے۔ ورنہ اس کی مثال گدھے کی طرح جس نے کتابوں کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے۔ قرآن میں واضح ارشاد باری تعالیٰ ہے كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا۔ ان کی مثال اس گدھے

کی سی ہے جس پر بہت سی کتابیں لدی ہوں۔ (جمعہ: ۵) اور دوسرے مقام پر فرمایا فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ اور اپنی خواہش کی پیروی کی سو اس کی مثال تو کتے کی سی ہو گئی کہ اگر اس پر سختی کرو تو بھی ہانپے (زبان نکلے) یا یونہی چھوڑ دو تو بھی ہانپے۔ (اعراف: 176)

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

"جن لوگوں نے ایمان کا دعوی کیا ہے، لیکن وہ صاحبان ذوق نہ تھے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اپنے کو مومن نہ کہو، مسلم کہو قَالَتِ الْأَعْرَابُ: آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ پس یہ لوگ مسلمان ہیں، مومن نہیں، اس لئے کہ ایمان ان کے دل کے اندر رچا نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صاحب ذوق نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا ان کے اعمال اجر میں کمی ہو گی (البتہ صاحب ذوق کا معاملہ دوسرا ہے) ذوق ایک باطنی امر ہے اور عمل اس کا نشان ہے۔ پس اعمال علوم و عقائد کے ثمرات ہیں اور یقین سے جہاد اور احسان کے مقامات پیدا ہوتے ہیں"۔

(مدارج السالکین ج3 ص58 بحوالہ تصوف کیا ہے، ص100 / 101 مقالات مولانا محمد اوّیس ندوی ادارہ اسلامیات لاہور اشاعت اوّل اگست 1981ء)

وقت اور اس سے متعلق عوامل کو سمجھنے کے لئے

نماز کے اوقات سے متعلق متعدد احادیث کتب حدیث میں موجود ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز کو اس کے وقت میں پڑھنا۔ انھوں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ماں باپ کی خدمت کرنا۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ اس کے بعد کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام کی امامت والی حدیث متعدد صحابہ کرامؓ سے مروی ہے جس میں مذکور ہے کہ ۲ روز حضرت جبرئیل علیہ السلام نے امامت فرما کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھائی۔ پہلے دن ہر نماز اول وقت میں پڑھائی اور دوسرے دن آخر وقت میں پڑھائی، پھر فرمایا کہ ہر نماز کا وقت ان دونوں وقتوں کے درمیان ہے۔ (ابو داود، ترمذی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز کو وقت پر ادا فرماتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ احزاب میں ایک روز شدتِ جنگ کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز عصر فوت ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غروبِ آفتاب کے بعد اس کی قضا پڑھی اور کفار کے خلاف سخت الفاظ میں بد دعا فرمائی کہ ان لوگوں نے ہمیں نماز عصر سے مشغول رکھا، اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔ (صحیح بخاری باب غزوہ الخندق، صحیح مسلم) جو وقت ادا نہ ہو وہ قضا ہے۔ غور فرمائیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے سفر میں جب کہ آپ کو لہولہان کر دیا گیا تھا، فرشتہ نے آپ کے سامنے حاضر ہو کر ان کو کچلنے کی پیش کش بھی کی مگر رحمۃ للعالمین نے ان کے لیے ہدایت کی ہی دعا فرمائی؛ مگر غزوۂ احزاب میں کفار کی مزاحمت کی وجہ سے نماز کے قضا ہو جانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ ان کے خلاف سخت سے سخت الفاظ میں بد دعا فرمائی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے بغیر کسی عذر کے دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھا اس نے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا۔ (ترمذی باب ماجاء فی الجمع بین الصلاتین)

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ وقت پیسے کی طرح ہے، اگر آپ اِسے ضائع کریں گے تو ضرورت پڑنے پر یہ آپ کے پاس نہیں ہوگا۔ اگر آپ پیسے کی طرح وقت کا حساب رکھیں گے تو آپ کے پاس ایسے کاموں کے لیے ضرور وقت بچے گا جو آپ کو پسند ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وقت کا صحیح اِستعمال کرنے سے آپ کو اپنی پسند کے کام کرنے کا زیادہ موقع ملے گا نہ کہ کم۔

وقت کا صحیح اِستعمال کرنا ایک مہارت ہے جو آگے چل کر آپ کے بڑے کام آئے گی۔ اِس مہارت کی وجہ سے ایک شخص کی ملازمت بچی رہ سکتی ہے اور یہ مہارت نہ ہونے کی وجہ سے اُسے ملازمت سے نکالا جا سکتا ہے۔ ذرا سوچیں کہ اگر آپ کسی کمپنی کے مالک ہوں تو کیا آپ کسی ایسے شخص کو ملازمت پر رکھیں گے جو آئے دن دیر سے کام پر آتا ہو؟

یہ دراصل اشارہ ہے کہ صوفیائے کرام وقت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہ قلبی واردات اور کیفیات دل پر مبنی ہوتا ہے۔ تو مولانا رومؒ نے صوفی کو ابن الحال کہا کہ وہ سب سے زیادہ وقت کی قدر کرنے والا ہوتا ہے۔

ایرانی

تو مگر خود مَردِ صوفی نیستی؟

ھست راا ز نَسْیہ خیزد نیستی

تم صوفی آدمی نہیں ہو۔ آپ کو یہ نہیں بھولنا کہ وہاں کیا ہے۔

پاکستانی

تو مگر خود مَردِ صوفی نیستی؟

نقد راا ز نِسْیہ خیزد نیستی

مگر: حرفِ استثنا۔ یہاں شک کے معنی دیتا ہے۔ نِسیہ: ادھار۔ نیستی: بربادی، زوال

نیستی فعل اور نیستی اسم میں تجنیسِ مستوفی (اگر شعر میں دو لفظ ایسے آئیں جو ترتیبِ حروف اور حرکات و سکنات میں برابر ہوں مگر معانی میں مختلف ہوں تو اسے صنعتِ تجنیسِ تام کہیں گے۔ اگر دونوں الفاظ کی نوع علاحدہ ہو یعنی ایک اسم ہو اور ایک فعل ہو تو اسے تجنیسِ تام مستوفی کہیں گے۔) ہے۔

ترجمہ: شاید تو صوفی آدمی نہیں ہے (کہ ٹال رہا ہے اور اتنی بھی خبر نہیں کہ) نقد کو ادھار سے نقصان پہنچتا ہے۔

اس شعر میں جناب رومیؒ سے مراد صوفیہ کا وقت کے ساتھ خاص رویہ ہے۔ رومی کے نقطہ نظر سے ماضی اور مستقبل کچھ نہیں۔ جو ہے، وہ "اب" ہے اور بس۔ موجودہ کو وسعت دینا چاہیے۔ جب حال پھیلتا ہے تو ماضی اور مستقبل بھی پھیلتا ہے۔

اے رومیؒ، کیا آپ صوفی آدمی نہیں ہیں جو کہتا ہے: "اس وقت کو ایک اور وقت تک چھوڑ دو" کیونکہ جو کچھ بھی موجود ہے اور نہیں دیا گیا اور اگلے وقت تک ملتوی نہیں کیا گیا تو وہ ناکارہ اور تباہی کا شکار ہو جائے گا۔

ایک اور نظریہ یہ ہے کہ اگر آپ بیداری حاصل کر رہے ہیں تو کام کے بیچ میں بیداری کو ترک نہ کریں۔

اگر آپ دیکھتے ہیں کہ دروازے کھل گئے ہیں اور آپ روحانی فہم کو پہنچ چکے ہیں اور آپ کا کام ٹھیک چل رہا ہے تو براہ کرم ہمت نہ ہاریں اور اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ آپ کی حالت ٹھیک نہ ہو جائے۔

حافظؒ جیسے حکیم نے اس لمحے کو اپنی روح کی گہرائی سے سمجھ لیا تھا، جس نے کہا:

ای دل ار عشرت امروز بہ فردا فکنی

مایہ نقد بقارا کہ ضمان خواھد شد؟

اے دل آج کی خوشی کو کل میں ڈال دے

دایم گل این بستان شاداب نمی ماند

دریاب ضعیفان را در وقت توانایی

اس باغ کا پھول ہمیشہ تازہ نہیں رہتا

قابلیت کے وقت کمزوروں کو تلاش کر۔

ایرانی

گُفتَمَش پوشیدہ خوش تَر سِرّ یار

خود تو در ضِمنِ حِکایَت گوش دار

پاکستانی

گُفتَمَش پوشیدہ خُوشتَر سِرِّ یار
خود تو در ضِمنِ حِکایَت گُوش دار

گفتمش: میں نے کہا۔۔ خوشتر: بہتر، اچھا۔۔ سریار: دوست کا راز۔۔ ضمن: درمیان۔۔ گوش داستن: سننا

ترجمہ: میں نے اس کو جواب دیا کہ یار کا بھید پوشیدہ ہی بہتر ہے۔ (اگر سننا ہی چاہتی ہو تو) اس حکایت کے ضمن میں سنتی جا۔

اس شعر میں، جناب رومیؒ نے الہی رازوں کو پوشیدہ رکھنے کی "حکمت" کا مختصراً ذکر کیا ہے،

اس بند میں قصہ کا معنی مطلق تمثیل اور قصہ ہے جیسا کہ رومیؒ کے کلام میں یہ "راز" کئی مقامات پر اس طرح بیان کیے گئے ہیں جس طرح کہانی اور تمثیل میں۔ مولانا رومیؒ جناب حسام الدین سے کہتے ہیں کہ یہ شمس کا سر ہے اسے ڈھانپنا چاہیے۔

وہ کہانیاں سنیں جن میں شمس کے راز بتائے جائیں گے ... یعنی میں شمس کی طرح دوسروں کے راز اور تعلیمات کو ظاہر نہیں کرتا، اور میں ان کو کہانیوں کے دوران بتاتا ہوں، اور آپ نکات کو غور سے تلاش کرتے ہیں۔

ایک مسلمان کی دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی دوسرے کا راز فاش نہ کرے، کسی کی پوشیدہ بات جاننے کی کوشش بھی نہ کرے اور ایک دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی کرے۔ ہم سب کے کندھوں پر یہ ایک بڑی قسم کی ذمہ داری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راز چھپانے سے زیادہ آسان ہے مال چھپانا۔ اس لئے یہ عظیم ذمہ داری ہے۔ افسوس کہ ہمارے اندر اس ذمہ داری کی ادائیگی میں بڑی کوتاہی ہے۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہ اکریم ورضی اللہ عنہ کا بڑا قیمتی قول ہے: سرُّك أسيرك، فإن تكلمت به، صرت أسيره (ادب الدنیا والدین للماوردی)

ترجمہ: راز اس وقت تک آپ کا غلام ہے جب تک آپ نے اسے کسی سے بیان نہیں کیا ہے لیکن جب اسے بیان کر دیا تو اب آپ اس کے غلام ہو گئے۔

اللہ کی طرف سے کوئی خاص فضل و کرم ہو جس کے بیان کرنے سے بغض و حسد کا اندیشہ ہو تو نعمت و فضل کا ذکر لوگوں میں

خصوصیت کے ساتھ نہ کریں بلکہ عمومی انداز میں کریں تاکہ آپ کی اس خاص نعمت کا حاسد کو پتہ نہ چلے جیسا کہ اللہ تعالی نے قرآن میں ذکر کیا ہے۔قَالَ يَابُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا (یوسف:5)

ترجمہ:یعقوب علیہ السلام نے کہا پیارے بچے! اپنے اس خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا،ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ کوئی فریب کاری کریں۔

اس آیت میں خواب کی نعمت وبشارت کو اپنے حاسد بھائی سے چھپانے کا ذکر ہے اور فرمان نبوی ہے۔

استعينوا على إنجاحِ الحوائجِ بالكتمانِ، فإنَّ كلَّ ذي نعمةٍ محسودٌ(صحیح الجامع:943)

ترجمہ:لوگوں سے چھپا کر اپنے مقاصد کی کامیابی پر مدد طلب کرو کیونکہ ہر نعمت والا حسد کیا جاتا ہے۔

بعض لوگ جان بوجھ کر کسی کے عیوب کو جاننے کی کوشش کرتا ہے،ٹوہ میں لگا رہتا ہے،جاسوسی کرتا ہے بلکہ چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنا کرتا ہے ایسے لوگوں کے لئے ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔اللہ تعالی نے کسی کی جاسوسی کرنے،اس کے ٹوہ میں لگنے سے منع کیا ہے۔

جو چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنتا ہے دیکھیں کس قدر شدید وعید آئی ہے

نبی ﷺ فرماتے ہیں:

من استمعَ إلى حديثِ قومٍ ، وهم له كارهون ، أو يفرُّون منه ، صُبَّ في أذنِه الآنكُ يومَ القيامةِ(صحیح البخاری:7042)

ترجمہ: جس شخص نے کسی قوم کی باتوں پر کان لگایا حالانکہ وہ اسے ناپسند سمجھتے ہوں یا وہ اس سے راہ فرار اختیار کرتے ہوں تو قیامت کے دن اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا۔

یہ عیب عورتوں میں بہت زیادہ ہے،اللہ کی پناہ اس بری خصلت ورذیل حرکت سے۔لوگوں کی باتیں چھپ چھپ کر اس لئے سنی جاتی ہیں تاکہ انہیں لوگوں میں عام کیا جائے اور اسے رسوا کیا جائے۔ایسے لوگ خود اس دن اور اس جگہ رسوا ہوں جس دن اور جس جگہ سارے جہان والے جمع ہوں گے۔

نبی ﷺ نے حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے راز کی ایک بات کی اور ان کو اس بات پر امین بنایا مگر انہوں نے رسول اللہ کے راز کو فاش کر دیا تو اللہ تعالی نے ان دونوں امہات المومنین کی سرزنش کی اور توبہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

إِن تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۖ وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ (التحریم:4)

ترجمہ:۔(اے نبی کی دونوں بیویو!) اگر تم دونوں اللہ کے سامنے توبہ کر لو (تو بہت بہتر ہے) یقیناً تمہارے دل جھک پڑے ہیں اور اگر تم نبی کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو گی پس یقیناً اس کا کارساز اللہ ہے اور جبرائیل ہیں اور نیک اہل ایمان اور ان کے علاوہ فرشتے بھی مدد کرنے والے ہیں۔

راز ایک امانت ہے اس کا بیان کرنے والا خائن ہے اور جو خائن کی سزا ہے وہ راز افشاء کرنے والے کو بھی ملے گی۔

حسن بصری سے مروی ہے: إِنَّ مِنَ الْخِيَانَةِ أَنْ تُحَدِّثَ بِسِرِّ أَخِيكَ (الصمت وآداب اللسان لابن ابی الدنیا:404)

ترجمہ: خیانت میں سے یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کا راز فاش کر دو۔

اور نبی ﷺ کا فرمان بھی ہے: إذا حدَّثَ الرَّجلُ الحديثَ ثمَّ التفتَ فَهِيَ أمانةٌ (صحیح الترمذی:1959)

ترجمہ: جب کوئی آدمی تم سے کوئی بات بیان کرے پھر (اسے راز میں رکھنے کے لیے) دائیں بائیں مڑ کر دیکھے تو وہ بات تمہارے پاس امانت ہے۔

اس امانت میں خیانت کرنے کی سزا جہنم بھی ہو سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقا بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: الخديعة في النار یعنی دھوکہ دینا جہنم میں لے جائے گا۔ شیخ البانی نے بھی "المكرُ والخديعةُ في النارِ" کو صحیح کہا ہے کہ مکر و فریب جہنم میں لے جانے کا سبب ہے۔ (السلسلۃ الصحیحۃ:1057)

راز امانت ہے

راز ایک امانت ہے اس کا ظاہر کرنا گویا چغلی کرنا ہے اور چلغوروں کی سزا جہنم ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

لا يدخل الجنة قتات (صحیح البخاری:6056)

ترجمہ: چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔

زوجیت کے متعلق راز فاش کرنے والا خواہ شوہر ہو یا کوئی دوسرا چغلخور قیامت میں اللہ کے نزدیک سب سے برا انسان ہو گا۔

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ، الرَّجُلَ يُفْضِي إِلَى امْرَأَتِهِ، وَتُفْضِي إِلَيْهِ، ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا (صحيح مسلم:1437)

ترجمہ: قیامت کے دن، اللہ کے ہاں لوگوں میں مرتبے کے اعتبار سے بدترین وہ آدمی ہو گا جو اپنی بیوی کے پاس خلوت میں جاتا ہے اور وہ اس کے پاس خلوت میں آتی ہے پھر وہ (آدمی) اس کا راز افشا کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں بہت سارے نصوص ہیں سب کو یہاں اکٹھا کرنا مشکل ہے، ہمیں صرف اصل ہدف جاننا ہے اس کے لئے یہ سارے نصوص کافی ہیں اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ کسی کے راز کی حفاظت کا طریقہ کیا ہے؟ بہت آسان طریقہ ہے اپنی زبان کی حفاظت کریں اور لوگوں کے معاملات میں خاموشی اختیار کریں۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے: مَن صَمت نَجا (صحيح الترمذي:2501)

ترجمہ: جس نے خاموشی اختیار کی اس نے نجات پالیا۔

تو مولانا رومؒ ایک نقطہ بیان کر رہے ہیں کہ یار کی باتوں کو راز ہی رہنے دے۔ کیونکہ یہ بہتر ہے۔ مثنوی کیا ہے؟ علوم و معرفت کا عظیم خزینہ۔ سبحان اللہ!

ایرانی

خوش تَر آن باشد کہ سِرِّ دِلبَران

گفتہ آید در حَدیثِ دیگران

پاکستانی

خوش تَر آن باشد کہ سِرِّ دِلبَران
گفتہ آید در حَدیثِ دیگران

اس کا مطلب ہے کہ ایسا راز اگر تمثیلوں اور دوسری کہانیوں کے ساتھ بتایا جائے تو بہتر ہے۔ غلول کا مطلب ہے خیانت اور یہاں اس کا معنی رازداری ہے۔ کیونکہ خیانت میں راز ہے۔ یہ وقت ضائع کرنے کے بارے میں ہے کہ جان واضح طور پر پوشیدہ رازوں کو ظاہر کرنے اور موقع سے محروم ہونے پر اصرار کرتا ہے۔

اس آیت میں ایک بہت اہم نکتہ ہے۔

دوسروں کی حدیث سے مراد وہ لوگ ہیں جو مستقبل میں آئے اور رومی کے راز کو سمجھے اور اس کے راوی بن گئے۔

اور اب ہم اس دور میں ہیں۔

واقعی، ہمارے پاس پیشرووں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ یعنی انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ضروری ہے اور سب سے بہتر کام جو ہم کر سکتے ہیں وہ ہے ان کے علم کو بیان کرنا اور بیان کرنا۔

ایرانی تصوف روحانیت میں مکمل ہے اور ہم بحیثیت "دوسرے" صرف ان میں چھپے رازوں کو سمجھ سکتے ہیں اور ظاہر کر سکتے ہیں۔

گفت مُکشوف و برہنہ، بی غُلول
باز گو، دَفعَم مَدہ ای بوالفُضول

یہ جناب حسام الدین چلبی کا جوش ہے کہ جتنا رومی اسے پیچھے دھکیلتا ہے، حسام الدین اتنا ہی زیادہ دھکیلتا ہے۔

اور یہ کام بہت قیمتی ہے۔

ایک دن، ایک نابینا شخص عیسیٰؑ کے پاس آیا اور کہا، مجھے شفا دے۔

یسوعؑ نے کہا میں ایسا نہیں کروں گا اور چلا گیا!

نابینا شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قمیص کو مضبوطی سے پکڑا اور کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ مجھے شفا نہ دیں اور جب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لٹکے ہوئے تھے تو ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور وہ شفایاب ہو گئے۔

اُس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک نہایت اہم راز سے پردہ اٹھایا کہ علاج اور شفا کی تمام توانائیوں کا فرض مقرر ہے۔

اور فرمایا: تمہارے ایمان (یقین) نے تمہیں شفا دی!

آپ کو ملنے والی بہت سی شفایابی آپ کے ایمان (یقین) سے متعلق تھی، ہسپتال سے نہیں!

اگر آپ شفا کے لیے جاتے ہیں، تو یہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا ایمان کتنا ہے۔ جہاں آپ جا رہے ہیں وہ بہت اچھی جگہ ہو سکتی ہے، لیکن آپ کا ایمان (یقین) زیادہ اہم ہے!

غلول کا مطلب ہے چور

ظاہر کا مطلب ہے دریافت شدہ اور ننگا

یہاں حسام الدین کو غصہ آیا اور رومی سے کہا: مختصر نہ بیچو اور روحانیت سے چوری مت کرو!

میرے کام کی وضاحت کریں اور پردہ ہٹا دیں اور مجھے بتائیں کہ آپ شمس کے بارے میں کیا جانتے ہیں!

جناب حسام الدین چلبی کا سلگتا ہوا جذبہ بہت قیمتی ہے۔ حسام الدین کہتے ہیں کہ اے صاحب فضل! مجھے دور نہ کرو اور مجھے بہانے مت دو!

پَردہ بَردار و بَرِہنہ گو کہ من
می نَخُسبَم با صَنَم با پیرہن

مشکل الفاظ کے معنی

پردہ بردار: پردہ ہٹادے، نقاب اٹھادے۔

برہنہ گو: صاف صاف کہہ دے، بلا جھجک بات کر، چھپائے بغیر بیان کر۔

می نخسبم: میں نہیں سوتا (فعل حال / مستقبل)۔

صنم: محبوب، معشوق (استعارہ خدا یا حقیقتِ مطلق کے لیے)۔

پیرھن: قمیض، لباس، حجاب۔

ترجمہ

(اے مخاطب!) پردہ ہٹادے اور صاف صاف بات کر (پردے میں بات نہ کر)، کیونکہ میں اپنے محبوب کے ساتھ لباس پہن کر نہیں سوتا۔

اس شعر کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور دوسرا عرفانی (روحانی)۔

1 . صراحت کی طلب (پردہ بردار و برہنہ گو): مولانا فرماتے ہیں کہ حقائق کو پہیلیوں، استعاروں یا اشاروں کنایوں میں بیان نہ کرو۔ جب بات عشق اور معرفت کی ہو، تو وہاں ابہام کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ "برہنہ گوئی" سے مراد یہاں سچائی کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا اور بیان کرنا ہے، بغیر کسی لگی لپٹی کے۔

2 . بے حجابی کی خواہش (می نخسبم با صنم با پیرھن): یہاں "پیرہن" (لباس) سے مراد وہ دنیاوی حجاب، مصلحتیں، رسمی عبادات یا ظاہری علم ہے جو انسان اور خدا کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ میرا اور میرے محبوب (خدا) کا تعلق ایسا ہے کہ وہاں کسی قسم کی اوٹ یا رکاوٹ برداشت نہیں۔

جس طرح وصلِ محبوب کے لیے لباس ایک رکاوٹ ہے، اسی طرح وصلِ الٰہی کے لیے "خود پسندی"، "دنیاداری" اور "ظاہری رسومات" ایک لباس کی مانند ہیں جنہیں اتارے بغیر حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

پیغام: اس شعر کا اصل لب لباب یہ ہے کہ طالبِ حق کو چاہیے کہ وہ ظاہری رنگ و روپ اور لفظی بحثوں سے نکل کر روحِ حقیقت تک پہنچے۔ وہ خدا سے بلاواسطہ تعلق چاہتا ہے، ایسا تعلق جس میں کوئی "پردہ" (حجاب) باقی نہ رہے۔

مولانا رومؒ کے اس شعر کا پس منظر ان کی زندگی کے سب سے اہم موڑ، یعنی شمس تبریزؒ سے ان کی ملاقات اور ان کے درمیان ہونے والے مکالمے سے جڑا ہے۔

اس شعر کا پس منظر درج ذیل نکات میں سمجھا جا سکتا ہے:

1 . شمس تبریز اور مولانا کا مکالمہ

جب مولانا روم مثنوی لکھ رہے تھے یا حقائقِ الٰہیہ بیان کر رہے تھے، تو ایک موقع پر انہوں نے تصوف کے گہرے رازوں کو استعاروں اور تشبیہات (Metaphors) میں بیان کرنا شروع کیا۔ مولانا کے مرشد اور محبوبِ روحانی، شمس تبریز (جو ان کے کلام میں اکثر مخاطب ہوتے ہیں) نے چاہا کہ وہ ان اسرار کو ذرا ڈھکے چھپے انداز میں بیان کریں۔

2 . سچائی کی بے باکی

مولانا روم اس مقام پر اتنے بے خود اور سچائی کی تڑپ میں اتنے آگے تھے کہ انہوں نے یہ شعر کہہ کر اپنے مرشد سے تقاضا کیا کہ:

"اے شمس! مجھ سے پہیلیوں میں بات نہ کرو۔ حقائق کو الفاظ کے پردوں میں چھپا کر پیش نہ کرو، بلکہ حقیقتِ ننگی (برہنہ) کر کے دکھاؤ۔"

3' . پیرہن' (لباس) کی حقیقت

اس دور میں صوفیاء کے ہاں "پیرہن" یا لباس سے مراد انسانی عقل، منطق اور لفظی بحثیں لی جاتی تھیں۔ مولانا کا ماننا تھا کہ عقل اور الفاظ حقیقت کو چھپا لیتے ہیں۔ اس شعر کے ذریعے انہوں نے واضح کیا کہ وہ اب اس منزل پر ہیں جہاں وہ خدا یا حقیقت کو کسی واسطے یا لفظی پردے کے بغیر دیکھنا چاہتے ہیں۔

4 . عشقِ صادق کی انتہا

یہ شعر اس تڑپ کی عکاسی کرتا ہے جہاں ایک عاشق اپنے محبوب سے ملنے کے لیے تمام مصلحتوں، دنیاوی آداب اور ظاہری شرم و حیا کے پردے چاک کر دینا چاہتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ میرا عشق اتنا شدید ہے کہ میں اپنے "صنم" (محبوبِ حقیقی) کے ساتھ ذرہ برابر دوری یا حجاب (پیرہن) بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

یہ شعر دراصل علمِ لدنی (وہ علم جو براہِ راست خدا کی طرف سے عطا ہو) کی طلب کا اظہار ہے۔ مولانا روم روایتی علم اور کتابی باتوں سے اکتا چکے تھے اور وہ اس "وصل" کے خواہشمند تھے جہاں بندہ اور خدا کے درمیان کوئی تیسری چیز (لباس / پردہ) موجود نہ رہے۔

گفتم اَر عُریان شود او در عِیان
نہ تو مانی، نہ کِنارت، نہ میان

مولانا رومی کا یہ شعر معرفتِ الٰہی اور "فنا" کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ذیل میں اس کے مشکل الفاظ کے معانی

اَر (ار گر) اگر؛ عُریان۔ ننگا، بے حجاب، بغیر کسی پردے کے۔۔۔ عیان: ظاہر ہونا، سامنے آنا، آشکار ہونا

نہ تو مانی: نہ تو باقی رہے گا (تیرا وجود ختم ہو جائے گا)۔۔۔ کنار: پہلو، سمت، حد و حدود

میان: بیچ، درمیان، مرکز

. اردو ترجمہ "میں نے کہا کہ اگر وہ (حقیقتِ حق) کھلم کھلا بے حجاب ہو جائے، تو نہ تو باقی رہے گا، نہ تیری حدیں (سمتیں) باقی رہیں گی اور نہ ہی تیرا وجود (درمیان) باقی رہے گا۔"

اس شعر میں مولانا رومی انسانی عقل اور محدود وجود کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ ہم جس مادی وجود اور انا (Ego) کے سہارے زندگی گزار رہے ہیں، وہ اس وقت تک ہے جب تک ہم پر "حقیقت" مکمل طور پر منکشف نہیں ہوئی۔

الف) تجلی الٰہی کی تاب نہ لانا:

یہ شعر اس قرآنی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا:

رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ (اے میرے رب! مجھے اپنا آپ دکھا)۔ جواب ملا کہ تم دیکھ نہ سکو گے۔ جب اللہ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ مولانا کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا جمال اور اس کی حقیقت اتنی عظیم ہے کہ انسان کا محدود وجود اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

ب) فنا فی اللہ کا تصور:

"نہ تو مانی" سے مراد تصوف کا مقامِ فنا ہے۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ستاروں کا وجود ختم نہیں ہوتا، لیکن سورج کی روشنی اتنی غالب ہوتی ہے کہ ستارے نظر نہیں آتے۔ اسی طرح جب معرفتِ الٰہی کا نور کسی قلب پر براہِ راست پڑتا ہے، تو انسان کی اپنی "میں" یا اس کی شخصیت اس نور میں گم ہو جاتی ہے۔

ج) حدود کا خاتمہ (نہ کنارت نہ میان):

انسان زمان و مکان (Space and Time) کی قید میں ہے۔ ہمارے لیے "دائیں، بائیں، اوپر، نیچے" (کنار) اور "میں" (میان) کے تصورات بہت اہم ہیں۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ جب وہ بے حجاب سامنے آئے گا تو یہ تمام مادی حدود مٹ جائیں گی۔ نہ کوئی سمت رہے گی اور نہ ہی کوئی دوری یا قربت کا فرق باقی رہے گا، کیونکہ صرف وہی ہو گا۔

ہماری ہستی ایک سائے کی مانند ہے اور حق تعالیٰ کی ذات نور ہے۔ جب نورِ مطلق (سورج حقیقی) بے حجاب سامنے آتا ہے تو سایہ غائب ہو جاتا ہے۔ یہ شعر انسان کو تواضع اور اپنی حیثیت پہچاننے کی دعوت دیتا ہے کہ تیرا وجود اس وقت تک ہے جب تک تو پردے میں ہے۔

آرزو می خواہ، لیکُ اندازہ خواہ

بَر نَتابَد کوہ را یک بَرگِ کاہ

مشکل الفاظ کی وضاحت

آرزو می خواہ— آرزو مانگو؛ خواہش یا طلب کرنا۔۔۔ لیک اندازہ خواہ— لیکن حد / اندازہ کے ساتھ مانگو؛ یہاں اندازہ کا مطلب ہے مقدار، پیمانہ یا حد۔۔۔ بَر نَتابَد— برداشت نہ کرے گا؛ فعلِ منفی جو بتاتا ہے کہ کوئی چیز سہہ نہیں پائے گی۔۔۔۔ کوہ— پہاڑ؛ بہت بڑا، بھاری یا طاقتور شے۔۔۔۔ یک بَرگِ کاہ— ایک پتّا کُوتا / ایک برگِ کاہ؛ بہت ہلکی، نازک چیز (کھیت کی بھوسی یا گھاس کا ایک پتّا)۔

اردو ترجمہ

اردو ترجمہ: "خواہش مانگو، مگر حد کے ساتھ؛ ایک پتّا بھوسہ پہاڑ کو برداشت نہیں کرے گا۔"

نصیحتِ اعتدال:

رومی یہاں کہہ رہے ہیں کہ انسان کو خواہشات رکھنی چاہئیں مگر حقیقت اور حدِ استطاعت کا اندازہ بھی رکھنا چاہیے؛ غیر معقول یا حد سے بڑھ کر مانگنا نقصان دہ یا ناممکن ہو سکتا ہے.

- تمثیلی معنی:

پہاڑ بڑے مقاصد، طاقت یا ذمہ داری کی علامت ہے؛ ایک برگِ کاہ معمولی وسائل یا کمزور کوشش کی علامت۔ مصرعہ بتاتا ہے کہ جب مقصد بہت بڑا ہو تو اس کے لیے مناسب وسائل، تیاری یا پیمانہ درکار ہے؛ چھوٹی کوششیں ناکافی رہیں گی۔

- اخلاقی اور روحانی زاویہ:

مثنوی میں اکثر مادی اور روحانی دونوں سطحوں پر نصیحت ہوتی ہے — یہاں بھی رومی ممکنہ طور پر روحانی سفر یا عشقِ الٰہی میں اعتدال اور مناسب تقویٰ کی طرف اشارہ کرتے ہیں: خواہش ہو مگر پیمانہ اور حکمت کے ساتھ.

- عملی سبق:

منصوبہ بندی، وسائل کا جائزہ، اور حقیقت پسندانہ توقعات رکھنا ضروری ہیں؛ بلند خواہشات کو چھوٹے قدموں، مناسب تیاری اور مناسب مدد کے ساتھ جوڑا جائے تو کامیابی ممکن ہے۔

بلاغی اور ادبی پہلو

- استعارہ اور تضاد: رومی نے متضاد اشیاء (کوہ اور برگِ کاہ) کے ذریعے قوتِ بیان بڑھائی؛ یہ قاری کو فوراً حقیقتِ امکان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

- حکایتی سیاق: مثنوی میں یہ مصرعہ عام طور پر نصیحت یا حکایت کے بیچ آتا ہے جہاں شمس تبریزی یا روحانی رہنمائی کا ذکر ملتا ہے؛ اسی وجہ سے مصرعہ کا مفہوم مادی اور روحانی دونوں سطحوں پر پڑھا جاتا ہے۔

- روحانی زاویہ:

عشقِ الٰہی یا روحانی سفر میں بلند آرزو رکھنا جائز ہے مگر تقویٰ، تیاری اور استاد کی رہنمائی ضروری ہے؛ ورنہ معمولی عمل بڑے مقصد کو پورا نہیں کرے گا۔

گھاس کا تنکا اور پہاڑ (مثال) : دوسرے مصرعے میں ایک خوبصورت تشبیہ دی گئی ہے۔ پہاڑ "عظمت اور بھاری بوجھ" کی علامت ہے، جبکہ تنکا "کمزوری اور بے مائیگی" کی علامت ہے۔ اگر ایک تنکے پر پہاڑ رکھ دیا جائے تو وہ دب کر ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر ایک کمزور شخصیت کا حامل انسان کسی ایسی بھاری ذمہ داری یا آرزو کا بوجھ اٹھانے کی کوشش کرے جس کی اس میں سکت نہیں، تو وہ ذہنی یا جسمانی طور پر بکھر جائے گا۔

پیغام (حاصلِ کلام) : یہ شعر قناعت پسندی کا درس نہیں دیتا بلکہ **"خودی کی تربیت"** کا درس دیتا ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم "پہاڑ" جیسی بڑی آرزو رکھنا چاہتے ہو، تو پہلے خود کو "تنکے" سے نکال کر "چٹان" بناؤ۔ اپنی

صلاحیت بڑھاؤ تا کہ تم بڑے مقاصد کا بوجھ اٹھا سکو۔ بے جا خیالی پلاؤ اور اپنی اوقات سے بڑھ کر دعوے انسان کو مضحکہ خیز یا ناکام بنا دیتے ہیں۔

آفتابی کَز وِیْ این عالَم فُروخت
اندکی گر پیش آید، جُملہ سوخت

اس شعر میں حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ ایک نہایت خوبصورت مثال (سورج) کے ذریعے سمجھا رہے ہیں، "اللہ تعالیٰ کی تجلی اور انسانی استطاعت کے درمیان تعلق کو"۔

مشکل الفاظ کے معانی

آفتابی: سورج، روشن کرنے والا، چمکدار۔۔۔کَز: "کہ از" کا مخفف، یعنی "جو اس سے"۔۔۔وی: اس کا / اس سے (ضمیر واحد)۔۔۔۔عالم: دنیا، کائنات، جہان۔۔۔فروخت: (یہاں) روشن کیا، منور کیا، (لفظی معنی "بیچا" لیکن استعاری استعمال)۔۔۔اندکی: تھوڑا سا، قلیل۔۔۔۔گر: اگر۔۔۔پیش آید: قریب آئے، نزدیک آئے

جملہ: سب کچھ، تمام۔۔۔۔سوخت: جل گیا، بھسم ہو گیا

ترجمہ:

وہ سورج جس سے یہ سارا جہان روشن ہے، اگر وہ (اپنی جگہ سے) ذرا سا بھی قریب آجائے تو سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے۔

اس شعر کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری (سائنسی و مادی) اور دوسرا باطنی (روحانی)۔

1. مادی پہلو: شاعر کہتا ہے کہ سورج کی روشنی اور تپش زمین پر زندگی کے لیے ضروری ہے، لیکن اس کی ایک خاص حد اور فاصلہ مقرر ہے۔ اگر سورج اپنے مقررہ فاصلے سے ذرا بھی زمین کے قریب آجائے تو

اس کی حدت اتنی بڑھ جائے گی کہ زمین پر موجود ہر جاندار اور مادہ جل کر ختم ہو جائے۔ یعنی کائنات کا نظام ایک توازن پر قائم ہے۔

2. روحانی و عرفانی پہلو (اصل مقصود): مولانا رومیؒ یہاں سورج سے مراد اللہ تعالیٰ کی تجلی اور نور لے رہے ہیں۔ وہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ: یہ ساری کائنات اللہ کے نور سے روشن ہے، لیکن اللہ نے اپنی تجلی کو حجابات (پردوں) میں رکھا ہوا ہے۔ انسان کی حقیقت اتنی کمزور ہے کہ وہ اللہ کے اصل نور اور اس کی پوری تجلی کا براہِ راست سامنا نہیں کر سکتا۔ جس طرح سورج کی قربت جسموں کو جلا دیتی ہے، اسی طرح اگر اللہ اپنی پوری تجلی کے ساتھ ظاہر ہو جائے تو انسانی عقل اور وجود اسے برداشت نہیں کر پائیں گے اور فنا ہو جائیں گے۔

یہ شعر انسان کی محدودیت اور اللہ کی لامحدود قدرت و جلال کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم اللہ کے فضل اور اس کے نور سے فیضیاب تو ہو رہے ہیں، لیکن اس کی ذات کی گہرائی اور اس کے جلالِ کامل کو پانے کی ہم میں ابھی سکت نہیں ہے۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر قرآن مجید کی آیات اور احادیثِ مبارکہ کے مفاہیم کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ جب ہم اسے اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، تو اس کی تشریح میں درج ذیل پہلو نمایاں ہوتے ہیں:

تجلیِ الٰہی اور واقعہِ طور

اس شعر کی سب سے بہترین قرآنی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے جب انہوں نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ-قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ-قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْۚ-فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًاۚ-فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ 143) الاعرف (

"جب موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے مقررہ وقت پر آئے اور ان کے رب نے ان سے کلام کیا، تو عرض کیا: اے میرے رب! مجھے (اپنا جلوہ) دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ ارشاد ہوا: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تم مجھے دیکھ سکو گے۔ پس جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش ہوا بولا پاکی ہے تجھے میں تیری طرف رجوع لایا اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔ (سورۃ الاعراف: 143)

مولانا رومیؒ یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ "سورج" (نورِ الٰہی) اگر ذرا سا قریب آ جائے (بے حجاب ہو جائے) تو پہاڑ جیسا مضبوط وجود بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا اور "جل" یا "ریزہ ریزہ" ہو جاتا ہے۔

اللہ کے نورانی حجابات (حدیثِ نبوی ﷺ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اور مخلوق کے درمیان نور کے پردے رکھے ہیں تا کہ مخلوق اس کی ہیبت سے فنا نہ ہو جائے۔

حدیثِ مبارکہ ہے:

حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ، عَنْ أَبِي عُبَيْدَةَ، عَنْ أَبِي مُوسَى، قَالَ: قَامَ فِينَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ: "إِنَّ اللَّهَ لَا يَنَامُ، وَلَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَنَامَ، يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ، يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ، وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ، حِجَابُهُ النُّورُ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهَى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ". سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: 195

تخریج الحدیث دارالدعوہ: « صحیح مسلم / الإیمان 79 (179)، (تحفة الأشراف: 9146)، وقد أخرجہ: مسند احمد (4/395، 400، 405) (صحیح) »

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور پانچ باتیں بیان فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ سوتا نہیں اور اس کے لیے مناسب بھی نہیں کہ سوئے، میزان کو اوپر نیچے کرتا ہے، رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے اس تک پہنچا دیا جاتا ہے، اس کا حجاب نور ہے، اگر اس کو ہٹا دے تو اس کے چہرے کی تجلیات ان ساری مخلوقات کو جہاں تک اس کی نظر پہنچے جلا دیں۔

یہ حدیث بعینہِ اس شعر کا مفہوم بیان کر رہی ہے کہ کائنات کی بقا ان "حجابات" (پردوں) کی مرہونِ منت ہے۔ اگر وہ نور اپنی اصلی شدت کے ساتھ سامنے آجائے تو "جملہ سوخت" (سب کچھ جل جائے)۔

نورِ الٰہی سے کائنات کی روشنی

شعر کا پہلا مصرعہ (جس سے یہ عالم روشن ہے) قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

"اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ" (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے)۔

یعنی کائنات میں جو بھی خوبصورتی، روشنی اور زندگی ہے، وہ اللہ ہی کے نور کا عکس ہے۔ لیکن یہ عکس "برائے ہدایت" ہے، "برائے فنا" نہیں۔ سورج کی روشنی زندگی دیتی ہے، لیکن سورج کی ذات (قربت) زندگی ختم کر دیتی ہے۔

انسانی استعداد اور اعتدال

اسلامی تعلیمات کے مطابق، انسان کو دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ اللہ کی صفات کا مشاہدہ کرے، نہ کہ اس کی ذات کی حقیقت میں گم ہو کر خود کو ہلاک کر لے۔

سنتِ نبوی ﷺ کا پہلو: معراج کے موقع پر نبی کریم ﷺ کو وہ ہمت اور بینائی عطا کی گئی جو کسی اور بشر کو نہیں ملی۔ عام انسان کے لیے دنیاوی آنکھ سے اس نور کا ادراک ناممکن ہے، جیسا کہ قرآن نے فرمایا: "آنکھیں اسے پا نہیں سکتیں" (الأنعام:103).

قرآن و سنت کی روشنی میں اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ:

خالق اور مخلوق کے درمیان ایک مقدس فاصلہ اور پردہ ضروری ہے، ورنہ مخلوقِ فانی، خالقِ باقی کے جلال کی تاب نہیں لا سکتی۔ اللہ کی رحمت اس کے غضب / جلال پر سبقت لے گئی ہے، اسی لیے اس نے اپنے جلال کو حجاب میں رکھا ہے تاکہ کائنات کا نظام چلتا رہے۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر سائنسی حقائق اور فلسفیانہ گہرائی کا ایک سنگم ہے۔ آیئے اسے ان دونوں زاویوں سے دیکھتے ہیں:

سائنسی تشریح (Scientific Perspective)

سائنسی نقطہ نظر سے اس شعر میں توازن (Equilibrium) اور فاصلے (Distance) کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

حیاتیاتی زون (Goldilocks Zone): ہماری زمین سورج سے ایک خاص فاصلے پر ہے جسے ماہرینِ فلکیات "Habitable Zone" کہتے ہیں۔ اگر زمین سورج کے ذرا سا قریب ہو جائے (اندکی گر پیش آید)، تو درجہ حرارت اتنا بڑھ جائے گا کہ سمندروں کا پانی بخارات بن کر اڑ جائے گا اور زندگی کا نام و نشان مٹ جائے گا (جملہ سوخت)۔

توانائی کا بہاؤ (Energy Flux): سورج کے مرکز میں نیوکلیائی فیوژن (Nuclear Fusion) کا عمل ہو رہا ہے۔ اگرچہ یہ توانائی کائنات کو روشن رکھتی ہے، لیکن اس کی بے پناہ حدت سے ہمیں زمین کا غلاف (Atmosphere) اور اوزون کی تہہ بچاتی ہے۔ رومی کا یہ شعر مادّی دنیا کے اس نازک توازن کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ روشنی زندگی کے لیے ضروری ہے، مگر اس کی حدت سے دوری بھی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔

فلسفیانہ تشریح (Philosophical Perspective)

فلسفے میں اس شعر کو "حقیقت" اور "ادراک" کے درمیان تعلق کے طور پر دیکھا جاتا ہے:

حقیقتِ مطلق اور انسانی عقل: فلسفیوں (جیسے افلاطون) کا خیال ہے کہ "حقیقتِ مطلق (Absolute Truth)" ایک تیز روشنی کی طرح ہے۔ انسانی عقل اس حقیقت کو براہِ راست اور مکمل طور پر برداشت نہیں کر سکتی۔ جس طرح آنکھ سورج کو براہِ راست نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح انسانی عقل حقیقت کو پردوں میں دیکھتی ہے۔ اگر حقیقت کا مکمل ادراک یکدم ہو جائے تو انسانی شعور مٹ جائے گا۔

وجود اور فنا کا فلسفہ: صوفیانہ فلسفے (وحدت الوجود) کے مطابق، اللہ کی ہستی "حقیقی وجود" ہے اور کائنات "سایہ" ہے۔ اگر اصل (سورج) اپنے سائے کے بہت قریب آ جائے، تو سایہ ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر بندہ اللہ کی ذات میں فنا ہونے کی کوشش کرے تو اس کا اپنا انفرادی وجود (Ego) ختم ہو جاتا ہے۔

تضاد کی ضرورت (The Dialectics of Contrast): فلسفہ یہ کہتا ہے کہ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اگر سورج ہر وقت بالکل قریب ہو تو "روشنی" کا تصور ہی ختم ہو جائے گا کیونکہ سب کچھ جل کر خاک ہو چکا ہو گا۔ روشنی کا فائدہ اٹھانے کے لیے اندھیرے کا ہونا اور روشنی سے ایک خاص فاصلہ رکھنا ضروری ہے۔

حاصلِ بحث

سائنس کہتی ہے کہ مادّی بقا کے لیے سورج سے فاصلہ ضروری ہے، جبکہ فلسفہ کہتی ہے کہ ذہنی اور وجودی بقا کے لیے حقیقتِ مطلق سے ایک پردہ ضروری ہے۔ مولانا رومیؒ نے ایک ہی شعر میں کائنات کے اس عظیم قانون کو سمو دیا ہے کہ "توازن ہی زندگی ہے"۔

اس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے افلاطون کی "غار کی تمثیل (Allegory of the Cave)" کا ذکر کروں، جو اس شعر کے فلسفیانہ پہلو سے بہت ملتی جلتی ہے؟

افلاطون کی "غار کی تمثیل (Allegory of the Cave)" مولانا رومیؒ کے اس شعر کے فلسفیانہ پہلو کو سمجھنے کے لیے ایک بہترین مثال ہے۔ یہ تمثیل افلاطون کی مشہور کتاب 'جمہوریت (The Republic)' کا حصہ ہے، جو حقیقت اور انسانی ادراک کے تعلق کو واضح کرتی ہے۔

تمثیل کا خلاصہ

افلاطون ایک خیالی غار کا منظر پیش کرتا ہے جہاں کچھ قیدی پیدائشی طور پر زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔
غار کی زندگی: ان کا رخ ایک دیوار کی طرف ہے اور ان کے پیچھے آگ جل رہی ہے۔ آگ کی روشنی کی وجہ سے دیوار پر مختلف اشیاء کے سائے بنتے ہیں۔ قیدیوں کے لیے وہ سائے ہی "اصل حقیقت" ہیں۔
باہر نکلنا: ان میں سے ایک قیدی آزاد ہو کر غار سے باہر نکلتا ہے۔ جب وہ پہلی بار سورج کی روشنی دیکھتا ہے، تو اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور اسے شدید تکلیف ہوتی ہے (یہ رومی کے "جملہ سوخت" کی ایک کیفیت ہے جہاں پرانی سوچ جل کر ختم ہو رہی ہے)۔

حقیقت کا ادراک

آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں سورج کی روشنی کی عادی ہو جاتی ہیں اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ غار کے سائے محض دھوکہ تھے، اصل حقیقت تو یہ سورج ہے۔
رومی کے شعر اور افلاطون کے فلسفے کا ربط
اس تمثیل اور رومی کے شعر میں تین اہم نکات مشترک ہیں

سورج بطور حقیقتِ مطلق

افلاطون کے ہاں سورج "خیرِ مطلق (The Good) "یا خدا کی ذات کی علامت ہے۔ جس طرح رومی کہتے ہیں کہ اسی آفتاب سے عالم روشن ہے، افلاطون بھی کہتا ہے کہ باہر کی اصل دنیا سورج ہی کی مرہونِ منت ہے۔

براہِ راست سامنا کرنے کی تاب نہ لانا

افلاطون کہتا ہے کہ اگر قیدی کو اچانک سورج کے سامنے کھڑا کر دیا جائے، تو وہ اندھا ہو سکتا ہے۔ یہی بات رومی کہہ رہے ہیں کہ "اندکی گر پیش آید، جملہ سوخت"۔ یعنی حقیقت کا براہِ راست اور اچانک ظہور انسانی برداشت سے باہر ہے۔

تدریجی رسائی :(Gradual Realization) جس طرح قیدی پہلے سائے، پھر عکس اور آخر میں سورج کو دیکھتا ہے، اسی طرح رومی بھی یہ سبق دیتے ہیں کہ اللہ کے نور تک پہنچنے کے لیے مراحل اور پردوں کی ضرورت ہے تاکہ انسانی روح آہستہ آہستہ اس جلال کی عادی ہو سکے۔

نتیجہ

سائنسی طور پر سورج کی قربت جسم کو جلاتی ہے، اور فلسفیانہ طور پر حقیقتِ مطلق کی اچانک تپش انسانی عقل اور انا کو جلا دیتی ہے۔ مولانا رومیؒ اور افلاطون دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کو اس "سورج" سے فیض تو لینا چاہیے، لیکن اپنی محدودیت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک توازن برقرار رکھنا چاہیے۔

علامہ اقبال نے اسی فلسفے (نور اور تجلی) کو اپنے کلام میں کس طرح بیان کیا ہے؟ ان کا نظریہ رومی سے بہت متاثر رہا ہے۔ وجدانی تشریح کا تعلق عقل، منطق یا سائنس سے نہیں بلکہ دل کی کیفیت اور رُوح کے تجربے سے ہوتا ہے۔ وجدان (Intuition/Mysticism) میں اس شعر کو ایک "تڑپ" اور "فنا و بقا" کے راز کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

1. تجلی اور ظرفِ انسانی

وجدان کی دنیا میں "سورج" سے مراد وہ حقیقتِ کُل ہے جو سالک (روحانی مسافر) کے دل پر اترتی ہے۔ رومی وجدانی طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ کا نور ہر وقت ہم پر برس رہا ہے، لیکن ہم نے اپنے اوپر "انا (Ego) " کے پردے ڈال رکھے ہیں۔

وجدانی نکتہ: یہ "فاصلہ" جو سورج اور ہمارے درمیان ہے، دراصل ہماری بشریت کا پردہ ہے۔ اگر یہ پردہ ذرا سا بھی ہٹ جائے اور وہ نور براہِ راست دل پر پڑے، تو انسان کا اپنا "آپ (Individual Self) " جل کر راکھ ہو جائے گا اور صرف "وہی" باقی رہ جائے گا۔

2. ہلاکت میں زندگی (فنا کا تصور)

عام طور پر جلنا "موت" کی علامت ہے، لیکن وجدان میں یہ "اصل زندگی" کا آغاز ہے۔

وجدانی نکتہ: رومی اس شعر میں ایک ڈر بھی پیدا کر رہے ہیں اور ایک دعوت بھی دے رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ تمہاری ہستی اس قابل نہیں کہ اس کا سامنا کرے، مگر وجدانی طور پر ایک صوفی کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ: "کاش وہ تھوڑا قریب آئے اور میں جل کر خاک ہو جاؤں"۔ اسے تصوف میں "فنا فی اللہ" کہتے ہیں۔ یعنی قطرے کا سمندر میں گر کر اپنی پہچان کھو دینا۔

3 . حجابِ دوری اور لذتِ وصال

وجدانی طور پر اس شعر میں "اندکی گر پیش آید" (اگر ذرا سا قریب آئے) میں ایک حسرت چھپی ہے۔

سالک جانتا ہے کہ اگر وہ نور قریب آیا تو یہ مادی وجود جل جائے گا، لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جب تک یہ وجود جلے گا نہیں، "وصل" (میلاپ) ممکن نہیں۔

وجدان کہتا ہے: یہ سورج دور ہے تو دنیا روشن ہے (عالم فروخت)، لیکن یہ سورج قریب آئے گا تو "میں" نہیں رہوں گا، صرف "نور" ہو گا۔ یہ فنا ہونے کا خوف اور بقا پانے کی تڑپ اس شعر کی روح ہے۔

4 . عشق کی حدت

رومی کے ہاں عشق ایک آگ ہے۔ وجدانی طور پر وہ یہ سمجھا رہے ہیں کہ اللہ کی محبت کا ایک ادنیٰ سا قطرہ یا ذرہ بھی اگر دل میں اتر جائے تو وہ دنیا کی تمام محبتوں، خواہشوں اور حرص و ہوس کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

جس طرح سورج کے قریب آتے ہی ہر چیز بھسم ہو جاتی ہے، اسی طرح عشقِ حقیقی جب قریب آتا ہے تو انسان کے اندر کا "غیر اللہ" جل کر ختم ہو جاتا ہے۔

وجدانی خلاصہ

وجدانی طور پر یہ شعر عجز اور نیاز کا اظہار ہے

"اے اللہ! تیرا نور تو اس کائنات کی جان ہے، لیکن میری ہستی اتنی بے مایہ ہے کہ میں تیرے جلال کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اگر تو ذرا سا بے نقاب ہو جائے تو میرا 'وہمِ وجود' مٹ جائے۔ پس تو پردے میں رہ کر ہی مجھے زندگی دے رہا ہے، اور تیرا یہ پردہ رکھنا بھی تیری مجھ پر مہربانی ہے۔"

ایک آخری وجدانی شعر جو اس کیفیت کو مکمل کرتا ہے:

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ رومی کا یہ شعر انسان کو اپنی اصل اوقات اور اللہ کی عظمت کا بیک وقت احساس دلاتا ہے؟ اس وجدانی کیفیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فِتنہ و آشوب و خون ریزی مَجوی
بیش ازین از شَمسِ تبریزی مگوی

یہاں مولانا رومیؒ اپنی کیفیتِ عشق اور شمس تبریزیؒ کے ذکر سے پیدا ہونے والی بے خودی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مشکل الفاظ کے معانی

فتنہ: ہنگامہ، آزمائش، فتنہ و فساد....۔ آشوب: بے چینی، اضطراب، کھلبلی۔۔۔خونریزی: خون بہانا(مراد: حد سے زیادہ تڑپ اور مٹ جانے کی کیفیت)۔۔۔۔ مجوی: نہ تلاش کر، نہ ڈھونڈ (جوئی سے مخفف)

بیش :زیادہ ۔۔۔ شمسِ تبریزی: مولانا رومیؒ کے مرشدِ کامل کا نام ۔۔۔مگوی: نہ کہہ، مت بول (گفتن سے مخفف)

ترجمہ:

(اے دل یا اے مخاطب!) اب فتنہ، ہنگامہ اور خونریزی تلاش نہ کر، اور اس سے زیادہ اب شمسِ تبریزیؒ کے بارے میں کچھ نہ کہہ (کیونکہ ان کا ذکر وہ تپش پیدا کر رہا ہے جو برداشت سے باہر ہے)۔

اس شعر میں مولانا رومیؒ ایک عجیب و غریب نفسیاتی اور روحانی کیفیت کا اظہار کر رہے ہیں

شمسِ تبریزیؒ کا ذکر اور جلالِ الٰہی

رومیؒ کے نزدیک شمس تبریزیؒ محض ایک انسان نہیں تھے، بلکہ وہ اللہ کے نور اور تجلی کا آئینہ تھے۔ پچھلے شعر میں رومیؒ نے کہا تھا کہ اگر سورج (تجلی) ذرا قریب آجائے تو سب جل جائے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ شمس (جس کا مطلب ہی سورج ہے) کا ذکر چھیڑنا گویا اس آگ کو دعوت دینا ہے۔

"فتنہ و آشوب" سے مراد

یہاں فتنہ و خونریزی سے مراد کوئی جنگ نہیں، بلکہ عشق کی وہ انتہا ہے جہاں انسان کا اپنی عقل پر قابو نہیں رہتا۔ رومیؒ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر شمسؒ کے بارے میں مزید بات کی گئی تو سننے والے اور خود کہنے والے کا وجود اس وجد اور تڑپ کی تاب نہ لا کر "ریزہ ریزہ" ہو جائے گا۔

خاموشی کی تلقین

رومیؒ اپنے آپ کو روک رہے ہیں۔ وہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ شمس تبریزیؒ کی حقیقت ایسی ہے کہ اگر اسے بیان کیا جائے تو دنیا میں ایک تہلکہ مچ جائے، عقلیں حیران رہ جائیں اور لوگ اس کی گہرائی کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے گمراہ ہو سکتے ہیں یا فانی وجود کو ہلاک کر سکتے ہیں۔

وجدانی نکتہ

جب صوفی پر تجلیات کی بارش ہوتی ہے، تو ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ "اب بس، میں مزید برداشت نہیں کر سکتا"۔ یہ شعر اسی انتہائے شوق کا نام ہے جہاں بیان عاجز آجاتا ہے اور خاموشی ہی سلامتی بن جاتی ہے۔

رومیؒ فرماتے ہیں کہ شمسِ تبریزیؒ کے انوار و اسرار کی تپش اتنی زیادہ ہے کہ اب اس سے زیادہ ذکر نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عشق کا ہنگامہ ہمیں اور پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کر دے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کی قرآن و سنت کی روشنی میں تشریح نہایت عمیق ہے۔بظاہر یہ شعر شمس تبریزیؒ کے بارے میں ہے، لیکن حقیقت میں یہ "اسرارِ الٰہی کی حفاظت" اور "بشری طاقت کی حد" کا بیان ہے۔

فتنہ اور آزمائش

قرآن مجید میں "فتنہ" کے ایک معنی "آزمائش" کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نور اور اس کے اسرار ہر ایک کے لیے نہیں ہوتے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ "ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے فتنہ (آزمائش) میں ڈالا" (سورۃ الانعام: 53)۔

اللہ کے خاص بندوں (اولیاء) کی حقیقت کو ظاہر کر دینا عام لوگوں کے لیے "فتنہ" بن سکتا ہے کیونکہ ان کی عقلیں اس مقام کو نہیں سمجھ سکتیں۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ شمسؒ کے رازوں کو مزید نہ کھولو، ورنہ لوگ اپنی کم علمی کی وجہ سے فتنہ و آشوب میں پڑ جائیں گے۔

کتمانِ سر (راز کو چھپانا- سنتِ نبوی ﷺ)

سنتِ نبوی ﷺ میں یہ اصول ملتا ہے کہ ہر بات ہر انسان کے سامنے نہیں کہی جاتی، بلکہ مخاطب کی عقل کے مطابق بات کی جاتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کیے۔ ایک کو تو میں نے (لوگوں میں) پھیلا دیا، لیکن اگر میں دوسرے کو پھیلاؤں تو میرا یہ گلا کاٹ دیا جائے"۔ (صحیح بخاری)

رومیؒ کا "خونریزی" کا لفظ اسی نبوی ﷺ بصیرت کی طرف اشارہ ہے کہ کچھ حقائق ایسے بھاری ہوتے ہیں کہ اگر انہیں عام کر دیا جائے تو وہ جان لیوا ثابت ہو سکتے ہیں یا معاشرے میں اضطراب پیدا کر سکتے ہیں۔

جلالِ الٰہی سے لرزہ بر اندام ہونا

قرآن میں بیان ہے کہ جب اللہ کی تجلی یا اس کا کلام نازل ہوتا ہے تو پہاڑ بھی لرز جاتے ہیں۔

ارشاد ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل فرماتے تو (اے مخاطب!) تو اسے دیکھتا کہ وہ اللہ کے خوف سے جھک جاتا، پھٹ کر پاش پاش ہو جاتا، اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کر رہے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں o (سورۃ الحشر: 21)۔

شمس تبریزیؒ کا وجود رومیؒ کے لیے اسی جلالِ الٰہی کا مظہر تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا ذکر جاری رہا تو سننے والوں کے دل اس کی ہیبت سے پاش پاش ہو جائیں گے، اسی لیے وہ "فتنہ و آشوب" سے بچنے کے لیے خاموشی مانگ رہے ہیں۔

اتباعِ نبوی ﷺ اور اعتدال

سنت کا ایک اہم پہلو "اعتدال" ہے۔ حد سے زیادہ وجد اور استغراق انسان کو دنیا کے فرائض سے غافل کر سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ صحابہ کرام کی تربیت میں توازن رکھا

رومیؒ یہاں ایک "توازن" قائم کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ عشق کی اس آگ کو اتنا نہ بھڑکاؤ کہ مادی وجود کی بساط ہی الٹ جائے (خونریزی ہو جائے)۔ شریعت کا تقاضا ہے کہ انسان ہوش و حواس میں رہ کر احکامِ الٰہی پر عمل کرے۔

یہ شعر اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ:

اللہ کے پیاروں کی حقیقت ایک پوشیدہ راز ہے جسے ہر جگہ بیان کرنا فتنہ پیدا کر سکتا ہے۔ انسان کو صرف اتنا ہی علم اور تجلی طلب کرنی چاہیے جتنا اس کا ظرف برداشت کر سکے۔

خاموشی اور ادب معرفت کے راستے میں "فتنہ و آشوب" سے بچنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

ریاضی اور جیومیٹری کے اصولوں پر اس شعر کی بحث

تناسب(Proportion)، لامحدودیت (Infinity) اور منطقی نمونوں (Patterns) کے گرد گھومتی ہے۔ جب ہم "شمس "(سورج / مرکز)اور "فتنہ و آشوب) "افراتفری (Entropy / کی بات کرتے ہیں، تو ریاضیاتی اعتبار سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱ . مرکزیت اور مرکز گریز قوت(Centripetal vs Centrifugal Force)

جیومیٹری میں ایک دائرہ اس وقت تک مکمل اور متوازن رہتا ہے جب تک اس کا ایک مرکز (Center) ہو۔

تشریح: شمس تبریزی اس دائرے کا "مرکز" ہیں۔ اگر مرکز کی قوت (Energy) حد سے بڑھ جائے، تو دائرے کا محیط (Circumference) اسے برقرار نہیں رکھ پاتا اور وہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔

ریاضیاتی طور پر، اگر مرکز کی شدت مادی ڈھانچے کی برداشت سے باہر ہو جائے، تو توازن (Equilibrium) بگڑ جاتا ہے، جسے شعر میں "فتنہ و آشوب" کہا گیا ہے۔

۲ . لامتناہیت کا تصور (The Concept of Infinity

∞

)

ریاضی میں کچھ اعداد یا مساواتیں ایسی ہوتی ہیں جو "Singularity" کی طرف لے جاتی ہیں (جیسے کسی عدد کو صفر سے تقسیم کرنا)۔

Singularity: یہ وہ نقطہ ہے جہاں ریاضی کے تمام قوانین کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ وہاں مقدار لامحدود ہو جاتی ہے۔

شمس تبریزی کی شخصیت رومی کے لیے وہ Singularity Point ہے جہاں پہنچ کر انسانی عقل کی منطق (Logic) مٹ جاتی ہے۔ "بیش ازیں مگو" کا ریاضیاتی مطلب یہ ہے کہ اب حساب کتاب کی حد ختم ہو گئی ہے اور ہم لامتناہیت میں داخل ہو رہے ہیں، جہاں مزید بحث "Error" یا "Chaos" پیدا کرے گی۔

۳. فریکٹلز اور افراتفری کا نظریہ (Chaos Theory and Fractals)

کوس تھیوری (Chaos Theory) کے مطابق، بظاہر نظر آنے والی بے ترتیبی (فتنہ) کے پیچھے ایک گہری ترتیب چھپی ہوتی ہے۔

فریکٹلز :(Fractals) یہ ایسی جیومیٹریکل اشکال ہیں جو لامتناہی طور پر خود کو دہراتی ہیں۔

روحانی طور پر، شمس کی باتیں بظاہر "فتنہ و آشوب" معلوم ہوتی ہیں، لیکن جیومیٹری کے لحاظ سے وہ ایک اعلیٰ ترتیب (Higher Order) کا حصہ ہیں جسے عام انسانی پیمانہ (Euclidean Geometry) ناپنے سے قاصر ہے۔

۴. تناسب اور سنہرا اصول - Golden Ratio)

Φ

)

کائنات کی ہر چیز ایک خاص تناسب میں خوبصورت لگتی ہے۔

اگر کسی تصویر میں روشنی کا تناسب ضرورت سے زیادہ بڑھا دیا جائے تو تصویر "وائٹ آؤٹ (White out) "ہو جاتی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

رومی ڈرتے ہیں کہ اگر شمس کی حقیقت کا "پکسل" یا "تناسب" مزید بیان کیا گیا، تو سننے والے کا ذہنی پردہ (Resolution) اسے برداشت نہیں کر سکے گا اور بصیرت کی جگہ "خون ریزی" (اندرونی ٹوٹ پھوٹ) لے لے گی۔

ریاضیاتی عنصر ادبی علامت مفہوم

Infinity (

∞

) شمس تبریزی وہ علم یا ہستی جس کی کوئی حد نہیں

Chaos Theory فتنہ و آشوب بظاہر بے ترتیبی، مگر اصل میں اعلیٰ سچائی

Singularity بیش ازیں مگو وہ مقام جہاں انسانی منطق ختم ہو جائے

Export to Sheets

خلاصہ: ریاضیاتی طور پر یہ شعر ایک محدود سیٹ (Finite Set) اور لا محدود سیٹ (Infinite Set) کے ٹکراؤ کا بیان ہے۔ جب ایک محدود عقل، لا محدود حقیقت کو لفظوں میں قید کرنے کی کوشش کرتی ہے، تو منطق کا نظام "Crash" کر جاتا ہے۔

کوانٹم فزکس (Quantum Physics) کے آئینے میں جب ہم اس شعر کو دیکھتے ہیں، تو یہاں مشاہدہ (Observation) اور مادے کی حقیقت کے دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔

١. ہائزنبرگ کا اصولِ غیر یقینی (Uncertainty Principle)

کوانٹم فزکس کا یہ اصول کہتا ہے کہ آپ ایک ہی وقت میں کسی ذرے کی مقام (Position) اور رفتار (Momentum) دونوں کو پوری درستی کے ساتھ معلوم نہیں کر سکتے۔

روحانی مماثلت: شمس تبریزی ایک ایسی "کوانٹم اسٹیٹ" ہیں جنہیں اگر لفظوں کے مادی قالب (Position) میں قید کیا جائے تو ان کی اصل روحانی لہر (Momentum/Energy) ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ "بیش ازیں مگو" (مزید مت کہو) دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ جوں جوں ہم حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کی وسعت اور گہرائی ہمارے ادراک سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔

۲. مشاہدہ کار کا اثر (Observer Effect)

کوانٹم فزکس میں مشاہدہ کرنے والا (Observer) جس چیز کو دیکھتا ہے، اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ لہر (Wave) ذرے (Particle) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

تشریح: رومی جانتے ہیں کہ شمس تبریزی ایک "روحانی لہر" کی مانند ہیں جو لامتناہی ہے۔ جب اسے الفاظ کی زبان میں لایا جائے گا (یعنی اس کا مشاہدہ کر کے اسے بیان کیا جائے گا)، تو وہ اپنی وسعت کھو کر ایک محدود "ذرہ" بن جائے گی۔ یہ محدودیت روح کے لیے "آشوب" اور "خون ریزی" کے مترادف ہے کیونکہ یہ حقیقتِ کبریٰ کی توہین یا اس کی تحقیر ہے۔

۳. کوانٹم انٹینگلمنٹ (Quantum Entanglement)

دو ذرات جو ایک دوسرے سے جڑے ہوں، چاہے کائنات کے دو الگ کونوں میں ہوں، ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

رومی اور شمس کا تعلق: رومی اور شمس کی مثال دو ایسے ہی انٹینگلڈ (Entangled) ذرات کی ہے۔ ایک کی کیفیت دوسرے میں فوری طور پر منتقل ہوتی ہے۔ جب رومی "خون ریزی" کی بات کرتے ہیں، تو وہ اس شدید

اندرونی تبدیلی کی بات کر رہے ہیں جو شمس کی ایک "روحانی حرکت" سے ان کے اپنے وجود میں برپا ہو رہی ہے۔

یہ تعلق زمان و مکان (Space and Time) سے آزاد ہے۔

۴. اینٹروپی اور نظام کا بکھرنا(Entropy and Chaos)

تھرموڈائنامکس کا دوسرا قانون کہتا ہے کہ کائنات میں بے ترتیبی (Entropy) ہمیشہ بڑھتی ہے۔

فلسفیانہ تعبیر: شمس کی گفتگو کا "ان پٹ (Input) "رومی کے وجود میں اتنی زیادہ اینٹروپی پیدا کرتا ہے کہ ان کا پرانا فکری نظام (عقلی ڈھانچہ) منہدم ہونے لگتا ہے۔ اس بکھرنے کے عمل کو "فتنہ و آشوب" کہا گیا ہے، جو کہ اصل میں ایک نئی اور اعلیٰ ترتیب کی تشکیل کا پیش خیمہ ہے۔

خلاصہِ بحث

اگر ہم ریاضی، جیومیٹری اور فزکس کو یکجا کریں تو یہ شعر ہمیں بتاتا ہے کہ:

حقیقت ہمیشہ بیان سے بڑی ہوتی ہے۔

لامتناہی کو محدود پیمانوں میں ناپنے کی کوشش نظام کو درہم برہم (Crash) کر دیتی ہے۔

خاموشی وہ واحد مقام ہے جہاں توازن(Equilibrium)برقرار رہ سکتا ہے۔

این ندارد آخرِ، از آغازُ گویُ

رو تمامِ این حِکایَت باز گویُ

مشکل الفاظ کے معنی

این: یہ۔۔۔ندارد: نہیں رکھتا / نہیں ہے۔۔۔آخرِ: انجام، انتہا۔۔۔از آغاز: ابتدا سے، شروع ہی سے

گوی: کہو، بیان کرو۔۔۔رو: جاؤ / آگے بڑھو (تاکید کے لیے)۔۔۔تمام: مکمل۔۔۔حکایت: قصہ، واقعہ، بات

بازگوی: دوبارہ کہو، پوری طرح سنادو

ترجمہ:

اس (داستانِ عشق یا حقیقتِ حق) کا کوئی انجام (کنارہ) نہیں ہے، اس لیے تم اسے شروع سے بیان کرو۔ جاؤ، یہ پوری حکایت دوبارہ (پھر سے) سناؤ۔

اس شعر میں گفتگو کے تسلسل، عشق کی بے پایاں وسعت اور حقیقتِ حال کو بیان کرنے کی عاجزی کا ذکر ملتا ہے۔

اس شعر کے دو اہم پہلو ہیں: ایک ادبی اور دوسرا صوفیانہ

1. ادبی و معنوی مفہوم:

شاعر کہتا ہے کہ جس قصے یا کیفیت کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس کا کوئی اختتام نظر نہیں آ رہا۔ یہ ایک ایسا لامتناہی سلسلہ ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ اس لیے اے مخاطب (یا اے میرے نفس)! اس کے انجام کی فکر چھوڑ اور اسے دوبارہ ابتدا سے شروع کر۔ یعنی جہاں سے بات شروع ہوئی تھی، وہیں سے اس کہانی کو دوبارہ مکمل تفصیل کے ساتھ سناؤ۔

2. صوفیانہ و عارفانہ پہلو:

صوفیانہ نکتہ نظر سے اس شعر میں عشقِ الٰہی اور معرفت کی طرف اشارہ ہے۔

بے پایاں حقیقت

اللہ کی ذات اور اس کی صفات کا تذکرہ ایسا ہے جس کا کوئی "آخر" نہیں ہے۔ انسانی عقل اور زبان اس قابل نہیں کہ اس داستان کو مکمل کر سکے۔

حیرت کا مقام:

جب سالک (راستہ چلنے والا) حقیقت کی گہرائی میں اترتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ وہ منزل کے قریب ہے، تو اسے ایک نیا دروازہ کھلا ملتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جب تم دیکھو کہ اس بات کا کوئی کنارہ نہیں مل رہا، تو گھبرانے کے بجائے دوبارہ "بسم اللہ" کرو اور اس کی یاد کے مزے شروع سے لو۔

تکرارِ ذکر

اس میں یہ پیغام بھی ہے کہ حق کی باتیں جتنی بار بھی دہرائی جائیں، وہ پرانی نہیں ہوتیں۔ "باز گوی" (دوبارہ کہو) اس بات کی علامت ہے کہ محبوب کا تذکرہ بار بار کرنے میں ہی اصل راحت ہے۔

دراصل شاعر کہتا ہے کہ عشق کی داستان کی کوئی حد نہیں، یہ ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی ہے۔ چونکہ ہم اس کے اختتام تک نہیں پہنچ سکتے، اس لیے بہتر ہے کہ ہم اس کی ابتدا کی مٹھاس میں ہی کھو جائیں اور اس حکایت کو بار بار دہراتے رہیں۔

مولانا روم کے اس شعر کا مفہوم جب ہم قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھتے ہیں، تو یہ ذکرِ الٰہی کی کثرت، اللہ کی صفات کی لامتناہی وسعت اور تکرارِ ہدایت کے تصورات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

ذیل میں اس شعر کے اہم نکات پر شرعی و قرآنی استدلال پیش ہے:

کلماتِ الٰہی کی بے انتہا وسعت (بے پایاں حقیقت)

شعر کا پہلا مصرعہ (این ندارد آخر - اس کا کوئی انجام نہیں) قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر معلوم ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے کلمات اور اس کی صفات کی وسعت کا ذکر ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (109)

ترجمہ: تم فرمادو: اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی ہو جاتا تو ضرور سمندر ختم ہو جاتا اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوتیں، اگرچہ ہم اس کی مدد کیلئے اُسی سمندر جیسا اور لے آتے۔ (سورہ الکھف، آیت: 109)

مولانا روم اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ حق کی گفتگو اور اللہ کی معرفت کا کوئی "آخر" یعنی کنارہ نہیں ہے۔ انسان جتنا بھی علم حاصل کر لے، وہ اللہ کی عظمت کے مقابلے میں آغاز ہی رہتا ہے۔

ذکر کی تکرار اور "باز گوی" (دوبارہ کہنا)

شعر کا دوسرا مصرعہ (رو تمام این حکایت باز گوی - جاؤ یہ پوری حکایت دوبارہ سناؤ) سنتِ نبوی اور قرآنی اسلوب سے میل کھاتا ہے:

قرآنی اسلوب (تکرارِ قصص)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ اور دیگر انبیاء کے قصص بار بار دہرائے ہیں۔ یہ "باز گوی" اس لیے ہے تاکہ ہر بار ایک نیا پہلو اور نئی ہدایت سامنے آئے۔

سنتِ نبوی ﷺ: نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ اہم بات کو تین مرتبہ دہراتے تھے تاکہ سننے والے کے دل میں وہ بات راسخ ہو جائے (صحیح بخاری)۔ مولانا بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ حق کی حکایت کو بار بار دہرانا ہی ایمان کی تازگی کا سبب ہے۔

معرفتِ الٰہی کا سفر

ابتدا سے انتہا تک

صوفیانہ نکتہ نظر سے "آغاز سے کہنا" دراصل فطرت کی طرف واپسی ہے۔

عہدِ الست (آغاز):

قرآن فرماتا ہے:

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ- قَالُوۡا بَلٰى ۛۚ-شَهِدۡنَا ۛۚ

اور اے محبوب! یاد کرو جب تمہارے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی نسل نکالی اور انہیں خود ان پر گواہ بنایا (اور فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب نے کہا: کیوں نہیں، ہم نے گواہی دی (سورہ الاعراف)۔

مولانا کہتے ہیں کہ اس حکایت کو وہاں سے شروع کرو جہاں سے انسان کا اللہ کے ساتھ تعلق جڑا تھا۔

حقیقتِ محمدی ﷺ

کائنات کا آغاز نورِ محمدی ﷺ سے ہوا، اس لیے کسی بھی حکایتِ حق کا آغاز ذکرِ رسول ﷺ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

حکمت اور تذکیر (یاددہانی)

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَّذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ

"اور آپ نصیحت کرتے رہیں، کیونکہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔" (سورہ الذاریات، آیت: 55)

مولانا روم کا یہ کہنا کہ "پوری حکایت پھر سے سناؤ" اسی قرآنی حکم کی تعمیل ہے کہ حق کی بات کو کبھی ختم نہ سمجھو بلکہ اسے بار بار دہراؤ تاکہ دل غفلت سے پاک رہیں۔

حاصلِ بحث

قرآن و سنت کی روشنی میں اس شعر کا پیغام یہ ہے کہ:

اللہ کی معرفت کا سمندر اتنا گہرا ہے کہ اس کا کوئی ساحل نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ طالبِ علم بن کر رہے اور حق کی باتوں کو بار بار سنے اور سنائے (تذکرہ و تکرار)۔

حق کی حکایت کبھی پرانی نہیں ہوتی، ہر بار اسے "آغاز" سے سننے میں ایک نیا روحانی لطف ملتا ہے۔

حافظ کے ہاں عشق ایک ایسی داستان ہے جو ہر بار نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یک قصہ بیش نیست غمِ عشق ویں — عجب از ہر کہ می شنوم مکرر نمی شود

ترجمہ: عشق کا قصہ تو صرف ایک ہی ہے، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ میں جس سے بھی سنتا ہوں، وہ (اپنے اندازِ بیاں کی وجہ سے) کبھی پرانا یا مکرر (Repeated) محسوس نہیں ہوتا۔ یہ براہِ راست مولانا روم کے "باز گوی" (دوبارہ سناؤ) کے فلسفے کی تائید ہے کہ حق کی بات کبھی پرانی نہیں ہوتی۔

سفرِ عشق کے لیے رختِ سفر کی — ہے تلاش جس کی کہیں انتہا نہ ہو،

اس کی ہے ابتدا مجھے (اقبال بھی مولانا کی طرح انجام کے بجائے ایسی "ابتدا" مانگ رہے ہیں جس کا کوئی آخر نہ ہو)

ذکرِ حق کی لذت: اقبال جب "بالِ جبریل" میں دعا کرتے ہیں، تو وہ بھی اسی تکرارِ حکایت کی بات کرتے ہیں:

یہی میری نماز، یہی میرا وضو

ہے میرے رندِ غزل خواں،

تیری تگو میں کیا ہے؟

وہی داستانِ پارینہ،

وہی تکرارِ تمنا!

دفتر اوّل ـ بخش ۷ ـ خَلوَت طَلبیدنِ آن وَلی از پادشاہ جِہَتِ دَریافتنِ رَنجِ کَنیزک

اس ولی کا بادشاہ سے خلوت (تنہائی) طلب کرنا، تاکہ کنیز کے رنج ودرد کی حقیقت معلوم کر سکے

گفت ای شَہ خَلوَتی کُن خانہ را
دور کُن ہم خویش و ہم بیگانہ را

مشکل الفاظ کے معنی

گفت: کہا --- ای شَہ: اے بادشاہ --- خَلوَتی کُن: خلوت کر دے، تنہائی پیدا کر --- خانہ را: گھر کو، محل کو
دور کُن: دور کر دے، ہٹا دے --- ہم خویش: اپنے لوگ، قریبی افراد --- ہم بیگانہ: غیر، اجنبی لوگ

ترجمہ

(ولی نے) کہا: اے بادشاہ! محل کو خلوت گاہ بنا دو، اپنوں کو بھی اور بیگانوں کو بھی، سب کو یہاں سے دور کر دو۔

اس شعر کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری (قصے کے لحاظ سے) اور دوسرا روحانی و صوفیانہ۔

ظاہری مفہوم

قصے میں جب تمام حکیم کنیز کا علاج کرنے میں ناکام ہو گئے، تو ایک اللہ والا طبیب تشریف لایا۔ اس نے بھانپ لیا کہ کنیز کو کوئی جسمانی بیماری نہیں بلکہ "عشق" کی بیماری ہے۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اس

کے دل کا حال معلوم کروں، تو یہاں مکمل تنہائی ہونی چاہیے۔ جب تک اردگرد لوگ ہوں گے، مریضہ اپنے دل کا راز بیان نہیں کر سکے گی۔

روحانی و عرفانی مفہوم

مولانا روم اس شعر کے ذریعے ایک گہرا سبق دے رہے ہیں:

اگر انسان اپنے نفس کی بیماریوں کا علاج چاہتا ہے یا خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اسے اپنے دل کے گھر کو "غیر" سے خالی کرنا ہو گا۔

یہاں 'اپنے اور بیگانے' سے مراد دنیاوی تعلقات، خواہشات، اور وہ خیالات ہیں جو انسان کو اللہ سے دور کرتے ہیں۔ جب تک دل میں دنیا کے ہنگامے رہیں گے، اللہ کی آواز سنائی نہیں دے گی۔

خلوت کی اہمیت

صوفیا کے نزدیک 'خلوت' (تنہائی) اس لیے ضروری ہے تاکہ بندہ اپنے اندر جھانک سکے اور اپنے خالق سے راز و نیاز کر سکے۔

سچی طلب اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ظاہری شور و غل اور دنیاوی وابستگیوں کو ترک کر کے اپنے باطن کی طرف متوجہ ہو۔

مولانا روم کے اس شعر کی بنیاد دراصل اسلامی تصوف اور تزکیہ نفس پر ہے، جس کے شواہد قرآن و سنت میں جا بجا ملتے ہیں۔ اس شعر کا مرکزی پیغام "اخلاص" اور "تخلیہ" (دل کو غیر اللہ سے خالی کرنا) ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی تشریح درج ذیل نکات سے واضح ہوتی ہے:

دل کی یکسوئی اور انابت

شعر میں "گھر خالی کرنے" سے مراد صوفیاء کے نزدیک "دل کا گھر" ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ (سورۃ الاحزاب:4) "اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں رکھے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دل میں دو محبتیں (خالق کی اور اس کے مقابل دنیا کی) بیک وقت مکمل طور پر نہیں سما سکتیں۔ اگر بادشاہ (روح) اپنے مقصد کو پانا چاہتا ہے، تو اسے "غیر" (ماسوی اللہ) کو نکالنا ہو گا۔

خلوت اور ذکرِ الٰہی (سنتِ نبوی ﷺ)

شعر میں طبیب کا "خلوت" کا مطالبہ کرنا سنتِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔

غارِ حرا کی خلوت:

وحی کے آغاز سے پہلے رسول اللہ ﷺ کئی کئی راتیں غارِ حرا میں تنہائی (خلوت) میں گزارتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معرفتِ الٰہی کے لیے شورِ دنیا سے دور ہونا ضروری ہے۔

حدیثِ نبوی ﷺ:

سات لوگ ایسے ہیں جنہیں اللہ قیامت کے دن اپنے عرش کا سایہ دے گا، ان میں سے ایک وہ ہے:

"جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔" (صحیح بخاری)

۳. اخلاص اور غیر اللہ کی نفی

شعر میں "خویش و بیگانہ" (اپنے اور غیر) کو دور کرنے کا مطلب شرکِ خفی سے پاک ہونا ہے۔

قرآن: "پس اللہ کی بندگی کرو اس کے لیے دین کو خالص کر کے۔" (سورۃ الزمر:2)

جب تک انسان کے دل میں لوگوں کی واہ واہ (خویش) یا لوگوں کا ڈر (بیگانہ) رہے گا، وہ سچا مومن اور خالص بندہ نہیں بن سکتا۔ مولانا روم یہی کہہ رہے ہیں کہ جب تک تم لوگوں کی خاطر جیو گے، تم اپنے اصل مرض (روحانی دوری) کو نہیں پہچان سکو گے۔

۴. تزکیہ نفس (دل کی صفائی)

اسلام میں تزکیہ نفس کا مطلب ہی یہ ہے کہ دل سے بری عادات اور دنیاوی بتوں کو نکال باہر کیا جائے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں: "تصوف یہ ہے کہ حق (اللہ) تجھے تجھ سے جدا کر دے اور اپنے ساتھ زندہ کر دے۔"

مولانا کے شعر میں طبیب (مرشدِ کامل) بادشاہ (طالبِ حق) سے کہہ رہا ہے کہ جب تک تو اپنی انا اور اپنے تعلقات کے حصار میں ہے، حقیقتِ حال واضح نہیں ہو گی۔

حاصلِ کلام قرآنی / نبوی اصول مولانا روم کا پیغام

تخلیہ (خالی کرنا) گھر (دل) کو غیر اللہ کے خیال سے خالی کرو۔

تحلیہ (آراستہ کرنا) جب غیر نکل جائے گا تو اللہ کی معرفت خود بخود آ جائے گی۔ اخلاص نہ اپنوں کی پروا کرو نہ بیگانوں کی، صرف سچائی کی تلاش کرو۔

مولانا روم کے اس شعر کی وجدانی (Intuitive) اور عرفانی (Gnostic) تشریح اس کے ظاہری الفاظ سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ عرفان کی دنیا میں یہ شعر "طالب" اور "مطلوب" کے درمیان موجود حجابات (پردوں) کو ہٹانے کا درس دیتا ہے۔

اس کی عرفانی تشریح درج ذیل نکات میں پنہاں ہے:

۱. دل: اللہ کا گھر (بیت اللہ)

عرفانی نکتہ نظر سے یہاں "گھر" سے مراد انسان کا "دل" ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ دل اللہ کی تجلی کا مقام ہے۔ جب تک اس گھر میں 'خویش' (اپنی انا، خود پرستی) اور 'بیگانہ' (دنیاوی تعلقات، مال و جاہ) موجود ہیں، وہاں اللہ کی معرفت داخل نہیں ہو سکتی۔

وجدانی حقیقت

جب تک برتن بھرا ہوا ہو، اس میں نئی چیز نہیں ڈالی جا سکتی۔ دل جب تک دنیا کے خیالات سے بھرا ہے، وہاں وحیِ الٰہی یا الہام کا نزول نہیں ہوتا۔

۲. "خویش" سے مراد "انا (Ego)"

عرفانِ رومی میں سب سے بڑا 'خویش' یا رشتہ دار انسان کی اپنی "میں" ہے۔

بقولِ صوفیاء: "تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دو پہلوؤں کے درمیان ہے"۔ * حقیقی طبیب (مرشد) کہتا ہے کہ اے طالب! پہلے اپنی اس "میں" کو کمرے سے باہر نکال، کیونکہ جہاں "تو" ہے وہاں "وہ" (خدا) نہیں، اور جہاں "وہ" ہے وہاں "تو" کی گنجائش نہیں۔

۳. "بیگانہ" سے مراد "ماسوی اللہ"

'بیگانہ' سے مراد وہ تمام مادی چیزیں ہیں جو انسان کو حقیقت سے غافل کر دیتی ہیں۔ عرفانی اصطلاح میں اسے "ماسوی" (اللہ کے علاوہ سب کچھ) کہتے ہیں۔

طبیبِ روحانی کا کہنا ہے کہ جب تک تمہاری توجہ لوگوں کی تنقید یا تعریف پر رہے گی، تم اپنی روح کی آواز نہیں سن سکو گے۔

۴. خلوتِ در انجمن (اکیلے میں محفل)

اس شعر کا ایک وجدانی پہلو یہ ہے کہ "خلوت" صرف کمرہ بند کرنے کا نام نہیں، بلکہ ہجوم میں رہ کر بھی دل کو غیر سے خالی کر لینا ہے۔

عرفانی رمز

بادشاہ انسانی روح جو اپنے اصل (خدا) سے دور ہو کر پریشان ہے۔

طبیب مرشدِ کامل یا عقلِ ایمانی جو علاج کرنا جانتی ہے۔

خلوت مراقبہ اور توجہ الی اللہ، جہاں کوئی تیسرا مخل نہ ہو۔

دردِ کنیز وہ تڑپ جو روح میں اپنے اصل کی تلاش کے لیے پیدا ہوتی ہے

عرفانی راز: جب انسان اپنے اندر کی دنیا کو صاف کر لیتا ہے، تو اسے کائنات کے ذرے ذرے میں خدا کا نور نظر آنے لگتا ہے۔ طبیب کا بادشاہ کو کمرہ خالی کرنے کا کہنا دراصل "تخلیہ" کا عمل ہے، تاکہ روح کی سچی تڑپ سامنے آ سکے۔

فخر الدین عراقی، جو کہ عشقِ حقیقی اور وحدت الوجود کے بہت بڑے شاعر ہیں، مولانا روم کے اس تصورِ "خلوت" کو ایک نہایت لطیف اور رندانہ رنگ دیتے ہیں۔ عراقی کے ہاں "خویش و بیگانہ" کو دور کرنے کا مطلب "محویت" اور "فنا" ہے۔ عراقی کی شاعری کی روشنی میں اس شعر کی تشریح درج ذیل نکات میں کی جا سکتی ہے:

1. دوئی (Duality) کا خاتمہ

عراقی کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی وجود ہے، اور وہ ہے "محبوب" (خدا)۔ جب مولانا روم کا طبیب کہتا ہے کہ "خویش و بیگانہ کو دور کرو"، تو عراقی کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم خود کو (خویش) اور دوسروں کو (بیگانہ) الگ وجود سمجھو گے، تم سچائی تک نہیں پہنچ سکتے۔

عراقی کہتے ہیں:

نخستیں بادہ کاندر جام کردند ز چشم مست ساقی وام

کردند (پہلی شراب جو جام میں ڈالی گئی، وہ ساقی کی مست آنکھوں سے ادھار لی گئی تھی۔)

تطبیق:

عراقی کے نزدیک خلوت اس لیے ضروری ہے تاکہ یہ راز کھلے کہ ساقی، شراب اور جام سب ایک ہی ہیں۔ "غیر" کا وجود محض ایک نظر کا دھوکا ہے۔

3. غیرتِ عشق (Divine Jealousy) عراقی کے ہاں یہ تصور بہت مضبوط ہے کہ عشق "غیر" کو برداشت نہیں کرتا۔ رومی کے شعر میں طبیب کا سب کو باہر نکالنا عراقی کی "غیرتِ عشق" کی عکاسی کرتا ہے۔ محبوب (حق) یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے گھر (دل) میں کوئی دوسرا موجود ہو۔ عراقی کا مشہور قول ہے:

"عشق آیا اور اس نے غیر کو جلا دیا، اب جو کچھ بچا ہے وہ وہی (محبوب) ہے۔"

4. خلوتِ خانہِ دل

فخر الدین عراقی کے نزدیک انسانی دل ایک ایسا خانہ (گھر) ہے جس کی خلوت میں صرف محبوب ہی سما سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب تک تم اپنے "آپ" سے باہر نہیں نکلو گے، محبوب کے "اندر" داخل نہیں ہو سکو گے۔ رومی کے شعر کی عراقیانہ تعبیر یہ ہوگی: خویش (اپنا): تمہارا اپنا وجود، تمہاری ہستی۔ بیگانہ (غیر): یہ ساری کائنات۔ عراقی کہتے ہیں کہ جب "میں" اور "کائنات" دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، تب جو خاموشی پیدا ہوتی ہے، وہی اللہ کا دیدار ہے۔

عراقی اور رومی کا تقابل نکتہ

مولانا روم کا انداز فخر الدین عراقی کا انداز خلوت تشخیصِ مرض کے لیے ضروری ہے (حکیمانہ)۔ وصالِ یار کے لیے شرطِ اول ہے (عاشقانہ)۔ غیر وہ حجاب جو سچائی چھپاتا ہے۔ وہ "دوئی" جو وحدت کے مشاہدے میں رکاوٹ ہے۔ نتیجہ دل کا حال معلوم کرنا۔ خود کو مٹا کر محبوب میں فنا ہو جانا۔

خلاصہ عراقی کی روشنی میں اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "خلوت" وہ مقام ہے جہاں طالب اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے۔ عراقی کہیں گے کہ اے بادشاہ! گھر اس لیے خالی کر دو کیونکہ محبوب (حقیقت) بہت غیرت مند ہے، وہ وہاں نہیں آتا جہاں کوئی دوسرا (خویش یا بیگانہ) موجود ہو۔ عراقی کا ایک شعر جو اس صورتحال کی عکاسی کرتا ہے:

در خلوت سرائے وحدت را جز بہ مفتاحِ عشق نتواں یافت

(وحدت کی خلوت گاہ کا دروازہ عشق کی چابی کے سوا کسی چیز سے نہیں کھل سکتا۔)

دنیا کا کوئی بھی بڑا کام، چاہے وہ سائنسی ایجاد ہو یا فنکارانہ تخلیق، اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان خود کو بیرونی دنیا سے کاٹ کر اپنے مقصد کے ساتھ "خلوت" اختیار نہ کر لے۔ یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ کثرت میں وحدت تلاش کرنے کے لیے پہلے کثرت کے شور کو خاموش کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک آفاقی سچائی ہے کہ سچ ہمیشہ خاموشی میں بولتا ہے۔

لسان الغیب حافظ شیرازی کی روشنی میں خواجہ حافظ شیرازی کے ہاں "خلوت" کا تصور محبوب کے ساتھ راز و نیاز اور ریاکاری سے پاک بندگی کا ہے۔ حافظ اس "خویش و بیگانہ" کو "زہدِ خشک" (دکھاوے کی عبادت) اور "دنیاوی ہنگاموں" سے تعبیر کرتے ہیں۔ حافظ فرماتے ہیں:

حافظا خلوتِ نشینانِ ملائک کہ خوردند مے کہ در صومعہِ زاہدِ خود بین نہ بود

(اے حافظ! فرشتوں کے ساتھ خلوت نشین ہونے والے وہ مے پی گئے جو مغرور زاہد کی خانقاہ میں نہیں ملتی۔)

حافظ کے نزدیک جب تک دل "خود بینی" (اپنی ذات کی پرستش) سے خالی نہ ہو، وہ محبوب کی تجلی کا مقام نہیں بن سکتا۔ مولانا روم کا 'خلوت' کا مطالبہ دراصل حافظ کا 'صفائے دل' ہے، تا کہ غیر کی جگہ نہ رہے۔

. حکیم الامت علامہ اقبال کی روشنی میں

اقبال کے ہاں "خلوت" کا تصور مولانا روم سے بہت قریب ہے، لیکن اقبال اسے "خودی" کی مضبوطی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک "خویش و بیگانہ" سے دور ہونا رہبانیت (دنیا چھوڑنا) نہیں بلکہ اپنے اندر چھپی طاقت کو پہچاننا ہے۔

اقبال کا شعر:

خلوت میں خودی، انجمن میں خدا

خلوت ہے مے، انجمن ہے مینا

خلوت میں خودی

اقبال کہتے ہیں کہ جب انسان "خویش و بیگانہ" کو دور کر کے تنہائی اختیار کرتا ہے، تو وہ اپنی خودی (Self) سے ملتا ہے۔ یہ وہی مرحلہ ہے جو رومی کا طبیب چاہتا ہے تاکہ روح کی اصل بیماری کا پتہ چلے۔ لا الہ الا اللہ: اقبال کے نزدیک "دور کن خویش و بیگانہ" دراصل "لا" کی ضرب ہے یعنی اللہ کے سوا ہر بت کو دل سے نکالنا۔ جب "لا" (نفی) مکمل ہوتی ہے، تبھی "الا اللہ" (اثبات) کا نور چمکتا ہے۔

فکر یکسوئی (Focus) کامیابی کے لیے خارجی مداخلت کا خاتمہ ضروری ہے۔ حافظ شیرازی صفائے قلب دل کو غیر اللہ اور ریاکاری سے پاک کرنا تاکہ تجلیِ یار ہو سکے۔ علامہ اقبال خودی کی تربیت خلوت وہ مقام ہے جہاں انسان کائنات کو مسخر کرنے کی قوت پاتا ہے۔

نتیجہ: مولانا روم کا یہ شعر ایک ایسا نقطہ ہے جہاں سے تصوف کی تمام راہیں گزرتی ہیں۔ چاہے وہ حافظ کا "عشق" ہو عراقی کی بیخودی یا اقبال کی "خودی"، منزل وہی ہے کہ جب تک "غیر" کا پردہ درمیان سے نہیں ہٹے گا، حقیقت کا چہرہ نظر نہیں آئے گا۔

یہ شعر پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم حقیقتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہو، تو اپنے باطن کے آئینے سے گردِ خودی کو صاف کرو۔ جب آئینہ صاف ہو گا، تو محبوب کا عکس خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔

مولانا روم کے اس شعر کی طبی اور فلسفیانہ تعبیر انسانی نفسیات اور مابعد الطبعیات (Metaphysics) کے کئی اہم پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہے۔

1. طبی اور نفسیاتی لحاظ سے تعبیر (Medical & Psychological Perspective) قدیم طب (یونانی و اسلامی) اور جدید نفسیات، دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ بعض امراض کا تعلق جسم کے بجائے "نفسیاتی گرہوں" سے ہوتا ہے۔ تشخیصِ راز (Confidentiality): طب کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ مریض اپنے دل کی بات اور بیماری کی اصل علامات اس وقت تک نہیں بتاتا جب تک اسے مکمل راز داری اور تنہائی میسر نہ ہو۔ طبیب کا بادشاہ کو باہر جانے کا کہنا دراصل Psychological Safety پیدا کرنا ہے تاکہ مریضہ (کنیز) کا دفاعی نظام (Defense Mechanism) ختم ہو اور وہ لاشعور میں چھپے سچ کو زبان پر لا سکے۔ علاج بالمشافہ (Psychotherapy): جدید نفسیاتی علاج میں اسے "تخلیہ" کہا جاتا ہے۔ جب تک مریض کے ارد گرد ایسے لوگ ہوں جن سے وہ شرماتا ہو یا جن کا اسے خوف ہو (جیسے بادشاہ یا خاندان والے)، وہ کبھی اپنی ذہنی الجھن (Conflict) بیان نہیں کرے گا۔

سومیٹک ڈس آرڈر (Somatic Disorder): مولانا یہاں اشارہ کر رہے ہیں کہ بعض جسمانی بیماریاں دراصل جذباتی محرومیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ طبی لحاظ سے جب تک ذہنی دباؤ (Stressors) کو دور نہیں کیا جاتا، ادویات بے اثر رہتی ہیں۔

2. فلسفیانہ لحاظ سے تعبیر (Philosophical Perspective) فلسفہ کی رو سے یہ شعر حقیقت پسندی اور تجرید (Abstraction) کی گہری بحث چھیڑتا ہے۔ حقیقت تک رسائی کے لیے تجرید: فلسفہ کہتا ہے کہ کسی بھی چیز کی ماہیت (Essence) کو جاننے کے لیے اس سے جڑے عارضی اور خارجی اثرات کو ہٹانا ضروری ہے۔ اگر آپ کسی مسئلے کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو آپ کو "خویش و بیگانہ" (تعصبات، مروجہ نظریات اور دوسروں کی آراء) سے ذہن کو خالی کرنا ہو گا جسے فلسفے میں Tabula Rasa (صاف تختی) کے قریب کی حالت کہا جا سکتا ہے۔ تکثریت سے وحدت کا سفر (Plurality to Unity): کائنات میں "کثرت" (بہت سارے لوگ، اشیاء، رشتے) انسان کی توجہ کو بکھیر دیتی ہے۔ فلسفیانہ نکتہ نظر سے "خلوت" وہ مقام ہے جہاں انسان کثرت سے نکل کر وحدت کی طرف آتا ہے۔ جب تک حواسِ خمسہ بیرونی دنیا (بیگانہ) میں الجھے رہیں گے، عقلِ سلیم (طبیب) بصیرت حاصل نہیں کر سکے

گی۔ داخلیت(Subjectivity): یہ شعر وجودی فلسفے(Existentialism) کے بھی قریب ہے۔ انسان کی اپنی سچائی اس کے اندر ہوتی ہے۔

دنیا(خویش و بیگانہ) صرف شور پیدا کرتی ہے۔ سچائی تک پہنچنے کے لیے انسان کو اپنے وجود کی گہرائی میں اکیلے اترنا پڑتا ہے۔ تقابلی جائزہ پہلو تعبیر طبی رازداری اور ذہنی سکون کے بغیر صحیح تشخیص اور نفسیاتی علاج ممکن نہیں۔ فلسفیانہ حقیقت کی تلاش کے لیے خارجی تعصبات اور مادی کثرت سے دستبردار ہونا لازم ہے۔

حاصلِ کلام: طبیب کا یہ مطالبہ محض ایک انتظامی حکم نہیں تھا، بلکہ یہ ایک عالمگیر اصول ہے کہ "حقیقت تب ہی ظاہر ہوتی ہے جب شور خاموش ہو جاتا ہے"۔

سائنسی فکر

مولانا روم کے اس شعر میں حیرت انگیز طور پر سائنسی فکر(Scientific Thinking) اور طریقہ کارِ تحقیق (Scientific Methodology) کے بنیادی اصول پوشیدہ ہیں۔ اگرچہ یہ مثنوی صدیوں پہلے لکھی گئی، لیکن اس میں موجود منطق جدید سائنس کے کئی اصولوں سے میل کھاتی ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے اس کی تعبیر درج ذیل ہے:

1. متغیرات کو قابو کرنا(Control of Variables) سائنسی تجربہ(Experiment) کا پہلا اصول یہ ہے کہ آپ جس چیز کا مشاہدہ کر رہے ہیں، اس کے علاوہ باقی تمام اثر انداز ہونے والے عوامل (Variables) کو روک دیں تاکہ نتائج درست نکلیں۔ سائنسی فکر: طبیب کا "خویش و بیگانہ" کو دور کرنے کا حکم دراصل Noise Cancellation اور External Interference (خارجی مداخلت) کو ختم کرنا ہے تاکہ مریض کی نبض اور ردِ عمل کا خالص مطالعہ کیا جا سکے اور کوئی دوسرا عامل (Factor) مشاہدے میں غلطی پیدا نہ کرے۔ ۲
2. مشاہدہ اور ڈیٹا کلیکشن(Observation and Data Collection) سائنس دان جب کسی مظہر کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے "آئسولیشن"(Isolation) کی ضرورت ہوتی ہے۔ سائنسی فکر: طبیب نے جان

لیا تھا کہ بیماری "نفسیاتی" ہے۔ نفسیات میں جب تک ماحول کو کنٹرول نہ کیا جائے، مریض کا لاشعور (Subconscious) ڈیٹا فراہم نہیں کرتا۔ تنہائی پیدا کرنا دراصل ایک Controlled Environment تخلیق کرنا ہے تاکہ خالص ڈیٹا (مریض کے حقیقی جذبات) حاصل کیا جا سکے۔

3. تشخیص کا تجرباتی طریقہ (Experimental Diagnosis) مولانا نے اس قصے میں دکھایا کہ طبیب نے باری باری مختلف شہروں کے نام لیے اور کنیز کی نبض چیک کی۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جسے سائنس میں Trial and Error یا Hypothesis Testing کہا جاتا ہے۔

سائنسی فکر: "خلوت" اس لیے ضروری تھی کہ طبیب Biofeedback (جسمانی ردِ عمل) کا مطالعہ کر سکے۔ جب کسی خاص نام پر کنیز کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی، تو یہ ایک سائنسی اشارہ (Signal) تھا جس نے مرض کی تشخیص کر دی۔

3 . علت اور معلول کا رشتہ (Cause and Effect) سائنس ہر اثر کے پیچھے ایک مادی یا نفسیاتی وجہ تلاش کرتی ہے۔ اس دور کے دیگر حکیموں نے اسے صرف جسمانی بخار سمجھا، لیکن اس طبیب نے "سائنسی بصیرت" کا مظاہرہ کرتے ہوئے جسمانی علامات کو صرف "اثر" (Effect) قرار دیا اور اس کی "علت" (Cause) یعنی عشق کو تلاش کیا۔ سائنسی فکر کا خلاصہ سائنسی اصول شعر کی تعبیر Isolation "خلوتی کن خانہ را" (تجربہ گاہ کو بیرونی اثرات سے پاک کرنا) Objectivity "دور کن بیگانہ را" (تعصبات اور غیر ضروری شور کو ختم کرنا) Biofeedback نبض کی رفتار سے جذباتی کیفیت کا اندازہ لگانا۔ Psychosomatic Link ذہن اور جسم کے باہمی تعلق کا سائنسی مطالعہ۔

نتیجہ: مولانا روم یہاں ایک سائنٹسٹ کی طرح بات کر رہے ہیں جو جانتا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے سطحی علامات سے گزر کر "لیبارٹری کی شرائط" (تنہائی اور توجہ) پوری کرنا لازمی ہے۔

کَس ندارد گوش در دِہلیزہا
تا بپُرسَم زین کَنیزک چیزہا

اس شعر میں اس وقت کا منظر ہے جب بادشاہ نے ایک بیمار کنیز کا علاج کرنے کے لیے ایک حکیمِ حاذق (جو دراصل اللہ کا ولی تھا) کو بلایا۔

مشکل الفاظ کے معنی

کَس: کوئی شخص، کوئی فرد۔۔۔ دِہلیزہا: ڈیوڑھی، گھر یا کمرے کا بیرونی حصہ، دہلیز (جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے یعنی آس پاس کے کمرے یا راستے)۔۔۔ تا بپُرسَم: تاکہ میں پوچھوں، سوال کروں۔

زین کنیزک: اس کنیز سے (زین مخفف ہے "از این" کا)۔۔۔ چیزہا: باتیں، احوال، خبریں۔

ترجمہ:

دہلیز پر کوئی سننے والا موجود نہیں، تبھی تو میں اس کنیز کے متعلق بات دریافت کر رہا ہوں

اس شعر میں حکیمِ الٰہی (روحانی معالج) کی دانشمندی اور نفسیاتی علاج کا ایک اہم پہلو بیان کیا گیا ہے:

خلوت اور رازداری: حکیم جانتا تھا کہ کنیز کی بیماری ظاہری نہیں بلکہ باطنی (عشق) ہے، اور کوئی بھی شخص اپنے دل کے راز مجمع میں یا کسی تیسرے کی موجودگی میں ظاہر نہیں کرتا۔ اس لیے اس نے کمرے کو خالی کرایا تاکہ "دہلیزوں" (آس پاس) میں کوئی سننے والا نہ رہے۔

نفسیاتی نکتہ

مولانا رومی یہاں یہ نکتہ سمجھا رہے ہیں کہ جب تک انسان کو مکمل تحفظ اور تنہائی کا احساس نہ ہو، وہ اپنے دکھ اور پوشیدہ زخم بیان نہیں کرتا۔ حکیم چاہتا تھا کہ کنیز بلا جھجک اپنے دل کا حال کہہ دے۔

روحانی اشارہ

صوفیانہ نقطہ نظر سے اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جب تک انسان دنیا کے شور و غل اور "اغیار" (دوسروں کے خیالات) سے اپنے دل کی دہلیز کو خالی نہیں کرتا، تب تک حقیقتِ حال واضح نہیں ہوتی۔

حقیقت میں یہ شعر اس کیفیت کو بیان کرتا ہے جہاں معالج مریض کو ذہنی سکون دینے کے لیے تنہائی اختیار کرتا ہے تاکہ مرض کی اصل جڑ (جو کہ اس قصے میں عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف سفر ہے) تک پہنچ سکے۔

قرآن و سنت کے مطابق اس شعر کی تشریح کیا ہو گی باحوالہ بتائیں

مولانا رومی کے اس شعر کو اگر قرآن و سنت کے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے، تو یہ تزکیہ نفس، رازداری اور حکمتِ تبلیغ کے گہرے مفاہیم کو واضح کرتا ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی تشریح

امانت اور رازداری (حفظِ اسرار)

اسلام میں کسی کی نجی زندگی کے احوال اور دکھوں کو راز رکھنا ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ حکیم کا کمرہ خالی کرانا اس لیے تھا تاکہ مریضہ کی پردہ پوشی ہو سکے۔

حدیثِ مبارکہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا يَسْتُرُ عَبْدٌ عَبْدًا فِي الدُّنْيَا إِلَّا سَتَرَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ».

([صحیح مسلم:2590])"۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص دنیامیں کسی دوسرے شخص کی پردہ پوشی کرتاہے اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا

ایک مسلمان سے جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے، تو اسے ٹوکنے، نصیحت کرنے اور اللہ کاڈر دکھانے کے ساتھ ساتھ اس کی پردہ پوشی بھی کرنی چاہیے۔ لیکن اگر وہ اہل شر وفساد ہو اور کھلے عام فسق وفجور کرتا رہتا ہو، تو اس کی پردہ پوشی نہیں ہونی چاہیے۔ کیوں کہ اس کی پردہ پوشی کا مطلب گناہ کے کام میں اس کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں حکومت کو باخبر کر دیا جائے گا۔ چاہے اس سے اس کی تشہیر ہی کیوں نہ ہوتی ہو، کیوں کہ وہ کھلے عام گناہ کے کام کرتا ہے۔

دوسروں کی غلطیوں کو چھپانے کی ترغیب

پردہ پوشی کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے گناہ گار کو اپنا احتساب کرنے اور توبہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ کیوں کہ لوگوں کے عیوب اور چھپی ہوئی باتوں کو سامنے لانا دراصل برائی کو عام کرنے، سماجی ماحول کو خراب کرنے اور لوگوں کو برائی کی ترغیب دینے کے مترادف ہے۔

وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ (حجرات:۱۲)

ور (پوشیدہ باتوں کی) جستجو نہ کرو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو

قرآن مجید میں دوسروں کے معاملات میں تجسس سے روکا گیا ہے، لیکن یہاں حکیم کا مقصد "تجسس" نہیں بلکہ "علاج" ہے۔ اسلام اجازت دیتا ہے کہ طبیب یا مصلح (اصلاح کرنے والا) تنہائی میں مریض کا حال پوچھے تاکہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔

تزکیہ نفس اور تخلیہ (دل کی صفائی)

صوفیاء کے نزدیک اس شعر میں "دہلیزوں کا خالی ہونا" دراصل دل کو غیر اللہ کی محبت سے خالی کرنے کی علامت ہے۔

قرآنی حوالہ: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ" (اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے۔ - سورۃ الاحزاب: 4)۔

جس طرح ایک کمرے میں دو متضاد چیزیں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح جب تک دل کی دہلیز سے دنیاوی خواہشات (اغیار) کو نہیں نکالا جاتا، اس میں معرفتِ الٰہی کی "باتیں" (چیزہا) داخل نہیں ہو سکتیں۔

خلوت اور مناجات (اللہ سے تنہائی میں کلام)

اس شعر کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب تک شور و غل کم نہ ہو، حق کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اسلام میں "خلوت" (تنہائی) کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

سنتِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ وحی کے نزول سے قبل "غارِ حرا" میں تنہائی اختیار فرماتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بڑے حقائق کے ادراک کے لیے دنیا سے کٹ کر تنہائی میں غور و فکر کرنا سنت ہے۔

حکیم (جو کہ اللہ کا ولی ہے) اس کنیز (روح) سے وہ باتیں پوچھنا چاہتا ہے جو صرف اللہ اور بندے کے درمیان ہونی چاہئیں۔

حکمت اور بصیرت

قرآن کریم میں ارشاد ہے: "يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ" (وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے - سورۃ البقرہ: 269)۔

حکیم کا یہ فعل کہ وہ مجمع میں سوال نہیں کرتا، اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ سنتِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کی نفسیات کے مطابق ان سے کلام فرماتے تھے اور کبھی کسی کو بھرے مجمع میں شرمندہ نہیں کرتے تھے۔

شرعی نقطہ نظر سے اس شعر کی روح یہ ہے کہ:

پردہ پوشی: مریض کے راز کو چھپانا واجب ہے۔

توجہِ کامل: کسی کی اصلاح یا علاج کے لیے مکمل یکسوئی اور تنہائی ضروری ہے تاکہ وہ اپنے دل کا حال بلا خوف و خطر بیان کر سکے۔

اخلاص: جب تک بندہ دنیا کی "دہلیز" سے باہر نکل کر اللہ کے سامنے تنہا نہیں ہوتا (جیسے نمازِ تہجد)، اسے باطنی بیماریوں کا علاج نہیں ملتا۔

مولانا رومی کے اس شعر کو اگر علامہ اقبال اور حافظ شیرازی کے چشمے سے دیکھا جائے تو دو بالکل مختلف لیکن نہایت دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔ علامہ اقبال "خودی" اور "حرکت" کے علمبردار ہیں، جبکہ حافظ شیرازی "رندی" اور "اسرارِ الٰہی" کے ترجمان ہیں۔

علامہ اقبال کے مطابق (خودی اور مردِ مومن)

علامہ اقبال مولانا رومی کو اپنا "پیرِ رومی" مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس شعر میں حکیم کا کمرہ خالی کرانا "خلوت" کی اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو خودی کی تربیت کے لیے ضروری ہے۔

خلوتِ خودی: اقبال کے نزدیک جب تک انسان بیرونی دنیا کے اثرات (خلق) سے کٹ کر اپنے اندر جھانکنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتا، وہ اپنی حقیقت (کنیز / روح) کو نہیں پا سکتا۔ اقبال کہتے ہیں:

"خلوت میں خودی کو دیکھتا ہے، جلوت میں خدا کو دیکھتا ہے"

مردِ مومن کی بصیرت: اقبال کے مطابق یہاں "حکیم" ایک ایسا مردِ مومن ہے جو فراستِ ایمانی سے لیس ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عام انسان مادی اسباب (ادویات) میں الجھے ہوئے ہیں، جبکہ حقیقتِ حال صرف تنہائی میں اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے ہی کھل سکتی ہے۔

تشریح کا نچوڑ: اقبال اس شعر کو "انفس" (باطنی دنیا) کی سیر سے تعبیر کریں گے۔ یعنی جب تک "دہلیز" (بیرونی حواس) کے پہرے ختم نہیں ہوتے، دل کی گہرائیوں میں چھپے رازوں تک رسائی ممکن نہیں۔

جبکہ حافظ شیرازی کے مطابق (رازِ عشق اور رندی)

حافظ شیرازی کے ہاں عشق ایک ایسا "راز" ہے جسے ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ اس شعر کو اپنی مخصوص اصطلاحات میں یوں دیکھیں گے:

حفظِ اسرار (راز کی حفاظت): حافظ کا مشہور قول ہے کہ "مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز" (یہ مصلحت نہیں کہ راز پردے سے باہر آئے)۔ حافظ کے نزدیک حکیم کا لوگوں کو نکالنا اس لیے ہے کہ عشق کا قصہ نامحرموں کے سامنے بیان کرنے کی چیز نہیں ہے۔

محرم اور نامحرم: حافظ کے مطابق دنیا والے "نامحرم" ہیں، وہ روح کی بیماری کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ فرماتے ہیں:

"غیر مَحرم نہ شود مَحرمِ رازِ ملکوت" یعنی فرشتے اور اللہ کے راز صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو محرمِ راز (حکیمِ کامل) ہو۔

خلوتِ خاص: حافظ کے نزدیک یہ شعر اس "خلوتِ خاص" کی عکاسی کرتا ہے جہاں مے (محبت) اور ساقی (مرشد) کے سوا کوئی نہ ہو۔ وہ اس دہلیز کو "خانقاہِ عشق" سے تعبیر کریں گے جہاں دنیاداروں کا داخلہ ممنوع ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی فارسی اور اردو شاعری میں بارہا مولانا رومی کے اس اندازِ بصیرت کی تعریف کی ہے۔ اقبال کے نزدیک رومی محض ایک شاعر نہیں، بلکہ وہ "طبیبِ روح" ہیں جو جانتے ہیں کہ جب ظاہری ادویات کام کرنا چھوڑ دیں، تو باطنی علاج کیسے کیا جاتا ہے۔

اقبال کے لیے رومی کا یہ طریقہ ایک "انقلابِ باطن" کی علامت ہے، جہاں انسان دوسروں سے کٹ کر ہی اللہ اور اپنی حقیقت سے جڑ سکتا ہے۔

مولانا رومی کے اس شعر کو اگر ہم طبِ قدیم (یونانی)، جدید نفسیات (Psychology) اور سائنسی نقطہ نظر سے دیکھیں، تو یہ پیشہ ورانہ اخلاقیات اور تشخیصی عمل کا ایک بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔

طبی اور سائنسی لحاظ سے اس کے اہم پہلو درج ذیل ہیں

۱. نفسیاتی تجزیہ (Psychoanalysis)

جدید نفسیات، خاص طور پر فرائڈ (Sigmund Freud) اور کارل جنگ (Carl Jung) کے نظریات کے مطابق، انسانی لاشعور میں چھپے ہوئے راز تبھی سامنے آتے ہیں جب مریض خود کو مکمل طور پر محفوظ (Safe) اور پر سکون محسوس کرے۔

Rapport Building: سائنسی طور پر، معالج اور مریض کے درمیان ایک تعلق (Rapport) قائم ہونا ضروری ہے۔ جب تک کمرے میں دیگر لوگ ("دہلیزوں میں بیٹھے ہوئے") موجود ہوں، مریض کا دفاعی نظام (Defense Mechanism) فعال رہتا ہے اور وہ سچ نہیں بولتا۔

Catharsis (کتھارسس): رومی کا حکیم جانتا ہے کہ "کنیز" کا مرض جذباتی ہے (Emotional Trauma)۔ جذباتی اخراج یا کتھارسس کے لیے تنہائی اور رازداری بنیادی شرط ہے۔

۲. طبی اخلاقیات (Medical Ethics)

اس شعر میں جس عمل کا ذکر ہے، اسے جدید طب میں "Patient Confidentiality" (مریض کی رازداری) کہا جاتا ہے۔

Doctor-Patient Privilege: میڈیکل سائنس یہ کہتی ہے کہ مریض اور ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی گفتگو تیسرے کان تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ حکیم کا دہلیزیں خالی کرانا اس اخلاقی ضابطے کی پاسداری ہے، تاکہ مریضہ بغیر کسی معاشرتی دباؤ کے اپنی علامات بتا سکے۔

۳. ہسٹری ٹیکنگ (History Taking) کا سائنسی طریقہ

میڈیکل سائنس میں مرض کی تشخیص کے لیے "History" کو ۷۰٪ اہمیت حاصل ہے۔

ایک اچھا طبیب وہ ہے جو مریض کو بولنے کا موقع دے۔ رومی کے شعر میں "تا بپُرسم" (تا کہ میں پوچھوں) اسی تشخیصی عمل کی طرف اشارہ ہے۔

سائنسی نکتہ: بیرونی شور اور مداخلت (Noise and Interference) ڈیٹا کی درستگی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ سائنسی تجربہ گاہ ہو یا کلینک، "الگ تھلگ ماحول (Controlled Environment) " درست نتائج کے لیے ضروری ہے۔

۴. نبض شناسی اور حیاتیاتی فیڈبیک (Bio-Feedback)

اسی حکایت کے اگلے اشعار میں ذکر ہے کہ حکیم نے کنیز کی نبض پر ہاتھ رکھا اور مختلف شہروں کے نام لیے۔

سائنسی مشاہدہ: جب انسان کسی جذباتی معاملے پر بات کرتا ہے تو اس کے جسم میں خودکار تبدیلیوں (Involuntary Changes) کا عمل شروع ہوتا ہے، جیسے دل کی دھڑکن تیز ہونا یا نبض کی رفتار بدلنا۔

اگر کمرے میں دوسرے لوگ موجود ہوتے تو کنیز کی گھبراہٹ کی وجہ "مجمع کا خوف (Social Anxiety) " بھی ہو سکتی تھی۔ حکیم نے ماحول کو "خالی (Neutral) " کر دیا تا کہ نبض میں ہونے والی تبدیلی صرف اور صرف اس کے "اندرونی دکھ" کی عکاسی کرے، نہ کہ بیرونی ڈر کی۔

سائنسی اور طبی اعتبار سے یہ شعر تشخیصِ مرض (Diagnosis) کے اس سنہری اصول کو بیان کرتا ہے کہ:

"درست معلومات تک پہنچنے کے لیے تمام بیرونی مداخلتوں (External Variables) کو حذف کرنا لازمی ہے تا کہ صرف اصل حقیقت (Core Reality) سامنے آ سکے۔"

خانہ خالی مانْد و یک دَیّار نَہ

جُز طَبیب و جُز ہمان بیمار نَہ

مشکل الفاظ کے معنی

خانہ:(یہاں مراد انسانی وجود یا دنیا ہے)۔۔۔خالی مانْد خالی رہ گیا،۔۔دَیّار بستی کا رہنے والا، کوئی شخص (عربی لفظ 'دار' سے نکلا ہے)۔۔۔۔جُز: سوائے، علاوہ،۔۔۔۔طبیب: ڈاکٹر، حکیم، معالج (یہاں مراد مرشدِ کامل یا اللہ ہے)۔۔ہمان: وہی، وہ خاص

ترجمہ: گھر خالی رہ گیا اور وہاں کوئی بستی والا (بندہ) موجود نہ رہا؛ وہاں سوائے اس معالج (طبیب) کے اور سوائے اس خاص بیمار کے کوئی دوسرا نہ تھا۔

اس شعر کے کئی پہلو ہیں، جنہیں ہم دو سطحوں پر سمجھ سکتے ہیں:

حکایتی پس منظر

مثنوی میں جب ایک کنیز بیمار ہو جاتی ہے اور دنیا کے تمام حکیم اس کا علاج کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں، تو ایک "طبیبِ الٰہی" (روحانی معالج) تشریف لاتے ہیں۔ وہ حکم دیتے ہیں کہ کمرے کو بالکل خالی کر دیا جائے اور وہاں کوئی تیسرا موجود نہ ہو تاکہ وہ بیمار کے دل کا حال جان سکیں۔ اس وقت کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ اب وہاں صرف دو ہی ہستیاں ہیں: ایک علاج کرنے والا اور دوسرا وہ جو تڑپ رہا ہے۔

۲۔صوفیانہ وعارفانہ پہلو:

صوفیا کے نزدیک اس شعر میں "خلوت" اور "وحدت" کا درس چھپا ہے: خانہ (دل): جب انسان اپنے دل کو دنیاوی خیالات، لالچ اور "غیر اللہ" (دوسروں کی محبت) سے خالی کر دیتا ہے، تو وہاں کوئی "دیار" (غیر) باقی نہیں رہتا۔

ملاقات: جب دل غیروں سے خالی ہو جاتا ہے، تو وہاں صرف دو ہی مقام باقی رہ جاتے ہیں۔ ایک خالق (حقیقی طبیب) اور دوسرا مخلوق (بندہ جو اللہ کی محبت میں بیمار ہے)۔

راز کی بات: یہ شعر اس مقام کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں بندہ اور اس کا رب تنہائی میں ہوتے ہیں۔ جب تک دنیا کے شور اور لوگوں کے خیالات دل میں رہیں گے، وہ حقیقی شفا اور وصال ممکن نہیں ہوتا۔

یہ شعر تنہائی اور توجہِ کامل کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ یعنی جب تک ہم اپنے اندر سے ہجوم کو باہر نہیں نکالیں گے، تب تک ہم اس حقیقی معالج (اللہ) کی توجہ حاصل نہیں کر پائیں گے جو ہمارے روحانی دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کی روح دراصل "اخلاص" اور "خلوتِ مع اللہ" (اللہ کے ساتھ تنہائی) پر مبنی ہے۔ جب ہم اسے قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھتے ہیں، تو اس کے نہایت گہرے مطالب سامنے آتے ہیں:

قلبِ سلیم: دل کا غیر اللہ سے خالی ہونا

شعر میں "خانہ خالی ماند" (گھر کا خالی ہونا) سے مراد دل کی وہ کیفیت ہے جسے قرآن نے "قلبِ سلیم" کہا ہے۔

يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ (88) إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (89)

"قیامت کے دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، سوائے اس کے جو اللہ کے پاس 'قلبِ سلیم' (پاک اور سلامت دل) لے کر آیا۔" (سورۃ الشعراء: 88-89)

جس طرح شعر میں طبیب نے کمرہ خالی کروادیا، ویسے ہی اللہ کی معرفت کے لیے ضروری ہے کہ دل سے بتوں (خواہشات، انا، اور دنیا کی محبت) کو نکال دیا جائے۔ جب دل "خالی" ہوتا ہے، تبھی اس میں "طبیبِ حقیقی" (اللہ) کی تجلی ظاہر ہوتی ہے۔

خلوت اور دعا: بندے اور رب کا مکالمہ

شعر میں "جز طبیب و جز ہمان بیار نہ "(سوائے معالج اور بیمار کے کوئی نہ تھا) اس خاص کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جہاں بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی عاجزی پیش کرتا ہے۔

سنتِ نبوی ﷺ:

حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، حَدَّثَنَا يَحْيَى، عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ، قَالَ: حَدَّثَنِي خُبَيْبُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ تَعَالَى فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ، إِمَامٌ عَدْلٌ وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللَّهِ، وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ، وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللَّهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ، وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ، فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات قسم کے آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے (عرش کے) سایہ میں رکھے گا جس دن اس کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہو گا۔ انصاف کرنے والا حاکم' وہ نوجوان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جوان ہوا ہو' وہ شخص جس کا دل ہر وقت مسجد میں لگا رہے' دو ایسے شخص جو اللہ کے لیے محبت رکھتے ہیں' اسی پر وہ جمع ہوئے اور اسی پر جدا ہوئے' ایسا شخص جسے کسی خوبصورت اور عزت دار عورت نے بلایا لیکن اس نے یہ جواب دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں' وہ انسان جو صدقہ کرے اور اسے اس درجہ چھپائے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا اور وہ شخص جو اللہ کو تنہائی میں یاد کرے اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بہنے لگ جائیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سات قسم کے لوگ ایسے ہیں جنہیں اللہ اپنے سائے میں جگہ دے گا... ان میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔" (صحیح بخاری)

تشریح: یہ "بیمار" (بندہ) اور "طبیب" (اللہ) کی وہ تنہائی ہے جہاں کوئی تیسرا مخل نہیں ہوتا۔ سنتِ نبوی میں "تہجد" کا وقت اسی خلوت کی بہترین مثال ہے جہاں بندہ اپنے روحانی امراض کی شفا مانگتا ہے۔

اللہ ہی حقیقی طبیب (الشافی) ہے

شعر میں "طبیب" کا لفظ اللہ کی صفت "الشافی" کی عکاسی کرتا ہے۔

قرآنی حوالہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول قرآن میں ہے: "**وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ**" (اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے)۔ (سورۃ الشعراء:80)

انسان فطرتاً روحانی طور پر بیمار (گناہوں اور غفلت کا شکار) ہے۔ سنتِ نبوی ہمیں سکھاتی ہے کہ شفا کے لیے غیر اللہ کی طرف دیکھنے کے بجائے براہِ راست اللہ سے تعلق جوڑا جائے۔ رومی اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جب بندہ خود کو "بیمارِ محبت" سمجھ کر اللہ کے سامنے ڈال دیتا ہے، تو اللہ ہی اس کا معالج بن جاتا ہے۔

اخلاص: شرکِ اصغر کی نفی

شعر میں "یک دیارنہ" (کوئی دوسرا بستی والا نہیں) سے مراد اخلاصِ نیت ہے۔

حدیثِ قدسی: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «قَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ».

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالی کا ارشاد ہے: میں تمام شریکوں سے بڑھ کر شرک سے بے نیاز ہوں۔ جو کوئی ایسا عمل کرے، جس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک کرے، میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

(صحیح مسلم:2985)

رومی کے شعر کا پیغام یہ ہے کہ جب تک تمہارے دل کے گھر میں "لوگوں کا ڈر" یا "لوگوں کی واہ واہ" (ریاکاری) موجود ہے، وہاں حقیقی طبیب نہیں آئے گا۔ جب دل "غیر" سے خالی ہو گا، تبھی وحدت کی کیفیت پیدا ہو گی۔

خلاصہ کلام

قرآن و سنت کی روشنی میں اس شعر کی تشریح یہ ہے کہ: نجات اور روحانی شفا اس وقت ملتی ہے جب انسان اپنے دل کو دنیاوی تعلقات اور غیر اللہ کے سہارے سے خالی کر کے "فقیر" اور "بیمار" بن کر اپنے رب کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ یہ مقامِ احسان ہے، جہاں بندہ اللہ کو ایسے پکارتا ہے جیسے وہ اسے دیکھ رہا ہو۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کو اگر ہم طبی (Medical) اور سائنس کے جدید تناظر میں دیکھیں، تو یہ علاج گاہ کے ماحول اور مریض و معالج کے نفسیاتی تعلق کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ سائنس اس کیفیت کو درج ذیل پہلوؤں سے دیکھتی ہے: 1. طبی نکتہ نظر: مریض اور معالج کا تعلق (Doctor-Patient Relationship) جدید طب (Medicine) میں کامیاب علاج کے لیے "Privacy" (خلوت) اور "Confidentiality" (راز داری) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

تشخیصی سکون: جب ایک مریض تنہائی میں ڈاکٹر کو اپنا حال بتاتا ہے، تو وہ ذہنی دباؤ سے آزاد ہوتا ہے۔ "خانہ خالی ماند" یعنی شور و غل اور دوسروں کی مداخلت سے پاک کمرہ مریض کو یہ ہمت دیتا ہے کہ وہ اپنے چھپے ہوئے امراض بیان کر سکے۔

توجہِ کامل: سائنس کہتی ہے کہ جب معالج کی پوری توجہ (Focused Attention) صرف ایک مریض پر ہو، تو تشخیص (Diagnosis) کے غلط ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ شعر میں "جز طبیب و جز بیمار نہ" اسی مکمل فوکس کی طرف اشارہ ہے۔

1. نفسیاتی پہلو (Psychology): کیتھارسس (Catharsis) نفسیاتی علاج (Psychotherapy) میں اس شعر کی کیفیت کو "کیتھارسس" ک((کیتھارسس) کے اردو معنی جذبات کی تسکین، تزکیہ نفس، یا ذہنی صفائی ہیں، جس کا مطلب ہے اندرونی دباؤ، غصے، خوف، یا صدمے جیسے شدید جذبات کو کسی عمل (جیسے آرٹ، ڈرامہ یا گفتگو) کے ذریعے باہر نکال کر ذہنی سکون اور راحت حاصل کرنا، جو ادبی، نفسیاتی، اور طبی اصطلاحات میں استعمال ہوتا ہے) کا عمل کہا جا سکتا ہے۔

خلوت کی ضرورت: ایک ماہرِ نفسیات (طبیب) اپنے مریض کو ایک پرسکون اور تنہا ماحول فراہم کرتا ہے تاکہ مریض کے لاشعور میں دبی ہوئی باتیں باہر آ سکیں۔

اعتماد کا رشتہ: جب تک مریض کو یہ یقین نہ ہو کہ اس کمرے میں "کوئی دوسرا" (یک دیار نہ) موجود نہیں ہے، وہ اپنے دل کی بات نہیں کھولتا۔ رومی نے صدیوں پہلے اس نفسیاتی سچائی کو بیان کر دیا تھا۔

2. حیاتیاتی سائنس (Biological Science): پلیسیبو ایفیکٹ اور شفا سائنس ثابت کرتی ہے کہ انسان کا دماغ (Brain) شفا کے عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

سکونِ قلب اور ہارمونز: جب مریض خود کو ایک محفوظ اور پرسکون ماحول میں پاتا ہے جہاں صرف وہ اور اس کا معالج ہو، تو جسم میں تناؤ پیدا کرنے والے ہارمونز (جیسے Cortisol) کم ہو جاتے ہیں اور سکون دینے والے ہارمونز (جیسے Endorphins) بڑھ جاتے ہیں، جو شفا کے عمل کو تیز کر دیتے ہیں۔ پلیسیبو ایفیکٹ (Placebo Effect): طبیب پر مکمل بھروسہ اور تنہائی میں اس کی توجہ حاصل ہونا مریض کے اندر یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا، اور یہ یقین خود ایک دوا کا کام کرتا ہے۔ سائنسی و طبی تجزیہ (جدول) شعر کا حصہ سائنسی / طبی تعبیر اثر خانہ خالی ماند ماحول کی صفائی اور شور سے پاک ہونا ذہنی سکون اور تناؤ میں کمی یک دیار نہ ہر از داری

(Confidentiality)مریض کا مکمل اظہارِ حال جُز طبیب معالج کی مہارت اور توجہ درست تشخیص اور علاج جُز ہمان بیمار مریض کی مرکزیت (Patient-Centric Care)خود اعتمادی اور تیز شفایابی

خلاصہ: سائنسی لحاظ سے یہ شعر ایک "Ideal Clinical Setting"(مثالی طبی ماحول) کی تعریف ہے، جہاں مریض کا معالج پر کامل بھروسہ اور بیرونی مداخلت کا خاتمہ علاج کی پہلی سیڑھی ہے۔

مولانا رومی کے اس شعر کا مرکزی مضمون "خلوتِ راز" اور "عشق و مستی کی تنہائی" ہے۔ اردو اور فارسی کے تین بڑے شعراء—عراقی، حافظ اور اقبال—نے اپنے مخصوص رنگ میں اسی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ ذیل میں ان تینوں کے افکار کی روشنی میں اس کی تشریح پیش ہے:

1. فخر الدین عراقی: مقامِ فنا اور محویت عراقی صوفیانہ عشق کے اس مقام کے شاعر ہیں جہاں "دوئی" (Dualism) ختم ہو جاتی ہے۔ رومی کے شعر میں جو طبیب اور بیمار کی تنہائی ہے، عراقی اسے "اتحادِ عاشق و معشوق" کے طور پر دیکھتے ہیں۔

عراقی کے نزدیک جب دل کا گھر (خانہ) غیر سے خالی ہوتا ہے، تو وہاں یہ تمیز بھی ختم ہو جاتی ہے کہ کون طبیب ہے اور کون بیمار۔ ان کے ہاں "خلوت" کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز نظروں سے اوجھل ہو جائے اور صرف ذاتِ حق باقی رہے۔

عراقی کا ہم معنی شعر:

نخستین بادہ کہ اندر جام کردند ✪ ز چشم مست ساقی وام کردند

(پہلی شراب جو جام میں ڈالی گئی، وہ ساقی کی مست آنکھوں سے مستعار لی گئی تھی۔)

یعنی وہاں ساقی اور شراب کے سوا کوئی تیسرا تھا ہی نہیں، بالکل ویسے ہی جیسے رومی کے ہاں صرف طبیب اور بیمار ہیں۔

2. حافظ شیرازی:

رندانہ خلوت اور رازداری حافظ کے ہاں "خانہ" سے مراد "خلوت کدہِ رنداں" ہے جہاں غیروں (ریاکاروں اور زاہدوں) کا داخلہ ممنوع ہے۔

حافظ رومی کے اس شعر کو "رازداری" کے پیرائے میں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب تک "اغیار" (اجنبی لوگ) موجود ہیں، معشوق (طبیب) اپنے چہرے سے پردہ نہیں ہٹاتا۔ حافظ کہتے ہیں کہ اپنے دل کے دروازے غیروں پر بند کر دو تاکہ وہ "خاص بیمار" (عاشق) اپنے طبیب سے ہمکلام ہو سکے۔

حافظ کا ہم معنی شعر:

خلوتِ دل نیست جایِ صحبتِ اضداد ✪ دیو چو بیرون رود فرشتہ در آید

(دل کی تنہائی متضاد چیزوں کے اکٹھے ہونے کی جگہ نہیں؛ جب شیطان (غیر اللہ) باہر نکلتا ہے، تب ہی فرشتہ اندر آتا ہے۔)

4. علامہ اقبال:

سوزِ دروں اور انفرادیت اقبال اس شعر کو "خودی کی تربیت" اور "خالق و مخلوق کے براہِ راست تعلق" کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک "خانہ خالی ماند" کا مطلب کائنات سے کٹنا نہیں، بلکہ اپنی خودی میں ڈوبنا ہے۔

اقبال اس "بیمار" کو وہ تڑپتا ہوا انسان قرار دیتے ہیں جو اپنی اصلاح کے لیے کسی "طبیب" (مردِ مومن یا اللہ) کی تلاش میں ہے۔ اقبال کے مطابق یہ وہ مقام ہے جہاں بندہ کائنات کے ہنگاموں سے بے نیاز ہو کر اپنے رب سے ہمکلام ہوتا ہے (مقامِ بندگی)۔

اقبال کا ہم معنی شعر:

تری نگاہ سے بچ کر کہاں جاؤں گا جہاں جاؤں گا تو ہی تو سامنے ہو گا

یاخلوت میں خودی، انجمن میں خدا!

اقبالی نقطہ نظر:

اقبال رومی کے اس شعر کو "مردِ مومن" کی اس کیفیت سے تعبیر کریں گے جہاں وہ اپنی "بیماری" (عجز) کو "طبیب" (قوتِ حق) کے سپرد کر کے لافانی ہو جاتا ہے۔

موازنہ: ایک نظر میں شاعر تشریح کا رخ مرکزی نکتہ عراقی فنا فی اللہ، دوئی کا خاتمہ، صرف ایک ہی وجود باقی رہتا ہے۔ حافظ رازداری / رندی غیروں (اغیار) کی موجودگی میں راز کی بات نہیں ہوتی۔ اقبال خودی و بندگی بندے کا اپنے رب سے براہِ راست اور پرزور تعلق۔

خلاصہ: رومی کا شعر ایک بنیاد فراہم کرتا ہے، عراقی اس میں فناڈھونڈتے ہیں، حافظ اس میں وفا اور رازداری تلاش کرتے ہیں، جبکہ اقبال اسے خودی کی بلندی اور رب سے مکالمے کا ذریعہ بناتے ہیں۔

نَرمُ نَرمَکُ گفت شہرِ تو کجاست؟
کہ عِلاجِ اَہلِ ہر شہری جُدا است

مشکل الفاظ کے معنی

نَرم نَرمَک: آہستہ آہستہ، نہایت نرمی اور محبت سے , شہرِ تو: تمہارا شہر، مراد تمہارا باطنی حال، مزاج، درجۂ فہم
علاج: اصلاح، تربیت، روحانی دوا , اہلِ ہر شہری: ہر شہر (ہر مزاج، ہر باطنی حال) کے لوگ , جُدا است: جدا جدا ہے، مختلف ہے

ترجمہ:

"اس (طبیب) نے نہایت نرمی اور آہستہ سے پوچھا کہ تمہارا شہر کون سا ہے؟ کیونکہ ہر شہر کے رہنے والوں کا علاج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔"

مفہوم ثانی: اس نے نہایت نرمی سے پوچھا:
تمہارا تعلق کس باطنی دنیا سے ہے؟ کیونکہ ہر انسان کے مزاج اور روحانی حالت کے مطابق اس کی اصلاح اور رہنمائی مختلف ہوتی ہے۔
اس شعر کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور طبی، اور دوسرا باطنی اور روحانی۔
1۔ نفسیاتی اور طبی پہلو (ظاہری معنی): مولانا رومیؒ بیان کر رہے ہیں کہ ایک ماہر معالج صرف دوا نہیں دیتا، بلکہ وہ مریض کا اعتماد جیتتا ہے۔ یہاں حکیم نے نہایت 'نرم نرمک' (آہستگی اور محبت) سے بات شروع کی تاکہ مریضہ گھبرا نہ جائے اور اپنے دل کا حال بیان کر دے۔ "شہر" پوچھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان جس ماحول، آب وہوا اور معاشرے میں رہتا ہے، اس کے مزاج اور بیماریوں کی نوعیت بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہر علاقے کے لوگوں کی نفسیات اور جسمانی ساخت الگ ہوتی ہے، اس لیے ان کا علاج بھی جداگانہ ہونا چاہیے۔
2۔ روحانی اور تصوف کا پہلو (باطنی معنی): صوفیانہ نکتہ نظر سے اس شعر میں چند اہم پیغامات پوشیدہ ہیں:
انفرادیت :(Individuality) ہر انسان کا روحانی سفر اور اس کی قلبی بیماریاں (حسد، کبر، عشق، اداسی) دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ مرشدِ کامل (روحانی استاد) ہر مرید کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکتا، بلکہ وہ ہر ایک کے "شہر" یعنی اس کے پس منظر اور استعداد کے مطابق اس کی تربیت کرتا ہے۔
محبت اور شفقت: اصلاحِ نفس کے لیے سختی کے بجائے نرمی اور ہمدردی ضروری ہے۔ جب تک طبیبِ روحانی مریض کے دل میں گھر نہ کر لے، وہ اس کے باطنی امراض کا علاج نہیں کر سکتا۔
بیماری کی جڑ تک پہنچنا: یہاں شہر پوچھنا محض جغرافیہ جاننا نہیں ہے، بلکہ یہ اس "اصل سبب" تک پہنچنے کی کوشش ہے جہاں سے دکھ کا آغاز ہوا۔
مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ہر انسان کا باطن، مزاج، فہم اور روحانی درجۂ شعور مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے:
جو نصیحت ایک شخص کے لیے مفید ہو وہی بات دوسرے کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے
اسی لیے ایک دانا، حکیم یا مرشد: پہلے نرمی سے حال پوچھتا ہے، سامنے والے کی باطنی کیفیت، فکری سطح اور روحانی شہر کو پہچانتا ہے، پھر اسی کے مطابق علاجِ دل تجویز کرتا ہے
یہی وجہ ہے کہ:

انبیا علیہم السلام نے ہر قوم سے ان کی عقل کے مطابق کلام فرمایا، صوفیا کرام ہر مرید کو ایک سا دوا ایک سا طریقہ نہیں دیتے۔ بغیر پہچانے دوا دینا، علاج نہیں بلکہ زہر بن جاتا ہے۔

اسی لیے کہا گیا:

سخت بات سخت دل کو اور سخت بنا دیتی ہے، نرمی سے کہی گئی بات دل کے بند دروازے کھول دیتی ہے۔

1" . شہر" سے مراد: مقامِ ارواح اور تعلقِ خاطر

وجدان کی زبان میں "شہر" سے مراد وہ مقام یا وہ مرکز ہے جہاں انسان کا دل اٹکا ہوا ہے۔ ہر انسان کی بے چینی کی ایک خاص وجہ ہوتی ہے؛ کوئی دنیا کے غم میں بیمار ہے، کوئی نفس کی قید میں ہے، اور کوئی فراقِ الٰہی میں تڑپ رہا ہے۔

تعبیر: روحانی طبیب (مرشد) مرید سے یہ پوچھ رہا ہے کہ "تیری تڑپ کا مرکز کیا ہے؟" کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ روح کس "شہر" (خیال یا تعلق) کی اسیر ہے، اس کی بے قراری کا علاج ممکن نہیں۔

"علاجِ اہلِ ہر شہری جداست": انفرادی سلوک

تصوف میں یہ مانا جاتا ہے کہ "الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق" (اللہ تک پہنچنے کے راستے اتنے ہی ہیں جتنے مخلوق کے سانس)۔

وجدان: ہر روح کی پیاس الگ ہے اور ہر ایک کا ظرف الگ۔ کسی کا علاج "ذکر" ہے، کسی کا "خدمت"، اور کسی کا "خاموشی"۔ وجدانی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف جانے والا ہر راستہ ہر مسافر کے لیے یکساں نہیں ہوتا۔ مرشدِ کامل مرید کے باطنی "شہر" (اس کی فطرت اور میلان) کو دیکھ کر اسے وہ راستہ بتاتا ہے جو اسے جلد منزل تک پہنچا دے۔

نرم نرمک": فیضِ الٰہی کی لطافت

روحانیت میں "نرمی" سے مراد وہ لطافت ہے جو قلبِ انسانی پر وارد ہوتی ہے۔ اللہ کی معرفت یا مرشد کی توجہ جب دل پر پڑتی ہے، تو وہ کسی بوجھ کی طرح نہیں ہوتی، بلکہ وہ نہایت نرمی سے انسان کے اندر چھپے ہوئے "درد" (راز) کو کرید دیتی ہے۔

تعبیر: یہ لطیف گفتگو اس بات کی علامت ہے کہ سچائی تک پہنچنے کے لیے روح کے ساتھ زبردستی نہیں کی جاسکتی۔ جب روح سکون اور محبت محسوس کرتی ہے، تبھی وہ اپنے چھپے ہوئے راز (اپنے اصل مرض یا عشق) کو ظاہر کرتی ہے۔

کثرت میں وحدت کا ادراک

اگرچہ "ہر شہر کا علاج جدا" ہے، لیکن طبیب ایک ہی ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسانیت کے رنگ، نسل اور مزاج مختلف ہوسکتے ہیں، لیکن ان سب کا شافیِ حقیقی (اللہ) ایک ہی ہے۔ وہ ہر انسان کی پکار اس کی اپنی زبان اور اس کے اپنے "شہر" کے لب و لہجے میں سنتا اور علاج کرتا ہے۔

حاصلِ کلام: اس شعر کی وجدانی تعبیر یہ ہے کہ انسان کی اصل بیماری اس کا وہ "تعلق" ہے جو اسے خدا سے دور رکھتا ہے۔ وہ تعلق کس "شہر" (چیز) سے ہے؟ یہ جاننا ہی شفا کی پہلی سیڑھی ہے، اور ایک کامل رہبر نہایت شفقت سے بندے کو اس کے اس داخلی شہر سے نکال کر "اقلیمِ وحدت" (خدا کی طرف) لے جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کی روشنی میں

ہر ایک کی صلاحیت اور وسعت جدا ہے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا سورۃ البقرہ (2:286)

ترجمہ:

اللہ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ خود بندوں کی وسعت، استعداد اور حالت کو دیکھ کر حکم دیتا ہے۔ تو ایک داعی، معلم یا مربی بھی اسی اصول پر چلے گا۔

حکمت کے ساتھ دعوت دینے کا حکم

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ سورۃ النحل (16:125)

اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ۔

حکمت کا مطلب ہے:
موقع محل کی رعایت، مخاطب کے مزاج اور ذہنی سطح کو پہچاننا، یہی شعر میں "شہر تو کجاست؟" کے سوال کا قرآنی مفہوم ہے۔
ہر نبی اپنی قوم کی زبان میں آیا
وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ سورۃ ابراہیم (14:4)
ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔
زبان صرف الفاظ نہیں بلکہ: سوچ، ثقافت، فہم کا نام ہے۔ یعنی ہدایت ہمیشہ مخاطب کے "شہر" کے مطابق آتی ہے۔
احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں
لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں (موقوف روایت): **حدِّثوا النّاسَ بما يعرِفون**۔ لوگوں سے وہ بات کرو جو وہ سمجھ سکیں۔
یہ حدیث اس شعر کی صریح تفسیر ہے کہ ہر شخص کے لیے ایک ہی اسلوب مفید نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تربیتی اسلوب

ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ! مجھے کوئی مختصر نصیحت فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لَا تَغْضَبْ** (غصہ نہ کیا کرو) (بخاری)
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے: نہ نماز، نہ روزہ، نہ صدقہ کا ذکر کیا، بلکہ اس شخص کے اصل مرض کو پہچان کر علاج بتایا
یہی "علاجِ اہلِ ہر شہری جداست" کی عملی مثال ہے۔

آسانی پیدا کرو، سختی نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا** آسانی پیدا کرو، سختی نہ کرو۔ (بخاری، مسلم)
یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ: سختی ہر ایک کے لیے یکساں نہیں ہوتی، بعض کے لیے نرمی ہی اصل دوا ہے۔

توجو اہم باتیں سامنے آتی ہیں ان کے مطابق:

1. حکمت اور نرمی کا اسلوب (نرم نرمک گفت)

اللہ تعالیٰ نے داعی اور معالج کے لیے "نرمی" کو کامیابی کی شرط قرار دیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ" (ترجمہ: اللہ کی رحمت کے باعث آپ ان کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہیں، اور اگر آپ بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے چھٹ کر بھاگ جاتے۔)—سورہ آل عمران:159

رومیؒ کا "نرم نرمک" کہنا دراصل اسی قرآنی صفت کی عکاسی ہے کہ دلوں کے بھید صرف محبت اور نرمی سے ہی کھلتے ہیں۔

2. ہر انسان کی استعداد الگ ہے (علاجِ اہلِ ہر شہری جدا است)

قرآن کریم نے واضح کیا ہے کہ ہر انسان اپنی ساخت اور میلانِ طبع کے مطابق عمل کرتا ہے:

"قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ" (ترجمہ: فرما دیجیے: ہر ایک اپنے (فطری) طریقے اور میلان کے مطابق عمل کرتا ہے۔)—سورہ بنی اسرائیل:84

سنتِ نبوی ﷺ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس جب مختلف لوگ آکر نصیحت طلب کرتے، تو آپ ﷺ ہر ایک کو اس کے "باطنی شہر" (یعنی اس کی کمزوری یا ضرورت) کے مطابق الگ جواب دیتے۔

کسی کو فرمایا: "غصہ نہ کرو۔" کسی کو فرمایا: "اپنی زبان قابو میں رکھو۔" کسی کو "والدین کی خدمت" کا حکم دیا تو کسی کو "جہاد" کی فضیلت بتائی۔ یہ بعینہٖ وہی "علاجِ جدا" ہے جس کا ذکر رومیؒ کر رہے ہیں۔

3. قرآن بحیثیتِ شفا (علاجِ اہلِ شہر)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو عمومی دوا نہیں بلکہ "شفا" کہا ہے:

"وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ" (اور ہم قرآن میں وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔)—سورہ بنی اسرائیل:82

قرآنِ کریم میں شک، کینہ، حسد اور کفر جیسی بیماریوں کا ذکر ہے اور ان میں سے ہر ایک کا "نفسیاتی اور روحانی" علاج مختلف طریقوں (خوفِ خدا، توبہ، ذکر، تدبر) سے کیا گیا ہے۔

4 . داعی کا بصیرت مند ہونا

شعر میں طبیب کا "شہر" پوچھنا اس کی بصیرت کی علامت ہے۔ سنتِ نبوی ﷺ ہمیں سکھاتی ہے کہ جب معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا گیا تو آپ ﷺ نے پہلے انہیں وہاں کے لوگوں کے عقائد اور پس منظر (شہر کے حالات) سے آگاہ فرمایا تاکہ وہ اسی مناسبت سے دعوت دیں۔

خلاصہ تعبیر

قرآن و سنت کی روشنی میں اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اصلاحِ نفس کے لیے "انسانی نفسیات" کو سمجھنا ضروری ہے۔ دین کوئی خشک ضابطہ نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید "علاج" ہے جو ہر انسان کی انفرادی ضرورت، اس کے ماضی (شہر) اور اس کے قلبی امراض کو مدنظر رکھ کر اسے اللہ سے جوڑتا ہے۔

وَنْدَر آن شہر از قَرابَت کیسْتَت؟

خویشی و پیوستگی باچیستَت؟

مشکل الفاظ کے معنی

وَندر: اور اُس میں / اور وہاں۔۔۔ , شہر: شہر (باطنی یا ظاہری معاشرہ)۔۔۔ , قَرابَت: قرب، نزدیکی، رشتہ کیسْتَت؟: کس سے ہے؟۔۔۔ خویشی: رشتہ داری، قرابت۔۔۔ , پیوستگی: تعلق، وابستگی باچیستَت؟: کس چیز کے ساتھ ہے؟

ترجمہ

اور اُس شہر میں تیرا قرب کس کے ساتھ ہے؟ تیری رشتہ داری اور وابستگی کس سے ہے؟ یعنی اور اس شہر میں تیرا رشتہ دار کون ہے؟ تیری وہاں کس سے نزدیکی ہے؟

اس شعر میں مولانا رومی انسان کو اس کی روحانی اصل کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ صوفیانہ فکر کے مطابق انسان اس مادی دنیا کا اصل باشندہ نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل وطن "عالمِ ارواح" یا "عالمِ قدس" ہے۔

الف) "آن شہر" (وہ شہر) سے کیا مراد ہے؟

یہاں "شہر" سے مراد یہ مادی دنیا یا جسم نہیں ہے، بلکہ وہ مقام ہے جہاں سے روح آئی ہے۔ اسے "نیستاں" (بانسری کا وہ باغ جہاں سے بانسری کاٹی گئی) یا "عالمِ لاہوت" بھی کہا جاتا ہے۔ شاعر پوچھ رہا ہے کہ اے انسان! تو اس دنیا کی رنگینیوں میں کھو گیا ہے، لیکن ذرا سوچ کہ اس حقیقی شہر میں تیرا کون ہے؟

ب) غربت اور اجنبیت کا احساس

انسان اس دنیا میں ایک مسافر کی طرح ہے۔ مولانا رومی اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ روح اس مادی قید خانے (جسم) میں کیوں تڑپتی ہے؟ وہ تڑپتی اس لیے ہے کیونکہ اس کا "خویش" (رشتہ دار) اور اس کی "پیوستگی" (تعلق) یہاں نہیں بلکہ اس الٰہی شہر میں ہے جہاں سے وہ جدا ہو کر آئی ہے۔

ج) خود شناسی کی دعوت

ان سوالات کے ذریعے رومی دراصل انسان کو خود شناسی (Self-realization) کی دعوت دے رہے ہیں۔

وہ پوچھ رہے ہیں: کیا تیرا تعلق مٹی کے اس ڈھیر سے ہے؟

یا تیرا رشتہ اس ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے جس نے تیرے اندر اپنی روح پھونکی؟

د) حاصلِ کلام

تشریح کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان کو اپنی اصل کو نہیں بھولنا چاہیے۔ جب تک انسان اپنی روحانی نسبت (پیوستگی) کو نہیں پہچانتا، وہ اس دنیا میں بے چین رہتا ہے۔ رومی یہ احساس دلا رہے ہیں کہ تمہارا حقیقی رشتہ اللہ کی ذات اور عالمِ ارواح سے ہے، لہٰذا اس عارضی دنیا کی رشتہ داریوں پر فخر کرنے کے بجائے اس حقیقی تعلق کو تلاش کرو۔

قرآن و سنت کی روشنی میں ان اشعار پر غور کرنے سے جو بنیادی حقیقت سامنے آتی ہے، اسے ہم درج ذیل تین اہم نکات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1. انسان کی "دوہری" حیثیت (Dual Nature) رومی کے سوالات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان صرف گوشت پوست کا نام نہیں، بلکہ اس کے اندر ایک ربانی روح موجود ہے۔

قرآنی نکتہ: قرآن فرماتا ہے: فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (الحجر: 29)۔ جب اللہ نے انسان میں اپنی روح پھونکی، تو انسان کا تعلق مٹی کے بجائے "عالمِ بالا" سے جڑ گیا۔

قرآن و سنت کے مطابق، انسان اس دنیا میں ایک اجنبی (Stranger) ہے

آپ ﷺ نے فرمایا:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبِي، فَقَالَ:

«كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ، يَقُولُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلاَ تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلاَ تَنْتَظِرِ المَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ.

[صحيح]-[رواه البخاري]-[صحيح البخاري: 6416]

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا:

”دنیا میں ایسے رہو، جیسے ایک اجنبی یا راہ گیر ہو“۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما فرمایا کرتے تھے: ”جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ اپنی صحت و تندرستی کے زمانے میں بیماری کے لیے اور اپنی زندگی میں موت کے لیے تیاری کر لو“

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کندھے کو پکڑا اور ان سے کہا: دنیا میں ایسے رہو، جیسے تم ایک اجنبی آدمی ہو، جو ایک ایسی جگہ پہنچ چکا ہو، جہاں نہ رہنے کا گھر ہو اور نہ دل بہلانے کے لیے آدمی۔ نہ اہل و عیال ہوں اور نہ رشتے داریاں۔ کیوں کہ یہی چیزیں انسان کو اس کے پیدا کرنے والے سے مشغول رکھتی ہیں۔ بلکہ اجنبی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر اپنے وطن کی تلاش میں نکلا ہوا راہ گیر بن جاؤ۔ اجنبی شخص تو کبھی کبھی کسی اجنبی جگہ میں اقامت گزیں بھی ہو جاتا ہے، لیکن اپنے شہر کی جانب جاتا ہوا راہ گیر چلتا ہی رہتا ہے۔ کہیں اقامت پزیر نہیں ہوتا۔ اس کی نظر منزل پر رہتی ہے۔ لہذا جس طرح ایک مسافر اتنی ہی چیزیں ساتھ لے جانا ضروری سمجھتا ہے، جو منزل تک پہنچا دیں، اسی طرح ایک مومن دنیا کے اتنے ہی اسباب جمع کرنا ضروری سمجھتا ہے، جو اسے منزل (جنت) تک پہنچا دیں۔

چنانچہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہمانے اس نصیحت پر مکمل طور سے عمل کیا۔ وہ کہا کرتے تھے: صبح آئے، تو شام کا انتظار مت کرو اور شام آئے تو صبح کا انتظار مت کرو۔ خود کو قبر میں دفن لوگوں میں شمار کرو۔ کیوں کہ انسان کی زندگی صحت اور مرض سے خالی نہیں ہوتی۔ اس لیے بیماری کے دن آنے سے پہلے صحت کے دنوں میں نیکی کے

کام کر لیا کرو۔ صحت کے دنوں میں نیکی کے کام کرتے جاؤ کہ کہیں بیماری راہ نہ روک لے۔ دنیا کی زندگی کو غنیمت جانتے ہوئے ایسی چیزیں اکٹھی کر لو، جو موت کے بعد کام آئیں۔
رومی یہی پوچھ رہے ہیں کہ جب تم یہاں مسافر ہو، تو تمہارا اصل رشتہ (قرابت) یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہارا رشتہ تو وہاں ہے جہاں سے تمہاری روح آئی ہے۔

عہدِ الست: ہماری اصل پہچان

شعر میں "آن شہر" (وہ شہر) سے مراد وہ مقام ہے جہاں تمام روحوں نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا۔ قرآنی نکتہ: سورہ الاعراف (172) میں عہدِ الست کا ذکر ہے، جہاں اللہ نے روحوں سے پوچھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" سب نے کہا: "بیشک تو ہی ہے۔" نتیجہ: قرآن و سنت کی رو سے انسان کی اصل "پیوستگی" (تعلق) اللہ کی ذات سے ہے۔ دنیا کی تمام رشتہ داریاں (ماں، باپ، اولاد) عارضی ہیں اور موت کے ساتھ ختم ہو جائیں گی، جبکہ وہ روحانی رشتہ (خالق اور مخلوق کا) دائمی ہے۔ رومی اسی دائمی رشتے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اصل وطن کی طرف واپسی (The Concept of Home)

رومی کے اشعار یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ تمہاری وابستگی کس چیز سے ہے؟ کیا تم اس مادی دنیا کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھے ہو؟ قرآن بار بار کہتا ہے: وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ (النجم: 42) یعنی "اور بیشک تمہارے رب ہی کی طرف آخری پہنچنا ہے۔"
نتیجہ: اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ انسان کی منزل یہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے۔ سنتِ نبویؐ ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ مومن کا دل دنیا میں نہیں بلکہ اپنے رب کی یاد میں لگتا ہے۔ رومی کا سوال "خویشی و پیوستگی با چیستت؟" دراصل ایک تنبیہ ہے کہ اگر تمہارا تعلق اللہ سے نہیں ہے، تو تم اس کائنات میں یتیم اور تنہا ہو۔
خلاصہ کلام (قرآن و سنت کی روشنی میں) ان اشعار سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ: دنیا ایک مسافر خانہ ہے: یہاں کی قرابتیں اور رشتے صرف امتحان کے لیے ہیں۔ روح کی اصل اللہ ہے: ہماری اصل خوشی اور سکون (پیوستگی) اللہ کی معرفت میں ہے۔ خود شناسی ہی خدا شناسی ہے: جب انسان اپنی روح کی حقیقت کو پہچان لیتا ہے، تو

اسے سمجھ آ جاتا ہے کہ وہ اس دنیا کا نہیں بلکہ اس "مقدس شہر" کا رہنے والا ہے جہاں اللہ کی قربت میسر تھی۔
قرآن و سنت کا جوہر یہ ہے کہ انسان اپنی مادی ضروریات پوری کرتے ہوئے بھی اپنی روحانی نسبت (اللہ سے تعلق) کو نہ بھولے، کیونکہ یہی وہ واحد رشتہ ہے جو قبر اور حشر میں کام آئے گا۔

نفسیاتی نقطہ نظر (Psychological Perspective) سے مولانا رومی کے یہ اشعار انسانی لاشعور، شخصیت کی تکمیل اور وجودی خلا (Existential Vacuum) کی عکاسی کرتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات، خاص طور پر کارل یونگ اور وکٹر فرینکل کے نظریات کی روشنی میں اس کی توضیح درج ذیل ہے:

وجودی تنہائی اور "گھر" کی تلاش (Existential Loneliness)

نفسیات کے مطابق ہر انسان کے اندر ایک نامعلوم "کمی" یا "خلا" کا احساس پایا جاتا ہے۔ رومی کا سوال "اس شہر میں تیرا رشتہ دار کون ہے؟" دراصل اس نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے جسے ہم Home-sickness of the Soul کہتے ہیں۔

انسان دنیا میں سب کچھ حاصل کر کے بھی ایک اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہماری انا (Ego) مادی دنیا میں رشتہ داریاں تو ڈھونڈ لیتی ہے، لیکن ہماری روح (Self) اپنی اصل کے لیے تڑپتی رہتی ہے۔

2. کارل یونگ کا "تفرّد" کا نظریہ (Individuation)

مشہور ماہرِ نفسیات کارل یونگ کے مطابق انسانی شخصیت کا ایک حصہ وہ ہے جو معاشرہ دیکھتا ہے، لیکن ایک گہرا حصہ "لازمان ولامکاں" سے جڑا ہوتا ہے۔

پیوستگی باچیستت؟ (تیرا تعلق کس سے ہے؟): یونگ کے نزدیک جب تک انسان اپنی داخلی حقیقت (Collective Unconscious) سے نہیں جڑتا، وہ ادھورا رہتا ہے۔ رومی کا سوال انسان کو مادی ماسک (Persona) اتار کر اپنی اصل شخصیت (Archetype) سے جڑنے کی ترغیب دیتا ہے۔

3. معنی کی تلاش (Logotherapy)

ڈاکٹر وکٹر فرینکل کے مطابق انسان کی بنیادی نفسیاتی ضرورت "معنی (Meaning)" کی تلاش ہے۔

اگر انسان کی "قرابت" اور "پیوستگی" (وابستگی) صرف فانی چیزوں (پیسہ، رتبہ، عارضی رشتے) سے ہو، تو ان کے چھن جانے پر انسان نفسیاتی طور پر ٹوٹ جاتا ہے۔

رومی نفسیاتی طور پر انسان کو ایک ایسے مرکز (Center) سے جوڑ رہے ہیں جو غیر فانی ہے، تاکہ اسے وہ ذہنی سکون ملے جو بیرونی حالات کا محتاج نہ ہو۔

4. اجنبیت کا احساس (Sense of Alienation)

نفسیات میں "Alienation" اس کیفیت کو کہتے ہیں جب انسان ہجوم میں رہ کر بھی خود کو اکیلا محسوس کرے۔

رومی یہ سوال کر کے اس نفسیاتی مرض کا علاج بتا رہے ہیں:

تم اس لیے اکیلے ہو کیونکہ تم نے "اجنبیوں" (مادی خواہشات) سے رشتہ جوڑ لیا ہے اور اپنے "حقیقی رشتہ دار" (اپنی روح اور خالق) کو بھلا دیا ہے۔

توضیح: جب انسان اپنی روحانی جڑوں کو پہچان لیتا ہے، تو اس کی نفسیاتی بے چینی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اسے اپنی "پیوستگی (Connection)" کا سرا مل جاتا ہے۔

خلاصہ

نفسیاتی طور پر یہ اشعار انسان کو Identity Crisis (بحرانِ شناخت) سے نکالنے کی کوشش ہیں۔ یہ سوالات انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کی تہوں میں اترے اور دیکھے کہ اس کی اصل وابستگی کہاں ہے۔ جس دن انسان کو یہ شعور آ جاتا ہے کہ اس کا اصل رشتہ "مادہ" سے نہیں بلکہ "معنی" سے ہے، اس دن اس کی تمام نفسیاتی الجھنیں سلجھ جاتی ہیں۔

دست بر نَبضَش نَہاد و یک بہ یَک

بازمی پُرسید از جورِ فلَک

مشکل الفاظ کے معنی

دست بر نبض نہاد: ہاتھ نبض پر رکھا، نبض ٹٹولی (حالت جانچنے کے معنی میں)، نبض: دل کی دھڑکن، زندگی کی علامت، باطنی کیفیت کا اظہار، یک بہ یک: ایک ایک کر کے، تفصیل سے، باری باری
بازمی پرسید: دوبارہ پوچھنے لگا، بار بار سوال کرنے لگا، جورِ فلک: زمانے کا ظلم، گردشِ ایام کی سختی، دنیا کے مصائب
فلک: آسمان، زمانہ، تقدیر، دنیاوی حالات

ترجمہ:

ہاتھ اس کی نبض پر رکھا اور پھر ایک ایک کر کے زمانے کے دکھوں اور تقدیر کے ستم کے بارے میں پوچھنے لگا۔

اس شعر میں مولانا رومیؒ ایک ماہر معالج کی نفسیاتی بصیرت اور تشخیصِ مرض کا طریقہ بیان کر رہے ہیں۔ اس کی تشریح کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

1. جسمانی علامت سے روحانی کیفیت تک:

حکیم نے لونڈی کا ہاتھ پکڑ کر نبض پر انگلیاں رکھ لیں۔ قدیم طب میں نبض کی رفتار سے نہ صرف جسمانی بیماری بلکہ انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ بھی لگایا جاتا تھا۔ حکیم کا مقصد یہ دیکھنا تھا کہ کن یادوں یا کن شہروں کے ذکر پر لونڈی کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے، تاکہ اس کے چھپے ہوئے دکھ (عشق) کو پہچانا جاسکے۔

2. جورِ فلک (گردشِ ایام) کا ذکر:

حکیم نے براہِ راست یہ نہیں پوچھا کہ "تمہیں کیا بیماری ہے؟" بلکہ اس نے اس کی زندگی کے حالات، ان مقامات جہاں وہ رہی، اور ان لوگوں جن سے وہ ملی، کے بارے میں سوالات شروع کیے۔ "جورِ فلک" سے مراد وہ تلخ واقعات ہیں جو اس پر گزرے تھے۔ رومیؒ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان کے بہت سے جسمانی امراض دراصل ان کے ماضی کے دکھوں اور محرومیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

3. صوفیانہ نکتہ:

تصوف کی رو سے یہ شعر مرشدِ کامل (روحانی استاد) کی علامت ہے۔ جس طرح ایک طبیب نبض دیکھ کر بیماری پکڑ لیتا ہے، اسی طرح ایک مرشدِ کامل اپنے مرید کی باتوں اور اس کے احوال سے یہ جان لیتا ہے کہ مرید کا دل کہاں اٹکا ہوا ہے اور کون سی دنیاوی محبت اسے اللہ کی راہ سے روک رہی ہے۔

4. نفسیاتی علاج (Psychotherapy)

جدید نفسیات کی رو سے دیکھیں تو یہ "تخلیہ" یا "Free Association" کی ایک صورت ہے۔ مریض جب اپنے دکھ بیان کرتا ہے تو اس کا کتھارسس (تزکیہ) ہوتا ہے۔ حکیم اسے بولنے کا موقع دے رہا ہے تاکہ وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے اور اصل حقیقت سامنے آسکے۔

خلاصہ: اس شعر میں بیان کیا گیا ہے کہ سچا معالج وہ ہے جو صرف علامات کا علاج نہیں کرتا بلکہ مریض کے ساتھ ہمدردی پیدا کر کے اس کے دل کے زخموں تک پہنچتا ہے۔

اس شعر کا مفہوم قرآن و سنت کے ان اصولوں سے گہری ہم آہنگی رکھتا ہے جو انسانی نفس، قلب کی حالت اور معالج (رہنما) کے کردار سے متعلق ہیں۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی تشریح کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. قلب (دل) کی مرکزیت اور جسم پر اس کے اثرات رومیؒ نے نبض کے ذریعے دل کی کیفیت جاننے کی جو بات کی ہے، اس کی بنیاد اس مشہور حدیثِ نبوی ﷺ میں ملتی ہے:

قَالَ: قَالَ: وَسَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: "فِي الإِنْسَانِ مُضْغَةٌ، إِذَا هِيَ صَلُحَتْ وَسَلِمَتْ سَلِمَ لَهَا سَائِرُ الْجَسَدِ وَصَحَّ، وَإِذَا هِيَ سَقِمَتْ سَقِمَ لَهَا سَائِرُ الْجَسَدِ وَفَسَدَ، وَهِيَ الْقَلْبُ".

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: "انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح و سالم رہے، تو سارا جسم صحیح و سالم رہتا ہے۔ اگر وہ بیمار ہو جائے، تو سارا جسم بیمار اور خراب ہو جاتا ہے۔ وہ دل ہے۔" [مسند الحميدي / حديث: 945]

تخریج الحدیث: « صحيح، وأخرجه البخاري في « صحيحه » برقم: 52، 2051، 6011، ومسلم في « صحيحه » برقم: 1599، وابن حبان في « صحيحه » برقم: 233، 297، 721، 5569، والنسائي في « المجتبیٰ » برقم: 4465، 5726، والنسائي في « الكبریٰ » برقم: 5200، 5997، وأبو داود في « سننه » برقم: 3329، والترمذي في « جامعه » برقم: 1205، والدارمي في « مسنده » برقم: 2573، وابن ماجه في « سننه » برقم: 3984، والبيهقي في « سننه الكبير » برقم: 6523، 10511، 10512، 10925، 10926، وأحمد في « مسنده » برقم: 18638، 18646»

حکیمِ الٰہی کا لونڈی کی نبض پر ہاتھ رکھنا دراصل اس کے قلب کی کیفیت کو ٹٹولنا تھا، کیونکہ جب دل کسی غم یا عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کا اثر پورے جسمانی نظام (نبض اور دھڑکن) پر پڑتا ہے۔

بیماریوں کی روحانی اور نفسیاتی وجوہات

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بعض قلبی حالتوں کو "مرض" قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ... (ان کے دلوں میں بیماری ہے) — (سورۃ البقرہ: 10) جس طرح جسمانی بیماریاں ہوتی ہیں، اسی طرح حسرت، شدید دنیاوی محبت، اور غم بھی دل کے امراض ہیں۔ رومیؒ کے شعر میں حکیم کا "جورِ فلک" (زمانے کے ستم) کے بارے میں پوچھنا اسی لیے تھا کہ وہ جان سکے کہ لونڈی کے دل میں کون سی ایسی حسرت یا تعلق چھپا ہے جو اس کی جسمانی بیماری کا سبب بن رہا ہے۔

حکمت اور دانائی

(حکیم کا کردار) قرآنِ کریم میں 'حکمت' کو خیرِ کثیر کہا گیا ہے: وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا... (اور جسے حکمت دی گئی، اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی) — (سورۃ البقرہ: 269) ایک سچا معالج یا مرشد وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ ایسی بصیرت (نورِ فراست) عطا کرتا ہے کہ وہ انسان کی باتوں اور اس کے احوال سے اصل مسئلے کی جڑ تک پہنچ جاتا ہے۔ حدیثِ قدسی کے مطابق: إِتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ، فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ.

أخرجه الخوارزمي في جامع المسانيد للإمام أبي حنيفة، 1/ 189، والترمذي في السنن، كتاب تفسير القرآن، باب من سورة الحجر، 5/ 298، الرقم/ 3127، والطبراني في المعجم الأوسط، 8/ 23، الرقم/ 7843، والقضاعي في مسند الشهاب، 1/ 387، الرقم/ 663

مومن کی فراست سے ڈرو کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے (عطا کردہ) نور سے دیکھتا ہے۔

حسنِ سماعت اور ہمدردی (سنتِ نبوی ﷺ)

نبی کریم ﷺ کے پاس جب کوئی دکھی یا پریشان حال شخص آتا، تو آپ ﷺ اس کی بات نہایت توجہ اور صبر سے سنتے تھے۔ حکیم کا ایک ایک کر کے سوال پوچھنا (یک بہ یک بازمی پُرسید) سنتِ نبوی کے اس پہلو کی عکاسی

کرتا ہے کہ سائل یا مریض کو بولنے کا پورا موقع دیا جائے تا کہ اس کا ذہنی بوجھ کم ہو سکے۔ قرآن میں آپ ﷺ کی اس صفت کو "اُذُنٌ" (بہت زیادہ سننے والا) کہا گیا ہے جو مخلصانہ ہمدردی کی علامت ہے۔

رومیؒ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ انسان صرف گوشت پوست کا نام نہیں، بلکہ اس کی اصل "روح اور دل" ہے۔ جب تک ان کا علاج نہ ہو، ظاہری دوائیں اثر نہیں کرتیں۔ ایک روحانی معالج قرآن و سنت کے اسی نور سے بصیرت پاتا ہے اور بھٹکے ہوئے یا دکھی دلوں کا علاج کرتا ہے۔

رومیؒ کے اس شعر کا مفہوم (دل کی پوشیدہ تڑپ اور معالجِ کامل کی بصیرت) فارسی اور اردو شاعری کے دیگر عظیم اساتذہ کے ہاں بھی بہت خوبصورتی سے ملتا ہے۔ حافظ، اقبال اور عراقی نے اپنے اپنے رنگ میں اس "نبضِ دل" اور "جورِ فلک" کی ترجمانی کی ہے۔ ذیل میں ان شعراء کے کلام سے اس موضوع کی وضاحت پیش ہے:

1. حافظ شیرازی: پیرِ مغاں کی نگاہِ بصیرت حافظ کے ہاں رومی کے "حکیم" کی جگہ "پیرِ مغاں" (مرشدِ کامل) کی اصطلاح ملتی ہے، جو صرف نظر ڈال کر دل کی الجھنیں سلجھا دیتا ہے۔ رومی کے شعر میں معالج نبض دیکھ رہا ہے، جبکہ حافظ کے ہاں وہ نگاہ سے تشخیص کرتا ہے:

مشکلِ خویش بَرِ پیرِ مُغاں بُردم دوشکوبہ تائیدِ نظر حلِّ معما می کرد

(ترجمہ: گذشتہ رات میں اپنی مشکل لے کر پیرِ مغاں کے پاس گیا، جو اپنی نگاہِ کی تائید (بصیرت) سے معمہ حل کر دیا کرتے تھے) حافظ یہ بتاتے ہیں کہ جو راز انسان کے سینے میں دفن ہوتے ہیں اور جنہیں وہ خود بھی نہیں سمجھ پاتا، صاحبِ نظر معالج انہیں ایک لمحے میں بھانپ لیتا ہے۔

۲۔ علامہ اقبال: نبضِ حیات اور نگاہِ مردِ مومن اقبال نے "نبض" اور "دل" کو محض طبّی تناظر میں نہیں بلکہ خودی اور بیداری کے تناظر میں دیکھا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ حقیقی معالج (مردِ حق) کی نظر دل کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے:

تری نگاہ سے دلوں میں وہ ولولہ نہ رہا نہیں رہی ہے وہ اب تیرے ہاتھ میں وہ نبضِ حیات

اقبال یہاں شکوہ کر رہے ہیں کہ جب معالج (رہنما) کی نگاہ میں بصیرت اور ہاتھ میں اثر نہ رہے تو وہ "نبضِ حیات" کو نہیں پہچان سکتا۔ رومی کے حکیم کی طرح، اقبال بھی ایسے صاحبِ نظر کے قائل ہیں جو زمانے کے ستم (جورِ فلک) کے باوجود روح کی تڑپ کو محسوس کر سکے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب　　　　آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

رومی کا حکیم اسی "دلِ بینا" کا حامل تھا جس نے محض نبض چھو کر روح کا حال معلوم کر لیا۔

2. فخر الدین عراقی: (سوزِ دروں اور دردِ محبت)

عراقی صوفیانہ عشق کے بڑے شاعر ہیں۔ وہ اس "درد" کی وضاحت کرتے ہیں
جسے رومی کا حکیم لونڈی کی نبض میں تلاش کر رہا تھا۔ عراقی کے نزدیک یہ درد ہر کسی کو نظر نہیں آتا:

دردِ دل راہماں دوا داند کہ　　　　کہ در آں درد مبتلا باشد

(ترجمہ: دل کے درد کی دوا وہی جانتا ہے جو خود اس درد میں مبتلا رہا ہو) رومی کے شعر میں حکیم کا "جورِ فلک" کے بارے میں پوچھنا دراصل اس سوزِ دروں کی تلاش تھی جس کا ذکر عراقی نے کیا ہے۔ حکیم اس لیے کامیاب ہوا کیونکہ وہ خود عشق کے رموز سے واقف تھا۔

شعراء کے کلام سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانی وجود کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے صرف منطق یا طبّی علم کافی نہیں، بلکہ ایک ایسی "چشمِ بینا" اور "دستِ شفا" کی ضرورت ہے جو کائنات کے حوادث (جورِ فلک) اور انسانی دل کے تعلق کو سمجھتی ہو۔ رومی کا حکیم دراصل اسی آفاقی بصیرت کا نمائندہ ہے۔

چون کسی را خارْ در پایَش جَهَد

پایِ خود را بر سَرِ زانو نَهَد

مشکل الفاظ کے معنی

چون: جب،۔۔۔ کسی را: کسی کو۔۔۔ خار: کانٹا۔۔۔ در پایَش: اس کے پاؤں میں۔۔۔ جَہَد: چبھ گیا، پیوست ہو گیا

پایِ خود: اپنا پاؤں۔۔۔ بر سَرِ زانو نَہَد: گھٹنے پر رکھتا ہے، موڑ کر قریب کرتا ہے

ترجمہ

"جب کسی شخص کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے، تو وہ (اسے نکالنے کے لیے) اپنا پاؤں اپنے گھٹنے پر رکھ لیتا ہے۔"

مولانا رومی اس سادہ سی مثال کے ذریعے ایک بہت گہرا روحانی اور اخلاقی سبق دے رہے ہیں۔ اس شعر کی تشریح کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

تکلیف کا احساس اور توجہ

جب پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے تو انسان تمام کام چھوڑ کر اپنی پوری توجہ اس پاؤں پر مرکوز کر دیتا ہے۔ وہ چلنا بند کر دیتا ہے کیونکہ درد اسے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ رومی فرماتے ہیں کہ بالکل اسی طرح جب انسان کی زندگی میں کوئی پریشانی، گناہ یا اخلاقی برائی (جو کہ ایک روحانی کانٹا ہے) پیدا ہوتی ہے، تو اسے رک کر اپنی حالت پر غور کرنا چاہیے۔

۲. خود احتسابی (Self-Reflection)

پاؤں کو گھٹنے پر رکھنا عجز اور غور و فکر کی علامت ہے۔ کانٹا نکالنے کے لیے انسان کو جھکنا پڑتا ہے اور اسے بہت قریب سے دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ہمیں اپنی زندگی میں سکون نہیں مل رہا، تو ہمیں اپنے اندر جھانکنا ہوگا (اپنا پاؤں اپنے گھٹنے پر رکھنا ہوگا) تاکہ ہم اس 'کانٹے' یا اس خرابی کو ڈھونڈ سکیں جو ہمیں تکلیف دے رہی ہے۔

۳. جستجو اور محنت

اس شعر سے اگلا مصرعہ (جو اس کا تسلسل ہے) یہ بتاتا ہے کہ انسان سوئی کی نوک سے اس کانٹے کو ڈھونڈتا ہے۔ رومی یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ:

روحانی بیماریوں یا دل کے کانٹوں کو نکالنا آسان نہیں ہوتا۔

اس کے لیے بہت باریک بینی، صبر اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر ایک چھوٹا سا کانٹا نکالنے کے لیے اتنی محنت درکار ہے، تو حسد، کینہ اور غرور جیسے بڑے کانٹے نکالنے کے لیے کتنی محنت چاہیے ہوگی؟

۴. باطنی کانٹا

مولانا رومی کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ ہم ظاہری تکلیف (جسمانی کانٹے) کے لیے تو فوراً بے چین ہو جاتے ہیں، لیکن جو کانٹے ہمارے نفس میں چھپے ہوئے ہیں اور ہماری روح کو زخمی کر رہے ہیں، ہم ان کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ وہ ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ اپنے باطن کی اصلاح کے لیے بھی وہی تڑپ پیدا کرو جو پاؤں سے کانٹا نکالتے وقت ہوتی ہے۔

یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ زندگی کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کے لیے "توجہ" اور "خود شناسی" پہلی شرط ہے۔

نفسیاتی نکتہ

انسان عموماً: تکلیف کے بغیر متوجہ نہیں ہوتا، آرام کی حالت میں اپنی خامیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے

لیکن: دکھ، ناکامی، آزمائش، ندامت یہ سب روح کے کانٹے ہیں، جو انسان کو رکنے اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اخلاقی سبق

اس شعر کا پیغام یہ ہے کہ: مسئلے سے بھاگنا نہیں چاہیے، تکلیف کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، اپنی غلطی کو قریب لا کر دیکھنا چاہیے خود کو موردِ الزام ٹھہرا کر اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

قرآنِ مجید کی روشنی میں

گناہ = دل میں کانٹا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (سورۃ المطففین:14)

ہر گز نہیں، بلکہ ان کے اعمال نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے۔

- یہ زنگ وہی کانٹا ہے جو انسان کے باطن میں چبھ جاتا ہے
- جب تک انسان رک کر اس پر توجہ نہیں دیتا، دل سخت ہوتا جاتاہ

مصیبت = توجہ دلانے کا ذریعہ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (سورۃ السجدہ:21)

ترجمہ: ہم انہیں بڑے عذاب سے پہلے چھوٹا عذاب چکھائیں گے تاکہ وہ رجوع کریں۔

تکلیف گناہوں کا کفارہ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ... حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ"

)بخاری، مسلم(

مسلمان کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے، حتیٰ کہ کانٹا چبھتا ہے، اللہ اس کے ذریعے اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔

حدیث میں کانٹے کا ذکر خود نبی ﷺ نے فرمایا

یعنی تکلیف انسان کے لیے اصلاح اور پاکیزگی کا ذریعہ ہے،

توبہ = کانٹا نکالنا

نبی ﷺ نے فرمایا:

"كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ، وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ ("ترمذی) ترجمہ: ہر انسان خطاکار ہے، اور بہترین خطاکار وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں۔

عملی اسلامی سبق

قرآن و سنت کے مطابق جب انسان: گناہ پر بے چین ہو، دل میں چبھن محسوس کرے، ضمیر ملامت کرے، تو یہ ایمان کی علامت ہے۔

نبی ﷺ نے فرمایا:

"الْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ ("مسلم) ترجمہ: گناہ وہ ہے جو تمہارے سینے میں کھٹکے۔

نتیجہ

یہ شعر دراصل قرآن و سنت کی اس تعلیم کا خلاصہ ہے کہ: گناہ پر بے حسی خطرناک ہے، تکلیف انسان کو متوجہ کرنے کی رحمت ہے، رک جانا، جھک جانا اور خود احتسابی کرنا ایمان کی علامت ہے، توبہ وہ عمل ہے جو دل کے کانٹے نکالتا ہے

وَزْ سَرِ سوزن ہَمے جوید سَرَش
وَرْ نَیابد، مے کُند بالَبْ تَرَش

اس شعر میں مولانا نے ایک بہت ہی عام سی انسانی حرکت (سوئی میں دھاگہ ڈالنا) کے ذریعے ایک گہری حقیقت بیان کی ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی

وَز (واز) :اور سے۔....۔ سرِ سوزن :سوئی کا ناکہ (وہ سوراخ جہاں سے دھاگہ گزارا جاتا ہے)۔۔۔۔ہَمی جوید :ڈھونڈتا ہے / تلاش کرتا ہے۔۔۔۔۔سَرَش :اس کا سرا (دھاگے کا کونا)۔۔۔۔۔وَرْ (واگر) :اور اگر۔۔۔۔نَیابد :نہ پائے / نہ ملے۔

می کُند بالَبْ تَرَش :اسے اپنے لبوں (ہونٹوں) سے گیلا کرتا ہے۔

ترجمہ " :

اور وہ (دھاگے کے) سرے کو سوئی کے ناکے میں تلاش کرتا ہے، اور اگر وہ اسے نہیں پاتا (یعنی دھاگہ سوراخ میں نہیں گھستا)، تو وہ اسے اپنے لبوں سے گیلا کر لیتا ہے۔"

اس شعر میں مولانا رومیؒ انسانی کوشش اور عاجزی کی ایک مثال دے رہے ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں:

ظاہری مفہوم : جب کوئی شخص سوئی میں دھاگہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور دھاگہ اپنے بکھرے ہوئے ریشوں کی وجہ سے سوراخ میں نہیں جاتا، تو انسان اسے اپنے منہ میں ڈال کر تھوک سے گیلا کرتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دھاگے کے بکھرے ہوئے ریشے آپس میں جڑ جائیں، وہ باریک ہو جائے اور اس میں تھوڑی سختی آ جائے تاکہ وہ آسانی سے سوئی کے ناکے سے گزر سکے۔

باطنی و عرفانی مفہوم : مولانا اس تمثیل سے یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ:

1. **توجہ اور محنت :** مقصد کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو (جیسے سوئی میں دھاگہ ڈالنا)، اس کے لیے باریک بینی اور خاص تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔

2. **عاجزی اور نرمی:** جس طرح خشک اور بکھرا ہوا دھاگہ سوراخ سے نہیں گزرتا بلکہ اسے "نرمی" (گیلا کرنے) کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح انسان کا سخت دل یا بکھری ہوئی سوچ معرفت کے باریک راستوں پر نہیں چل سکتی۔ اسے عشق اور عاجزی کی نمی درکار ہوتی ہے۔

3. **تلاشِ حق:** انسان حق کی راہ میں کوشش کرتا ہے، اور جہاں اسے رکاوٹ نظر آتی ہے، وہ اپنی تدبیر بدلتا ہے اور مزید عاجزی اختیار کرتا ہے تاکہ منزل تک پہنچ سکے۔

مولانا رومیؒ کے کلام کی خاصیت یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کے حقائق کو تمثیل (مثالوں) کے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ اس شعر کو اگر ہم شرعی اور اسلامی تناظر میں دیکھیں تو اس کے بطن سے کئی اہم قرآنی و نبویؐ اصول برآمد ہوتے ہیں:

تزکیہ نفس اور توجہ (Concentration)

جس طرح سوئی کے باریک سوراخ میں دھاگہ ڈالنے کے لیے **مکمل** توجہ اور دھاگے کا یکسو ہونا ضروری ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قرب کے لیے **"اخلاص"** اور **"توجہ الی اللہ"** ضروری ہے۔

- **قرآنی ربط:** ارشاد باری تعالیٰ ہے "**قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا**" (کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا)۔

جس طرح دھاگے کو گیلا کر کے اس کے بکھرے ہوئے ریشوں کو سمیٹا جاتا ہے، اسی طرح انسان کو اپنے بکھرے ہوئے خیالات اور شہوات کو **ذکرِ الٰہی** سے سمیٹ کر "ایک" کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ صراطِ مستقیم کے باریک راستے پر چل سکے۔

عاجزی اور انکساری (Humility)

دھاگے کو لبوں سے تر کرنا اسے نرم کرنے کی علامت ہے۔ دینِ اسلام میں سختی کے بجائے نرمی اور تکبر کے بجائے عاجزی کو کامیابی کی کنجی قرار دیا گیا ہے۔

- **قرآنی آیت":** إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ) "سورۃ الاعراف:40(

- **ترجمہ** " : بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ **اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گزر جائے**۔"
- **ربط** : رومیؒ گویا اس قرآنی استعارے کو الٹا کر سمجھا رہے ہیں کہ اگر سوئی کے ناکے (جنت یا معرفت کا راستہ) سے گزرنا ہے تو اونٹ جیسا "تکبر" اور "جسامت" چھوڑ کر دھاگے جیسی "عاجزی" اور "نرمی" پیدا کرنی ہوگی۔

تدبیر اور استقامت(Effort and Persistence)

شعر میں "ہمی جوید" (وہ ڈھونڈتا ہے) اور "می کند" (وہ کرتا ہے) مسلسل عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ سنتِ نبویؐ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ مقصد کے حصول کے لیے جائز تدبیر کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

- **حدیثِ نبویؐ**" : پہلے اونٹ کو گھٹنے سے باندھو، پھر اللہ پر توکل کرو۔"

سوئی میں دھاگہ نہ جائے تو انسان ہمت نہیں ہارتا بلکہ اسے گیلا کرنے کی "تدبیر" کرتا ہے۔ اسی طرح مومن کو چاہیے کہ اگر دعا قبول ہونے میں دیر ہو یا مقصد حاصل نہ ہو، تو وہ اپنی حالت کو بدلے، توبہ (لبوں کی نمی یعنی گریہ وزاری) سے اپنے دل کو نرم کرے اور دوبارہ کوشش کرے۔

توبہ اور گریہ وزاری کا اثر

لبوں سے تر کرنے کو صوفیاء "**اشکِ ندامت** " سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

- **مفہوم** : جب انسان کا دل گناہوں کی وجہ سے سخت ہو جاتا ہے تو وہ نیکی کی راہ پر نہیں چل پاتا۔ پھر جب وہ اللہ کے حضور روتا ہے (اپنے خشک وجود کو آنسوؤں سے تر کرتا ہے) تو اس میں وہ نرمی اور لچک پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دین کے مشکل سے مشکل حکم پر بھی آسانی سے عمل کر لیتا ہے۔

خلاصہ : یہ شعر قرآنی حکم "**واعتصموا بحبل اللہ** " (اللہ کی رسی کو تھام لو) کی عملی کیفیت کو بیان کرتا ہے کہ اس رسی (دھاگے) کو تھامنے اور سوراخ سے گزارنے کے لیے عاجزی، نرمی اور کامل توجہ کی ضرورت ہے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر میں بظاہر ایک معمولی گھریلو مشاہدہ بیان ہوا ہے، لیکن اس کے اندر **فنِ شاعری، نفسیات اور تصوف** کے کئی نادر نکات پوشیدہ ہیں۔ اس کی "خاص" باتیں درج ذیل ہیں:

1. **سہلِ ممتنع** (Simplicity with Depth)

اس شعر کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا **سہلِ ممتنع** ہونا ہے۔ رومیؒ نے اتنی سادہ زبان استعمال کی ہے کہ ایک بچہ بھی منظر کشی سمجھ لے، لیکن اس کے پیچھے چھپا فلسفہ اتنا گہرا ہے کہ بڑے بڑے عارفین اس پر وجد کرتے ہیں۔ روزمرہ کی ایک چھوٹی سی حرکت کو آفاقی سچائی میں بدل دینا رومیؒ کا خاصہ ہے۔

2. **ارتکازِ توجہ** (Power of Focus)

اس شعر میں **"توجہ"** کی انتہا دکھائی گئی ہے۔

- سوئی کا ناکہ (Eye of the needle) دنیا کی تنگ ترین جگہوں میں سے ایک ہے۔
- اس میں دھاگہ ڈالنے کے لیے انسان کو اپنی پوری کائنات، اپنی نظر اور اپنی سوچ کو ایک نقطے پر مرکوز کرنا پڑتا ہے۔
- **نکتہ:** رومیؒ سمجھا رہے ہیں کہ جب تک تم اپنی بکھری ہوئی خواہشات کو سمیٹ کر ایک مرکز (خدا) پر جمع نہیں کرو گے، تم زندگی کے امتحان کی سوئی سے پار نہیں گزر سکو گے۔

3. **تدبیر اور تسلیم کا امتزاج**

شعر کا دوسرا مصرعہ انسانی نفسیات کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔

- جب سیدھی طرح کام نہ بنے (دھاگہ سوراخ میں نہ جائے)، تو انسان جھنجھلا کر اسے پھینک نہیں دیتا، بلکہ **"لب تر"** کرتا ہے۔
- یہاں لبوں سے تر کرنا **"نرمی"** اور **"لچک"** کی علامت ہے۔ سخت اور سوکھا دھاگہ کبھی سوئی میں نہیں جاتا۔
- **خاص بات:** یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ زندگی کی سختیوں اور رکاوٹوں کا حل "غصہ" نہیں بلکہ "نرمی" اور "عاجزی" ہے۔ جہاں زور کام نہیں آتا، وہاں تھوڑی سی نرمی (تھوک یا آنسو) راستہ بنا دیتی ہے۔

4. **تمثیلِ عشق** (Metaphor of Love)

صوفیاء کے نزدیک یہاں "لبوں سے تر کرنا "**عشق اور تڑپ** کی علامت ہے۔

- دھاگہ "عقل" ہے جو اپنی خشکی کی وجہ سے حقیقت کے باریک سوراخ میں نہیں گھس پاتی۔
- پھر اسے "عشق کے لبوں" سے تر کیا جاتا ہے (یعنی اس میں جذب و مستی شامل کی جاتی ہے)۔
- جیسے ہی عقل میں عشق کی نمی شامل ہوتی ہے، وہ بڑی سے بڑی حقیقت کو پالیتی ہے۔

5.منظر نگاری(Visual Storytelling)

رومیؒ نے الفاظ سے ایک تصویر بنادی ہے۔ قاری کی آنکھوں کے سامنے ایک شخص آجاتا ہے جو سوئی ہاتھ میں پکڑے، آنکھیں سکیڑے، پوری توجہ سے دھاگہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے اور ناکامی پر اسے اپنے منہ میں لے کر گیلا کر رہا ہے۔ یہ تصویر کشی قاری کو فوراً شعر کے احساس سے جوڑ دیتی ہے۔

"تنگ راستہ" اور "باریک حقیقت"

سوئی کا ناکہ **"حق کی راہ "**کی علامت ہے۔ قرآن میں بھی اسے جنت میں داخلے کی شرط کے طور پر استعمال کیا گیا۔ رومیؒ اس شعر میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حق کی راہ بہت باریک ہے، وہاں وہی گزر سکے گا جو:

1. خود کو باریک (عاجز) کر لے۔
2. اپنے بکھرے ہوئے وجود (ریشوں) کو ایک کر لے۔
3. اپنی خشکی (تکبر) کو نرمی میں بدل دے۔

اس شعر میں خاص بات یہ ہے کہ یہ ایک معمولی جسمانی عمل کو **روحانی ریاضت** کا درجہ دے دیتا ہے۔

خارْ دَر پا شُد چُنین دشوار یاب

خارْ در دل چون بُوَد؟ وادِہ جُواب

مشکل الفاظ کے معانی

خار: کانٹا، جس سے شدید درد اور تکلیف ہوتی ہے؛ استعاراتی طور پر دکھ یا خلش۔۔۔ دَر پا: پاؤں میں؛ جسمانی درد کی مثال۔

دشوارِ یاب: مشکل سے ملنے والا، نایاب یا تلاش میں دشوار۔۔۔ دَر دل: دل میں؛ روحانی یا جذباتی تکلیف کی نشاندہی۔

وادِہ جواب: جواب دے، وضاحت کر؛ سننے والے سے چیلنج۔

ترجمہ

اگر پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اسے نکالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، تو بتاؤ! جب دل میں کانٹا چبھ جائے تو پھر کیا حال ہو گا؟

یعنی "پاؤں میں (چبھنے والا) کانٹا جب اس قدر مشکل سے ملتا ہے (کہ اسے ڈھونڈنا دشوار ہوتا ہے)، تو پھر وہ کانٹا جو دل میں چھپا ہو، اس کی کیا کیفیت ہو گی؟ ذرا اس کا جواب تو دو!"

اس شعر میں مولانا رومی انسانی نفس اور باطنی اصلاح کے ایک بہت اہم پہلو پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ تشریح کو ہم درج ذیل نکات میں سمجھ سکتے ہیں:

الف: ظاہری بمقابلہ باطنی تکلیف اگر پاؤں میں ایک چھوٹا سا کانٹا چبھ جائے، تو وہ نظر نہیں آتا لیکن اس کا درد پورے جسم کو بے چین کر دیتا ہے۔ اس باریک کانٹے کو ڈھونڈنے کے لیے انسان کو بہت تگ و دو کرنی پڑتی ہے، کبھی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی سوئی سے کریدنا پڑتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جب پاؤں کا کانٹا (جو کہ مادی ہے) ڈھونڈنا اتنا مشکل ہے، تو وہ "کانٹا" جو انسانی دل یا روح میں چبھ جائے، اسے تلاش کرنا کتنا کٹھن ہو گا۔

دل کے کانٹے سے کیا مراد ہے؟

تصوف کی اصطلاح میں "دل کا کانٹا" سے مراد انسان کی بری عادتیں، اخلاقی خامیاں، حسد، تکبر، حرص اور دنیا کی محبت ہے۔ یہ ایسی بیماریاں ہیں جو انسان کے اندر موجود تو ہوتی ہیں اور اسے روحانی طور پر بے چین بھی رکھتی ہیں، لیکن انسان انہیں پہچان نہیں پاتا۔

ج: تلاش کی دشواری انسان اکثر اپنی ظاہری غلطیوں کو تو دیکھ لیتا ہے، لیکن اپنے باطن کے کھوٹ (منافقت یا غرور) کو نہیں دیکھ پاتا۔ پاؤں کا کانٹا تو جسم کے ایک حصے کو تکلیف دیتا ہے، مگر دل کا کانٹا انسان کے ایمان اور سکون کو تباہ کر دیتا ہے۔

د: دعوتِ فکر (وادِہ جواب) شعر کے آخری حصے میں "جواب دو" کہہ کر مولانا قاری کو سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ:

کیا تم نے کبھی اپنے دل کے اندر جھانک کر ان پوشیدہ کانٹوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی؟

اگر معمولی کانٹا نکالنے کے لیے ماہر (ڈاکٹر) کی ضرورت پڑتی ہے، تو دل کے کانٹے نکالنے کے لیے کسی "طبیبِ روحانی" (مرشد یا رہبر) کی ضرورت کیوں نہ ہو گی؟

حاصلِ کلام

مولانا رومی یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ باطنی اصلاح، ظاہری اصلاح سے کہیں زیادہ مشکل اور ضروری ہے۔ جب تک انسان اپنے دل میں چھپے ہوئے "انا اور دنیا" کے کانٹے نہیں نکالتا، وہ حقیقی روحانی سفر طے نہیں کر سکتا۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کا مفہوم قرآن و سنت کی روشنی میں نہایت گہرا اور واضح ہے۔ قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں دل کی پاکیزگی (تزکیہ نفس) کو فلاح کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

1 . قرآنِ کریم کی روشنی میں

الف) تزکیہ نفس کی اہمیت: مولانا جس "دل کے کانٹے" کو نکالنے کی بات کر رہے ہیں، قرآن اسے "تزکیہ" کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰٮهَا (سورۃ الشمس:9) "بیشک وہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنے نفس کو (گناہوں کے کانٹوں سے) پاک کر لیا۔"

ب) دل کی بیماریاں: قرآن میں منافقت، حسد اور کفر کو دل کی بیماری کہا گیا ہے:

فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ (سورۃ البقرہ:10) "ان کے دلوں میں بیماری ہے۔" یہ بیماری وہی "کانٹا" ہے جو انسان کو روحانی طور پر مفلوج کر دیتا ہے اور اسے تلاش کر کے نکالنا ضروری ہے۔

جس کا دل سخت ہو جائے وہ ہدایت سے محروم

ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالۡحِجَارَةِ (البقرہ:74)

دل میں کانٹا رہ جائے تو دل **پتھر** بن جاتا ہے، پھر نہ نصیحت اثر کرتی ہے اور قرآن

یاد رکھیں **دل کی بیماری سب سے پہلے ایمان کو زخمی کرتی ہے**

حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو (ابو داوٗد)

حسد = دل کا خطرناک کانٹا، باہر سے عبادت باقی، اندر سے ایمان کھوکھلا

اخلاقی و روحانی نکتہ

پاؤں کا کانٹا **چلنے سے روک دیتا ہے**، دل کا کانٹا **اللہ تک پہنچنے سے روک دیتا ہے**

ج) قلبِ سلیم: قیامت کے دن وہی شخص کامیاب ہو گا جس کا دل ان کانٹوں سے پاک ہو گا۔

اِلَّا مَنۡ اَتَى اللّٰهَ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍ (سورۃ الشعراء:89) "مگر وہ جو اللہ کے پاس سلامت (پاکیزہ) دل لے کر آیا۔"

2. احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں

الف) دل کی مرکزیت: نبی کریم ﷺ نے دل کی اہمیت کو ایک مشہور حدیث میں واضح فرمایا:

"خبردار! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست رہتا ہے، اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سن لو! وہ دل ہے۔" (صحیح بخاری) مولانا رومی کا شعر اسی حدیث کی شعری تفسیر ہے کہ اگر پاؤں کا کانٹا پورے جسم کو بے چین کرتا ہے، تو دل کا فساد (کانٹا) تو پوری زندگی تباہ کر دیتا ہے۔

گناہ کا اثر (سیاہ نکتہ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے..." (جامع ترمذی) یہ سیاہ نکتہ یا دھبہ وہی "باریک کانٹا" ہے جو شروع میں محسوس نہیں ہوتا لیکن آہستہ آہستہ پورے دل کو سخت کر دیتا ہے

قرآن و سنت کی رو سے انسان کا اصل امتحان اس کے **باطن کی صفائی** ہے۔ جس طرح پاؤں میں چبھا ہوا کانٹا نکالے بغیر آرام سے چلنا **ممکن** نہیں، اسی طرح دل سے حسد، بغض اور دنیا کی بے جا محبت کا کانٹا نکالے بغیر اللہ کی راہ پر چلنا **ممکن** نہیں۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کی نفسیاتی (Psychological) اور طبی (Medical) تشریح انسانی وجود کے اس گہرے نظام کو ظاہر کرتی ہے جہاں ذہن اور جسم ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

1. نفسیاتی تشریح (Psychological Perspective)

نفسیات کی رو سے "دل کا کانٹا" ان **پوشیدہ ذہنی الجھنوں، دبے ہوئے جذبات اور لاشعوری ہیجانات** کی علامت ہے جنہیں انسان خود بھی نہیں دیکھ پاتا۔

- **لاشعور کا اندھیرا (The Unconscious):** جس طرح پاؤں میں چبھا ہوا باریک کانٹا گوشت کے اندر چھپ جاتا ہے، اسی طرح بچپن کے صدمات، احساسِ محرومی یا احساسِ کمتری انسان کے لاشعور میں "نفسیاتی کانٹے" بن کر چبھتے رہتے ہیں۔ انسان بے چین رہتا ہے، لیکن اسے وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

- **دفاعی میکانزم (Defense Mechanisms):** نفسیات میں انسان اپنی انا (Ego) کو بچانے کے لیے اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالتا ہے۔ یہ "دشواریاب" (مشکل سے ملنا) اسی طرف اشارہ ہے کہ انسان دوسروں کی خامیاں تو دیکھ لیتا ہے، لیکن اپنے اندر چھپے ہوئے تکبر یا حسد کے کانٹے اسے نظر نہیں آتے۔

- **سائیکوسومیٹک (Psychosomatic) اثرات:** جب دل کا کانٹا (ذہنی دباؤ یا تناؤ) نہیں نکالا جاتا، تو وہ جسمانی بیماریوں کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ رومیؒ اسی لیے کہہ رہے ہیں کہ اسے ڈھونڈو، ورنہ یہ پورے وجود کو بیمار کر دے گا۔

2.طبی تشریح (Medical Perspective)

طبی لحاظ سے اس شعر کو "درد کی منتقلی" اور "تشخیص (Diagnosis)" کے اصولوں پر سمجھا جا سکتا ہے:

- **پوشیدہ انفیکشن (Hidden Infection):** بعض اوقات جسم کے کسی حصے میں بہت معمولی سا کانٹا یا ذرہ رہ جاتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا لیکن اندر ہی اندر پیپ (Abscess) پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اس کی تشخیص (Diagnosis) نہ ہو، تو وہ پورے جسم میں زہر (Sepsis) پھیلا سکتا ہے۔

- **دردِ قلب اور اعصابی نظام:** طبی نقطہ نظر سے دل کا درد (Angina) یا Cardiac Pain اکثر براہِ راست دل میں محسوس ہونے کے بجائے بائیں بازو، جبڑے یا کندھے میں محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کے لیے اصل "کانٹے" (بیماری کی جڑ) تک پہنچنا ایک چیلنج ہوتا ہے۔

- **نفسیاتی-جسمانی تعلق (Mind-Body Connection):** جدید میڈیکل سائنس تسلیم کرتی ہے کہ دل کی دھڑکن اور خون کا دباؤ (Blood Pressure) براہِ راست انسانی جذبات سے جڑے ہیں۔ اگر دل "اضطراب" (Anxiety) کے کانٹے سے زخمی ہے، تو ادویات جسم کو تو آرام دے سکتی ہیں، لیکن جڑ تک نہیں پہنچتیں۔

- مولانا رومیؒ کا یہ شعر نہ صرف اپنے معنی کے لحاظ سے بلند ہے، بلکہ فنی اور ادبی اعتبار سے بھی "سہلِ ممتنع" (ایسا کلام جو بظاہر سادہ لگے لیکن ویسا لکھنا نہایت مشکل ہو) کی بہترین مثال ہے۔

- اس شعر کی شعری خوبیوں اور فنی نکات کا تفصیلی جائزہ درج ذیل ہے:

- **1.صنعتِ تضاد (Antithesis)**

- اس شعر میں مولانا نے دو متضاد چیزوں کا موازنہ کیا ہے:
- **پاؤں (پا)** : جو انسانی جسم کا سب سے نچلا اور ظاہری حصہ ہے۔
- دل: جو انسانی وجود کا سب سے اعلیٰ اور باطنی مرکز ہے۔
- اس تضاد کے ذریعے انہوں نے مادی تکلیف اور روحانی تکلیف کے فرق کو واضح کیا ہے۔
- **2. تمثیل نگاری (Allegory)**
- رومیؒ کی سب سے بڑی خوبی **تمثیل** (مثال دے کر بات سمجھانا) ہے۔
- انہوں نے "گناہ"، "بری عادت" یا "روحانی بے چینی" جیسے مجرد (Abstract) تصورات کو سمجھانے کے لیے "کانٹے" (خار) جیسی ٹھوس (Concrete) مثال استعمال کی ہے۔ ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ پاؤں کا کانٹا نکالنا کتنا تکلیف دہ ہے، اسی سے وہ دل کے کانٹے کی سنگینی کا اندازہ لگالیتا ہے۔
- **3. صنعتِ استفہامِ انکاری (Rhetorical Question)**
- شعر کے دوسرے مصرعے میں مولانا نے سوال کیا ہے" : خار در دل چون بود؟ "(دل کا کانٹا کیسا ہوگا؟)۔
- یہ سوال جواب حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ **حقیقت پر زور دینے** کے لیے ہے۔ اسے "استفہامِ انکاری" یا "تاکیدی سوال" کہا جاتا ہے، جس کا مقصد قاری کو اس بات کی ہولناکی کا احساس دلانا ہے کہ اگر پاؤں کا کانٹا اتنا برا ہے تو دل کا کانٹا تو ناقابلِ برداشت ہوگا۔
- **4. ایجاز و اختصار (Conciseness)**
- مولانا نے صرف دو مصرعوں میں پوری "نفسیات" اور "تصوف" سمو دیا ہے۔
- **پہلا مصرع** : تشخیص کی دشواری (Diagnostic challenge)۔
- دوسرا مصرع: درد کی شدت اور علاج کی دعوت۔
- بہت کم الفاظ میں اتنی بڑی حقیقت بیان کرنا فصاحت و بلاغت کی معراج ہے۔

- .5صوتی آہنگ اور بحر (Meter and Rhythm)
- یہ شعر مثنوی کے مخصوص وزن **"بحرِ رمل مسدس مقصور "** پر ہے:
- فاعلاتن / فاعلاتن / فاعلن
- اس بحر کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں روانی اور ترنم بہت زیادہ ہے، جو صوفیانہ کلام کے لیے نہایت موزوں ہے کیونکہ یہ سننے والے کے دل پر براہِ راست اثر کرتی ہے۔
- **.6رعایتِ لفظی**
- شعر میں "خار" (کانٹا)، "پا" (پاؤں) اور "دشواریاب" (مشکل سے ملنا) کے درمیان ایک منطقی اور لفظی تعلق ہے۔ کانٹا پاؤں میں ہی چبھتا ہے اور اس کا باریک ہونا ہی اسے "دشواریاب" بناتا ہے۔ الفاظ کا یہ انتخاب فنِ شاعری میں **"تناسبِ لفظی "** کہلاتا ہے۔

مولانا رومیؒ کے کلام کی **روحانی ووجدانی تشریح** الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک کیمیا ہے جو انسان کے باطن کو بدلنے کی قوت رکھتی ہے۔ اس شعر کے ذریعے عرفان (خداشناسی اور خودشناسی) تک پہنچنے کے لیے ہمیں اس کی تہوں میں چھپے رازوں کو کھولنا ہو گا۔

خودشناسی: پہلا قدم (معرفتِ نفس)

عرفان کا پہلا اصول ہے " : جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا"۔ رومیؒ فرمارہے ہیں کہ اے مسافر! تو کائنات کی تسخیر کے خواب دیکھتا ہے، ستاروں پر کمند ڈالتا ہے، مگر کیا تجھے اپنے پاؤں میں چبھے اس کانٹے کی خبر ہے جو تجھے حق کی راہ میں دوڑنے نہیں دے رہا؟

- **روحانی نکتہ :** ہم دوسروں کے عیب ڈھونڈنے میں مائیکروسکوپ لگائے بیٹھے ہیں، مگر اپنے اندر کا "خارِ کبر" (تکبر کا کانٹا) ہمیں نظر نہیں آتا۔ جب تک انسان اپنی عاجزی اور اپنی کمزوری کو تسلیم نہیں کرتا، معرفت کا دروازہ نہیں کھلتا۔

" .2دشواریاب" کی حقیقت (بصیرت کی ضرورت)

پاؤں کا کانٹا چراغ یا سورج کی روشنی میں مل جاتا ہے، لیکن **دل کا کانٹا** دیکھنے کے لیے "بصیرت" (باطنی آنکھ) چاہیے۔

- **وجدان :** یہ کانٹا اتنا باریک ہے کہ کبھی "نیکی کے لبادے" میں چھپا ہوتا ہے (ریاکاری)، کبھی "علم کے غرور" میں (تکبر)۔ اسے وہی دیکھ سکتا ہے جس کے پاس عشقِ الٰہی کا نور ہو۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ جب تک تم اپنی انا کی اندھیری کوٹھڑی سے باہر نہیں نکلو گے، تمہیں یہ کانٹا نہیں ملے گا جو تمہاری روح کو زخمی کر رہا ہے۔

3. عشق: باطنی جراح (Surgeon)

کانٹا جب گوشت میں گہرائی تک اتر جائے تو اسے نکالنے کے لیے "چیرا" لگانا پڑتا ہے، جس سے درد ہوتا ہے اور خون نکلتا ہے۔

- **روحانی وجدان :** دل سے دنیا کی محبت، حسد اور بغض کا کانٹا نکالنے کے لیے **"عشقِ صادق "** کی سوئی چاہیے۔ جب اللہ کا عشق دل میں آتا ہے، تو وہ ان تمام کانٹوں کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ وہ درد جو توبہ کے وقت محسوس ہوتا ہے، دراصل وہ عمل ہے جس میں قدرت آپ کے دل سے وہ کانٹا نکال رہی ہوتی ہے۔

" .4 وادِہ جواب " (خدا سے مکالمہ)

مولانا جب کہتے ہیں "جواب دو"، تو یہ دراصل بندے کو اس کے ضمیر کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔

- **عرفانی پہلو :** یہ "جواب" زبان سے نہیں، عمل سے دینا ہے۔ کیا تم اس درد کے ساتھ جینے پر راضی ہو یا اس کانٹے کو نکال کر "قلبِ سلیم" پانا چاہتے ہو؟ عرفان یہ ہے کہ انسان کو احساس ہو جائے کہ اس کی بے چینی کا سبب کوئی بیرونی دشمن نہیں، بلکہ اس کے اپنے اندر چھپا ہوا وہ کانٹا ہے جو اسے سجدے کی لذت سے محروم کیے ہوئے ہے۔

خارِ دل را گر بِدیدی ہر خَسی

دستِ کی بودی غمان را بر کسی؟

مشکل الفاظ کے معنی

خار: کانٹا، چبھنے والی چیز۔۔۔ خارِ دل: دل کا کانٹا، باطنی دکھ، اندرونی زخم۔۔۔ گر: اگر۔۔۔ بِدیدی: دیکھ لیتا

ہر خَس: ہر معمولی شخص، ہر عام آدمی۔۔۔ دست: ہاتھ۔۔۔ غَمان: غم، دکھ، رنج

بر کسی: کسی پر، کسی انسان پر

ترجمہ

"اگر ہر عام و خاص (یا ناقدر شناس) انسان دوسرے کے دل کے کانٹے (پوشیدہ تکلیف) کو دیکھ سکتا، تو پھر غموں کا ہاتھ کسی (انسان کے گریبان) تک کیسے پہنچ سکتا تھا؟"

یعنی اگر دل کے چھپے ہوئے زخم سب کو نظر آ جائیں، تو کوئی بھی شخص کسی پر ظلمِ غم روا نہ رکھے۔

اس شعر میں شاعر انسانیت کے ایک بڑے المیے کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ انسانوں کے درمیان دوری اور غموں کے بڑھنے کی اصل وجہ بے حسی ہے۔

باطنی دکھ کی پوشیدگی

انسان کے جسم پر لگنے والی چوٹ تو سب کو نظر آ جاتی ہے، لیکن "دل کا کانٹا" یعنی وہ ذہنی اذیت، تنہائی یا دکھ جو انسان اندر ہی اندر سہتا ہے، وہ دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہر شخص میں اتنی بصیرت اور ہمدردی ہوتی کہ وہ دوسرے کے اس چھپے ہوئے درد کو پہچان لیتا، تو حالات مختلف ہوتے۔

ہمدردی کا علاج

شعر کا دوسرا مصرع ایک سوالیہ انداز رکھتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کے دکھوں کو محسوس کرنے لگیں، تو غموں کو یہ ہمت ہی نہ ہوتی کہ وہ کسی پر غلبہ پا سکیں۔ جب انسان کو معلوم ہو کہ کوئی اس کے درد کو سمجھنے والا ہے، تو اس کا آدھا غم ویسے ہی ہلکا ہو جاتا ہے۔

سماجی پہلو

یہ شعر ہمیں پیغام دیتا ہے کہ دنیا میں غم اس لیے زیادہ ہیں کیونکہ ہم دوسروں کے معاملے میں "خس" (بے قدر تنکے) کی طرح ہو گئے ہیں، جو صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں اور باطن سے بے خبر رہتے ہیں۔ اگر معاشرے میں ایک دوسرے کے جذباتی اور قلبی حالات کا خیال رکھا جائے، تو غموں کا زور ٹوٹ جائے۔

خلاصہ: اگر ہم ایک دوسرے کے دکھوں کے لیے حساس ہو جائیں اور محض ظاہری حالت دیکھ کر فیصلہ نہ کریں، تو دنیا سے دکھوں اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس شعر کے مفہوم کی وضاحت نہایت گہری ہے۔ یہ شعر دراصل "ہمدردی (Empathy)" اور "غم گساری" کے اس اسلامی تصور کی عکاسی کرتا ہے جسے اسلام نے ایمان کا لازمی جزو قرار دیا ہے۔

ذیل میں قرآن و سنت کے چند اہم نکات کے ذریعے اس کی وضاحت پیش ہے:

مومنین ایک جسم کی مانند ہیں (حدیثِ رسول ﷺ)

آپ ﷺ نے مسلمانوں کی مثال ایک جسم سے دی ہے۔ فرمایا:

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رضی الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

«مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ، إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى.» [صحيح]-[متفق عليه]-[صحيح مسلم: 2586]

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مومنوں کی آپس میں ایک دوسرے سے محبت و مودّت اور باہمی ہمدردی کی مثال ایک جسم کی طرح ہے کہ جب اس کا کوئی عضو تکلیف میں ہوتا ہے، تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے، بایں طور کہ نیند اڑ جاتی ہے اور پورا جسم بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

"شعر سے مطابقت: جیسے جسم کا ایک حصہ دوسرے حصے کے درد (خارِ دل) کو محسوس کرتا ہے، ویسے ہی اگر معاشرے کے افراد ایک دوسرے کی تکلیف محسوس کریں تو "غم" کبھی کسی پر غالب نہیں آ سکے گا۔

دوسروں کی تکلیف کا احساس (قرآنِ کریم)

قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ کی صفت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ "تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں، جن پر تمہاری تکلیف بہت شاق (بھاری) گزرتی ہے۔" (سورۃ التوبہ: 128)

شعر سے مطابقت: یہ آیت بتاتی ہے کہ دوسروں کے دکھ کو محسوس کرنا "خصلتِ نبوی" ہے۔ شعر میں "ہر خس" (ناقدر شناس) کا لفظ ان لوگوں کے لیے ہے جو اس صفت سے محروم ہیں، جبکہ مومن کا شیوہ دوسروں کی تکلیف دیکھنا اور محسوس کرنا ہے۔

دوسروں کے غم دور کرنے کی فضیلت

حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیف دور کرے گا، اللہ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور فرمائے گا۔

حَدَّثَنَا مَحْمُودُ بْنُ غَيْلَانَ، حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ، حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ نَفَّسَ عَنْ أَخِيهِ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ، وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا قَعَدَ قَوْمٌ فِي مَسْجِدٍ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَمَنْ أَبْطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ"، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَكَذَا رَوَى غَيْرُ وَاحِدٍ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ هَذَا الْحَدِيثِ، وَرَوَى أَسْبَاطُ بْنُ مُحَمَّدٍ، عَنِ الْأَعْمَشِ، قَالَ: حُدِّثْتُ عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ بَعْضَ هَذَا الْحَدِيثِ.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے اپنے بھائی کی کوئی دنیاوی مصیبت دور کی تو اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کے دن کوئی نہ کوئی مصیبت دور فرمائے گا۔ اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی۔ تو اللہ اس کی دنیا و آخرت میں پردہ پوشی کرے گا، اور جس نے کسی تنگ دست کے ساتھ آسانی کی، تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے لیے

آسانی پیدا فرمائے گا۔ اللہ اپنے بندے کی مدد میں ہوتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے، اور جو ایسی راہ چلتا ہے جس میں اسے علم کی تلاش ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ ہموار کر دیتا ہے اور جب قوم (لوگ) مسجد میں بیٹھ کر کلام اللہ (قرآن) کی تلاوت کرتے ہیں اور اسے پڑھتے پڑھاتے (سمجھتے سمجھاتے) ہیں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے، انہیں رحمت الٰہی ڈھانپ لیتی ہے۔ ملائکہ انہیں اپنے گھیرے میں لیے رہتے ہیں، جس کے عمل نے اسے پیچھے کر دیا تو آخرت میں اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا"[۱]۔

امام ترمذی کہتے ہیں:

۱ - ایسے ہی کئی رواۃ نے اسی حدیث کی طرح اعمش سے اعمش نے ابوصالح کے واسطہ سے، اور ابوصالح نے ابوہریرہ کے واسطہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے،

۲- اسباط بن محمد نے بھی اعمش سے روایت کی ہے، (اس روایت میں ہے کہ) اعمش کہتے ہیں: مجھ سے بیان کیا گیا ہے[۲] ابوصالح کے واسطہ سے اور ابوصالح نے ابوہریرہ کے واسطہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں پھر اس حدیث کا بعض حصہ ذکر کیا۔ [سنن ترمذي / كتاب القراءات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم / حدیث: 2945]

"جو شخص کسی مومن کی دنیاوی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت دور کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں سے اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔" (صحیح مسلم)

شعر سے مطابقت: شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کے "خارِ دل" (اندرونی دکھ) دیکھ کر انہیں دور کرنے کی کوشش کریں، تو غموں کا ہاتھ کسی تک پہنچ ہی نہیں پائے گا کیونکہ ہر شخص دوسرے کا مددگار بن جائے گا۔

بے حسی کی مذمت

اسلام میں اس شخص کو کامل مومن قرار نہیں دیا گیا جو اپنے بھائی کے دکھ سے بے خبر ہو۔

(صحیح) عن عبداللہ بن المساور قال: سمعت ابن عباس یخبر ابن الزبیر یقول سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "لیس المؤمن الذی یشبع، وجارُہ جائع". حدیث نمبر: 82

عبد اللہ بن مساور سے مروی ہے کہتے ہیں میں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا وہ سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بتاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مسلمان وہ نہیں کہ جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا ہو۔[صحيح الادب المفرد / حدیث:82]

ارشاد فرمایا

حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ مُوسَى، حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، حَدَّثَنَا زَكَرِيَّاءُ بْنُ إِسْحَاقَ الْمَكِّيُّ، عَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ صَيْفِيٍّ، عَنْ أَبِي مَعْبَدٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا إِلَى الْيَمَنِ، فَقَالَ: "اتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ، فَإِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللَّهِ حِجَابٌ""

ہم سے یحییٰ بن موسیٰ نے بیان کیا، کہا ہم سے وکیع نے بیان کیا، کہا ہم سے زکریا بن اسحاق مکی نے بیان کیا، ان سے یحییٰ بن عبد اللہ صیفی نے، ان سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام ابو معبد نے، اور ان سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو جب (عامل بنا کر) یمن بھیجا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہدایت فرمائی کہ مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہنا کہ اس (دعا) کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔[صحيح البخاري / كتاب المظالم والغصب / حدیث:2448]

کیونکہ اس کا دل زخمی ہوتا ہے، چاہے زبان خاموش ہو

قرآن وسنت کی روشنی میں اس شعر کا لبِ لباب یہ ہے کہ معاشرتی امن اور انفرادی سکون کا راز "احساس" میں چھپا ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کے پوشیدہ دکھوں اور جذباتی ضرورتوں کے لیے حساس ہو جائیں، تو یہ دنیا غموں سے پاک ہو کر امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔

طبی اور سائنسی نقطہ نظر سے اس شعر کی وضاحت **نفسیات** (Psychology) اور **اعصابی سائنس** (Neuroscience) کے پیرائے میں کی جا سکتی ہے۔ شاعر جس "خارِ دل" (دل کے کانٹے) کو دیکھنے کی بات کر رہا ہے، سائنس اسے **"ایمپیتھی "** (Empathy) یا ہمدردی کا مل کہتی ہے۔

ذیل میں اس کی سائنسی اور طبی وضاحت دی گئی ہے:

.1 آئینہ دار اعصاب (Mirror Neurons)

سائنس کہتی ہے کہ انسانی دماغ میں کچھ خاص خلیے ہوتے ہیں جنہیں **Mirror Neurons** کہا جاتا ہے۔ جب ہم کسی دوسرے انسان کو تکلیف میں دیکھتے ہیں، تو یہ خلیے ہمارے دماغ میں بھی وہی کیفیت پیدا کرتے ہیں جیسے وہ تکلیف ہمیں خود ہو رہی ہو۔

- **شعر سے تعلق :** اگر کسی شخص کے یہ اعصاب "فعال" ہوں (یعنی وہ 'ہر خس' یا بے حس نہ ہو)، تو وہ دوسرے کے پوشیدہ غم کو بالکل ویسے ہی محسوس کرلے گا جیسے وہ اس کا اپنا ہو۔

2. جذباتی ذہانت (Emotional Intelligence - EQ)

طبی نفسیات میں EQ کا تصور بہت اہم ہے۔ یہ وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے انسان دوسروں کے ان جذبات اور اشاروں کو سمجھ لیتا ہے جو الفاظ میں بیان نہیں کیے جاتے۔

- **خارِ دل :** بہت سی ذہنی بیماریاں جیسے **ڈپریشن (Depression)** اور **انزائٹی (Anxiety)** وہ "خارِ دل" ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے۔ اگر معاشرے میں لوگوں کا 'جذباتی ذہانت' کا درجہ بلند ہو، تو وہ ان خاموش علامات کو پہچان کر مریض کی مدد کر سکتے ہیں، جس سے اسے ذہنی دباؤ کے بدترین اثرات سے بچایا جا سکتا ہے۔

سماجی مدد اور تناؤ کا خاتمہ (Social Support & Cortisol)

سائنسی تحقیق ثابت کرتی ہے کہ جب کوئی انسان اپنے غم میں کسی دوسرے کو ہمدرد پاتا ہے، تو اس کے جسم میں تناؤ پیدا کرنے والا ہارمون **کورٹیسول (Cortisol)** کم ہو جاتا ہے اور "محبت کا ہارمون" یعنی **آکسی ٹوسن (Oxytocin)** بڑھ جاتا ہے۔

- **شعر سے تعلق :** شاعر کہتا ہے کہ اگر لوگ ایک دوسرے کے دکھ دیکھ لیتے، تو "غموں کا ہاتھ" کسی پر نہ ہوتا۔ سائنسی طور پر اس کا مطلب ہے کہ **سوشل سپورٹ** انسان کے دفاعی نظام (Immune System) کو مضبوط کرتی ہے اور اسے نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ سے بچاتی ہے۔

اس طرح یہ شعر محض جذبات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی بقا (Human Survival) کے اس سائنسی اصول کی طرف اشارہ ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے اور اس کی بقا ایک دوسرے کے "باطنی دکھوں" کو سمجھنے میں ہی پنہاں ہے۔

اس شعر کی **روحانی اور وجدانی** تشریح مادّی دنیا سے ماوراء حقائق کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تصوف اور سلوک کی دنیا میں "دیکھنے" سے مراد سر کی آنکھ سے دیکھنا نہیں، بلکہ **"چشمِ بصیرت"** (دل کی آنکھ) سے دیکھنا ہے۔

ذیل میں اس کے مختلف روحانی پہلو پیش ہیں:

تجلیِ حق اور ہمدردی کا مقام

روحانیت میں انسان کو "خلیفۃ اللہ" کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "الطیف" (باریک بین) ہے۔ صوفیہ کے نزدیک جب ایک انسان کا تزکیہِ نفس ہو جاتا ہے، تو اس کے اندر دوسروں کے باطنی احوال جاننے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

- **وجدان:** جب سالک کا دل آئینے کی طرح صاف ہو جاتا ہے، تو اسے دوسرے کے دل میں چبھا ہوا "خار" (کانٹا) اپنے دل میں محسوس ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں ہر انسان اس مقامِ احسان پر فائز ہو جائے جہاں وہ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھے، تو کائنات سے غم کا وجود ہی مٹ جائے۔

وحدتِ وجود کا تصور

اس شعر میں وحدتِ وجود کی جھلک ملتی ہے۔ اگر ہم سب ایک ہی نور کا حصہ ہیں، تو ایک کا درد دوسرے کا درد ہے۔

- **خارِ دل:** یہ دراصل وہ حجاب یا دوری ہے جو انسان کو اللہ سے یا مخلوق سے دور رکھتی ہے۔
- **تشریح:** روحانی طور پر "غم" اس وقت حملہ آور ہوتا ہے جب انسان تنہائی محسوس کرتا ہے۔ وجدانی طور پر جب کوئی دوسرا آپ کے "خارِ دل" کو دیکھ لیتا ہے، تو وہ تنہائی ختم ہو جاتی ہے اور انسان اللہ کی رحمت کے حصار میں آ جاتا ہے۔

نفسِ امارہ بمقابلہ نفسِ مطمئنہ

شاعر نے "ہر خس" (گھاس پھونس / کم ظرف) کا لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جو نفسِ امارہ کے قیدی ہیں اور صرف اپنی ذات تک محدود ہیں۔

- **روحانی نکتہ:** جس انسان کا نفس مٹ جاتا ہے، وہ "خس" نہیں رہتا بلکہ "مردِ حق" بن جاتا ہے۔ مردِ حق کی نظر سے کچھ چھپا نہیں رہتا۔ اگر معاشرے میں مادی دوڑ کے بجائے روحانی بالیدگی ہوتی، تو ہر شخص دوسرے کے کرب کو پہچان کر اس کا مداوا کرتا اور یوں غم کا تسلط ختم ہو جاتا۔

عشقِ حقیقی کا پہلو

عشقِ صادق میں عاشق اپنے محبوب کے دل کی ذرا سی تڑپ کو بھی جان لیتا ہے۔ وجدانی طور پر یہ شعر اس کائنات کو ایک "خاندانِ خداوندی" قرار دیتا ہے۔ اگر ہم سب ایک دوسرے کے باطنی کانٹوں (کمزوریوں، دکھوں، لغزشوں) کو ہمدردی کی نظر سے دیکھیں (بجائے تنقید کے)، تو نفرتوں اور غموں کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے کٹ جائے۔

حاصلِ کلام: یہ شعر ایک ایسے مثالی روحانی معاشرے کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں انسانوں کے درمیان "کشف القلوب" (دِلوں کا حال کھل جانا) جیسا تعلق ہو۔ جہاں زبان سے حال بیان کرنے کی ضرورت نہ پڑے، بلکہ نگاہیں ہی "خارِ دل" پڑھ لیں اور مرہم رکھ دیں۔

علمِ بیان وبدیع (Poetic Devices)

اس شعر میں کئی فنی خوبیاں موجود ہیں:

- **استعارہ** * :(Metaphor) **خارِ دل** : یہاں "خار" (کانٹا) استعارہ ہے 'پوشیدہ دکھ' یا 'تکلیف' کے لیے۔
    - **دستِ غماں**" : غموں کا ہاتھ" ایک استعارہ ہے غم کے غلبے اور تسلط کے لیے۔
- **صنعتِ تشخیص** * :(Personification) شاعر نے **غم** کو ایک زندہ وجود کی طرح پیش کیا ہے جس کا "ہاتھ" (دست) ہے اور وہ انسان کے گریبان تک پہنچتا ہے۔ بے جان چیز کو جاندار کی خصوصیت دینا 'تشخیص' کہلاتا ہے۔
- **کنایہ** * :(Metonymy) **خَس** : (تنکا یا گھاس پھونس) یہاں کنایہ ہے 'کم ظرف'، 'بے حس' یا 'عام' انسان کے لیے۔
- **صنعتِ سوال وجواب**:(Rhetorical Question)
    - دوسرے مصرعے میں شاعر نے "کِی بودی؟" (کب ہوتا؟) کہہ کر سوالیہ انداز اپنایا ہے، جس کا مقصد سوال پوچھنا نہیں بلکہ حقیقت پر زور دینا ہے کہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔

زبان وبیان

- **فارسی آموختہ :** یہ خالص فارسی کلام ہے، لیکن اردو شاعری میں بھی اس طرح کی تراکیب (خارِ دل، دستِ غماں) کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔

- **ایجاز و اختصار :** شاعر نے بہت بڑے اخلاقی اور نفسیاتی فلسفے کو صرف دو مصرعوں میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

فلسفیانہ صنف: حکیمانہ شاعری

- موضوع کے اعتبار سے یہ **حکیمانہ یا صوفیانہ شاعری** کے زمرے میں آتا ہے، جہاں شاعری کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ انسان کی اخلاقی اصلاح اور کائنات کے حقائق کی تفہیم ہے۔

خلاصہ : فنی لحاظ سے یہ شعر **غزل** کی صنف، **استعارہ و تشخیص** کی صنعتوں اور **حکیمانہ** اسلوب کا شاہکار ہے۔

کَس بہ زیرِ دُمِّ خَر خاری نَہد

خَر نَداند دَفعِ آن، بَر می جَہد

مشکل الفاظ کے معنی

کَس : کوئی شخص۔۔۔**بہ زیر :** نیچے، کے نیچے۔۔**دُمّ خَر :** گدھے کی دُم۔۔۔**خاری :** کانٹا۔۔۔**نَہَد :** رکھ دے، گاڑ دے

خَر : گدھا۔۔۔**نَداند :** نہیں جانتا۔۔۔**دَفعِ آن :** اس کو دور کرنا، اس کا علاج

بَر می جَہَد : کودتا ہے، اچھلتا ہے، بے قابو ہو جاتا ہے

ترجمہ

"اگر کوئی شخص گدھے کی دم کے نیچے کانٹا رکھ دے، تو گدھا اس (تکلیف) کو دور کرنا نہیں جانتا، بلکہ وہ (درد کی شدت سے) اچھلنے اور دولتیاں چلانے لگتا ہے۔"

اس شعر میں مولانا رومیؒ نے ایک سادہ سی مثال کے ذریعے ایک بہت بڑے انسانی المیے اور اخلاقی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں:

۱۔ بے وقوفی اور عقل کی کمی : گدھا یہاں علامت ہے ایسے انسان کی جو عقلِ سلیم سے عاری ہو۔ جب گدھے کو کانٹا چبھتا ہے، تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سکون سے کھڑا ہو کر کانٹا نکلوانے کی کوشش کرے یا کسی ایسے طریقے سے اسے دور کرے جس سے تکلیف ختم ہو۔ لیکن وہ اپنی فطرت کے مطابق اچھلنا کودنا شروع کر دیتا ہے، جس سے وہ کانٹا جسم میں مزید گہرا اپیوست ہو جاتا ہے اور اسے مزید تکلیف پہنچتی ہے۔

۲۔ غصہ اور غلط ردِ عمل : رومیؒ ہمیں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے یا کوئی اسے دکھ پہنچاتا ہے، تو جاہل انسان "ردِ عمل (Reaction) " دیتا ہے۔ وہ غصہ کرتا ہے، چیختا چلاتا ہے اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اشتعال انگیزی میں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا یہ رویہ اس کی اپنی تکلیف کو کم کرنے کے بجائے مزید بڑھا رہا ہے۔

حاصلِ کلام : یہ شعر ہمیں سبق دیتا ہے کہ مشکلات یا کسی کی دی ہوئی تکلیف پر "گدھے" کی طرح محض اچھلنا کودنا (بے جا غصہ اور احتجاج کرنا) مسئلے کا حل نہیں ہے۔ دانائی یہ ہے کہ انسان ٹھنڈے دماغ سے تکلیف کی اصل وجہ (کانٹے) کو پہچانے اور اسے نکالنے کی تدبیر کرے، نہ کہ اشتعال میں آکر اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کرے۔

اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ مصیبت یا اشتعال کے وقت انسان کا ردِ عمل حیوانی جبلت (Instinct) کے بجائے ایمانی بصیرت کے تابع ہونا چاہیے۔

۱ . صبر اور ثباتِ قدم

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ) "البقرۃ:156" (وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

تعلق : گدھے کا "اچھلنا" (برمی جہد) بے صبری اور بے چینی کی علامت ہے۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ جب "کانٹا" چبھے (کوئی تکلیف آئے) تو چیخنے چلانے یا بے قابو ہونے کے بجائے اللہ کی طرف رجوع کریں اور سکون اختیار کریں تاکہ عقل کام کر سکے۔

۲ . غصے پر قابو پانا (سنتِ نبوی ﷺ)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔" (صحیح بخاری)

تعلق: رومیؒ کے شعر میں گدھے کا ردِ عمل "غصہ" اور "ہیجان" ہے جو اسے مزید تکلیف دیتا ہے۔ سنتِ نبویؐ کے مطابق طاقتور انسان وہ ہے جو تکلیف پہنچنے پر اشتعال میں آنے کے بجائے اپنے جذبات کو قابو (Control) میں رکھے، تاکہ وہ مسئلے کا درست حل نکال سکے۔

۳۔ تدبر اور حکمت (حکمتِ دین)

قرآن کریم میں حکمت کو "خیرِ کثیر" کہا گیا ہے۔

"وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا" (البقرۃ:269)

تعلق: گدھا "دفعِ آن" (تکلیف دور کرنا) نہیں جانتا کیونکہ اس کے پاس حکمت نہیں ہے۔ اسلام مومن کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں غور و فکر (تدبر) کرے۔ اگر دشمن یا کوئی حاسد آپ کی پیٹھ کے پیچھے "کانٹا" چبھوئے، تو مومن کا کام محض احتجاج کرنا یا اچھلنا نہیں، بلکہ حکمت کے ساتھ اس شر کو ختم کرنا ہے۔

۴۔ نفسِ امارہ کی مثال

صوفیانہ نکتہ نظر سے رومیؒ اکثر "گدھے" کو **نفسِ امارہ** (برائی پر اکسانے والا نفس) کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

- قرآن کے مطابق نفسِ امارہ انسان کو بے لگام بناتا ہے۔
- جب نفس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی، تو وہ "گدھے" کی طرح سرکشی کرتا ہے۔
- اسلام اس نفس کو "نفسِ مطمئنہ" میں بدلنے کی تعلیم دیتا ہے، جو کانٹا چبھنے پر بھی اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے اور بے وقوفانہ ردِ عمل نہیں دیتا۔

یاد رکھیں یہ شعر قرآن و سنت کے مزاج کے عین مطابق ہے: کیونکہ

﴿وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا﴾

"اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا اٹھتا ہے" (سورۃ المعارج:20)

نادان انسان تکلیف پر جزع وفزع کرتا ہے، جبکہ دانا شخص صبر، فکر اور اصلاح کا راستہ اختیار کرتا ہے

قرآن وسنت کی کسوٹی پر یہ شعر ہمیں **"ردِ عمل کی نفسیات (Psychology of Reaction)** "سکھاتا ہے۔ اسلام ہمیں "Reconstructive"(تعمیری) سوچ دیتا ہے، جبکہ "گدھے کا اچھلنا" ایک "Destructive" (تخریبی) ردِ عمل ہے جو انسان کو اپنی ہی نظر میں گرا دیتا ہے اور تکلیف میں اضافہ کرتا ہے۔

نفسیاتی نقطہ نظر سے مولانا رومیؒ کا یہ شعر **"ردِ عمل کی نفسیات (Psychology of Reaction)** "اور **"جذباتی ذہانت "** (Emotional Intelligence) کا ایک شاہکار نقشہ کھینچتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات اسے انسانی طرزِ عمل کی مختلف تہوں سے واضح کرتے ہیں:

۱. لاشعوری ردِ عمل بمقابلہ شعوری جواب (React vs Respond)

نفسیات میں دو طرح کے طرزِ عمل ہوتے ہیں:

- **ردِ عمل (Reaction):** یہ جبلت (Instinct) پر مبنی ہوتا ہے۔ جیسے گدھے کو کانٹا چبھا اور وہ فوراً اچھل پڑا۔ اس میں سوچنے سمجھنے کا عمل شامل نہیں ہوتا۔
- **جواب (Response):** یہ شعور پر مبنی ہوتا ہے۔ انسان تکلیف محسوس کرتا ہے، رکتا ہے، سوچتا ہے اور پھر اسے حل کرتا ہے۔

رومیؒ یہ سمجھا رہے ہیں کہ جو انسان اپنے جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر فوراً "اچھلنے (Reaction) " لگتے ہیں، وہ دراصل اپنی حیوانی سطح پر ہوتے ہیں۔

۲. ایمگڈالا ہائی جیک (Amygdala Hijack)

جدید نیورو سائنس کے مطابق، جب ہمیں کوئی اچانک صدمہ یا تکلیف (کانٹا) پہنچتی ہے، تو ہمارے دماغ کا ایک حصہ جسے **Amygdala** کہتے ہیں، وہ فوری طور پر "بھاگو یا لڑو (Fight or Flight) "کا سگنل دیتا ہے۔

- شعر میں گدھے کا اچھلنا اسی **"Fight or Flight"** کی علامت ہے۔

- نفسیاتی طور پر پختہ انسان وہ ہے جو اپنے Prefrontal Cortex (دماغ کا منطقی حصہ) کو استعمال کر کے اس اشتعال پر قابو پالے۔

۳. نقلِ مکانی (Displacement)

اکثر نفسیاتی مریض یا کمزور اعصاب کے مالک لوگ اپنی تکلیف کا غصہ غلط جگہ نکالتے ہیں۔ گدھا کانٹا نکالنے کے بجائے ہوا میں دولتیاں جھاڑتا ہے (برمی جھد)۔

- عام زندگی میں جب ہمیں کوئی تکلیف پہنچاتا ہے، تو ہم اس مسئلے کو حل کرنے کے بجائے اپنے گھر والوں پر غصہ نکالتے ہیں یا چیخ و پکار شروع کر دیتے ہیں۔ یہ "غیر متعلقہ اچھل کود" تکلیف کو کم نہیں بلکہ زیادہ کرتی ہے۔

۴. خود اذیتی (Self-Sabotage)

گدھے کا اچھلنا اس کے جسم میں موجود کانٹے کو مزید گہرا کر دیتا ہے۔ نفسیاتی طور پر اسے **Self-Sabotaging Behavior** کہتے ہیں۔

- جب ہم کسی دکھ میں مبتلا ہو کر منفی خیالات، بے صبری اور چیخ و پکار کا راستہ اپناتے ہیں، تو ہم دراصل اپنی ذہنی صحت کو مزید تباہ کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم اس "کانٹے" کو نکالنے کے بجائے اسے اپنے اعصاب میں مزید پیوست کر لیتے ہیں۔

۵. ادراک کی کمی (Lack of Insight)

گدھے کا مسئلہ یہ نہیں کہ اسے درد ہو رہا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ "**دفعِ آن**" (اس کا تدارک) نہیں جانتا۔ اسے یہ سمجھ ہی نہیں کہ درد کی وجہ کیا ہے۔

- نفسیاتی علاج (Therapy) کا پہلا قدم ہی یہ ہے کہ انسان یہ پہچانے کہ اسے "کانٹا" کہاں چبھا ہے؟ اکثر لوگ اپنی پوری زندگی اچھل کود (اضطراب اور ڈپریشن) میں گزار دیتے ہیں لیکن اس کانٹے (بنیادی صدمے یا غلط فہمی) کی نشاندہی نہیں کرتے جو اس تکلیف کی اصل وجہ ہے۔

نفسیاتی طور پر یہ شعر "**توقف** (The Power of Pause)" کی اہمیت بیان کرتا ہے۔ تکلیف پہنچنے اور اس پر ردِ عمل دینے کے درمیان جو ایک لمحہ ہوتا ہے، وہی انسان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرتا ہے۔

اس شعر کی روحانی اور وجدانی تشریح مٹی اور گوشت کے انسان سے نہیں، بلکہ اس **"روح "** کے تڑپنے سے تعلق رکھتی ہے جو اس مادی جسم میں قید ہے۔ مولانا رومیؒ یہاں محض ایک گدھے کی مثال نہیں دے رہے، بلکہ وہ ہماری اس **"خودی "** کا ماتم کر رہے ہیں جو عشقِ الٰہی سے محروم ہے۔

آیئے اس کی روح میں اترتے ہیں:

۱۔ گدھا: ہماری مادی حقیقت (نفسِ امارہ)

رومیؒ کے نزدیک انسان کا یہ جسم اور اس کا نفسِ امارہ ایک "گدھا" ہے۔ ہم نے عمر بھر اس گدھے کو سجایا، اسے کھلایا اور اس کی نازبرداری کی۔ لیکن اس کی جبلت نہیں بدلی۔ جب کائنات کی تلخیاں، زمانے کے حوادث یا رب کی طرف سے کوئی آزمائش (کانٹا) اس نفس کو چبھتی ہے، تو یہ بلبلا اٹھتا ہے۔ یہ اللہ سے شکوہ کرتا ہے، تقدیر سے لڑتا ہے اور غصے میں اندھا ہو کر ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ وہ "آزمائش کا کانٹا" اس کی روح کے پار ہو جاتا ہے۔

۲۔ کانٹا: مشیتِ الٰہی کی چبھن

وہ "خاری" (کانٹا) کیا ہے؟ وہ کبھی جدائی ہے، کبھی ناکامی ہے، کبھی بیماری ہے اور کبھی اپنوں کا رویہ۔ یہ کانٹا کوئی عام شخص (کَس) نہیں رکھ رہا، بلکہ پردۂ غیب سے یہ اللہ کا ایک "اشارہ" ہوتا ہے۔ اللہ یہ کانٹا اس لیے چبھوتا ہے تاکہ تجھے احساس ہو کہ تو یہاں کا نہیں ہے، تیرا ٹھکانا کہیں اور ہے۔

۳۔ غفلت کی انتہا: تڑپ تو ہے مگر سمت نہیں

شعر کا سب سے دردناک حصہ **"خَرنَداند دَفعِ آن "** (گدھا اسے دور کرنا نہیں جانتا) ہے۔ ہائے افسوس! ہم تڑپتے تو ہیں، روتے تو ہیں، فریاد بھی کرتے ہیں، لیکن ہمیں یہ نہیں پتہ کہ اس درد کا علاج کیا ہے۔ ہم "دولتیاں" جھاڑتے ہیں۔ ہم گناہوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں، ہم لوگوں کے سامنے ذلیل ہوتے ہیں، ہم نفسانی لذتوں میں درد چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم اس تڑپ کو "وجد" (اللہ کی طرف پرواز) بنانے کے بجائے "اضطراب" (روح کی بے چینی) بنا دیتے ہیں۔

۴۔ وجدانی تڑپ: اچھلنا یا پرواز کرنا؟

گدھا اچھلتا ہے تو وہ مٹی میں ہی گرتا ہے، لیکن اگر یہی تڑپ کسی "عاشق" کو نصیب ہو جائے، تو وہ اس کانٹے کی چبھن سے فرش سے عرش تک کا سفر طے کر لیتا ہے۔ رومیؒ کہتے ہیں" : **درد کے بغیر راستہ نہیں ملتا، اور کانٹا چبھے بغیر گلستان کی قدر نہیں ہوتی۔"**

تکلیف کا کانٹا چبھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی تم زندہ ہو! لیکن اگر تم گدھے کی طرح صرف "ردِ عمل" دیتے رہے، تو تم اسی مٹی میں مر جاؤ گے۔ اگر تم اس درد کو پہچان لو اور "دُم" (نفس) کے بجائے "سر" (روح اور سجدہ) کی طرف توجہ کرو، تو یہی کانٹا تمہارے گناہوں کا کفارہ اور تمہارے درجات کی بلندی کا سبب بن جائے گا۔

خلاصہ ٔ وجدان

اے سالک! جب زمانے کا کوئی کانٹا تجھے چبھے، تو گدھے کی طرح زمانے کو دولتیاں نہ مار، بلکہ اپنے رب کے حضور گر جا۔ وہ کانٹا تیرے دشمن نے نہیں، تیرے محبوب (خدا) نے چبھویا ہے تاکہ تو غفلت کی نیند سے جاگ جائے۔

تڑپنا مقدر ہے، مگر انتخاب تیرا ہے:

- یا تو گدھے کی طرح اچھل کر لہولہان ہو جا۔
- یا بسمل کی طرح تڑپ کر واصلِ بحق ہو جا۔

مولانا رومیؒ کے اس تمثیلی شعر نے فارسی اور اردو شاعری کے ان بڑے ستونوں کے ہاں مختلف رنگ اختیار کیے ہیں۔ رومیؒ جس "گدھے اور کانٹے" کی بات کر رہے ہیں، ان دیگر شعراء نے اسی حقیقت کو **نفس، عشق، خودی** اور **تسلیم و رضا** کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ ان چاروں عظیم فکر کاروں کے ہاں اس کی کیا گونج ہے:

۱۔ شیخ سعدی شیرازیؒ: مصلحت اور تربیت

سعدی چونکہ مصلحت اور اخلاق کے شاعر ہیں، وہ رومیؒ کی اس بات کو "تربیتِ نفس" کے رخ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ جاہل کو جتنا مرضی مارا جائے یا اسے چبھن دی جائے، وہ اپنی جبلت نہیں بدلتا۔

- **سعدی کا قول" :** گدھے پر اگر سونے کی زین بھی رکھ دی جائے، تب بھی وہ گدھا ہی رہتا ہے۔"

- **رابطہ :** سعدی یہ کہتے ہیں کہ جس انسان میں شعور (Insight) نہیں، اسے زندگی کے حادثات (کانٹے) سبق نہیں دیتے بلکہ وہ ان سے مزید وحشی ہو جاتا ہے۔

۲۔ فخر الدین عراقیؒ: سوزِ عشق اور تسلیم

عراقی صوفیِ باصفا اور سوز و گداز کے شاعر ہیں۔ رومیؒ کے شعر میں جو "تڑپ" اور "اچھلنا" ہے، عراقی اسے **عشق کی بے چینی** میں بدل دیتے ہیں۔

- **عراقی کا رنگ :** وہ کہتے ہیں کہ عاشق کو جب جدائی کا کانٹا چبھتا ہے، تو وہ گدھے کی طرح بے کار نہیں اچھلتا، بلکہ اس کا تڑپنا اسے اللہ کے قریب کر دیتا ہے۔

- **رابطہ :** رومیؒ کے نزدیک اچھلنا حیوانیت ہے، عراقی کے نزدیک اسی چبھن کو سہنا اور اسے لذتِ درد بنانا روحانیت ہے۔

۳۔ حافظ شیرازیؒ: رضا اور رندی

حافظ کے ہاں رومیؒ کے اس فلسفے کا حل **"تسلیم و رضا "** ہے۔ حافظ کہتے ہیں کہ اگر راستہ پر خار ہے یا زمانے نے تمھیں زخم دیا ہے، تو فریاد کر کے تماشہ نہ بنو۔

- **حافظ کا شعر:**

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم

کہ در طریقتِ ما کافریست رنجیدن

)ہم وفا کرتے ہیں، ملامت سہتے ہیں اور خوش رہتے ہیں، کیونکہ ہمارے راستے میں رنجیدہ ہونا کفر کے برابر ہے۔(

- **رابطہ :** رومیؒ کا گدھا چبھن پر اچھلتا ہے، حافظ کا "رند" چبھن پر مسکراتا ہے تاکہ رازِ محبت فاش نہ ہو۔

۴۔ علامہ اقبالؒ: ضبطِ نفس اور خودی

اقبال نے رومیؒ کے اس گدھے کو **"نفس "** قرار دیا اور اس کے اچھلنے کودنے کو **"کمزوری "** سمجھا۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے نفس کے گدھے پر سوار نہ ہو جائے، وہ خودی کی بلندی نہیں پا سکتا۔

- **اقبال کا شعر:**

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

- **رابطہ :** اقبال رومیؒ کے اس شعر کی نفسیاتی گرہ یوں کھولتے ہیں کہ اے انسان! حادثات (کانٹے) کے سامنے گدھے کی طرح بے بس نہ ہو، بلکہ اپنی خودی کو اتنا مضبوط کر کہ یہ کانٹے تیرے پاؤں تلے مسل جائیں۔ وہ کہتے ہیں:

"ترا وجود ہے مومن، تری خودی ہے کلیم"

(یعنی تو وہ نہیں جو کانٹے سے ڈر جائے، تو تو وہ ہے جو آگ میں بھی گلزار پیدا کر لے)۔

موازنہ: ایک نظر میں

شاعر	**پیغام کا خلاصہ**
عراقیؒ	اس تڑپ کو عشقِ الٰہی کا ذریعہ بناؤ۔
سعدیؒ	جب تک مٹی (نفس) پاک نہ ہو، چبھن سے اصلاح نہیں ہوتی۔
رومیؒ	جاہلانہ ردِ عمل (Reaction) سے بچو، عقل استعمال کرو۔
حافظؒ	شکایت نہ کرو، تقدیر کے کانٹے کو پھول سمجھ کر قبول کرو۔
اقبالؒ	اپنی خودی کو اتنا فولاد بنالو کہ زمانے کے کانٹے بے اثر ہو جائیں۔

رومیؒ کے اس شعر میں جو **"خار" (کانٹا)** ہے، وہ دراصل **"خارِ جستجو "** بن سکتا ہے اگر انسان کے پاس اقبال جیسی **خودی** اور حافظ جیسی **رضا** ہو۔

بَر جَہَد، وان خارْ مُحکَم تر زَنَد

عاقلی باید کہ خاری بَر کَنَد

مشکل الفاظ کے معنی

بَر جَہَد: اچھل پڑتا ہے، جھٹکے سے حرکت کرتا ہے۔۔۔وان: اور وہ، تب وہ۔۔۔خار: کانٹا۔۔۔مُحکَم تَر: اور زیادہ مضبوط، اور گہرا

زَنَد: گاڑ دیتا ہے، پیوست کر دیتا ہے۔۔۔عاقلی: عقل مندی، دانائی۔۔۔باید: چاہیے، لازم ہے

بَر کَنَد: جڑ سے نکال دے، اکھاڑ پھینکے

مفہوم قریب:

وہ تڑپ کر اچھلتا ہے، تو کانٹا اور زیادہ مضبوطی سے پیوست ہو جاتا ہے؛
دانشمندی تو یہ ہے کہ آدمی کانٹے کو جڑ سے نکال دے۔

اس شعر کا تعلق مثنوی کی ایک علامتی حکایت سے ہے جس میں ایک شخص نے راستے میں کانٹے دار جھاڑی بو دی تھی۔ لوگ گزرتے تو ان کے کپڑے پھٹتے اور پاؤں زخمی ہوتے۔ جب اس سے کہا گیا کہ اسے اکھاڑ دو، تو وہ کل کل کہہ کر ٹالتا رہا۔ مولانا رومیؒ اس تمثیل کے ذریعے انسان کو ایک عظیم نفسیاتی اور روحانی حقیقت سمجھا رہے ہیں:

1۔ برائی کی جڑیں وقت کے ساتھ مضبوط ہوتی ہی

مولانا فرماتے ہیں کہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، وہ کانٹے دار جھاڑی (جو دراصل انسان کی **بُری عادات، گناہ یا انا** کی علامت ہے) بوڑھی اور مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ اسے اکھاڑنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ انسان جوں جوں بوڑھا ہوتا ہے، اس کی ہمت کم ہوتی ہے لیکن اس کی جاہ پسندی اور بری عادتیں جوان اور توانا ہوتی جاتی ہیں۔

2۔ توبہ اور اصلاح میں تاخیر کا نقصان: اس شعر کا پیغام یہ ہے کہ اگر انسان اپنی اصلاح میں دیر کرے گا، تو وہ "کانٹا" (برائی) اس کے وجود میں اتنی گہرائی تک اتر جائے گا کہ پھر اسے نکالنا عام انسان کے بس کی بات نہیں رہے گی۔

3۔ 'عاقل' (مرشد یا دانائی) کی ضرورت: لفظ '**عاقلی باید**' سے مراد یہ ہے کہ جب برائی یا نفس کی جڑیں اتنی مضبوط ہو جائیں کہ انسان خود انہیں نہ نکال سکے، تو پھر اسے کسی ایسے '**عاقل**' **(کامل انسان یا مرشدِ معنوی)** کی رہنمائی درکار ہوتی ہے جو اپنی حکمت اور توجہ سے ان گہری جڑوں کو اکھاڑ سکے۔

دراصل یہ شعر ہمیں **وقت کی قدر** اور **فوری خود احتسابی** کا سبق دیتا ہے۔ یہ خبردار کرتا ہے کہ اپنی کمزوریوں کو "کل" پر مت چھوڑو، کیونکہ کل وہ کمزوری ایک تناور درخت بن چکی ہو گی اور تم اسے اکھاڑنے کے قابل نہیں رہو گے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کا مفہوم قرآن و سنت کے ان عالمگیر اصولوں سے گہرا تعلق رکھتا ہے جو انسانی نفس کی اصلاح، گناہوں کی جڑوں اور توبہ میں تاخیر کے نقصانات سے متعلق ہیں۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت درج ذیل نکات سے کی جا سکتی ہے:

1. گناہ کا دل پر اثر (کانٹے کا جڑ پکڑنا)

شعر میں مولانا فرماتے ہیں کہ "کانٹا (برائی) وقت کے ساتھ مضبوط ہوتا جاتا ہے"۔ یہ بعینہ اس حدیثِ نبوی ﷺ کی ترجمانی ہے جس میں دل پر گناہ کے اثر کو واضح کیا گیا ہے:

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ,حَدَّثَنَا حَاتِمُ بْنُ إِسْمَاعِيل ,وَالْوَلِيدُ بْنُ مُسْلِمٍ ,حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَجْلَانَ ,عَنْ الْقَعْقَاعِ بْنِ حَكِيمٍ ,عَنْ أَبِي صَالِحٍ ,عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ,أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ,قَالَ: "إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا أَذْنَبَ كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِي قَلْبِهِ ,فَإِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ , صُقِلَ قَلْبُهُ ,فَإِنْ زَادَ زَادَتْ ,فَذَلِكَ الرَّانُ الَّذِي ذَكَرَهُ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ سورة المطففين آية 14."

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب مومن کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ (داغ) لگ جاتا ہے، اگر وہ توبہ کرے، باز آ جائے اور مغفرت طلب کرے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے، اور اگر وہ (گناہ میں) بڑھتا چلا جائے تو پھر وہ دھبہ بھی بڑھتا جاتا ہے، یہ وہی زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے: «كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون» ”ہرگز نہیں بلکہ ان کے برے اعمال نے ان کے دلوں پر زنگ پکڑ لیا ہے جو وہ کرتے ہیں“ (سورۃ المطففین: 14)“۔ [سنن ابن ماجہ / كتاب الزهد / حدیث: 4244]

یہی وہ حالت ہے جسے قرآنِ کریم نے **'رَانَ'** (زنگ) سے تعبیر کیا ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ "ہر گز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ چڑھ گیا ہے۔"(سورہ المطففین:14)

2. نفس کی اصلاح اور تزکیہ (کانٹا اکھاڑنا)

مولانا رومیؒ کے نزدیک "عاقل" وہ ہے جو اس کانٹے کو جڑ سے نکال دے۔ قرآن مجید میں اسے **'تزکیہ نفس'** کہا گیا ہے۔ اگر نفس کی برائیوں (کانٹوں) کو شروع میں نہ روکا جائے، تو وہ انسان کی فطرت بن جاتی ہیں۔

حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ الْحِمْصِيُّ ,حَدَّثَنَا بَقِيَّةُ بْنُ الْوَلِيدِ ,حَدَّثَنِي ابْنُ أَبِي مَرْيَمَ ,عَنْ ضَمْرَةَ بْنِ حَبِيبٍ ,عَنْ أَبِي يَعْلَى شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ ,,قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : " الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ ,وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ ,وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا ,ثُمَّ تَمَنَّى عَلَى اللَّهِ "

ابو یعلیٰ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” : عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے، اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے، اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشوں پر لگا دے، پھر اللہ تعالیٰ سے تمنائیں کرے۔(سنن ابن ماجہ / کتاب الزہد / حدیث:4260)

- **قرآنی اصول:** "کامیاب وہ ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔"(سورہ الشمس:9)
- کانٹا اکھاڑنے سے مراد یہاں **'توبہ نصوح'** (سچی توبہ) ہے، جو برائی کو جڑ سے ختم کر دیتی ہے۔

3. توبہ میں تاخیر اور 'تسویف' کی ممانعت

شعر میں یہ تنبیہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اصلاح مشکل ہو جاتی ہے۔ اسلام میں توبہ کو ٹالنے (Procrastination) کو **'تسویف'** کہا جاتا ہے، جس سے منع کیا گیا ہے۔

- جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی ہے، اس کی عادات (خواہ وہ اچھی ہوں یا بری) پختہ ہوتی جاتی ہیں۔ اگر بڑھاپے تک گناہوں کے کانٹے نہ نکالے جائیں، تو وہ اتنے گہرے ہو جاتے ہیں کہ انہیں نکالنا ایک مشکل ترین جہاد بن جاتا ہے۔

4. رہنمائی اور صحبتِ صالح (عاقل کی ضرورت)

شعر کا دوسرا مصرع **"عاقلی باید کہ خاری بر کند"** (ایک عقل مند چاہیے جو کانٹا نکالے) قرآن کے اس حکم کے مطابق ہے کہ اصلاح کے لیے ماہرینِ دین اور اللہ والوں کی صحبت اختیار کی جائے۔

- **ارشادِ باری تعالیٰ ہے:**
- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ(119)
- "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور **سچوں کے ساتھ** ہو جاؤ۔" (سورہ التوبہ:119)
- جس طرح پاؤں میں گہرا پیوست کانٹا نکالنے کے لیے کسی جراح (Surgeon) کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح دل میں جمی ہوئی پرانی برائیوں کو نکالنے کے لیے کسی **'مرشدِ کامل'** یا عقل مند استاد کی رہنمائی ضروری ہوتی ہے جو قرآن و سنت کے علم سے لیس ہو۔

خلاصہ

قرآن و سنت کی روشنی میں مولانا رومیؒ کا یہ شعر ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ:

1. **گناہ** کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہ کریں، کیونکہ یہ دل میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔
2. **اصلاح** میں دیر نہ کریں، کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ نفس کی سرکشی بڑھتی اور انسان کی ہمت کم ہوتی ہے۔
3. **صحبتِ صالحین** اختیار کریں تاکہ وہ دانائی (عقل) حاصل ہو سکے جس سے باطنی کانٹے نکالے جا سکیں۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر میں بیان کردہ حقیقت کو اگر ہم **جدید سائنس، طب (Medicine)** اور **نفسیات** کے ترازو میں تولیں، تو یہ بالکل ایک سائنسی فارمولے کی طرح درست ثابت ہوتی ہے۔

سائنس کی نظر میں اس شعر کی تشریح درج ذیل تین بڑے پہلوؤں سے کی جا سکتی ہے:

1. عصبیاتی نقطہ نگاہ (Neurobiology of Habits)

سائنس کہتی ہے کہ جب انسان کوئی کام بار بار کرتا ہے، تو دماغ میں اس کے لیے مخصوص راستے بن جاتے ہیں جنہیں **Neural Pathways** کہتے ہیں۔

- **برجهد و محکم تر زند:** جب آپ کسی بری عادت (مثلاً سستی، غصہ یا نشہ) کو بار بار دہراتے ہیں، تو دماغ کے خلیوں (Neurons) کے درمیان تعلق مضبوط ہو جاتا ہے۔ اسے سائنسی زبان میں **Long-Term Potentiation** کہتے ہیں۔ یعنی وہ "کانٹا" جتنا پرانا ہوتا جائے گا، دماغ کی وائرنگ اتنی ہی پختہ ہو جائے گی اور اسے بدلنا مشکل ہوتا جائے گا۔
- **عاقلی باید:** اس پختہ عادت کو ختم کرنے کے لیے محض خواہش کافی نہیں ہوتی، بلکہ شعوری محنت اور بسا اوقات کسی ماہرِ نفسیات (Therapist) کی ضرورت پڑتی ہے جو دماغ کو 'Re-wire' کرنے میں مدد دے سکے۔

2.طب اور پیتھالوجی (Medical Pathology)

طبی لحاظ سے یہ شعر **انفیکشن (Infection)** یا کینسر کی مثال پر پورا اترتا ہے۔

- **وقت کے ساتھ پھیلاؤ:** اگر جسم میں کوئی چھوٹا سا زخم ہو یا کوئی بیرونی ذرہ (جیسے لکڑی کا تنکا یا کانٹا) چبھ جائے اور اسے فوری نہ نکالا جائے، تو وہاں انفیکشن بڑھ جاتا ہے۔
- **گہرائی اور پیچیدگی:** بیکٹیریا اپنی تعداد بڑھاتے ہیں (برجهد) اور جسم کے گہرے ٹشوز تک پہنچ جاتے ہیں (محکم تر زند)۔ اگر اسے شروع میں نہ نکالا جائے تو یہ **Sepsis** یا پورے جسم میں زہر پھیلنے کا سبب بن سکتا ہے۔
- **ماہرِ جراحت (Surgeon):** اب ایک "عاقل" یعنی ماہر ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے جو سرجری کر کے اس زہریلے مادے کو جڑ سے نکالے۔

3. نفسیاتی اور حیاتیاتی وراثت (Psychology & Epigenetics)

نفسیاتی طور پر "کانٹا" وہ منفی خیالات یا صدمے (Traumas) ہیں جو بچپن میں ذہن میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

- **جڑوں کی مضبوطی:** جیسے جیسے انسان بڑا ہوتا ہے، وہ صدمے اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ سائنسی تحقیق (Epigenetics) بتاتی ہے کہ شدید ذہنی تناؤ انسان کے جینز (Genes) کے کام کرنے کے طریقے کو بھی بدل سکتا ہے، جو نسل در نسل منتقل ہو سکتا ہے۔

- **اصلاح کا عمل:** ان گہرے نفسیاتی کانٹوں کو نکالنے کے لیے Cognitive Behavioral Therapy (CBT) جیسے سائنسی طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں ایک "عاقل" معالج فرد کی سوچ کے انداز کو بدلنے میں مدد کرتا ہے۔

سائنسی خلاصہ

پہلو	کانٹا (خار)	مضبوط ہونا (محکم تر)	نکالنا (بر کَنَد)
اعصابی سائنس	بری عادت کا آغاز	مضبوط عصبی راستے (Neural Pathways)	ری وائرنگ / بیہیویئر تھراپی
طبی سائنس	جراثیم یا رسولی	انفیکشن کا پھیلاؤ (Metastasis)	سرجری یا علاج
نفسیات	منفی سوچ / صدمہ	شخصیت میں پختگی (Conditioning)	کونسلنگ اور شعوری تبدیلی

حاصلِ مطالعہ: سائنس یہ ثابت کرتی ہے کہ کسی بھی مسئلے (حیاتیاتی ہو یا نفسیاتی) کو اس کے آغاز میں حل کرنا آسان ہے، کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ جسم اور ذہن کے نظام (System) میں اتنا گہرا سرایت کر جاتا ہے کہ اسے نکالنے کے لیے غیر معمولی کوشش اور مہارت درکار ہوتی ہے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کی روحانی اور وجدانی تشریح مٹی اور پانی کی دنیا سے بلند ہو کر **'عالمِ لاہوت'** اور **'وارفتگیِ عشق'** کے دریچوں سے کی جاتی ہے۔ یہاں رومیؒ ایک جراح (Surgeon) بن کر روح کا آپریشن کر رہے ہیں۔

آیئے اس وجدانی سفر میں اترتے ہیں:

1. خار (کانٹا): انا اور خودی کا حجاب

روحانیت میں یہ کانٹا کوئی عام گناہ نہیں، بلکہ یہ **'انا (Ego)'** اور **'میں'** کی وہ چبھن ہے جو انسان کو اللہ سے جدا رکھتی ہے۔ جب انسان کہتا ہے کہ "میں ہوں"، تو وہ حق کے باغ میں ایک کانٹا بو دیتا ہے۔

- **وجدان:** رومیؒ فرما رہے ہیں کہ اے مسافر! یہ جو تیری 'خودی' ہے، یہ وقت کے ساتھ تیری روح کے ریشوں میں اس طرح پیوست ہو رہی ہے کہ اب یہ تجھے محسوس بھی نہیں ہوتی، مگر یہ تجھے اڑنے سے روک رہی ہے۔ یہ کانٹا تیری شہ رگ کے پاس جڑیں جما چکا ہے۔

.2برجہد اور محکم تر: غفلت کی جڑیں

جیسے جیسے تیری عمر دنیا کی محبت میں گزر رہی ہے، یہ کانٹا تیری روح کے لہو سے سیراب ہو کر ایک تناور درخت بن رہا ہے۔

- **کیفیت :** غفلت کی نیند میں یہ کانٹا اور گہرا اترتا ہے۔ جتنا تو اس دنیا کے رنگ و بو میں مگن ہوتا ہے، تیرا باطنی زخم اتنا ہی لاعلاج ہوتا جاتا ہے۔ رومیؒ پکار رہے ہیں: "ہوشیار! تیرا دشمن (تیرا نفس) تیری ہی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر تیرے اندر اپنا قلعہ مضبوط کر رہا ہے۔"

.3عاقلی باید: عشقِ کامل کی دستِ مسیحائی

یہاں 'عاقل' سے مراد وہ دنیادار عقل نہیں جو نفع نقصان سوچتی ہے، بلکہ یہاں مراد **'عقلِ کُل'** یا **'پیرِ مغاں'** ہے جس کے پاس عشق کا نشتر ہے۔

- **وجدانی نکتہ :** تیرا اپنا ہاتھ اس کانٹے تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ تیرا ہاتھ خود اس انا کی گرفت میں ہے۔ تجھے ایک ایسے "دیوانے عاقل" کی ضرورت ہے جو تیرے وجود کی دھجیاں اڑا دے تاکہ تو دوبارہ جڑ سکے۔

.4برکَنَد: فنا سے بقا کا رقص

کانٹا نکالنے کا عمل تکلیف دہ ہے۔ جب مرشد یا عشقِ الٰہی اس کانٹے کو کھینچتا ہے، تو انسان تڑپ اٹھتا ہے۔ لیکن اس تڑپ میں ایک لذت ہے۔

- **روحانی مدہوشی :** جب وہ کانٹا (انا) نکلتا ہے، تو روح کے اس سوراخ سے تجلیاتِ الٰہیہ اندر داخل ہوتی ہیں۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ جب تک تو ٹوٹے گا نہیں، تب تک تو ہیرے کی طرح چمکے گا نہیں۔ یہ کانٹا نکلنا دراصل **'فنا'** ہے، اور اس کے بعد جو ہریالی آتی ہے وہ **'بقا'** ہے۔

حاصلِ وجدان (ایک پکار)

اے پڑھنے والے! تصور کر کہ تیرے دل کے نہاں خانے میں ایک قدیم خارِ تمنا چھپا ہوا ہے۔ تو اسے چھپائے بیٹھا ہے، مگر وہ تیری روح کو لہولہان کر رہا ہے۔ رومیؒ تجھ سے کہہ رہے ہیں:

"کب تک اس کانٹے کو پالے گا؟ آ! کسی صاحبِ نظر کے قدموں میں گر جا، کہ اس کی ایک نگاہِ کیمیا تیرے اس خارِ ہستی کو گلزارِ معرفت میں بدل دے۔ جب یہ کانٹا نکلے گا، تو تجھے پتہ چلے گا کہ تو قید میں نہیں تھا، بلکہ تو خود اپنی قید بنا ہوا تھا۔"

مولانا رومیؒ کی شاعری محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ **'کلام عارفانہ'** ہے جہاں فن اور فکر اس طرح یکجا ہوتے ہیں کہ قاری پر ایک سحر طاری ہو جاتا ہے۔ اس شعر کی شعری اور ادبی خوبیاں درج ذیل ہیں:

1. **تمثیل نگاری** (Symbolism and Allegory)

اس شعر کی سب سے بڑی خوبی اس کا **استعاراتی پیرایہ** ہے۔ رومیؒ نے ایک مادی مثال (کانٹا اور جھاڑی) کے ذریعے ایک نہایت پیچیدہ نفسیاتی اور روحانی حقیقت (گناہ اور عادتِ بد) کو واضح کیا ہے۔

- **خار (کانٹا):** یہ برائی، انا، یا کسی ایسی عادت کا استعارہ ہے جو ابتدا میں معمولی لگتی ہے مگر بعد میں وبال بن جاتی ہے۔
- **عاقل:** یہ شعور، مرشدِ کامل یا عقلِ سلیم کی علامت ہے۔

2. **ایجاز و اختصار** (Brevity and Conciseness)

رومیؒ نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ "برجہد" (اچھل کر نکلنا) اور "محکم تر زند" (مضبوطی سے جڑ پکڑنا) کے تین چار الفاظ میں انسانی نفسیات کا پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے کہ کس طرح ایک چھوٹی سی کوتاہی وقت کے ساتھ ایک طاقتور جبلت بن جاتی ہے۔

3. **صوتی آہنگ اور لفظی تناسب** (Phonetics and Diction)

شعر کے الفاظ میں ایک خاص قسم کی **'سختی'** اور **'کاٹ'** محسوس ہوتی ہے جو موضوع (کانٹے) کے عین مطابق ہے:

- لفظ **'خار'**، **'محکم'** اور **'برکند'** میں حروفِ حلق (خ، ح، ک) کا استعمال ایک ایسی آواز پیدا کرتا ہے جو کانٹے کے چبھنے اور اسے کھینچنے کی مشقت کا احساس دلاتی ہے۔
- فارسی زبان کی سلاست اس شعر کو زباں زدِ عام بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

4. **حرکت اور حرکیات** (Dynamic Imagery)

اس شعر میں جمود (Stagnation) نہیں بلکہ **حرکت (Movement)** ہے:

- پہلے مصرعے میں کانٹے کا '**بڑھنا**' اور '**گہرائی میں جانا**' ایک مسلسل عمل (Process) کو ظاہر کرتا ہے۔
- دوسرے مصرعے میں '**اکھاڑنا**' ایک عملی قدم (Action) کی دعوت دیتا ہے۔ یہ شعر قاری کو محض سوچنے پر نہیں چھوڑتا بلکہ اسے عمل پر اکساتا ہے۔

5. صنعتِ تضاد اور تقابل (Contrast)

شعر میں ایک خوبصورت تضاد پایا جاتا ہے:

- ایک طرف **کانٹے کی خودکار نشوونما** ہے (جو خود بخود ہو رہی ہے)۔
- دوسری طرف **ارادی کوشش** (عاقل کا اسے اکھاڑنا) ہے۔ یہ تضاد انسانی زندگی کی کشمکش (نفس بمقابلہ عقل) کو بہترین طریقے سے واضح کرتا ہے۔

6. حکیمانہ اسلوب (Didactic Style)

یہ شعر '**سہلِ ممتنع**' کی بہترین مثال ہے۔ یعنی دیکھنے میں نہایت سادہ مگر اپنے اندر معانی کی گہرائی لیے ہوئے ہے۔ رومیؒ کا یہ اسلوب تعلیم و تربیت کے لیے بہترین مانا جاتا ہے کیونکہ یہ سیدھا دل پر اثر کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ: فنّی اعتبار سے یہ شعر فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے، جہاں رومیؒ نے فطرت کے مناظر (کانٹا اکھاڑنا) کو انسانی روح کے جراح (Surgeon) کے طور پر استعمال کیا ہے۔

خَر زِ بَہرِ دَفعِ خار از سوز و درد

جُفتہ می انداخت، صد جاز خم کرد

مشکل الفاظ کے معنی

خَر: گدھا۔۔۔ **زِ بَہرِ**: کے لیے، کی خاطر۔۔۔ **دَفعِ**: دور کرنا۔۔۔ **خار**: کانٹا۔۔۔ **سوز**: جلن، تکلیف۔۔۔ **دَرد**: درد

جُفتہ: زور سے، شدت سے، بے قابو ہو کر (کبھی زمین پر لوٹنے کے معنی میں بھی آتا ہے)

می انداخت: پھینکتا تھا، گراتا تھا، پٹختا تھا۔۔۔ **صَد**: سو۔۔۔ **جا**: جگہ۔۔۔ **زَخم**: زخم۔۔۔ **کرد**: کیا، لگا دیا

"گدھا کانٹے کی جلن اور درد کو دور کرنے کے لیے زور زور سے (زمین پر) لوٹنے لگا، (مگر اس طرح) اس نے سو جگہ اپنے جسم کو زخمی کر لیا۔"

یعنی گدھا کانٹے کے درد سے بچنے کے لیے بے قابو ہو کر زمین پر لوٹنے لگا، لیکن اس نادانی میں اس نے اپنی تکلیف کم کرنے کے بجائے جگہ جگہ زخم لگا لیے

اس شعر میں مولانا روم ایک بہت گہری نفسیاتی اور روحانی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں:

1۔ نادانی اور غلط حکمتِ عملی

گدھا جب محسوس کرتا ہے کہ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہے، تو وہ اسے نکالنے کے لیے کسی ماہر کی مدد لینے یا تحمل سے کام لینے کے بجائے اندھا دھند دولتی مارنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کانٹا تو نہیں نکلتا، بلکہ وہ جھٹکے مار مار کر اپنے ہی جسم کو مزید لہو لہان کر لیتا ہے۔ یہ اس شخص کی مثال ہے جو کسی مصیبت میں مبتلا ہو کر صبر اور عقل کے بجائے جذبات اور غصے سے کام لیتا ہے، جس سے اس کی مشکل کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہے۔

2۔ نفسِ امارہ کی مثال

: تصوف کی رو سے 'خر' (گدھا) انسان کے بے لگام نفس کی علامت ہے۔ جب انسان گناہوں یا دنیاوی خواہشات کے 'کانٹے' میں الجھ جاتا ہے، تو وہ ان سے چھٹکارا پانے کے لیے غلط طریقے (جیسے مزید گناہ یا دنیاداری) اختیار کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنا علاج کر رہا ہے، لیکن در حقیقت وہ اپنے روحانی وجود کو مزید زخمی کر رہا ہوتا ہے۔

یہ شعر **انسانی نادانی اور غلط طریقۂ علاج** کی بہترین تمثیل ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ:

- بعض اوقات انسان کو دل، عقل یا کردار میں کوئی کانٹا (گناہ، غلط عادت، حسد، کینہ، جہالت) چبھ جاتا ہے۔
- اس کانٹے کو **صبر، حکمت اور درست رہنمائی** سے نکالنے کے بجائے

وہ جذبات، غصے اور ناسمجھی میں ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جو اس کی تکلیف کم نہیں بلکہ **مزید بڑھا دیتے ہیں۔**

- جیسے گدھا کانٹا نکالنے کے بجائے لوٹ پوٹ کر کے مزید زخم لگا لیتا ہے،

ویسے ہی انسان غلط فیصلوں، جلد بازی، یا دنیاوی سہاروں سے مسئلہ حل کرنا چاہتا ہے اور خود کو زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔

اخلاقی و روحانی سبق

- ہر درد کا علاج **حکمت** سے ہوتا ہے، **بے صبری** سے نہیں۔
- اندرونی بیماری (دل کا کانٹا) کا علاج

  توبہ، علم، اہلِ بصیرت کی صحبت، صبر و دعا سے ہوتا ہے۔
- غلط طریقہ اختیار کرنا مسئلے کو حل نہیں بلکہ **زخموں کی تعداد بڑھا دیتا ہے۔**

حاصلِ کلام : یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ مشکل وقت میں **حکمت اور دانائی** کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ غلط طریقے سے نکالا گیا کانٹا مزید گہرا زخم دے جاتا ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس صورتحال (نادانی میں خود کو زخمی کرنا) کے حوالے سے درج ذیل رہنمائی ملتی ہے:

1. جلد بازی سے ممانعت (عجلت پسندی)

شعر میں گدھے کی دولتی مارنا جلد بازی اور بے صبری کی علامت ہے۔ قرآن و سنت میں جلد بازی کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے:

- **قرآن کریم** " :انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے" (الانبیاء:37)۔ یہ آیت انسان کی اس فطرت کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ تکلیف میں فوراً بے چین ہو جاتا ہے۔
- **حدیثِ نبوی ﷺ** " :بردباری اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے" (ترمذی)۔ جس طرح گدھے نے جلد بازی میں خود کو زخمی کیا، اسی طرح انسان جب کسی مشکل میں جلد بازی کرتا ہے تو وہ اپنا نقصان کر بیٹھتا ہے۔

2. صبر اور استقامت (صبر)

کانٹے کی تکلیف پر تڑپنے کے بجائے صبر سے کام لینا مطلوب تھا۔

- **ارشادِ باری تعالیٰ ہے** " :اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد چاہو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے "(البقرہ:153)۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ جب کوئی کانٹا(تکلیف)چبھے تو اسے نکالنے کے لیے "واویلا" کرنے کے بجائے استقامت دکھائی جائے تاکہ اللہ کی مدد شاملِ حال ہو۔

.3 دانائی اور حکمت (الحکمۃ)

گدھے کا رویہ "جہالت" پر مبنی تھا، جبکہ مومن کو "حکمت" کا حکم دیا گیا ہے۔

- **قرآن کریم** " :اور جسے حکمت دی گئی، اسے بہت بڑی خیر (بھلائی) عطا کی گئی "(البقرہ:269)۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر پاؤں میں کانٹا چبھا ہے تو اسے نکالنے کے لیے کسی ماہر (طبیب یا عقل مند دوست) سے رجوع کیا جائے، نہ کہ الٹی سیدھی حرکتیں کر کے زخم کو گہرا کیا جائے۔

.4 خود کو ہلاکت میں ڈالنے سے ممانعت

شعر کے دوسرے مصرعے میں گدھے نے "صد جا زخم" (سو جگہ زخم) لگائے۔ اسلام اپنی جان کو جان بوجھ کر یا نادانی میں خطرے میں ڈالنے سے روکتا ہے:

- **ارشادِ باری تعالیٰ ہے** " :اور اپنے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو "(البقرہ:195)۔ غصے یا جذبات میں آکر ایسے فیصلے کرنا جو انسان کی اپنی صحت، مال یا عزت کے لیے نقصان دہ ہوں، اس آیت کی رو سے غلط ہیں۔

حاصلِ بحث

مولانا روم کا یہ شعر دراصل اس قرآنی فلسفے کی ترجمانی ہے کہ **"مصیبت پر بے صبری، خود مصیبت سے بڑی مصیبت ہے"**۔
قرآن و سنت کی تعلیم یہ ہے کہ جب زندگی میں کوئی "خار" (مشکل) چبھے تو:

1. **صبر** سے کام لیں۔
2. **حکمت** اور سوچ بچار سے حل نکالیں۔
3. **اہلِ علم** یا تجربہ کار لوگوں سے مشورہ کریں۔
4. **جذبات** میں آکر اپنی مشکلات میں اضافہ نہ کریں۔

مولانا روم کا یہ شعر محض ایک اخلاقی سبق نہیں، بلکہ یہ انسانی جبلت (Instinct) ، اعصابی نظام اور حیاتیاتی ردِ عمل کی ایک بہترین تمثیل ہے۔ جب ہم اسے جدید علوم کے آئینے میں دیکھتے ہیں، تو بہت سے دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں:

1. نفسیاتی نقطہ نگاہ (Psychological Perspective)

نفسیات میں اس عمل کو "**ایمیگڈالا ہائی جیک (Amygdala Hijack)** " یا جذباتی مغلوبیت کہا جاتا ہے۔

- **ردِ عمل بمقابلہ جواب :(Reaction vs Response)** جب گدھے کو کانٹا چبھا، تو اس کے دماغ کے جذباتی حصے (Amygdala) نے خطرے کا سگنل دیا۔ اس نے سوچنے سمجھنے والے حصے (Prefrontal Cortex) کو بائی پاس کر دیا اور فوری طور پر "Fight or Flight" (لڑو یا بھاگو) کی کیفیت طاری کر دی۔
- **تکلیف میں نادانی :** نفسیات کہتی ہے کہ جب انسان شدید تناؤ یا جسمانی تکلیف میں ہوتا ہے، تو اس کی منطقی سوچ (Logical Thinking) مفلوج ہو جاتی ہے۔ وہ مسئلے کا حل نکالنے کے بجائے ایسی حرکتیں کرتا ہے جو تکلیف کو مزید بڑھا دیتی ہیں (جیسے غصے میں دیوار پر ہاتھ مارنا)۔
- **:Maladaptive Coping** اسے "غلط طریقہِ مدافعت" کہتے ہیں، جہاں فرد عارضی سکون یا حل کے لیے وہ راستہ اپناتا ہے جو طویل مدت میں نقصان دہ ہوتا ہے۔

2. طبی نقطہ نگاہ (Medical Perspective)

طبی لحاظ سے گدھے کا یہ فعل "**اضطراری عمل (Reflex Action)** " اور درد کے چکر کی عکاسی کرتا ہے۔

- **درد اور اینٹھن کا چکر :(Pain-Spasm-Pain Cycle)** جب جسم کو تکلیف پہنچتی ہے، تو پٹھے خود بخود سکڑتے ہیں۔ گدھے نے درد کی وجہ سے جو دولتی ماری، وہ ایک بے اختیار مسل ریفلیکس تھا (Muscle Reflex) ۔ لیکن طبی طور پر اگر ایسے میں جسم کو پر سکون نہ چھوڑا جائے، تو پٹھوں کا کھچاؤ مزید چوٹوں اور اندرونی خون بہنے (Internal Hemorrhage) کا سبب بنتا ہے۔
- **ثانوی چوٹ :(Secondary Injury)** طب میں اسے "Secondary Trauma" کہتے ہیں۔ اصل مسئلہ (کانٹا) اتنا بڑا نہیں تھا جتنا بڑا نقصان اس نے خود کو مار مار کر پہنچا لیا۔ اکثر مریض گھبراہٹ (Panic) میں آکر اپنے زخم کو کھرچ کر یا غلط طریقے سے چھیڑ کر اسے ناسور بنا لیتے ہیں۔

3. سائنسی اور منطقی نقطہ نگاہ (Scientific/Logical Perspective)

سائنس "توانائی کے ضیاع" اور "سسٹم کے توازن (Homeostasis)" کی بات کرتی ہے۔

- **توانائی کا غلط استعمال:** فزکس کے لحاظ سے، گدھے نے اپنی توانائی (Kinetic Energy) کو ایک غیر منظم طریقے سے استعمال کیا۔ اگر وہ یہی توانائی ایک جگہ کھڑے رہ کر پاؤں کو ساکن رکھنے میں صرف کرتا، تو وہ بچ جاتا۔ بے ترتیب حرکت (Chaos) ہمیشہ نظام میں بگاڑ پیدا کرتی ہے۔
- **فیڈبیک لوپ (Negative Feedback Loop):** سائنسی نظام میں جب ایک خرابی آئے، تو اسے درست کرنے کے لیے الٹ اثر (Counter-action) کی ضرورت ہوتی ہے۔ گدھے نے "مثبت فیڈبیک" دیا، یعنی درد کے جواب میں مزید درد پیدا کرنے والی حرکت کی، جس سے سسٹم (جسم) تباہی کی طرف چلا گیا۔

خلاصہ مولانا روم ہمیں یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ "صبر " محض ایک مذہبی اصطلاح نہیں، بلکہ ایک اعصابی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے مسائل کو حکمت سے حل کر سکیں نہ کہ خود کو مزید الجھائیں۔

صوفیاء اور عرفاء کے نزدیک اس شعر کی گہرائی درج ذیل نکات میں پوشیدہ ہے:

1. نفسِ امارہ اور گدھے کی تمثیل

عرفانِ تصوف میں "گدھا" (خر) **نفسِ امارہ** کی علامت ہے۔ نفس کی فطرت حیوانی ہے، جو صرف فوری لذت اور فوری سکون (Instinctive relief) کو پہچانتا ہے۔

- **کانٹا (خار):** یہ دنیاوی خواہشات، گناہ، یا وہ باطنی بے چینی ہے جو روح کو تڑپاتی ہے۔
- **دولتی مارنا:** جب انسان کا نفس کسی مصیبت یا گناہ کی لذت کے بعد پیدا ہونے والی خلش میں مبتلا ہوتا ہے، تو وہ اسے مٹانے کے لیے مزید مادی سہارے ڈھونڈتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاید مزید گناہ یا مادی دوڑ اسے سکون دے گی، لیکن

یہ ایسا ہی ہے جیسے کانٹا نکالنے کے لیے پاؤں پٹخنا، جس سے کانٹا مزید اندر دھنس جاتا ہے اور روح مزید زخمی ہو جاتی ہے۔

2. تدبیرِ جاہلانہ بمقابلہ تسلیم و رضا (وجدانی پہلو)

وجدانی طور پر یہ شعر ہمیں **"خودی "** کے غلط استعمال سے ڈراتا ہے۔

- انسان جب اپنی عقلِ جزوی (Limited Intellect) کے بل بوتے پر باطنی الجھنیں سلجھانا چاہتا ہے، تو وہ "خودی" کے تکبر میں مبتلا ہو کر اللہ کی مشیت سے لڑنے لگتا ہے۔
- وجدانی کیفیت یہ ہے کہ جب "خار" چبھے، تو تڑپنے اور ہاتھ پاؤں مارنے کے بجائے **"ساکن "** ہو جائے اور اس ذات کی طرف رجوع کرے جس نے یہ درد عطا کیا ہے۔ عارِف جانتے ہیں کہ درد کا علاج درد دینے والے کے پاس ہے، نہ کہ اندھی تدبیروں میں۔

3. پیرِ کامل کی ضرورت (عرفانی نکتہ)

مولانا روم اس تمثیل سے یہ نکتہ نکالتے ہیں کہ " **: پاؤں کا کانٹا نکالنے کے لیے ہاتھ اور آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے، پاؤں کی اپنی حرکت کی نہیں "۔**

- روحانی دنیا میں "ہاتھ اور آنکھ" سے مراد **مرشدِ کامل** یا **عقلِ کلی** ہے۔
- انسان جب تک خود گدھے کی طرح دولتی مارتا رہے گا، وہ اپنے زخموں میں اضافہ کرے گا۔ عرفان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو کسی صاحبِ نظر کے حوالے کر دے، جو اپنی بصیرت کے "چمٹے" سے وہ کانٹا نکال دے جو انسان کو برسوں سے تڑپا رہا ہے۔

4. باطنی جراحت (Spiritual Surgery)

اس شعر کی ایک وجدانی تفسیر یہ بھی ہے کہ اللہ کبھی کبھی انسان کو "درد" (کانٹا) اس لیے چبھوتا ہے تاکہ وہ بے قرار ہو کر اس کی طرف پلٹے۔

- لیکن نادان انسان اس درد کو "دشمن" سمجھ کر اس سے چھٹکارا پانے کے لیے غلط طریقے (جُفتہ زنی) اختیار کرتا ہے۔
- **صد جا زخم :** یہ وہ گناہ اور نفسیاتی گرہیں ہیں جو انسان اپنی نادانی میں اپنے گرد بن لیتا ہے۔ وہ ایک الجھن سلجھانے نکلتا ہے اور سو نئی الجھنیں (Complexities) پال لیتا ہے۔

خلاصہِ عرفانی

یہ شعر پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ:

"اے انسان! اپنی مصلحتوں اور تدبیروں کے جال سے باہر نکل۔ تیرا نفس تجھے کبھی صحیح راستہ نہیں دکھائے گا۔ اگر روح میں کانٹا چبھا ہے، تو تڑپنا چھوڑ اور **'تسلیم'** کی لذت چکھ، تاکہ کوئی صاحبِ بصیرت تیرا علاج کر سکے۔"

مولانا روم کے اس شعر کی **روحانی تعبیر** (Spiritual Interpretation) بہت عمیق اور بصیرت افروز ہے۔ روحانیت کی دنیا میں یہ شعر "انسانی روح" اور اس کی "باطنی کشمکش" کی کہانی بیان کرتا ہے۔

اس کی روحانی تعبیر کے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

.1 نفسِ امارہ کی بیچارگی

روحانیت میں "گدھا" اس نفس کی علامت ہے جو ابھی تربیت یافتہ نہیں ہے۔

- **تعبیر :** جب انسان کی روح پر کوئی بوجھ پڑتا ہے یا اسے کوئی باطنی تکلیف (مثلاً گناہ کا احساس، جدائی کا دکھ، یا دنیاوی پریشانی) پہنچتی ہے، تو وہ اسے دور کرنے کے لیے اپنے "نفس" کے بتائے ہوئے طریقے استعمال کرتا ہے۔
- **نتیجہ :** چونکہ نفس کے پاس صرف مادی اور حیوانی طریقے ہیں، اس لیے وہ جتنا ہاتھ پاؤں مارتا ہے، روح اتنی ہی زخمی ہوتی چلی جاتی ہے۔

.2 دردِ دل اور غلط تڑپ

روحانیت میں "کانٹا" اللہ کی طرف سے ایک **"بیداری کا پیغام "** بھی ہو سکتا ہے۔

- **تعبیر :** کبھی کبھی اللہ انسان کو ایک چھوٹی سی تکلیف (کانٹا) دیتا ہے تاکہ وہ متوجہ ہو، لیکن نادان انسان اس تکلیف کا مقصد سمجھنے کے بجائے اسے مٹانے کے لیے بے صبری دکھاتا ہے۔

- **روحانی نکتہ :** وہ درد جو آپ کو اللہ کے قریب کر سکتا تھا، آپ کی اپنی نادانی (دولتی مارنے) کی وجہ سے آپ کے لیے سو نئے "زخموں" (مزید پریشانیوں اور دوری) کا باعث بن جاتا ہے۔

.3 تدبیرِ نفس بمقابلہ تقدیرِ الٰہی

یہ شعر **"تسلیم و رضا "** کے مقام کی وضاحت کرتا ہے۔

- **تعبیر :** جب کوئی روحانی مشکل آئے، تو وہاں "اپنی مرضی (Jufta/Kicking) " چلانا ہلاکت ہے۔ روحانی سفر میں جب تک بندہ یہ سمجھتا رہتا ہے کہ "میں خود ہی اس مسئلے کو حل کر لوں گا"، وہ اپنی مشکلات میں اضافہ کرتا ہے۔
- **روحانی حل :** روحانیت کہتی ہے کہ جب کانٹا چبھے تو **ساکن** ہو جاؤ۔ اپنی تدبیر کو اللہ کی تقدیر میں فنا کر دو۔ جتنا تم "میں میں" کرو گے، اتنے ہی نئے زخم لگاؤ گے۔

.4 مرشد کی ضرورت کا روحانی استعارہ

اس تمثیل کی سب سے بڑی روحانی تعبیر یہ ہے کہ:

"پاؤں کا کانٹا نکالنے کے لیے سر کو جھکانا پڑتا ہے۔"

اگر گدھا جھک کر اپنے دانتوں سے یا کسی دوسرے کی مدد سے کانٹا نکالتا تو بچ جاتا۔ لیکن اس نے "تکبر" اور "طاقت" (دولتی) کا استعمال کیا۔

- **تعبیر :** روح کا کانٹا کبھی بھی روح خود نہیں نکال سکتی۔ اس کے لیے اسے ایک **"طبیبِ روحانی"(مرشدِ کامل)** کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی رہبر کے بغیر اپنی باطنی اصلاح کر لے گا، وہ اسی گدھے کی طرح خود کو لہولہان کر لیتا ہے۔

خلاصہِ روحانی

علامت	روحانی حقیقت
گدھا	انسانی نفس جو عشقِ الٰہی سے خالی ہے۔

کانٹا وہ ابتلا یا آزمائش جو روح کو جھنجھوڑنے آتی ہے۔

دولتی مارنا اللہ کی رضا پر اعتراض اور اپنی ناقص عقل سے حل ڈھونڈنا۔

سوزخم اللہ سے دوری، بے سکونی اور مزید گناہوں کی دلدل۔

حاصلِ کلام:

یہ شعر ہمیں **"فنا "** اور **"عاجزی "** کا درس دیتا ہے۔ روحانیت میں خاموشی اور صبر وہ مرہم ہیں جو کانٹے کے زہر کو بھی امرت بنا دیتے ہیں، جبکہ بے صبری اور اپنی طاقت پر بھروسہ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔

آن حکیمِ خار چین اُستاد بود

دست می زَد جا بہ جا، می آزُمود

مشکل الفاظ کے معنی

حکیم: دانا، طبیب، عقل و دانائی والا۔۔۔خار چین: کانٹا نکالنے والا، وہ شخص جو زخم سے کانٹا نکالتا ہو

اُستاد: ماہر، کامل فنکار، استاد۔۔۔دست می زَد: ہاتھ لگاتا، ہاتھ سے کام کرتا۔۔۔جا بہ جا: جگہ جگہ، مختلف مقامات پر

می آزُمود: آزماتا، جانچتا، پرکھتا

وہ "کانٹے چننے والا" (بیماری کی جڑ پکڑنے والا) طبیب بڑا ہی ماہر تھا۔ وہ مہارت کے ساتھ جگہ جگہ (نبض پر) ہاتھ رکھ کر دیکھ رہا تھا۔

یعنی وہ کانٹا نکالنے والا حکیم ایک ماہر استاد تھا، وہ ہاتھ لگا کر جگہ جگہ آزما کر دیکھتا تھا۔

اس شعر میں مولانا روم ایک سچے روحانی معالج اور ایک عام معالج کے درمیان فرق کو واضح کر رہے ہیں۔ اس قصے میں جب ظاہری طبیب لڑکی کا علاج کرنے میں ناکام ہو گئے، تو اللہ کی طرف سے ایک الٰہی طبیب آیا۔

۱۔ بصیرت اور مہارت (حکیمِ خار چین)

مولانا نے طبیب کو **"خار چین "**(کانٹے چننے والا) کہا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جسمانی امراض کے بجائے روح میں چبھے ہوئے ان باریک کانٹوں (نفسیاتی اور روحانی الجھنوں) کو دیکھ رہا تھا جو عام آنکھ کو نظر نہیں آتے۔ وہ جانتا تھا کہ بیماری جسم میں نہیں، بلکہ دل کے کسی معاملے میں چھپی ہے۔

۲۔ تشخیص کا انداز (چدست می زَد) : وہ طبیب محض رسمی طور پر نبض نہیں دیکھ رہا تھا، بلکہ وہ لڑکی سے مختلف شہروں، لوگوں اور مقامات کے نام پوچھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کی نبض کی رفتار چیک کر رہا تھا۔ جہاں لڑکی کا دل دھڑکتا، طبیب سمجھ جاتا کہ "کانٹا" وہیں چبھا ہوا ہے۔

۳۔ گہرا پیغام : اس شعر کا پیغام یہ ہے کہ انسانی مسائل کا حل اکثر سطح پر نہیں ہوتا۔ جس طرح ایک ماہر استاد نبض کی حرکت سے دل کے راز پا لیتا ہے، اسی طرح ایک **مرشدِ کامل** یا سچا ہمدرد انسان کی باتوں اور رویوں کے پیچھے چھپے ہوئے اصل دکھ (کانٹے) کو پہچان لیتا ہے۔ یہ شعر ہمیں ظاہری علاج کے بجائے "اصلِ سبب" تک پہنچنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اگر ہم قرآن و سنت کی روشنی میں اس حکیم (روحانی معالج) کے عمل اور اس کی مہارت کا جائزہ لیں، تو ہمیں کئی اہم پہلو ملتے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں:

۱ . علم اور مہارت کی اہمیت (استادی)

شعر میں حکیم کو "اُستاد" کہا گیا ہے۔ اسلام میں کسی بھی کام کو مہارت اور علم کے ساتھ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

- **سنتِ نبوی ﷺ :** آپ ﷺ نے فرمایا:
- حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى حَدَّثَنَا أَبُو أَحْمَدَ الزُّبَيْرِيُّ حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ سَعِيدِ بْنِ أَبِي حُسَيْنٍ قَالَ: حَدَّثَنِي عَطَاءُ بْنُ أَبِي رَبَاحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَا أَنْزَلَ اللَّهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً»
- ہم سے محمد بن مثنیٰ نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہم سے ابواحمد زبیری نے بیان کیا، ان سے عمر بن سعید بن ابی حسین نے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ مجھ سے عطاء بن ابی رباح نے بیان کیا اور ان سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری نہیں اتاری جس کی دوا بھی نازل نہ کی ہو۔ [صحیح البخاري / كتاب الطب / حدیث:5678]

- **اصول:** ماہر طبیب یا ماہرِ فن سے رجوع کرنا عین سنت ہے۔ قرآن کہتا ہے "*فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ*" (اگر تم نہیں جانتے تو اہل سے پوچھو)۔ حکیم کا اپنی فن میں ماہر ہونا قرآن و سنت کے اس حکم کی تعمیل ہے کہ کام اس کے اہل کے سپرد کیا جائے۔

۲. فراستِ مؤمن (بصیرت)

حکیم کا نبض کے ذریعے دل کا حال جان لینا دراصل **"فراست"** ہے۔

- **حدیثِ مبارکہ:** نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "**اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ**" (مؤمن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے)۔ (ترمذی)
- وہ حکیم اللہ کا فرستادہ (ولی) تھا، اور اولیاء اللہ کی بصیرت قرآن و سنت سے ثابت ہے کہ وہ ظاہری علامتوں سے باطنی بیماریوں کا سراغ لگا لیتے ہیں۔

۳. باطنی امراض کا علاج (تزکیہ نفس)

مثنوی کے اس قصے میں لڑکی کی بیماری ظاہری نہیں بلکہ باطنی (نفسیاتی / عشق) تھی۔

- **قرآنی تصور:** قرآن کریم نے دل کی بیماریوں کا ذکر کیا ہے) **فی قلوبهم مرض**(۔ جس طرح جسمانی طبیب جسم کا علاج کرتا ہے، روحانی طبیب (مرشد) دل کے کانٹے نکالتا ہے۔ یہ عمل **تزکیہ نفس** کہلاتا ہے، جس کا حکم قرآن میں جابجا موجود ہے۔

۴. سبب اور مسبب (حکمت)

حکیم نے براہِ راست معجزے کا انتظار نہیں کیا بلکہ "خار چین" (کانٹے چننے والے) کی طرح محنت کی، نبض دیکھی اور سبب (Cause) تلاش کیا۔

- **اسلامی موقف:** اسلام "اسباب" کو اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو بھی حکم ہوا تھا کہ سمندر پر لاٹھی ماریں یا درخت کو ہلائیں۔ حکیم کا "آزمودن" (ٹیسٹ کرنا) اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام عقل اور تدبیر کو استعمال کرنے سے نہیں روکتا۔

خلاصہ

مولانا روم کا یہ حکیم دراصل ایک **مرشدِ کامل** کی علامت ہے جو انسان کے نفس میں چھپی ہوئی خواہشات اور بیماریوں کو اپنی روحانی بصیرت سے پہچان لیتا ہے۔ یہ عمل قرآن و سنت کے **تزکیہ، بصیرت اور طلبِ علم** کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔

شریعت میں اس بات کی ممانعت نہیں کہ ایک ماہر طبیب مریض کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اس سے گفتگو کرے یا اس کی نبض سے اس کے جذبات کا اندازہ لگائے، بشرطیکہ مقصد علاج اور خیر خواہی ہو۔

طبی اور سائنسی نقطہ نظر سے مولانا روم کا یہ بیان کردہ منظر نہایت دلچسپ ہے، کیونکہ یہ **سائیکو فزیالوجی** (Psychophysiology) اور **بایو فیڈ بیک** (Biofeedback) کے ان ابتدائی تصورات کی عکاسی کرتا ہے جنہیں آج کی جدید سائنس تسلیم کرتی ہے۔

سائنسی لحاظ سے ہم اسے درج ذیل تین اہم نکات میں سمجھ سکتے ہیں:

۱. خود مختار اعصابی نظام (Autonomic Nervous System)

سائنس کہتی ہے کہ جب انسان کسی جذباتی کیفیت (خوف، محبت، غصہ یا تناؤ) سے گزرتا ہے، تو اس کا **خود مختار اعصابی نظام** متحرک ہو جاتا ہے۔

- **نبض کی رفتار:** جیسے ہی اس مریضہ کے سامنے اس کے محبوب یا اس کے شہر کا ذکر آتا، اس کے دماغ میں "لیمبک سسٹم (Limbic System) "متحرک ہوتا جو دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار کو تیز کر دیتا۔
- حکیم کا نبض پر ہاتھ رکھنا دراصل اس **جذباتی رد عمل** (Emotional Response) کو نوٹ کرنا تھا جسے مریضہ زبان سے چھپا رہی تھی۔

۲. لفظی تلازمہ کا ٹیسٹ (Word Association Test)

جدید نفسیات میں کارل جنگ (Carl Jung) نے "ورڈ ایسوسی ایشن" کا طریقہ متعارف کروایا، لیکن مولانا روم نے صدیوں پہلے بتا دیا کہ کیسے ایک ماہر طبیب مختلف مقامات اور ناموں کا ذکر کر کے مریض کے لاشعور تک پہنچتا ہے۔

- حکیم جا بجا (مختلف ناموں پر) نبض چیک کر رہا تھا تاکہ یہ دیکھ سکے کہ کس مخصوص نام یا جگہ پر مریضہ کا جسمانی رد عمل (Physiological Reaction) تبدیل ہوتا ہے۔

۳. ابن سینا کا طبی طریقہ کار (Avicenna's Method)

تاریخی طور پر یہ واقعہ مشہور طبیب **ابن سینا** سے منسوب ہے) جنہیں مغرب میں Avicenna کہا جاتا ہے(۔ ابن سینا نے "القانون فی الطب" میں نبض کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔

- انہوں نے پہلی بار ثابت کیا کہ "عشق" یا "شدید جذباتی لگاؤ" محض ایک خیال نہیں بلکہ ایک طبی حالت ہے جو انسانی جسم کے نظام (خاص طور پر نبض اور نیند) کو متاثر کرتی ہے۔

سائنسی موازنہ: قدیم حکیم بمقابلہ جدید ٹیکنالوجی

خصوصیت قدیم حکیم) مثنوی کا کردار(جدید سائنسی آلہ (Polygraph/Lie Detector)

طریقہ کار	نبض پر ہاتھ رکھنا اور گفتگو کرنا	سینسرز کے ذریعے دل کی دھڑکن اور بلڈ پریشر ناپنا
بنیاد	بصیرت اور تجربہ	الیکٹرانک ڈیٹا اور گراف
مقصد	پوشیدہ جذباتی سچائی تک پہنچنا	جھوٹ یا چھپے ہوئے تناؤ کا سراغ لگانا

حاصلِ بحث

سائنسی طور پر اس حکیم کا عمل **"سائیکو سومیٹک ڈائگنوسس (Psychosomatic Diagnosis)"** کہلاتا ہے، یعنی یہ دیکھنا کہ ذہن کے خیالات جسم پر کیا اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ وہ حکیم صرف طبیب نہیں بلکہ ایک بہترین ماہرِ نفسیات تھا جس نے نبض کو "ڈیٹا ریڈر" کے طور پر استعمال کیا۔

مولانا روم کے اس شعر کی تہیں جتنی کھولی جائیں، اتنے ہی معرفت کے در وا ہوتے ہیں۔ آپ نے تین بہت ہی لطیف پہلوؤں — **روحانی، عرفانی اور وجدانی** ہے، جو دراصل تصوف کے تین مختلف درجات ہیں۔

۱. روحانی تشریح (Spiritual Interpretation)

روحانی نقطہ نظر سے یہ شعر **تزکیہ نفس** (Self-Purification) کے عمل کو بیان کرتا ہے۔

- **حکیمِ الٰہی:** یہاں حکیم سے مراد "مرشدِ کامل" ہے جو روح کا طبیب ہوتا ہے۔
- **خار چینی (کانٹے چننا):** روح کے راستے میں سب سے بڑے کانٹے **"ہوائے نفس"** (خواہشات) اور **"حبِ دنیا"** ہیں۔ ایک عام انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی بے چینی کی اصل وجہ کیا ہے، لیکن مرشد اپنی روحانی بصیرت سے وہ "کانٹا" ڈھونڈ نکالتا ہے جو روح کو زخمی کر رہا ہوتا ہے۔
- **جابجا آزمودن:** مرشد مرید کی زندگی کے مختلف گوشوں (عبادت، معاملات، اخلاق) کو پرکھتا ہے تاکہ دیکھ سکے کہ شرکِ خفی یا تکبر کا کانٹا کہاں چھپا ہوا ہے۔

۲. عرفانی تشریح (Gnostic Interpretation)

عرفان کا تعلق "معرفت" اور "شناخت" سے ہے۔ اس پہلو سے یہ شعر **اسرارِ الٰہی** کی معرفت کا آئینہ دار ہے۔

- **حق کی پہچان:** عارف (حکیم) جانتا ہے کہ کائنات کی ہر حرکت کے پیچھے اللہ کی مشیت کار فرما ہے۔ وہ ظاہری اسباب (نبض) کو دیکھ کر مسبب الاسباب (اللہ) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
- **رمز شناسی:** عرفانی طور پر "دستِ حکیم" دراصل **"یدِ قدرت"** کا مظہر ہے۔ حکیم کا نبض پر ہاتھ رکھنا اس بات کی علامت ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ جانتا ہے کہ کس دل میں کیا چھپا ہے۔ یہاں "کانٹا چننا" سے مراد دل کے آئینے سے "غیر اللہ" کے عکس کو صاف کرنا ہے تاکہ وہاں صرف "حق" کی پہچان باقی رہے۔

۳. وجدانی تشریح (Intuitive/Ecstatic Interpretation)

وجدان کا تعلق "کیفیت" اور "وارداتِ قلبی" سے ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں الفاظ ختم اور احساس شروع ہوتا ہے۔

- **لمسِ مسیحا:** وجدانی طور پر اس شعر میں اس لمحے کی لذت ہے جب ایک ٹوٹا ہوا انسان کسی ایسے شخص سے ملتا ہے جو اس کے دکھ کو بن کہے سمجھ لے۔ "چد ست می زَد" (کیا ہاتھ مار رہا تھا) میں ایک حیرت اور سرور کی کیفیت ہے۔
- **سکونِ قلب:** جب حکیم کا ہاتھ نبض پر پڑتا ہے، تو مریض کو یہ وجدانی احساس ہوتا ہے کہ "اب میں محفوظ ہوں، اب میرا علاج شروع ہو گیا ہے"۔ یہ وہ وجدانی تعلق ہے جو محب اور محبوب کے درمیان ہوتا ہے، جہاں خاموشی میں بھی گفتگو جاری رہتی ہے۔ وجدان بتاتا ہے کہ یہ طبیب کوئی اجنبی نہیں، بلکہ وہ ہے جو میرے وجود کے تاروں سے واقف ہے۔

خلاصہ صوفیانہ فکر

پہلو	مرکزِ توجہ	پیغام
روحانی	تزکیہ	نفس کے کانٹے نکال کر روح کو پاک کرنا۔
عرفانی	معرفت	کائنات اور دل میں چھپے ربانی رازوں کو پہچاننا۔
وجدانی	کیفیت	معالج کی موجودگی اور اس کی توجہ سے حاصل ہونے والا سرور۔

مولانا روم ہمیں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جب تک ہم اپنی زندگی کی باگ ڈور کسی ایسے "حکیمِ خار چین" (مرشد یا بصیرتِ کامل) کے ہاتھ میں نہیں دیتے جو ہمارے باطن کی نبض سے واقف ہو، ہم اپنے ہی پیدا کردہ دکھوں کے کانٹوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

زان کَنیزک بر طَریقِ داستان

باز می پُرسید حالِ دوستان

مشکل الفاظ کے معنی

زان: اُس سے، اس سبب سے (یعنی پچھلی بات کے تسلسل میں)۔۔۔ کَنیزک: باندی، لونڈی۔۔۔ بر طَریقِ داستان: کہانی کے انداز میں، تمثیل و حکایت کے پیرائے میں یعنی صاف صاف نہیں، بلکہ اشاروں، مثالوں اور رمز میں بات کرنا

باز: دوبارہ، پھر سے۔۔۔ می پُرسید: پوچھتی تھی۔۔۔ حالِ دوستان: دوستوں کا حال

ترجمہ

"(وہ حکیم) اس کنیز سے کہانی کے انداز میں (باتوں باتوں میں) اس کے پرانے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے حالات دریافت کرنے لگا۔"

جامع تشریح

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ ایک بادشاہ کی کنیز بیمار ہو گئی اور دنیاوی طبیب اسے ٹھیک کرنے میں ناکام رہے۔ تب ایک اللہ والا معالج (حکیمِ حاذق) آیا، جس نے بھانپ لیا کہ بیماری جسمانی نہیں بلکہ قلبی (عشق) ہے۔

.1 **نفسیاتی طریقہ علاج :** حکیم نے کنیز پر دباؤ نہیں ڈالا کہ وہ اپنا راز بتائے، بلکہ **"بر طریقِ داستاں "** (کہانی کے پیرائے میں) بات شروع کی۔ یہ ایک ماہر نفسیات کا طریقہ ہے کہ وہ مریض کو باتوں میں لگا کر اس کے لاشعور تک پہنچتا ہے۔

.2 **تجسس اور کھوج :** وہ حکیم کنیز سے پوچھ رہا تھا کہ وہ پہلے کہاں رہتی تھی؟ وہاں کے لوگ کیسے تھے؟ اس کے دوست احباب کون تھے؟ اس کا مقصد یہ تھا کہ باتوں باتوں میں جب کسی خاص شہر یا شخص کا نام آئے تو کنیز کی نبض کی رفتار بدلے، جس سے اس کے محبوب کا سراغ مل سکے۔

.3 **صوفیانہ نکتہ :** مولانا روم یہاں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ انسان کے باطنی امراض کا علاج براہِ راست نصیحت سے نہیں، بلکہ حکمت اور دانائی سے ہوتا ہے۔ جس طرح وہ حکیم کنیز کے "دوستوں" کا حال پوچھ کر اس کے اصل "محبوب" تک پہنچنا چاہتا تھا، اسی طرح مرشدِ کامل بھی انسان کی دنیاوی وابستگیوں کا جائزہ لے کر اسے حقیقی عشق (عشقِ الٰہی) کی طرف موڑ دیتا ہے۔

مولانا روم کی مثنوی کے اس واقعے (جہاں حکیم باتوں باتوں میں کنیز کا راز معلوم کرتا ہے) کا قرآنی تعلیمات اور سنتِ نبوی ﷺ سے گہرا تعلق بنتا ہے۔ یہاں بنیادی طور پر **"حکمت"**، **"باطنی اصلاح "** اور **"نفسیاتی بصیرت "** کے پہلو نمایاں ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کے درج ذیل استدلال کیے جاسکتے ہیں:

.1 حکمت اور دانائی (Al-Hikmah)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حکمت کو "خیرِ کثیر" قرار دیا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۤءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا "

وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے، اور جسے حکمت مل گئی، اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی۔" (البقرہ:269)

- **استدلال :** حکیم کا براہِ راست دوا دینے کے بجائے باتوں باتوں میں (بر طریقِ داستاں) اصل مرض تک پہنچنا اسی "حکمت" کی مثال ہے، جو اللہ اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے تاکہ وہ الجھے ہوئے معاملات کو سلجھا سکیں۔

2. دل کی مرکزیت (The Heart as the Core)

حدیثِ مبارکہ میں دل کی اہمیت کو جسم کی صحت سے جوڑا گیا ہے:

أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ..... أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ "خبردار! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست رہتا ہے... اور وہ 'دل' ہے۔" (صحیح بخاری)

- **استدلال:** مولانا روم یہ دکھا رہے ہیں کہ کنیز کی ظاہری بیماری دراصل اس کے "دل" کی کیفیت سے جڑی تھی۔ سنتِ نبوی ﷺ ہمیں سکھاتی ہے کہ انسان کی ظاہری حالت اس کی باطنی اور قلبی حالت کی عکاس ہوتی ہے۔ جب تک دل کا اضطراب ختم نہ ہو، جسم شفا نہیں پاتا۔

3. نرم گفتگو اور تجسس سے گریز (Gentleness in Counseling)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون جیسے شخص کے پاس بھیجتے ہوئے بھی ہدایت فرمائی:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى

"پھر اس سے نرم بات کرنا، شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا (اللہ سے) ڈر جائے۔" (طٰہٰ:44)

- **استدلال:** حکیم کا طریقہ کار "نرمی" اور "رازداری" پر مبنی تھا۔ اس نے ڈانٹ کر یا زبردستی سوال نہیں کیے، بلکہ "داستان" کے انداز میں گفتگو کی۔ یہ سنتِ انبیاء ہے کہ مخاطب کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جائے کہ وہ اجنبیت محسوس نہ کرے اور اپنا حالِ دل بیان کر دے۔

4. ستر پوشی اور پردہ داری (Privacy and Dignity)

اسلام کسی کے رازوں کی ٹوہ لینے سے منع کرتا ہے، لیکن اصلاح کے لیے خیر خواہی (نصیحت) کا حکم دیتا ہے۔

- **استدلال:** نبی کریم ﷺ اکثر خطبات میں کسی کا نام لینے کے بجائے فرماتے تھے "**مَا بَالُ أَقْوَامٍ**"... (لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا کرتے ہیں...)۔

- مولانا کا حکیم بھی کنیز کو شرمندہ کیے بغیر پرانے دوستوں کا حال پوچھ کر اصل حقیقت تک پہنچتا ہے۔ یہ نبوی طریقہ ہے کہ کسی کی تذلیل کیے بغیر اس کی اصلاح کی جائے۔
- **حکمت و ادب**
- اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں:
- نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ

"ہم آپ کو بہترین قصہ سناتے ہیں" (یوسف:3)

یعنی: روحانی حقائق **کہانی، مثال اور تمثیل** سے دل میں اترتے ہیں، ہر دل براہِ راست حقیقت برداشت نہیں کر سکتا

اسی لیے اولیاء: سوال بھی **ادب میں لپیٹ کر** کرتے ہیں، حقیقت بھی **رمز میں** بتاتے ہیں

خلاصہ

مولانا روم کے اس شعر سے جو شرعی اور اخلاقی اصول سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

1. **علاجِ باطن**: جسمانی بیماریوں کی جڑ اکثر روحانی یا ذہنی مسائل میں ہوتی ہے۔
2. **طریقۂ تبلیغ و اصلاح**: کسی کے دل میں اترنے کے لیے حکمت اور نرم کلامی شرط ہے۔
3. **فراستِ مومن**" : مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"(حدیث)۔ وہ حکیم اسی نورِ بصیرت سے کنیز کے چھپے ہوئے درد کو پہچان گیا تھا۔

مولانا روم کے اس شعر میں نفسیاتی علاج (Psychotherapy) اور طبی تشخیص (Medical Diagnosis) کے ایسے گہرے راز پوشیدہ ہیں جنہیں آج کی جدید سائنس بھی تسلیم کرتی ہے۔ یہ محض ایک کہانی نہیں، بلکہ **"نفسیاتی تجزیے "** **(Psychoanalysis)** کی ایک مکمل مشق ہے۔

طبی اور نفسیاتی اعتبار سے اس کی تشریح درج ذیل ہے:

1. نفسیاتی نقطہ نظر (Psychological Perspective)

نفسیات کی زبان میں اس عمل کو **"تلازمِ خیال (Word Association)"** اور **"بیانیہ طریقہ علاج (Narrative Therapy)"** کہا جا سکتا ہے۔

- **مزاحمت کا خاتمہ (Breaking Resistance):** جب کوئی مریض کسی صدمے یا ایسے راز (جیسے عشق) میں مبتلا ہوتا ہے جسے وہ بتانا نہیں چاہتا، تو وہ دفاعی حصار (Defensive Walls) بنا لیتا ہے۔ حکیم نے براہِ راست سوال

نہیں کیا، بلکہ "داستان" (کہانی) کا سہارا لیا تاکہ مریضہ کا دفاعی حصار ٹوٹ جائے اور وہ غیر محسوس طریقے سے سچ اگل دے۔

- **ریپورٹ بلڈنگ (Rapport Building):** ایک اچھا ماہرِ نفسیات پہلے مریض کا اعتماد جیتا ہے۔ "دوستوں کا حال پوچھنا" دراصل مریضہ کو آرام دہ (Comfortable) محسوس کروانے کا ایک طریقہ تھا تاکہ وہ معالج کو اپنا ہمدرد سمجھے۔
- **لاشعور کی کرید (Accessing the Unconscious):** باتوں باتوں میں پرانے شہروں اور لوگوں کا ذکر کرکے حکیم دراصل کنیز کے لاشعور میں چھپے ہوئے "جذباتی مرکز (Emotional Trigger)" کو تلاش کر رہا تھا۔

2.طبی نقطہ نظر (Medical Perspective)

قدیم طب (یونانی و اسلامی) اور جدید طب (Psychosomatic Medicine) دونوں اس نکتے پر متفق ہیں کہ ذہن اور جسم الگ نہیں ہیں۔

- **نفسیاتی جسمانی امراض (Psychosomatic Disorders):** کنیز کی بیماری بظاہر جسمانی تھی (بخار، کمزوری)، لیکن اس کی وجہ نفسیاتی تھی (ہجر اور اداسی)۔ حکیم جانتا تھا کہ جب تک "وجہ (Cause)" دور نہیں ہو گی، "علامت (Symptom)" ختم نہیں ہو گی۔
- **نبض اور جذبات کا تعلق (Biofeedback):** اگرچہ اس شعر میں ذکر نہیں، لیکن اگلی منزل میں حکیم کنیز کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے۔ جب وہ "دوستوں کا حال" پوچھتا ہے، تو کسی خاص نام یا شہر (سمرقند) کے ذکر پر کنیز کے دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار بدل جاتی ہے۔ یہ بالکل وہی اصول ہے جس پر آج کا **"لائی ڈیٹیکٹر (Polygraph Test)"** کام کرتا ہے کہ جذبات بدلنے سے جسمانی کیفیات (بلڈ پریشر، نبض) بدل جاتی ہیں۔

طبی و نفسیاتی خلاصہ (جدول)

تکنیک (Technique)	طبی و نفسیاتی فائدہ
بر طریقِ داستاں	مریض کے ذہنی تناؤ کو کم کرنا (Anxiety Reduction)
بازمی پُرسید	باریک بینی سے ڈیٹا اکٹھا کرنا (Clinical Interviewing)
حالِ دوستاں	جذباتی وابستگی کے مراکز کی تلاش (Finding Emotional Triggers)
تنہائی میں گفتگو	رازداری اور مریض کا سکون (Patient Confidentiality)

حاصلِ کلام < **:** مولانا روم یہ بتا رہے ہیں کہ ایک ماہر معالج صرف وہ نہیں جو دوا لکھ دے، بلکہ وہ ہے جو مریض کی **"خاموشی کی زبان "** پڑھ لے۔ طبی اعتبار سے یہ ثابت ہے کہ جب تک مریض ذہنی طور پر پرسکون نہ ہو، کیمیائی ادویات بھی اثر نہیں کرتیں۔

مولانا روم کی مثنوی محض قصہ گوئی نہیں بلکہ **"سلوک و تصوف "** کی ایک عملی کتاب ہے۔ اس شعر کی عرفانی اور وجدانی تعبیر ہمیں مادیت سے روحانیت کے سفر کی طرف لے جاتی ہے۔

یہاں اس کی گہری روحانی تشریح ملاحظہ کریں:

.1 **عرفانی تعبیر** (Mystical Interpretation)

عرفانِ الٰہی میں یہ شعر "انسانی روح" اور اس کے "اصل وطن" کے درمیان تعلق کو بیان کرتا ہے۔

- **کنیزک (روحِ انسانی) :** صوفیاء کے نزدیک یہ کنیز اس انسانی روح کی علامت ہے جو اس مادی دنیا (بادشاہ کا محل) میں قید ہے لیکن یہاں کے آرام و آسائش کے باوجود بیمار ہے۔ اس کی بیماری دراصل **"فراق" (جدائی)** ہے۔
- **حکیمِ الٰہی (مرشدِ کامل) :** وہ اللہ والا معالج دراصل مرشدِ کامل یا عقلِ کلی کی علامت ہے جو یہ جانتا ہے کہ روح جب تک اپنے مرکز (خالق) سے دور رہے گی، بے چین رہے گی۔
- **حالِ دوستاں (دنیاوی تعلقات) :** حکیم کا دوستوں کا حال پوچھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مرشد مرید کی سابقہ زندگی، اس کی خواہشات اور اس کی وابستگیوں کا جائزہ لیتا ہے تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ روح کا جھکاؤ کس طرف ہے اور اسے کائنات کی کن کن رنگینیوں نے مسحور کر رکھا ہے۔

.2 **وجدانی تعبیر** (Ecstatic/Intuitive Interpretation)

وجدانی لحاظ سے یہ شعر ایک "کیفیت" کو بیان کرتا ہے:

- **درد کی ٹیس :** جب حکیم پرانے دوستوں کا ذکر کرتا ہے، تو کنیز کے اندر ایک درد جاگتا ہے۔ وجدان کی دنیا میں جب تک "یادِ ماضی" یا "اپنے اصل کی تڑپ" بیدار نہ ہو، توبہ اور انابت کا عمل شروع نہیں ہوتا۔
- **خاموش مکالمہ :** یہاں مکالمہ صرف زبان سے نہیں ہو رہا، بلکہ روح سے روح کا رابطہ ہے۔ وجدان بتاتا ہے کہ سچا معالج وہ ہے جو آپ کے الفاظ کے پیچھے چھپی ہوئی **"خاموش سسکیوں "** کو سن لے۔
- **مجاز سے حقیقت کا سفر :** کنیز کسی شخص (عشقِ مجازی) کی وجہ سے بیمار تھی، لیکن حکیم اس مجازی عشق کو سیڑھی بنا کر اسے عشقِ حقیقی (خدا کی محبت) تک لے جانا چاہتا تھا۔ وجدان کی رو سے ہر دنیاوی محبت دراصل اللہ کی خوبصورتی کا ایک ادھورا عکس ہے، اور عارف کا کام اسی عکس سے اصل (خالق) تک پہنچنا ہے۔

کلیدی علامات اور ان کے حقائق

علامت	حقیقتِ عرفانی
بیماری	روح کی تڑپ اور مادی دنیا سے بیزاری
داستان (کہانی)	کائنات کا پھیلاؤ اور زندگی کا سفر
باز پُرس (کریدنا)	تزکیہِ نفس (Self-Purification) کا عمل
سمرقند (کنیز کا شہر)	مقامِ وصل یا وہ روحانی مقام جہاں سے روح آئی ہے

خلاصہِ وجدان:

مولانا روم یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ ہر انسان کے اندر ایک "کنیز" (روح) قید ہے جو دنیاوی بادشاہوں (نفسانی خواہشات) کے زیرِ اثر رہ کر بیمار ہو چکی ہے۔ اسے کسی ایسے حکیم کی ضرورت ہے جو باتوں باتوں میں اسے اس کے "اصل وطن" کی یاد دلا دے اور اسے مٹی کی محبت سے نکال کر نورِ الٰہی سے جوڑ دے۔

با حکیمِ اُو قِصّہ ہا می گفت فاش

از مُقام و خواجگان و شہر و باش

مشکل الفاظ کے معنی

با حکیم: حکیم کے ساتھ، دانا شخص کے پاس (مراد: صاحبِ عقل و بصیرت)۔۔۔۔او: وہ شخص، یعنی حکایت کا مرکزی کردار

قصّہ ہا: قصے، حکایتیں، باتیں۔۔۔می گفت فاش: کھلے طور پر بیان کرتا تھا، بلا جھجھک کہتا تھا

از مقام: مرتبہ، درجہ، روحانی یا سماجی حیثیت۔۔۔خواجگان: معززین، امراء، اہلِ دولت و اقتدار، مشائخ یا بڑے لوگ

شہر و باش: شہر اور رہائش، طرزِ زندگی، معاشرت، دنیاوی نظام

(وہ بیمار لڑکی) اس روحانی طبیب (حکیم) کے سامنے اپنی زندگی کے قصے، اپنے سابقہ ٹھکانوں، اپنے پرانے آقاؤں، شہروں اور اپنی بود و باش کے حالات بالکل کھلم کھلا (بغیر کسی جھجھک کے) بیان کرنے لگی۔

اس شعر کا سیاق و سباق یہ ہے کہ ایک لونڈی بیمار تھی اور دنیاوی طبیب اس کا علاج کرنے میں ناکام رہے تھے۔ جب اللہ کی طرف سے ایک روحانی طبیب آیا، تو اس نے بھانپ لیا کہ بیماری جسمانی نہیں بلکہ "عشق" ہے۔ اس نے لڑکی کو تنہائی میں بٹھایا تاکہ وہ اپنے دل کا حال بیان کر سکے۔

اس شعر کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

- **اعتماد کی فضا:** جب انسان کسی سچے ہمدرد یا روحانی مرشد سے ملتا ہے، تو وہ اپنے وہ راز بھی فاش کر دیتا ہے جو اس نے برسوں سے چھپا رکھے ہوتے ہیں۔ یہاں "فاش" کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لڑکی نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔
- **تشخیص کا طریقہ:** حکیم اسے باتوں میں لگا کر اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ باتوں کے دوران جب کسی خاص شہر یا شخص کا ذکر آئے اور لڑکی کی نبض کی رفتار تیز ہو، تو اصل معشوق کا سراغ مل سکے۔
- **تصوف کا پہلو:** صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جب تک سالک (طالبِ حق) اپنے مرشد کے سامنے اپنے تمام احوال، ماضی کی وابستگیاں اور دل کی الجھنیں "فاش" نہیں کر دیتا، تب تک اس کا روحانی علاج ممکن نہیں ہوتا۔

خلاصہ: یہ شعر نفسیاتی علاج (Psychotherapy) کی بھی بہترین مثال ہے، جہاں مریض اپنے معالج پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تمام کڑیاں (مقامات، لوگ اور یادیں) اس کے سامنے رکھ دیتا ہے تاکہ درد کی اصل جڑ تک پہنچا جا سکے

مولانا رومیؒ کے اس شعر میں "حکیم" کے سامنے دل کا حال کھولنے کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے، اسے قرآن و سنت کی روشنی میں **تزکیہ نفس، مشورہ اور روحانی علاج** کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے اس کی وضاحت درج ذیل نکات میں کی جا سکتی ہے:

١. اہلِ ذکر سے رجوع (قرآنی حکم)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَسْئَلُوٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ) ترجمہ: پس تم ذکر والوں (اہلِ علم) سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔ —(سورہ النحل:43

اس آیت سے یہ اصول واضح ہوتا ہے کہ جب انسان کسی الجھن (چاہے وہ جسمانی ہو یا روحانی) میں مبتلا ہو، تو اسے اس فن کے ماہر (حکیم یا عالم) کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اسے اپنے حالات سے آگاہ کرنا چاہیے تاکہ وہ صحیح رہنمائی کر سکے۔

۲. تزکیہ نفس اور اعترافِ حال

سنتِ نبویؐ میں ہمیں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جہاں صحابہ کرامؓ اپنی قلبی کیفیات اور گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور اپنی حالت "فاش" (کھل کر بیان) کر دیتے۔

- مثلاً، جب کسی صحابی سے کوئی لغزش ہو جاتی، تو وہ چھپانے کے بجائے آپ ﷺ کے پاس آکر اس کا ذکر کرتے تاکہ ان کا تزکیہ ہو سکے۔
- **اصول:** اسلام میں گناہوں کی تشہیر منع ہے، لیکن **اصلاح اور علاج** کی نیت سے کسی مصلح (Mentor/Healer) کو حال بتانا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔

۳. طبیب اور مریض کا رشتہ (شرعی رخصت)

اسلامی فقہ میں "ستارِ عیوب" (عیب چھپانے) کی بہت تاکید ہے، لیکن **علاج کی ضرورت** اسے مستثنیٰ کرتی ہے۔

- شریعت کی رو سے ایک مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ طبیب کو اپنی بیماری کی تمام علامات اور ماضی کے حالات بتائے۔
- حکیم رومی اسی طبی اصول کو روحانی دنیا پر منطبق کر رہے ہیں کہ جب تک سالک اپنے "طبیبِ روحانی" (مرشد) سے اپنے تعلقات، وابستگیاں اور قلبی امراض نہیں چھپاتا، تب تک اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

۴. الامانۃ (معالج کی ذمہ داری)

شعر میں لڑکی کا حکیم کے سامنے سب کچھ ظاہر کر دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اسے معالج کی **امانتداری** پر پورا بھروسہ تھا۔

حدیثِ مبارکہ ہے:

حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ، حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، عَنْ دَاوُدَ بْنِ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ، عَنِ ابْنِ جُدْعَانَ، عَنْ جَدَّتِهِ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ، وَفِي الْبَابِ، عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ، وَابْنِ عُمَرَ، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ مِنْ حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ.

ام المؤمنین ام سلمہ ؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مشیر یعنی جس سے مشورہ لیا جائے اس کو امین ہونا چاہیئے۔

امام ترمذی کہتے ہیں: ۱- یہ حدیث حدیث ام سلمہ ؓ کی روایت سے غریب ہے، ۲- اس باب میں ابن مسعود، ابوہریرہ اور ابن عمر ؓ سے بھی احادیث آئی ہیں۔

""" تخریج دارالدعوہ: تفرد بہ المؤلف (تحفۃ الأشراف: ۱۸۲۹۹) (صحیح) (سند میں عبد الرحمن بن زید بن جدعان کی دادی (جدۃ) مجہول راوی ہیں، لیکن سابقہ حدیث سے تقویت پا کر یہ حدیث صحیح ہے)"""

"**الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ**) "ترجمہ: جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہوتا ہے۔ — (ترمذی

یعنی حکیم یا روحانی معالج کے لیے ضروری ہے کہ وہ مریض کے رازوں کو سینے میں دفن کر دے، جیسا کہ رومی کے قصے میں اس الٰہی طبیب نے کیا۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کی **عظیم روحانی اور عرفانی تشریح** مادیت سے ماوراء ہو کر "روح کے سفر" اور "مطلوبِ حقیقی" کی تلاش پر مبنی ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یہ محض ایک بیمار لڑکی اور طبیب کا قصہ نہیں، بلکہ یہ ہر اس انسان کی کہانی ہے جو اس مادی دنیا میں قید ہو کر اپنی اصل (اللہ) کو بھول چکا ہے اور بے چین ہے۔

اس شعر کی عرفانی گہرائی کو درج ذیل نکات میں سمجھا جا سکتا ہے:

۱. روح کا غریب الوطنی کا قصہ (The Soul's Exile)

عرفانی نقطہ نظر سے، وہ لڑکی "**روحِ انسانی** " کی علامت ہے۔ روح اس مادی دنیا میں پردیسی ہے۔

- "**قصہ ہا می گفت فاش** :" یہاں قصوں سے مراد روح کا وہ سفر ہے جو اس نے عالمِ ارواح سے عالمِ اجساد (دنیا) تک طے کیا۔
- جب روح کسی "کامل مرشد" (حکیمِ الٰہی) کے سامنے بیٹھتی ہے، تو وہ اپنی بے چینی کی داستان سناتی ہے کہ وہ کن کن مقامات (مقاماتِ سلوک) سے گزری اور کہاں کہاں اسے دھوکہ ملا۔

۲ . کثرت سے وحدت کی طرف واپسی

شعر میں **"شہر، خواجگان اور باش "**(شہر، آقا اور قیام گاہیں) کثرتِ دنیا کی علامات ہیں۔

- انسان دنیا میں کئی چیزوں کا غلام بنتا ہے (کبھی مال کا، کبھی جاہ و منصب کا، کبھی مجازی محبتوں کا)۔ یہ سب اس کے "خواجگان" (آقا) ہیں۔
- **عرفانی نکتہ:** حکیمِ الٰہی یہ دیکھ رہا ہے کہ روح کا تعلق کن کن باطل آقاؤں سے رہا ہے۔ جب تک روح ان تمام پچھلے "تعلقات" اور "مقامات" کا تذکرہ کر کے انہیں اپنے اندر سے نکال نہیں دیتی (Exorcise) نہیں کر دیتی (، تب تک وہ اپنے اصل مالک (خالقِ حقیقی) سے نہیں جڑ سکتی۔

۳ . اعترافِ حال اور تخلیہ (Catharsis)

تصوف میں **"تخلیہ "**(دل کو غیر اللہ سے خالی کرنا) پہلا قدم ہے۔

- وہ لڑکی حکیم کے سامنے سب کچھ "فاش" (برملا) کہہ رہی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ سالک جب اپنے مرشد کے سامنے اپنی تمام تر کمزوریاں، اپنی پچھلی وابستگیاں اور دل کے بتوں کا اعتراف کر لیتا ہے، تو اس کے اندر کی صفائی شروع ہو جاتی ہے۔
- **روحانی رمز:** جب تک پچھلے قصے ختم نہیں ہوتے، اللہ سے تعلق کا نیا قصہ شروع نہیں ہوتا۔

۴ . نبضِ عشق کی پہچان

عارفین فرماتے ہیں کہ حکیم اس کے قصے سن کر یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی نبض کس ذکر پر تڑپتی ہے۔

- ہم سب کسی نہ کسی "یاد" میں بیمار ہیں۔ کسی کو دنیا کی فکر بیمار رکھتی ہے، کسی کو اپنی انا کی۔
- حکیم رومیؒ یہ سمجھا رہے ہیں کہ جب بندہ اپنے رب کے حضور یا کسی اللہ والے کے سامنے اپنے دل کا حال کھولتا ہے، تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی اصل بیماری "خدا سے دوری" ہے، جسے اس نے غلطی سے "دنیا کی محرومی" سمجھ رکھا تھا۔

۵ . مادی وجود سے ماوراء مقام کی تلاش

لفظ **"مقام "** اور **"شہر "** کی ایک گہری تشریح یہ بھی ہے کہ روح مختلف "مراتبِ وجود" سے گزر کر آئی ہے۔

- حکیم یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ یہ روح کس مقام کی قیدی ہے۔ کیا یہ صرف مادی لذتوں کے شہر میں قیام پذیر ہے یا اسے اپنے "وطنِ اصلی" (عالمِ قرب) کی یاد ستا رہی ہے؟
- بقولِ رومی، یہ دنیا ایک سرائے ہے، اور روح یہاں کی مسافر۔ جب روح اپنے مسافر ہونے کا اعتراف کر لیتی ہے، تو شفا کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

حاصلِ عرفان

یہ شعر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ:

"روحانی شفا اس وقت شروع ہوتی ہے جب انسان اپنی خودی کے جھوٹے پردوں کو چاک کر کے اپنے 'کامل' کے سامنے سچ بولنا سیکھ لیتا ہے۔"

وہ لڑکی (روح) جب تک خاموش تھی، بیمار تھی؛ جب وہ بول پڑی اور اس نے اپنی ماضی کی تمام وابستگیاں (خواجگان) گنوا دیں، تو اس نے دراصل ان سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ یہی **فنا** کی ابتدا اور **بقا** کا راستہ ہے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر میں آج سے 800 سال پہلے جس عمل کا ذکر کیا گیا، اسے جدید طبی سائنس (Medical Science) اور نفسیات (Psychology) میں ایک انقلابی بنیاد کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

طبی اور سائنسی نقطہ نظر سے اس کی تشریح درج ذیل چار بڑے ستونوں پر کھڑی ہے:

۱ . طبی تاریخ (Medical History/ Anamnesis)

جدید طب میں تشخیص (Diagnosis) کا پہلا اور اہم ترین مرحلہ **"ہسٹری لینا "** ہے۔

- **سائنسی پہلو :** ایک ماہر معالج صرف دوا نہیں دیتا، بلکہ مریض کے ماضی، اس کے رہن سہن) **باش** (، اس کے کام کی جگہ) **خواجگان / آقا** (اور اس کے ماحول) **شہر** (کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

- رومی کا "حکیم" دراصل ایک **Epidemiologist** کی طرح کام کر رہا ہے، جو بیماری کے ماحولیاتی اسباب (Environmental Factors) تلاش کر رہا ہے۔

۲. کلامی علاج (The Talking Cure / Psychotherapy)

نفسیات کی دنیا میں سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) کو "ٹاکنگ کیور" کا بانی مانا جاتا ہے، لیکن رومی نے اس شعر میں اسے پہلے ہی بیان کر دیا۔

- **نفسیاتی پہلو:** لفظ **"فاش"** (کھل کر کہنا) دراصل **Catharsis** (تخلیۂ جذبات) کا عمل ہے۔
- جب مریض اپنے دبے ہوئے جذبات، صدمات اور یادوں کو زبان دیتا ہے، تو اس کے دماغ کے **Amygdala** (جذبات کا مرکز) میں تناؤ کم ہوتا ہے اور **Prefrontal Cortex** (منطقی دماغ) اسے ترتیب دینا شروع کرتا ہے۔ یہ عمل تناؤ کے ہارمونز (Cortisol) کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

۳. حیاتیاتی فیڈبیک (Bio-Feedback) اور نبض

اس قصے میں آگے ذکر ہے کہ حکیم لڑکی کے قصے سنتے ہوئے اس کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ یہ خالصتاً ایک سائنسی تجربہ ہے۔

- **سائنسی میکانزم:** جب ہم کسی ایسی چیز یا شخص کا ذکر کرتے ہیں جس سے ہمارا جذباتی لگاؤ یا صدمہ وابستہ ہو، تو ہمارا **Autonomic Nervous System** متحرک ہو جاتا ہے۔
- **نبض کی رفتار (Pulse Rate):** جیسے ہی لڑکی نے اپنے محبوب کے شہر کا نام لیا ہو گا، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی ہو گی۔ جدید سائنس میں اسے **Physiological Arousal** کہتے ہیں۔ حکیم یہاں ایک زندہ "پولی گراف" (Polygraph/Lie Detector) مشین کا کام کر رہا ہے۔

۴. سماجی وماحولیاتی اثرات (Social Determinants of Health)

شعر میں "شہر"، "آقا" اور "مقامات" کا ذکر یہ ظاہر کرتا ہے کہ بیماری صرف اندرونی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق سماجی حالات سے ہوتا ہے۔

- **سائنسی پہلو:** اسے جدید میڈیکل سائنس میں Social Determinants of Health کہا جاتا ہے۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اور جن لوگوں کے زیرِ اثر (**خواجگان**) کام کرتا ہے، وہ اس کی ذہنی اور جسمانی صحت پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔

خلاصہ برائے موازنہ

رومی کا تصور	**جدید سائنسی اصطلاح**
قصہ ہای گفت فاش	Narrative Therapy / Catharsis
مقام و شہر و باش	Environmental History / Case Study
خواجگان (آقا / تعلقات)	Psychosocial Stressors
حکیم کا نبض دیکھنا	Bio-feedback / Sympathetic Nervous System Response

نتیجہ:

سائنسی طور پر یہ شعر ثابت کرتا ہے کہ **"جسمانی علامات اکثر ذہنی الجھنوں کا نتیجہ ہوتی ہیں** (Psychosomatic Disorders)"۔ رومی کا حکیم ایک ایسا سائنٹسٹ ہے جو جانتا ہے کہ جب تک یادوں کے "ڈیٹا" کو "پروسیس" نہیں کیا جائے گا، جسم کی مشینری درست نہیں ہوگی۔

ادبی اور فنی نقطہ نظر سے مولانا رومیؒ کا یہ شعر ان کے خاص طرزِ نگارش، یعنی **"سہلِ ممتنع "**(ایسی سادہ کلام جو بظاہر آسان مگر کہنی بہت مشکل ہو) کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ کلاسیکی فارسی ادب اور مثنوی نگاری کے تناظر میں اس کے ادبی محاسن درج ذیل ہیں:

۱. بیانیہ اسلوب(Narrative Technique)

مولانا رومی ایک عظیم داستان گو ہیں۔ اس شعر میں انہوں نے **"ترسیل** (Communication) **"** کو موضوع بنایا ہے۔

- **ادبی نکتہ :** کہانی کے اندر کہانی بننا مثنوی کا خاصہ ہے۔ یہاں رومی "مکالمے (Dialogue) "کی اہمیت کو اجاگر کر رہے ہیں۔ وہ صرف یہ نہیں کہہ رہے کہ لڑکی بول رہی تھی، بلکہ وہ ان جزئیات (Details) کا ذکر کر رہے ہیں جو ایک مکمل سوانح عمری (Biography) کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

۲. مراعات النظیر(Harmony of Words)

ادبی اصطلاح میں **مراعات النظیر** اسے کہتے ہیں جہاں ایسے الفاظ لائے جائیں جن کا آپس میں گہرا تعلق ہو۔

- اس شعر میں **مقام (جگہ)، شہر، اور باش (قیام)** ہم معنی اور ہم صنف الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کے مجموعے سے ایک "مسافر" یا "پردیسی" کی پوری زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ لفظی تناسب شعر میں ایک خاص روانی پیدا کر رہا ہے۔

۳. ایجاز واختصار(Conciseness)

ادب میں کم الفاظ میں بڑی بات کہنا کمال سمجھا جاتا ہے۔

- رومی نے صرف چار الفاظ) **مقام، خواجگان، شہر، باش** (میں اس لڑکی کی پوری ماضی کی زندگی، اس کی سماجی حیثیت، اس کی ہجرتوں اور اس کی ملازمتوں کی داستان سمیٹ دی ہے۔ ایک ادیب کے لیے یہ "جامعیت" فن کی بلندی ہے۔

۴. صنعتِ اشتقاق اور صوتی آہنگ

شعر کے قافیے **"فاش "**اور **"باش "**پر غور کریں:

- **فاش :** انکشاف کی علامت ہے۔

- **باش**: وجود اور ٹھکانے کی علامت ہے۔
- ان دونوں ہم وزن الفاظ کا ملاپ ایک صوتی نغمگی (Musicality) پیدا کر رہا ہے جو مثنوی کے بحر (**بحر رمل مسدس مقصور**) کے وزن پر پورا اترتا ہے۔ یہ سننے والے کے کانوں میں ایک تسلسل کا احساس پیدا کرتا ہے۔

۵. حقیقت نگاری (Realism)

ادبی لحاظ سے رومی یہاں ایک "**نفسیاتی حقیقت نگار**" کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

- وہ مبالغہ آرائی کے بجائے انسانی فطرت کی عکاسی کر رہے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی پر کامل بھروسہ کرتا ہے، تو وہ اپنی زندگی کے تمام گوشے (خواجگان سے لے کر شہروں تک) اس کے سامنے کھول دیتا ہے۔ یہ کردار نگاری (Characterization) کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جہاں کردار (لڑکی) کے عمل سے اس کی ذہنی کیفیت ظاہر ہو رہی ہے۔

مولانا رومیؒ کے اس تصور کو کہ "مریض (سالک) اپنے طبیب (مرشد) کے سامنے دل کے نہاں خانے کھول دیتا ہے"، فارسی اور اردو کے دیگر عظیم شعراء نے بھی اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔

یہاں سعدی، حافظ، عراقی اور اقبال کے منتخب اشعار مع تشریح پیشِ خدمت ہیں:

۱. شیخ سعدی شیرازیؒ (حکمت اور تسلیم)

سعدی کے ہاں مصلح اور حکیم کا تصور بہت واضح ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

علاجِ دردِ مشتاقان مگر در جلوۂ جانان — کہ سودی ہیچ می نہ بخشد علاجِ مصلح و عطار

- **تشریح**: سعدی فرماتے ہیں کہ شوق کی راہ میں تڑپنے والوں کا علاج صرف "جلوۂ جانان" (محبوب کا دیدار) ہے۔ دنیاوی اصلاح کرنے والے یا دوائیں بیچنے والے پنساری (عطار) اس درد کا علاج نہیں کر سکتے۔
- **رومی سے ربط**: رومی کے شعر میں بھی وہی "حکیم" کامیاب ہوا جس نے دنیاوی ادویات کے بجائے "دل کے قصوں" کے ذریعے محبوب تک رسائی حاصل کی۔

۲. خواجہ حافظ شیرازیؒ (رازِ دل اور پیرِ مغاں)

حافظ کے نزدیک اپنے مسائل کا حل کسی صاحبِ بصیرت کے سامنے پیش کرنا ہی نجات کا راستہ ہے:

مشکلِ خویش بر پیرِ مغان بُردم　　　دوش کو بہ تائید نظر حلِ معمامی کرد

- **تشریح:** کل رات میں اپنی مشکل لے کر "پیرِ مغاں" (روحانی استاد) کے پاس گیا، جنہوں نے صرف اپنی ایک نگاہِ کرم (تائید نظر) سے میرے تمام الجھے ہوئے معمے حل کر دیے۔
- **رومی سے ربط:** حافظ کا "پیرِ مغاں" وہی رومی کا "حکیم" ہے جس کے سامنے قصے بیان کیے جاتے ہیں اور وہ اپنی بصیرت سے تشخیص کرتا ہے۔

۳۔ فخر الدین عراقیؒ (روح کی بے چینی)

عراقی تصوف میں "عشق و مستی" کے امام مانے جاتے ہیں۔ وہ روح کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جو رومی کی اس بیمار لڑکی پر طاری تھی:

دلِ من در ہوائے روئے جانان　　　ہمے گردوز ہر سوئے شابان

- **تشریح:** میرا دل محبوب کے چہرے کی جستجو میں ہر طرف تیزی سے بھٹک رہا ہے۔ وہ کبھی اس شہر جاتا ہے، کبھی اس مقام پر۔
- **رومی سے ربط:** رومی کے شعر میں جو "مقام و شہر و باش" کا ذکر ہے، عراقی نے اسے دل کی تڑپ اور آوارگی سے تعبیر کیا ہے کہ روح اپنے اصل مرکز کو ڈھونڈنے کے لیے مادی مقامات میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

۴۔ علامہ اقبالؒ (نگاہِ مردِ مومن کا علاج)

اقبال نے رومی کے اسی حکیمِ الٰہی کے تصور کو "مردِ قلندر" کی نگاہ سے جوڑا ہے:

نہ مصلحت، نہ سیاست، نہ دانش و حکمت　　　علاجِ دردِ جگر جز نگاہِ مردِ قلندر

- **تشریح:** نہ دنیاوی تدبیریں کام آتی ہیں، نہ سیاست اور نہ ہی فلسفیانہ دانش؛ دل کے زخموں کا اصل علاج صرف ایک اللہ والے کی نگاہِ کیمیا میں پوشیدہ ہے۔

- **رومی سے ربط :** اقبال رومی کے معنوی شاگرد ہیں۔ وہ اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ جب تک وہ "حکیم" (مردِ قلندر) اپنی توجہ شاملِ حال نہ کرے، تب تک ماضی کے قصے (تاریخ یا نفسیات) محض بوجھ ہیں۔ شفا "نگاہ" میں ہے۔

سوئے قِصّہ گُفتَنَش می داشت گوش
سوئے نَبض و جُستَنَش می داشت ہوش

مشکل الفاظ کے معنی

سوئے: کی طرف ....۔ قِصّہ: بات، داستان، بیان ۔۔۔ گُفتَنَش: اس کی باتیں، اس کا قصہ (گُفتن = گفتگو / حال)

می داشت: رکھتا تھا ۔۔۔ گوش: کان، توجہ ۔۔۔ نَبض: نبض (دل کی دھڑکن / طبی علامت)

جُستَن: تلاش کرنا، جانچ کرنا ۔۔۔ جُستَنَش: اس کی تلاش / جانچ ۔۔۔ ہوش: عقل، سمجھ، ذہنی توجہ

وہ (طبیب) ایک طرف تو اس کی باتوں کی طرف کان لگائے ہوئے تھا (تاکہ اس کے حالات معلوم کرے)، اور دوسری طرف اس کی نبض کی حرکت اور اس کے اچھلنے پر پوری توجہ رکھے ہوئے تھا۔

اس شعر میں مولانا روم نفسیاتی علاج اور روحانی تشخیص کا ایک باریک نکتہ بیان کر رہے ہیں۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک بادشاہ کی کنیز بیمار ہو جاتی ہے اور دنیاوی اطباء اس کا علاج کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بالآخر ایک اللہ والا طبیب (حکیمِ الٰہی) آتا ہے اور وہ بھانپ لیتا ہے کہ یہ بیماری جسمانی نہیں بلکہ "عشق" کی بیماری ہے۔

تشریح کے اہم نکات:

ذہن اور جسم کا تعلق

حکیم جانتا تھا کہ جب انسان کسی ایسی چیز کا ذکر کرتا ہے جس سے اس کا گہرا جذباتی لگاؤ ہو، تو اس کے جسمانی تاثرات (خصوصاً نبض کی رفتار) بدل جاتے ہیں۔

طبیب کی حکمت: حکیم کنیز سے مختلف شہروں اور لوگوں کے بارے میں سوالات کر رہا تھا تاکہ معلوم کر سکے کہ اس کا دل کہاں اٹکا ہوا ہے۔ وہ بظاہر باتیں سن رہا تھا لیکن در حقیقت اس کا اصل "ہوش" نبض کی تیزی پر تھا کہ کس نام یا کس شہر کے ذکر پر نبض کی رفتار میں غیر معمولی تبدیلی آتی ہے۔

عشق کی تشخیص

اس طریقے سے طبیب نے یہ معلوم کر لیا کہ جب "سمرقند" کا نام آیا تو کنیز کی نبض کی رفتار تیز ہو گئی، جس سے ظاہر ہوا کہ اس کا محبوب وہاں مقیم ہے۔

روحانی سبق: مولانا یہاں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ انسان کے لفظوں سے زیادہ اس کی کیفیات سچ بولتی ہیں۔ ایک ماہرِ نفسیات یا مرشدِ کامل اسی طرح مرید کے باطن کا حال اس کی گفتگو اور اس کے قلبی تاثرات سے معلوم کر لیتا ہے۔

شعر کے پہلے مصرعے میں "گفتگو پر کان دھرنے" کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حوالے سے ایک نہایت اہم نفسیاتی نکتہ بیان فرمایا کہ انسان کے الفاظ اور اس کے بولنے کا انداز اس کے باطن کو ظاہر کر دیتا ہے:

وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِي لَحۡنِ ٱلۡقَوۡلِ" اور تم انہیں ان کے اندازِ گفتگو سے ضرور پہچان لوگے۔" (سورۃ محمد: 30)

یہ آیت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ایک صاحبِ بصیرت شخص، کسی کی باتوں کے اتار چڑھاؤ اور لہجے) **لحن** (سے اس کے چھپے ہوئے جذبات یا بیماری کو پہچان سکتا ہے، جیسا کہ رومی کے قصے میں طبیب نے کیا۔

مومن کی فراست (بصیرت)

رومی کا طبیب محض ایک ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک "حکیمِ الٰہی" ہے جو بصیرت سے کام لے رہا ہے۔ حدیثِ قدسی اور ارشاداتِ نبوی میں اس بصیرت کا ذکر ملتا ہے:

"اتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنور الله" "مومن کی فراست (بصیرت) سے ڈرو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔" (جامع ترمذی)

طبیب کا "ہوش" اور "گوش" (توجہ اور کان) دراصل اسی **نورِ الٰہی** کی علامت ہیں جس کے ذریعے وہ ظاہری علامات سے گزر کر روح کے روگ تک پہنچ جاتا ہے۔

ذکر اور قلبی اضطراب

شعر میں "نبض کے اچھلنے" کا ذکر ہے، جو کسی خاص نام یا یاد پر ردِ عمل ہے۔ قرآن میں سچے مومنین کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے:

"**إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ**" "جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے (لرز جاتے) ہیں۔" (سورۃ الانفال:2)

جس طرح اللہ کے ذکر سے روح میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اسی طرح مجازی عشق میں بھی محبوب کے تذکرے سے نبض اور دل کی دھڑکن میں تبدیلی آتی ہے۔ طبیبِ کامل اسی "لرزش" اور "تڑپ" کو دیکھ کر تشخیص کرتا ہے کہ اس کا تعلق کس سے ہے۔

خلاصہ : قرآن و حدیث کی رو سے انسان کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ دار ہے۔ رومی کا یہ شعر دراصل **تزکیہ نفس** اور **فراستِ ایمانی** کی ایک تمثیل ہے، جہاں ایک مرشدِ کامل (طبیب) اپنے مرید (مریض) کی گفتگو اور کیفیات سے اس کے اصل روحانی مرض کی تشخیص کرتا ہے۔

مولانا روم کے کلام کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی تہیں پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک کے بعد ایک کھلتی ہیں۔ آپ نے جن تین جہتوں—**وجدانی، عرفانی اور روحانی**—سے وضاحت طلب کی ہے، یہ دراصل اس شعر کے باطنی سفر کے تین مختلف پڑاؤ ہیں۔

1. **وجدانی تعبیر** (Ecstatic/Intuitive Interpretation)

وجدانی نقطہ نظر سے اس کا تعلق "**ہم آہنگی**" اور "**قلبی واردات**" سے ہے۔

- **مٹتی ہوئی دوری :** یہاں طبیب اور مریض کے درمیان "دوئی" ختم ہو رہی ہے۔ طبیب صرف کانوں سے نہیں سن رہا، بلکہ وہ اپنے وجود کو مریض کے وجود سے جوڑ چکا ہے۔
- **کیفیتِ جذب :** وجدان میں لفظ (قِصّہ) ثانوی ہو جاتا ہے اور کیفیت (نبض) بنیادی۔ یہ اس لمحے کی عکاسی ہے جب ایک انسان دوسرے کے دکھ میں اس قدر گم ہو جائے کہ اسے الفاظ کے پیچھے چھپی تڑپ سنائی دینے لگے۔

- **خلاصہ :** وجدان کہتا ہے کہ سچی ہمدردی اور تعلق وہ ہے جہاں آپ دوسرے کی زبان سے زیادہ اس کے دل کی دھڑکن (Vibrations) کو محسوس کریں۔

.2 عرفانی تعبیر (Gnostic/Mystical Knowledge)

عرفان کا تعلق **"معرفت "** اور **"حقیقت کی پہچان "** سے ہے۔ رومی یہاں ایک "عارف" کا طریقہ کار بیان کر رہے ہیں۔

- **مجاز سے حقیقت کا سفر :** قصہ "مجاز" (ظاہر) ہے اور نبض کی حرکت "حقیقت" (باطن) ہے۔ عارف دنیا کے قصوں کو سنتا ضرور ہے لیکن اس کی نظر اس "محرک" پر ہوتی ہے جو کائنات کو حرکت دے رہا ہے۔
- **کشفِ اسرار :** عارف کے لیے کائنات کا ہر ذرہ ایک "نبض" ہے جس پر ہاتھ رکھ کر وہ خالق کی مرضی کو پہچان لیتا ہے۔ یہاں طبیب "عقلِ کلی" کی علامت ہے جو مادی پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے اصل سبب (Cause) کو دیکھ رہا ہے۔

عرفانی طور پر یہ شعر سکھاتا ہے کہ اہل اللہ دنیا کے ہنگاموں (قصوں) میں الجھتے نہیں، بلکہ ان ہنگاموں کے پیچھے چھپے الٰہی اشاروں پر نظر رکھتے ہیں۔

.3 روحانی تعبیر (Spiritual/Sufi Interpretation)

روحانی طور پر یہ شعر **"شیخ اور مرید "** یا **"ہادی اور طالب "** کے رشتے کی عکاسی کرتا ہے۔

- **تربیتِ مرید :** مرید جب اپنے حالات (قصہ) بیان کرتا ہے، تو کامل مرشد صرف اس کے الفاظ نہیں سنتا، بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ ان باتوں کے دوران مرید کی روح کس طرف مائل ہو رہی ہے۔ کیا اس کا دل دنیا کی طرف اچھل رہا ہے یا اللہ کی طرف؟
- **روحانی تشخیص" :** نبض و جستن" سے مراد مرید کا روحانی اضطراب ہے۔ مرشد دیکھتا ہے کہ طالب کا "نفس" کہاں اٹکا ہوا ہے۔ جب تک نفس کا بت (وہ محبوب جس کی یاد میں نبض تیز ہوتی ہے) بر آمد نہ ہو جائے، روحانی علاج ممکن نہیں۔
- **بیداریِ روح :** یہ شعر اس عمل کی طرف اشارہ ہے جہاں ایک اعلیٰ روح (طبیب) ایک پسماندہ روح (کنیز) کو اس کے اپنے ہی نفسیاتی اور روحانی قید خانے سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔

- **خلاصہ :** روحانی تعبیر یہ ہے کہ کامل رہنما وہی ہے جو آپ کی گفتگو سے آپ کے باطنی امراض اور میلانات کا سراغ لگا لے۔

خلاصہِ کلام

ان تینوں تعبیرات کا نچوڑ یہ ہے:

"ظاہر (الفاظ) دھوکہ دے سکتا ہے، لیکن باطن (کیفیت / نبض) کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

رومی ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اگر تم کسی کی مدد کرنا چاہتے ہو یا سچائی تک پہنچنا چاہتے ہو، تو اپنی توجہ اس کے **"قال "** (باتوں) سے زیادہ اس کے **"حال "** (کیفیت) پر مرکوز کرو۔

مولانا روم کے اس شعر میں بیان کردہ طریقہ کار موجودہ دور کی طبی سائنس (Medical Science) اور نفسیات (Psychology) کے عین مطابق ہے۔ 800 سال پہلے رومی نے جس مشاہدے کو بیان کیا، آج اسے **"سائیکو فزیالوجی "** **(Psychophysiology)** کے نام سے جانا جاتا ہے۔

طبی اور سائنسی نقطہ نظر سے اس کی وضاحت مندرجہ ذیل ہے:

طبی تشخیص کا بنیادی طریقہ (Clinical History Taking)

شعر کا پہلا مصرعہ (قصے کو غور سے سننا) میڈیکل سائنس میں **Anamnesis** یا **History Taking** کہلاتا ہے۔

- آج بھی کسی معالج کے لیے سب سے اہم مرحلہ مریض کی گفتگو کو سننا ہوتا ہے۔ 70٪ سے 80٪ تشخیص صرف مریض کی "کہانی (Story/History) " سننے سے مکمل ہو جاتی ہے۔
- طبیب کا "گوش" (کان) دراصل مریض کے لاشعور تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

2. سائیکو فزیولوجیکل تعلق (The Mind-Body Connection)

شعر کا دوسرا مصرعہ (نبض کی حرکت پر توجہ) جسم اور ذہن کے گہرے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

- **خودکار نظامِ عصبی (Autonomic Nervous System):** جب انسان کسی جذباتی صدمے، خوف یا محبت کا ذکر کرتا ہے، تو اس کا دماغ (Amygdala) متحرک ہو جاتا ہے۔ یہ دماغی تحریک فوری طور پر دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار پر اثر انداز ہوتی ہے۔
- **ایڈرینالین کا اخراج:** جذباتی ہیجان کی صورت میں جسم میں ایڈرینلین (Adrenaline) جیسے ہارمونز خارج ہوتے ہیں، جو نبض کی رفتار (Pulse Rate) کو تیز کر دیتے ہیں یا اس کی ترتیب (Rhythm) بدل دیتے ہیں۔

.3 پولی گراف یا جھوٹ پکڑنے والی مشین (The Polygraph Principle)

سائنسی طور پر یہ شعر "**لائی ڈیٹیکٹر (Lie Detector)**" کے اصول کی قدیم ترین اور بہترین مثال ہے۔

- جدید پولی گراف مشین بھی یہی کام کرتی ہے: وہ ایک طرف انسان سے سوال پوچھتی ہے (قصہ) اور دوسری طرف اس کے بلڈ پریشر، نبض اور سانس کی رفتار (نبض و جستن) کو مانیٹر کرتی ہے۔
- جس طرح رومی کا طبیب کسی خاص نام پر نبض کی تبدیلی سے "سچ" تک پہنچ گیا، بالکل اسی طرح جدید سائنس جسمانی ردِ عمل سے باطنی سچائی معلوم کرتی ہے۔

.4 نفسیاتی تناؤ اور دھڑکن (Psychocardiology)

سائنس میں اب ایک مستقل شاخ **Psychocardiology** موجود ہے جو اس بات کا مطالعہ کرتی ہے کہ انسانی جذبات (عشق، غم، غصہ) دل اور رگوں پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔

- **نبض کی اچھال (Tachycardia):** کسی خاص شخص یا شہر کے ذکر پر نبض کا "اچھلنا" سائنسی طور پر ثابت شدہ ہے کہ جذباتی وابستگی دل کی برقی لہروں (ECG) میں فوری تبدیلی لا سکتی ہے۔

تقابلی جائزہ (ٹیبل)

رومی کا نکتہ	سائنسی اصطلاح	وضاحت
قصّہ گفتن	Clinical Interview	مریض کے بیان سے علامات کا سراغ لگانا۔

نبض و جستن Physiological Response جذباتی محرک پر جسمانی ردِ عمل۔

ہوش رکھنا Monitoring / Observation ڈیٹا اکٹھا کر کے باطنی تناؤ کا پتہ لگانا۔

بیماری کا پتہ چلنا Root Cause Analysis محض علامت نہیں بلکہ بیماری کی اصل وجہ (Cause) تک پہنچنا۔

خلاصہ:

سائنس کہتی ہے کہ **"زبان جھوٹ بول سکتی ہے لیکن جسم کا ردِ عمل (نبض) جھوٹ نہیں بولتا"**۔ رومی نے اس شعر میں ایک ماہرِ نفسیات اور ماہرِ قلب (Cardiologist) دونوں کے کردار کو یکجا کر دیا ہے، جو ثابت کرتا ہے کہ قدیم تصوف اور جدید سائنس انسانی وجود کے حقائق پر متفق ہیں۔

مولانا روم کا یہ شعر فنی اور معنوی اعتبار سے کمالِ فن کا نمونہ ہے۔ فارسی شاعری کے قواعد اور بلاغت کے نقطہ نظر سے اس کے اہم شعری محاسن درج ذیل ہیں:

.1 صنعتِ تجنیسِ خطی (Tajnees-e-Khati)

اس شعر کے قوافی **"گوش "** اور **"ہوش "** ہیں۔ ان دونوں الفاظ کے حروف اور شکلیں آپس میں ملتی جلتی ہیں، صرف ایک حرف (گ اور ہ) کا فرق ہے۔ اسے علمِ بدیع میں **تجنیسِ خطی** یا **تجنیسِ ناقص** کہا جاتا ہے۔ یہ صوتی آہنگ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ معنی میں ایک ربط بھی پیدا کرتا ہے کہ "سننا" (گوش) تبھی کارآمد ہے جب "توجہ" (ہوش) ساتھ ہو۔

.2 صنعتِ مراعات النظیر (Harmony of Terms)

مولانا نے ایک ہی طبقے یا ماحول سے تعلق رکھنے والے الفاظ کو نہایت خوبصورتی سے جمع کیا ہے:

- پہلے مصرعے میں : **قِصّہ، گُفتن، گوش** (بات، بولنا، کان)۔ یہ سب سماعت اور کلام کے متعلق ہیں۔
- دوسرے مصرعے میں : **نَبض، جَستن، ہوش** (رگ، حرکت، آگاہی)۔ یہ سب طبی معائنے اور تشخیص کے متعلق ہیں۔

ان متناسب الفاظ کے استعمال سے شعر میں ایک مکمل "طبی منظر کشی" پیدا ہو گئی ہے۔

.3 لف و نشر (Fold and Unfold)

اگرچہ یہ روایتی "لف ونشر" کی طرح پیچیدہ نہیں، لیکن اس میں ایک متوازی ترتیب (Parallelism) موجود ہے:

- پہلا عمل: گفتگو سننا (سماعت)۔
- دوسرا عمل: نبض دیکھنا (لمس اور مشاہدہ)۔

یہ دونوں افعال مل کر ایک کامل "تشخیصی عمل" کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

4. سہلِ ممتنع (Simplicity)

رومی کا یہ شعر **سہلِ ممتنع** کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے نہایت سادہ اور روزمرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، کوئی ثقیل (بھاری بھرکم) لفظ موجود نہیں، لیکن اس سادگی میں نفسیات اور طب کا ایک سمندر بند کر دیا ہے۔ عام قاری اسے آسانی سے سمجھ لیتا ہے، مگر اس جیسا دوسرا شعر کہنا نہایت مشکل ہے۔

5. پیکر تراشی (Imagery)

شعر پڑھتے ہی قاری کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر آ جاتا ہے: ایک حکیم مریضہ کے پاس بیٹھا ہے، اس کا ایک ہاتھ نبض پر ہے اور اس کا سر مریضہ کی طرف جھکا ہوا ہے تاکہ وہ اس کی دبی دبی آواز سن سکے۔ یہ متحرک منظر کشی (Dynamic Imagery) رومی کے اسلوب کا خاصہ ہے۔

6. بحر اور آہنگ

یہ شعر **بحرِ رمل مسدس مقصور** ($فاعِلاتُن \ f\ فاعِلاتُن \ f\ فاعِلُن $) میں ہے، جو کہ مثنوی رومی کی مخصوص بحر ہے۔ یہ بحر اپنے اندر ایک وقار، دھیما پن اور کہانی سنانے کا فطری آہنگ رکھتی ہے، جو طبیب کی سنجیدگی اور احتیاط کو ظاہر کرنے کے لیے موزوں ترین ہے۔

مولانا روم نے جس طرح "نبض" اور "گفتگو" کے ذریعے پوشیدہ عشق اور باطنی واردات کو آشکار کیا، اسی موضوع کو فارسی اور اردو کے دیگر عظیم شعراء نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں بھی "عشق" ایک ایسی بیماری ہے جس کی تشخیص عام طبیب کے بس سے باہر ہے۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ یہ اساطینِ ادب اس حوالے سے کیا کہتے ہیں:

.1 شیخ سعدی شیرازی:(حقیقت پسندی اور عجزِ طبیب)

سعدی کے ہاں عشق ایک ایسی لاعلاج بیماری ہے جس کے سامنے مادی تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب عشق کا روگ لگ جائے تو طبیب کی نبض شناسی بے کار ہے۔

دردِ عشقی کشیده ام که مپرس   زہرِ ہجری چشیدہ ام کہ مپرس

سعدی کا ایک مشہور قول ہے جس کا مفہوم رومی کے اس شعر سے ملتا ہے" : جو شخص عشق کی آگ سے واقف نہیں، وہ اس کی تڑپ (نبض کی تیزی) کو محض ایک بخار سمجھتا ہے۔ "وہ معالج کو مشورہ دیتے ہیں کہ نبض چھوڑ اور دل کا حال دیکھ۔

.2 فخر الدین عراقی:(سوز و گداز اور ہمہ گیریت)

عراقی صوفیانہ شاعری میں "عشقِ محض "کے قائل ہیں۔ رومی کے ہاں طبیب نبض دیکھ رہا ہے، لیکن عراقی کے ہاں کائنات کی ہر حرکت عشق کی وجہ سے ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر تم کائنات کی نبض پر ہاتھ رکھو تو تمہیں ہر جگہ محبوب ہی کا تذکرہ سنائی دے گا:

در رگِ ہستیِ ما،   خونِ تمنا جوشد)ہماری ہستی کی ہر رگ میں تیری ہی تمنا کا خون جوش مار رہا ہے۔(

عراقی کے نزدیک انسان کی خاموشی میں بھی ایک "قصہ "چھپا ہوتا ہے جسے صرف صاحبِ ذوق ہی سن سکتا ہے۔

.3 خواجہ حافظ شیرازی:(طبیبِ عشق اور نبض)

حافظ کے ہاں رومی کے اس تصور کی سب سے واضح جھلک ملتی ہے۔ حافظ بار بار **"طبیبِ عشق "**کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیاوی ڈاکٹر کو میری نبض نہ دکھاؤ:

طبیبِ عشق مسیحادم است و مشفق،   لیکن چو درد در تو نبیند، کہ را دوا بکند؟)عشق کا طبیب مسیحا کی طرح شفا بخش ہے، لیکن جب تک وہ تم میں تڑپ اور درد نہ دیکھ لے، وہ دوا کس کی کرے گا؟(

ایک اور جگہ حافظ رومی کے اسی خیال کو یوں بیان کرتے ہیں کہ میرے مرض کا حال میری باتوں سے نہیں، میری آنکھوں اور نبض سے پوچھو:

نبضِ مرا بگیر و بدیں حالِ من بسنج)میری نبض تھام لو اور اس سے میرے حال کا اندازہ لگاؤ۔(

.4علامہ اقبال:(جنونِ عشق اور جِست)

اقبال نے رومی کے لفظ "**جستن** "(اچھلنا/کودنا) کو ایک نیا فلسفہ عطا کیا۔رومی کے ہاں نبض کی "جَست "(تڑپ) بیماری کی علامت تھی،اقبال کے ہاں یہ زندگی کی علامت ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ عقل قصوں اور دلیلوں میں الجھی رہتی ہے،جبکہ عشق ایک "جِست "میں منزل پالیتا ہے:

عقل کو تنقید سے کام ہے، عشق ہے مٹی کا خمیر عشق کی ایک جِست نے طے کر دیا قصہ تمام

اقبال رومی کے اس طبیب کی طرح "نبضِ کائنات "پر ہاتھ رکھنے کے قائل ہیں،وہ کہتے ہیں:

نبضِ کائنات میں ہے تپشِ حیات سے محکم ہے نظامِ کائنات، عشق کی زات سے

یعنی اقبال کے نزدیک اگر دل میں تڑپ (نبض کی تیزی) نہیں ہے،تو انسان زندہ ہی نہیں ہے۔رومی جس تڑپ سے "مرض" ڈھونڈرہے تھے،اقبال اس تڑپ سے "مردِ مومن" کی پہچان کرتے ہیں۔

موازنہ

- **رومی :** نبض کو تشخیص (Diagnosis) کا ذریعہ بناتے ہیں۔
- **سعدی :** نبض شناس طبیب کی بے بسی کا ذکر کرتے ہیں۔
- **حافظ :** دنیاوی طبیب کے بجائے "طبیبِ عشق"(مرشد) کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔
- **اقبال :** نبض کی تڑپ کو عمل اور انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔

تا کہ نَبْض از نامِ کہ گردد جَہان
او بُوَد مَقصودِ جانَش در جَہان

مشکل الفاظ کے معنی

تا کہ: تا کہ،اس غرض سے کہ.....نَبْض: رگِ حیات،دل کی دھڑکن،زندگی کی حرکت،پلس۔۔۔از: سے

نامِ کہ: کس کے نام سے ؟(یہاں تعجب و استفہام کے لیے)۔۔۔ گردد: ہو جائے، بن جائے۔۔۔ جَہان: عالم، کائنات

او: وہ (مراد: اللہ تعالیٰ)۔۔۔ بُوَد: ہے۔۔۔ مقصود: مطلوب، اصل ہدف، غایت۔۔۔ جانَش: اس کی جان، اس کا باطن

در جَہان: اس دنیا میں

"تا کہ (دیکھا جائے کہ) دنیا میں اس کی نبض کس کے نام سے دھڑکتی ہے؛ (کیونکہ) جس کا نام اس کی نبض میں ہے، وہی جہان میں اس کی جان کا حقیقی مقصد ہے۔"

اس شعر میں شاعر ایک گہری نفسیاتی اور روحانی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے:

1. **عشق کی علامت کے طور پر نبض:** طبیب عام طور پر جسمانی بیماری معلوم کرنے کے لیے نبض دیکھتے ہیں، لیکن صوفی شعرا کے ہاں نبض اس تڑپ کی علامت ہے جو کسی کی یاد میں دل کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر آپ کسی کی شخصیت یا اس کے ایمان کا حال جاننا چاہتے ہیں، تو یہ دیکھیں کہ اس کے دل کی دھڑکن (نبض) کس کے ذکر سے تیز ہوتی ہے۔
2. **محبت ہی مقصود ہے:** انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے، وہی اس کی زندگی کا مرکز و محور بن جاتی ہے۔ اگر انسان کی نبض میں دنیا کی طلب ہے تو وہ دنیا دار ہے، اور اگر اس میں ذکرِ الٰہی یا عشقِ رسول ﷺ کی تڑپ ہے تو وہی اس کی روح کا اصل مقصود ہے۔
3. **مرکزی خیال:** انسان کی پہچان اس کی پسند اور اس کے محبوب سے ہوتی ہے۔ جس کے لیے انسان کا دل دھڑکتا ہے، وہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی اور منزل ہوتی ہے۔

اس فارسی شعر کا بنیادی فلسفہ "مرکزِ محبت" ہے، یعنی انسان کا دل جس چیز کی طرف مائل ہوتا ہے، وہی اس کی زندگی کا قبلہ و کعبہ بن جاتی ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس تصور کو ہم درج ذیل نکات سے سمجھ سکتے ہیں:

ذکرِ الٰہی اور دل کی کیفیت (نبض کا تڑپنا)

شعر کا پہلا مصرع کہتا ہے کہ "دیکھا جائے کہ نبض کس کے نام پر دھڑکتی ہے"۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے سچے مومنوں کی علامت یہی بیان فرمائی ہے کہ اللہ کا نام سن کر ان کے دلوں کی کیفیت بدل جاتی ہے:

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ..."(سورہ الانفال:2)"

ایمان والے تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں (لرز اٹھتے ہیں)۔"

جس طرح نبض کی تیزی کسی مخفی محبت کا پتہ دیتی ہے، اسی طرح قرآن کے مطابق مومن کے دل کی دھڑکن اور اس کا اضطراب اللہ کی یاد سے وابستہ ہوتا ہے۔

مقصدِ حیات اور مرکزِ محبت (مقصودِ جاں)

شعر کا دوسرا مصرع کہتا ہے کہ "جس کا نام نبض میں ہو، وہی جان کا مقصود ہے"۔ اسلام کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ انسان کا "مقصودِ کل" صرف اللہ کی ذات ہو۔

قرآنی نقطہ نظر: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (سورہ البقرہ:165) یعنی "جو لوگ ایمان والے ہیں، وہ سب سے زیادہ محبت اللہ ہی سے کرتے ہیں۔" جب محبت شدید ہو جائے تو وہی "مقصودِ جاں" بن جاتی ہے اور انسان کے ہر عمل کا محرک وہی بنتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ جس کا نام نبض میں ہے، وہی اس کی منزل ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں اس کی تصدیق یوں ملتی ہے:

"اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ) "(صحیح بخاری)

"انسان (قیامت کے دن) اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔"

اگر دنیا میں کسی کی روح کا مقصود اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو اس کا انجام بھی انہی کے قرب میں ہوگا۔

خلاصہ

قرآن و حدیث کے مطابق، انسان کی پہچان اس کے **"مطلوب "** سے ہوتی ہے۔ اگر انسان کے دل کی تڑپ (نبض) ذکرِ خدا سے ہے، تو وہ کامیاب ہے، اور اگر اس کی تڑپ دنیاوی مال و جاہ کے لیے ہے، تو وہی اس کا "مقصود" ہے جو کہ فانی ہے۔

اس شعر میں بیان کردہ حقیقت صرف شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ **طبی** (Medical) اور **سائنسی** (Scientific) لحاظ سے ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ انسانی جسم اور جذبات کا آپس میں گہرا تعلق ہے، جسے سائنس "Psychosomatic Response" (نفسیاتی-جسمانی ردِ عمل) کہتی ہے۔

طبی اور سائنسی نقطہ نظر سے اس کی تعبیر درج ذیل ہے:

اعصابی نظام کا ردِ عمل (Autonomic Nervous System)

جب انسان کسی ایسی چیز یا ہستی کا نام سنتا ہے جس سے وہ شدید محبت یا لگاؤ رکھتا ہے، تو اس کا دماغ) خاص طور پر Amygdala اور Hypothalamus) فوری طور پر متحرک ہو جاتا ہے۔

- **سائنسی عمل:** دماغ کا خودکار اعصابی نظام (Sympathetic Nervous System) متحرک ہوتا ہے، جو جسم میں **ایڈرینالین (Adrenaline)** ہارمون خارج کرتا ہے۔
- **نتیجہ:** اس ہارمون کے اخراج سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور خون کی گردش کی رفتار بڑھ جاتی ہے، جسے طبی زبان میں **Tachycardia** یا عام فہم میں "نبض کا تیز ہونا" کہتے ہیں۔

ابنِ سینا کا "نبض ٹیسٹ" (تاریخی طبی پس منظر)

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ شعر جس واقعے کی طرف اشارہ کر رہا ہے (جو مثنویِ رومی میں بھی ہے)، وہ قدیم طب کا ایک مشہور طریقہ علاج رہا ہے۔ **بو علی سینا** نے ایک مریض کا علاج اسی طرح کیا تھا:

- انہوں نے مریض کی کلائی پر ہاتھ رکھا اور مختلف شہروں اور لوگوں کے نام لیے۔
- جب ایک مخصوص نام لیا گیا، تو مریض کی نبض کی رفتار اچانک بدل گئی۔
- **طبی تشریح:** ابنِ سینا نے یہ ثابت کیا کہ انسانی نبض صرف جسمانی بیماری ہی نہیں بتاتی، بلکہ وہ **لاشعوری جذبات (Subconscious Emotions)** کی عکاسی بھی کرتی ہے۔

ہارمونز کا کیمیائی کھیل (Biochemistry)

محبت اور عقیدت کی صورت میں دماغ میں **ڈوپامائن** (Dopamine) اور **آکسی ٹوسن** (Oxytocin) جیسے "خوشی کے ہارمونز" پیدا ہوتے ہیں۔

- جب محبوب یا "مقصودِ جاں" کا تذکرہ ہوتا ہے، تو دماغ کا **Reward System** متحرک ہو جاتا ہے۔
- اس کیمیائی تبدیلی کا براہِ راست اثر دورانِ خون پر پڑتا ہے، جس سے نبض کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ سائنس کے مطابق، نبض کی یہ تبدیلی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس شخص کے لیے آپ کے اعصاب میں ایک خاص "جذباتی اہمیت (Emotional Significance) " موجود ہے۔

جدید جھوٹ پکڑنے والی مشین (Polygraph)

آج کی جدید سائنس میں **لائی ڈیٹیکٹر** (Lie Detector) یا پولی گراف مشین بھی اسی اصول پر کام کرتی ہے۔

- یہ مشین نبض، سانس کی رفتار اور پسینے کے اخراج کو ناپتی ہے۔
- جب کوئی نام یا سوال انسان کے اندرونی جذبات یا حقیقت سے ٹکراتا ہے، تو جسمانی ردِ عمل (نبض کا بدلنا) اس کے **"مقصودِ جاں "** یا چھپے ہوئے سچ کو ظاہر کر دیتا ہے۔

خلاصہ

سائنسی طور پر، نبض کا کسی نام پر غیر معمولی ردِ عمل ظاہر کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ نام اس شخص کے **عصبی نظام** (Nervous System) میں مرکزی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ گویا نبض ایک "بائیو میٹرک گواہ" ہے جو بتاتی ہے کہ آپ کا حقیقی مرکزِ توجہ (Focus) کیا ہے۔

اس شعر کی **روحانی، وجدانی اور عرفانی** تعبیر مادیت سے بلند ہو کر اس مقامِ عشق کی بات کرتی ہے جہاں "نبض" محض خون کی گردش نہیں رہتی، بلکہ ایک غیبی تار بن جاتی ہے۔ صوفیا کے ہاں اس کی تعبیر کچھ یوں ہے:

روحانی تعبیر: (Spiritual Interpretation) روح کی پکار

روحانیت میں "نبض" سے مراد روح کی وہ بے چینی اور تڑپ ہے جو اسے اپنے اصل (خالق) کی طرف کھینچتی ہے۔

- **روح کا قیدی ہونا:** روح اس مادی بدن میں ایک قیدی کی طرح ہے۔ جیسے پرندہ قفس میں پھڑ پھڑاتا ہے، ویسے ہی جب روح اپنے محبوبِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کا نام یا اس کی یاد پاتی ہے، تو وہ تڑپ اٹھتی ہے۔
- **پہچان کا عمل:** روحانی طبیب (مرشدِ کامل) مرید کی باطنی نبض دیکھتا ہے کہ اس کے دل میں دنیا کی طلب کی تڑپ ہے یا مولیٰ کی؟ روحانی تعبیر یہ ہے کہ جب تک نبض میں "نامِ حق" کی تڑپ پیدا نہ ہو، انسان اپنی روح کے اصل مقصود کو نہیں پا سکتا۔

وجدانی تعبیر: (Intuitive/Ecstatic Interpretation)

کیفیتِ جذب و مستی

وجدان اس باطنی احساس کو کہتے ہیں جو دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس نقطہ نظر سے:

- **عقل بمقابلہ عشق:** عقل نام پوچھتی ہے، جبکہ وجدان "نام" سنتے ہی رقص کرنے لگتا ہے۔ شعر کا وجدانی پہلو یہ ہے کہ جب محبوب کا نام لیا جائے تو عاشق کی حالت غیر ہو جاتی ہے؛ یہ حالتِ وجد (Ecstasy) ہی اس بات کی گواہی ہے کہ اس کا تعلق کس سے ہے۔
- **بے ساختگی:** وجدان میں نبض کا کسی نام پر دھڑکنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ محبت دکھاوا نہیں بلکہ رگ و پے میں رچی ہوئی حقیقت ہے۔ یہاں نبض کا "تیز ہونا" دراصل دل کا وہ **"سماع"** ہے جو خاموشی میں بھی جاری رہتا ہے۔

3. عرفانی تعبیر: (Gnostic/Mystical Interpretation) حقیقتِ فنا و بقا

عرفان (Gnosis) کی رو سے یہ شعر کائنات کے ایک عظیم راز کو فاش کرتا ہے:

- **مرکزِ کائنات:** عارف کے نزدیک کائنات کی ہر حرکت کسی نہ کسی "نام" کی مرہونِ منت ہے۔ جس طرح انسان کی نبض کسی محبوب کے نام سے ہلتی ہے، اسی طرح پوری کائنات کی نبض "اسمِ اعظم" سے چل رہی ہے۔

- **مقصودِ جاں کی معرفت:** عارف وہ ہے جس نے پہچان لیا کہ اس کی جان کا اصل مقصود اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر "نبض" اور "نام" الگ نہیں رہتے۔
- **فنافی المحبوب:** عرفانی تعبیر میں جب نبض کسی کے نام پر ٹھہر جائے یا تڑپ جائے، تو اس کا مطلب ہے کہ عاشق کی اپنی ہستی مٹ چکی ہے اور اب وہاں صرف محبوب کا نام باقی رہ گیا ہے۔ یعنی:

"میں تو نہیں ہوں، وہی ہے جس کی تڑپ میری رگوں میں جاری ہے۔"

یہ شعر اپنی سادگی، معنویت اور فنی پختگی کے لحاظ سے فارسی ادب کا ایک شاہکار نمونہ ہے۔ اس کے شعری محاسن درج ذیل نکات میں سموئے جا سکتے ہیں:

شعری محاسن

1. سہلِ ممتنع (Simplicity and Profundity)

اس شعر کا سب سے بڑا حسن اس کی سادگی ہے۔ شاعر نے نہایت سادہ الفاظ استعمال کیے ہیں جو عام فہم ہیں، لیکن ان کے پیچھے چھپا ہوا مفہوم اس قدر گہرا ہے کہ اسے بیان کرنے کے لیے دفتر درکار ہیں۔ اسے ادب کی اصطلاح میں ***سہلِ ممتنع*** کہتے ہیں — یعنی ایسا کلام جو بظاہر آسان لگے مگر اس جیسا لکھنا مشکل ہو۔

2. استعارہ اور مجازِ مرسل (Metaphor & Metonymy)

- **نبض:** یہاں نبض محض ایک طبی علامت نہیں ہے، بلکہ یہ **"پوشیدہ جذبات"** اور **"قلبی واردات"** کا استعارہ ہے۔
- **نام:** یہ کسی ہستی کی یاد اور اس کے اثر کا استعارہ ہے۔ شاعر نے ایک چھوٹے سے جسمانی فعل (نبض کی حرکت) کو ایک وسیع روحانی مفہوم (مقصودِ جاں) سے جوڑ کر کمالِ فن دکھایا ہے۔

3. صنعتِ تکرار (Repetition)

شعر میں لفظ **"جہان"** دو بار استعمال ہوا ہے:

- پہلی بار یہ "گردشِ دوراں" یا خارجی دنیا کے معنوں میں آسکتا ہے۔

- دوسری بار یہ "انسان کی اپنی دنیا" یا کائناتِ ہستی کے معنوں میں ہے۔ یہ تکرار کلام میں موسیقی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر زور دیتی ہے کہ انسان کا اصل "جہان" وہی ہے جہاں اس کا "مقصود" بسا ہوا ہے۔

4. حسنِ تعلیل (Poetic Causality)

شاعر نے نبض کے دھڑکنے کی ایک ایسی وجہ بیان کی ہے جو طبی نہیں بلکہ جذباتی اور روحانی ہے۔ نبض کا تیز ہونا ایک قدرتی عمل ہے، لیکن اسے کسی خاص "نام" سے منسوب کر دینا **حسنِ تعلیل** کی ایک خوبصورت مثال ہے (یعنی کسی عمل کی ایسی وجہ بیان کرنا جو حقیقت میں نہ ہو مگر شاعرانہ لحاظ سے بہت دلکش ہو)۔

5. منطقی ربط اور ایجاز (Logical Flow & Conciseness)

شعر کے دونوں مصرعے ایک دوسرے کے ساتھ منطقی طور پر جڑے ہوئے ہیں:

- **پہلا مصرع (دعویٰ)**: نبض کی حرکت سے محبوب کی شناخت ہوتی ہے۔
- **دوسرا مصرع (دلیل)**: کیونکہ جس کی یاد خون میں شامل ہو، وہی زندگی کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اتنے بڑے فلسفے کو صرف دو مصرعوں میں سمیٹ لینا **ایجاز و اختصار** کا بہترین نمونہ ہے۔

6. نغمگی اور آہنگ (Musicality)

فارسی بحر کا انتخاب ایسا ہے کہ شعر میں ایک خاص قسم کا اتار چڑھاؤ محسوس ہوتا ہے جو نبض کی دھڑکن (Rhythm) سے مماثلت رکھتا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے ایک وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو صوفیانہ شاعری کا خاصہ ہے۔

حاصلِ بحث

اس شعر کا فنی کمال یہ ہے کہ یہ **طبیب** (Physician)، **عاشق** (Lover) اور **عارف** (Gnostic) تینوں کے لیے یکساں کشش رکھتا ہے۔ شاعر نے انسانی اناٹومی (Anatomy) کو انسانی نفسیات اور الہیات سے جوڑ کر اسے آفاقی بنا دیا ہے۔

اس شعر کا مرکزی تخیل یعنی **"نبض کا تڑپنا اور محبوب کا پتا دینا"**، اردو اور فارسی شاعری کا ایک نہایت محبوب موضوع رہا ہے۔ قدیم شعراء نے اسے "عشقِ مجازی" اور "دردِ دل" کے پیرائے میں برتا، جبکہ جدید اور خاص طور پر علامہ اقبال جیسے شعراء نے اسے "عشقِ حقیقی" اور "قومی بیداری" کے لیے استعمال کیا۔

درج ذیل میں مختلف ادوار کے شعراء کے خیالات کا خلاصہ پیش ہے:

.1 قدیم اور کلاسیکی شعراء (فارسی و اردو)

قدیم شعراء کے ہاں "نبض" اور "طبیب" کا استعارہ محبوب کے چھپے ہوئے نام کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

- **مولانا روم (خالقِ شعر)**: رومی کے ہاں نبض کا بدلنا اس بات کی دلیل ہے کہ عشق کوئی جسمانی بیماری نہیں بلکہ ایک ماورائی حقیقت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جیسے دھوپ دیوار پر پڑتی ہے تو اس کا تعلق سورج سے ہوتا ہے، ویسے ہی نبض کی تڑپ کا تعلق روح کے محبوب سے ہوتا ہے۔
- **میر تقی میر**: میر کے ہاں نبض کا دکھانا ایک بے بسی کی علامت ہے۔ وہ کہتے ہیں:

نبض دیکھ کر کہا طبیب نے افسوس

کہ خاک ہو گیا یہ تو انتظار میں

(یعنی میر کے ہاں نبض محبوب کا نام نہیں لیتی بلکہ اس کی جدائی میں ہونے والی بربادی کی گواہی دیتی ہے)۔

- **مرزا غالب**: غالب نے نبض اور خون کی گردش کو زندگی کی علامت قرار دیا، مگر اسے ایک بلند معیار پر رکھا:

رگوں میں دوڑنے کے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

)غالب کہتے ہیں کہ اگر نبض کی وہ تڑپ آنکھ سے آنسو بن کر نہ نکلے، تو ایسی گردش کا کیا فائدہ؟(

.2 علامہ اقبال (حکیم الامت کا نقطہ نظر)

اقبال نے اس "نبض" کے تصور کو فرد سے نکال کر پوری امت اور "خودی" پر لاگو کیا۔ اقبال کے نزدیک نبض کی تڑپ کا "مقصود" صرف اللہ کی ذات اور رسول اللہ ﷺ کی محبت ہونی چاہیے۔

- **مقصودِ جاں**: اقبال فرماتے ہیں کہ اگر مسلمان کی نبض میں "لا الہ الا اللہ" کی تڑپ موجود ہے، تو وہ زندہ ہے، ورنہ وہ ایک زندہ لاش ہے۔

دلِ سوزِ عشق سے ہے، رگِ جاں میں ہے تپش

کہ اسی تپش سے ہے تیرے سوزِ دروں کی زندگی

- اقبال کے ہاں نبض کی حرکت "حرکت و عمل" کی علامت ہے۔ وہ اس شخص کو مردِ مومن کہتے ہیں جس کی نبض زمانے کی رفتار کا ساتھ دینے کے بجائے زمانے کو اپنے پیچھے چلانے کی تڑپ رکھتی ہو۔

.3 جدید شعراء (نفسیاتی اور سماجی رنگ)

جدید شعراء نے نبض کو سچائی کے معیار (Yardstick of Sincerity) کے طور پر پیش کیا۔

- **احمد فراز یا فیض احمد فیض**: ان کے ہاں نبض کی تیزی کسی سماجی انقلاب کی آہٹ یا کسی سچے رشتے کی گواہی بن جاتی ہے۔
- جدید شعراء کہتے ہیں کہ آج کے مصنوعی دور میں جہاں چہروں پر نقاب ہیں، وہاں صرف "نبض" (اندرونی تڑپ) ہی ہے جو یہ بتا سکتی ہے کہ انسان کا حقیقی رخ کس طرف ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ فیض اب دل کی کیا حالت ہے؟

نبض ٹھہری ہے کہ کچھ ابھی تڑپ باقی ہے

موازنہ

دور	نبض کی علامت	مقصودِ جاں
قدیم	مرضِ عشق کی پہچان	محبوبِ مجازی (انسان)
اقبال	خودی اور ایمان کی تڑپ	اللہ اور اس کا رسول ﷺ
جدید	سچائی اور اضطراب	مقصدیت اور انسانیت

فارسی ادب کے یہ تینوں ستون (سعدی، حافظ، اور عراقی) عشق اور انسانی وارداتِ قلبی کے بڑے ترجمان ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک کا اسلوب اور زاویہ نگاہ مختلف ہے۔ اگر رومی کے اس شعر (نبض کا محبوب کے نام پر تڑپنا) کو ان تینوں کے رنگ میں دیکھا جائے، تو ان کی تعبیر کچھ یوں ہو گی:

1. شیخ سعدی شیرازی: (حکمت اور صداقت کا رنگ)

سعدی "حکیمِ مشرق" ہیں۔ وہ اس بات کو انسانی فطرت اور سچائی کے تناظر میں بیان کریں گے۔ ان کے ہاں عشق ایک ایسی سچائی ہے جو چھپائے نہیں چھپتی۔

- **سعدی کی تعبیر:** سعدی کہیں گے کہ اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ تمہیں زندگی کا مقصد مل گیا ہے، تو اپنی زندگی کے طور طریقے (نبض) دیکھو۔ اگر تمہارے عمل میں اس "نام" کی مٹھاس نہیں، تو تمہارا دعویٰ جھوٹا ہے۔
- **ممکنہ کلام کا رنگ:** ان کا مشہور تصور ہے کہ "عشق وہ درد ہے جس کی دوا خود درد ہی ہے"۔ وہ کہیں گے کہ طبیب کو نبض دکھانے کی ضرورت نہیں، عاشق کی زرد رنگت اور اس کی بے چینی خود پکار پکار کر اس کے "مقصودِ جاں" کا نام لے رہی ہوتی ہے۔ سعدی کے نزدیک نبض کا دھڑکنا **صداقتِ عشق** کی گواہی ہے۔

2. حافظ شیرازی: (رندی اور اسرار کا رنگ)

حافظ کے ہاں "نبض" اور "طبیب" کے استعارے بہت گہرے ہیں۔ وہ اکثر دنیاوی طبیبوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو عشق کی بیماری کو جسمانی مرض سمجھتے ہیں۔

- **حافظ کی تعبیر:** حافظ کہیں گے کہ اے طبیب! تو میری نبض کیا دیکھتا ہے؟ میری نبض تو اس "ساقی" کے ہاتھ میں ہے جس کے ذکر سے محفلِ عرفان روشن ہے۔
- **ممکنہ کلام کا رنگ:** حافظ اس شعر کو **"رازِ الٰہی"** سے جوڑ دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ کائنات کی ہر نبض میں اسی کا نام رواں ہے، مگر اسے سننے کے لیے "گوشِ ہوش" (شعور کے کان) چاہیے۔ حافظ کے نزدیک نبض کا تڑپنا محبوب کی **تجلی کا اثر** ہے، جو انسان کو خود سے بے خود کر دیتا ہے۔ ان کا رنگ یہ ہو گا:

"طبیبِ عشق مسیحا دم است و مشفق لیک　　　چو درد در تو نبیند کرا دوا بکند"

(عشق کا طبیب مسیحا صفت ہے، مگر جب تک وہ تمہاری نبض میں تڑپ اور درد نہ دیکھ لے، دوا کس کی کرے؟)

.3 فخر الدین عراقی: (جذب اور وحدت کا رنگ)

عراقی صوفی شاعر ہیں اور ان کا کلام سراپا "سوز و گداز" ہے۔ ان کے ہاں عاشق اور محبوب میں دوئی (Duality) ختم ہو جاتی ہے۔

- **عراقی کی تعبیر :** عراقی کہیں گے کہ نبض میں خون نہیں دوڑ رہا، بلکہ محبوب کا نام ہی رگوں میں گردش کر رہا ہے۔ وہ "مقصودِ جاں" کو کوئی بیرونی شے نہیں بلکہ اپنی روح کے اندر کی حقیقت قرار دیں گے۔
- **ممکنہ کلام کا رنگ :** عراقی کے لیے نبض کا ہر جھٹکا **"ھُو" (وہی ہے)** کی صدا ہے۔ وہ کہیں گے کہ جب کائنات میں اس کے سوا کوئی ہے ہی نہیں، تو نبض میں کسی اور کا نام کیسے آ سکتا ہے؟ عراقی کے ہاں یہ شعر **"فنا فی اللہ "** کی کیفیت بن جائے گا، جہاں انسان کی اپنی ہستی مٹ جاتی ہے اور صرف مقصودِ حقیقی باقی رہ جاتا ہے۔

خلاصہِ موازنہ

شاعر	**تعبیر کا مرکز**	**نبض کیا بتاتی ہے؟**
سعدی	انسانی صداقت	کہ تمہارا دعویٰ کتنا سچا ہے؟
حافظ	جمالِ محبوب	کہ تم کس کے حسن کے اسیر ہو؟
عراقی	وحدتِ الٰہی	کہ تمہاری رگوں میں خون نہیں، محبوب دوڑ رہا ہے۔

ان تینوں شعراء کے نزدیک، رومی کا یہ شعر دراصل **"انسان کی باطنی عدالت "** کا فیصلہ ہے؛ کہ اے انسان! تو زبان سے کچھ بھی کہے، تیری تڑپ (نبض) بتا دیتی ہے کہ تیرا اصلی خدا (مقصود) کون ہے — دنیا یا خدا؟

حاصلِ کلام

تمام شعراء اس بات پر متفق ہیں کہ **"انسان وہ نہیں جو نظر آتا ہے، بلکہ وہ ہے جس کی تڑپ اس کے اندر (نبض میں) چھپی ہوئی ہے"**۔ رومی کا یہ شعر دراصل تمام شعراء کے لیے ایک بنیاد فراہم کرتا ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد پہچاننے کے لیے اپنے دل کی دھڑکنوں کا موازنہ کرو کہ وہ کس کے لیے بے چین ہوتی ہیں۔

دوستان و شہر او را بَر شِمُرد
بعد از آن شہرے دِگر را نام بُرد

مشکل الفاظ کے معنی

دوستان: دوست، احباب، تعلق رکھنے والے۔۔۔ شہر او: اُس کا شہر، اُس کی بستی۔۔۔ بَر شِمُرد: شمار کیا، گنوایا، ایک ایک کر کے بیان کیا۔۔۔ بعد از آن: اس کے بعد۔۔ شہری دِگر: کوئی دوسرا شہر، نئ بستی۔۔ نام بُرد: نام لیا، ذکر کیا "(طبیب نے) اس کے دوستوں اور اس کے شہر کا (ایک ایک کر کے) ذکر کیا، اس کے بعد ایک دوسرے شہر کا نام لیا"۔

یعنی اس نے پہلے اپنے دوستوں اور اپنے شہر کے لوگوں کو ایک ایک کر کے بیان کیا، پھر اس کے بعد کسی دوسرے شہر کا نام لینے لگا۔

پس منظر:

بادشاہ کی ایک خوبصورت کنیز شدید بیمار ہو گئی تھی اور دنیا کے بڑے بڑے طبیب اس کا علاج کرنے میں ناکام رہے تھے۔ آخر کار ایک اللہ والے طبیب (حکیمِ الٰہی) تشریف لائے۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ بیماری جسمانی نہیں بلکہ روحانی اور نفسیاتی ہے، یعنی یہ 'عشق' کا معاملہ ہے۔

شعر کی وضاحت:

تشخیصی طریقہ کار

اس شعر میں مولانا روم بیان کر رہے ہیں کہ طبیب نے کنیز کی نبض پر ہاتھ رکھا اور مختلف شہروں، علاقوں اور وہاں کے رہنے والے لوگوں کے نام لینے شروع کیے۔ اس کا مقصد یہ دیکھنا تھا کہ کس شہر یا کس شخص کے نام پر کنیز کی نبض کی رفتار تیز ہوتی ہے۔

نفسیاتی علاج:

یہ قدیم دور کا 'سائیکو اینالیسس (Psychological Analysis) ' تھا۔ طبیب جاننا چاہتا تھا کہ کنیز کا دل کہاں اٹکا ہوا ہے۔ وہ ایک شہر کا تذکرہ کرتا، پھر دوسرے کا، تاکہ ردِ عمل نوٹ کر سکے۔

تلاشِ حق: صوفیانہ نقطہ نظر سے اس کی تشریح یہ بھی کی جاتی ہے کہ مرشدِ کامل (طبیب) مرید (کنیز) کے دل کے احوال کا جائزہ لیتا ہے تاکہ اسے دنیاوی وابستگیوں سے نکال کر اصل منزل (عشقِ حقیقی) کی طرف لے جا سکے۔

حاصلِ کلام:

یہ شعر اس لمحے کی عکاسی کرتا ہے جہاں طبیب بڑی مہارت سے کنیز کے ماضی اور اس کی یادوں کو کرید رہا ہے تاکہ اس پوشیدہ راز (محبت) تک پہنچ سکے جو اس کی بیماری کا اصل سبب ہے۔ اس کے فوراً بعد والے اشعار میں ذکر آتا ہے کہ جب 'سمرقند' کا نام لیا گیا تو کنیز کی نبض بے قابو ہو گئی اور اس کا راز فاش ہو گیا۔

سالک پہلے اپنی پرانی وابستگیوں کا جائزہ لیتا ہے، پھر جب دل ان سے آگے بڑھتا ہے تو ایک نئے روحانی شہر (قربِ الٰہی، معرفت) کا نام لیتا ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جسے قرآن میں یوں اشارۃً بیان کیا گیا:

وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (اور خود تمہارے اندر بھی نشانیاں ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں؟) (ذاریت:۲۱)

مولانا روم کے اس شعر اور اس پوری حکایت کی تعبیر اگر ہم قرآن و سنت کی روشنی میں کریں، تو یہ محض ایک طبیب اور مریضہ کا قصہ نہیں رہتا، بلکہ یہ 'تزکیہ نفس' اور 'امراضِ قلب' (باطنی بیماریوں) کی ایک گہری تمثیل بن جاتا ہے۔

امراضِ قلب اور ان کی تشخیص

قرآن کریم میں کئی جگہ 'دل کی بیماری' کا ذکر آیا ہے، جیسے:

فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ (ان کے دلوں میں بیماری ہے)۔ [البقرہ:10]

جس طرح اس حکایت میں کنیز کا مرض ظاہری نہیں بلکہ پوشیدہ (عشقِ مجازی) تھا، اسی طرح بہت سے انسان حسد، کینہ، حد سے بڑھی ہوئی دنیاوی محبت یا حبِ جاہ (شہرت کی بھوک) میں مبتلا ہوتے ہیں۔

تعبیر: اس شعر میں "طبیب" سے مراد وہ مرشدِ کامل یا عالمِ دین ہے جو قرآن و سنت کی روشنی میں انسان کے باطن کا جائزہ لیتا ہے اور یہ پہچانتا ہے کہ اس کا دل اللہ کے بجائے کن دنیاوی بتوں (شہروں اور دوستوں) میں اٹکا ہوا ہے۔

دنیاوی وابستگیوں کی پہچان

شعر میں طبیب ایک ایک کر کے شہروں اور دوستوں کا تذکرہ کرتا ہے تاکہ پتا چلے کہ کنیز کا دل کہاں دھڑکتا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کی آزمائش ان اشیاء میں ہے جن سے وہ محبت کرتا ہے:

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ

"اور جان لو تمہارے لیے تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہیں۔" [انفال:۲۸]

تعبیر: "شہروں اور دوستوں" کے نام لینا دراصل ان تعلقات اور خواہشات کی نمائندگی کرتا ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیتے ہیں۔ جب تک ان بیماریوں کی صحیح تشخیص (Identification) نہ ہو، علاج ممکن نہیں۔

حکیمِ حاذق (مرشدِ معنوی) کی ضرورت

جس طرح کنیز خود اپنی بیماری نہیں بتا پا رہی تھی اور اسے ایک ماہر طبیب کی ضرورت پڑی، اسی طرح دین میں بھی تزکیہ کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

فَسۡـَٔلُوٓاْ أَهۡلَ ٱلذِّكۡرِ إِن كُنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ

(پس تم اہل اللہ / اہلِ علم سے پوچھو اگر تم خود نہیں جانتے)۔ [النحل:43]

تعبیر: اس شعر میں طبیب کا عمل اس بات کی دلیل ہے کہ ایک مصلح (اصلاح کرنے والا) مرید کی نفسیات اور اس کے ماحول کا مطالعہ کر کے ہی اس کے روحانی علاج کی تدبیر کرتا ہے۔

سچائی کا ظہور (صدق)

جب طبیب نے صحیح شہر کا نام لیا تو کنیز کا راز کھل گیا۔ اسلام میں 'صدق' (سچائی) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جب تک انسان اپنے عیب کو تسلیم نہ کرے، توبہ کا دروازہ نہیں کھلتا۔

تعبیر: یہ مرحلہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان کے سامنے اس کی باطنی کمزوری واضح ہو جائے، تو اسے چھپانے کے بجائے اللہ کے حضور پیش کر دینا چاہیے تاکہ شفا مل سکے۔

خلاصہ: قرآن و سنت کی روشنی میں اس شعر کی تعبیر یہ ہے کہ انسان کا باطن اس کے ظاہر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب نبض دیکھ کر دل کا حال جان لیتا ہے، اسی طرح اللہ والے بصیرت کے نور سے یہ جان لیتے ہیں کہ بندہ کن دنیاوی علائق میں پھنسا ہوا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ دل کو "غیر اللہ" کی محبت سے نکال کر "اللہ کی محبت" کی طرف موڑ دیا جائے (یعنی مرضِ عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کی شفا میں بدل دیا جائے)۔

مولانا رومؒ کے کلام کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی تہیں پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک کے بعد ایک کھلتی ہیں۔ اس شعر کی **روحانی، عرفانی اور نورانی** تعبیر مادّی دنیا سے بلند ہو کر "عالمِ باطن" کے سفر کی عکاسی کرتی ہے:

کشفِ اسرار اور فِراستِ مومن

عرفان (Gnosis) کی رو سے یہ شعر محض ایک معائنے کا نام نہیں، بلکہ '**کشف**' کا مقام ہے۔

- **پیرِ کامل کی بصیرت:** یہاں طبیب سے مراد "مرشدِ کامل" ہے جو مرید کے دل کی دھڑکنوں (وارداتِ قلبی) سے واقف ہوتا ہے۔ وہ مرید کی زبان سے سنے بغیر اس کے باطن کے پوشیدہ بتوں کو پہچان لیتا ہے۔
- **ناموں کا جادو:** جب طبیب ایک ایک کر کے شہروں کے نام لیتا ہے، تو یہ ایک صوفیانہ عمل ہے جسے '**تفتیشِ قلب**' کہتے ہیں۔ عارف یہ دیکھتا ہے کہ سالک (راستہ چلنے والا) کا دل کس جگہ پر آ کر اٹک گیا ہے اور اسے کس مقام پر "حجاب" (پردہ) آ گیا ہے۔

روح کی قید اور اس کی اصل کی تلاش

روحانی نقطہ نظر سے اس کی تعبیر روح کے اس سفر سے ہے جو وہ عالمِ ارواح سے اس مٹی کی دنیا تک کرتی ہے۔

- **تعلقاتِ ماسوا"** : دوست اور شہر "ان دنیاوی وابستگیوں کی علامت ہیں جن میں انسانی روح گرفتار ہو جاتی ہے۔ روح اصل میں اللہ کی طرف سے آئی تھی، لیکن دنیا میں آکر وہ "سمرقند" (دنیاوی حسن و لذت) کی اسیر ہو گئی۔
- **روحانی جراحی (Surgery):** روحانی طبیب مرید کے اندر سے ان تمام "شہروں" (خواہشات کے مراکز) کو کرید کر باہر نکالتا ہے تاکہ روح اپنے اصل مرکز یعنی "عشقِ الٰہی" کی طرف لوٹ سکے۔ یہ شعر اس نفسیاتی کرب کو ظاہر کرتا ہے جب انسان اپنی پرانی یادوں اور وابستگیوں سے گزر کر حقیقت کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

نورِ بصیرت کا ظہور

نورانیت کے پہلو سے اس شعر کا تعلق اس حدیثِ قدسی سے ہے" : جب میں بندے سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے"۔

- **نورِ الٰہی سے دیکھنا :** یہاں طبیب کی نگاہیں "نورِ الٰہی" سے منور ہیں۔ وہ کنیز کی نبض نہیں دیکھ رہا، بلکہ اس کے باطن میں موجود اس نور کی رکاوٹ کو دیکھ رہا ہے جو "دنیاوی غبار" کی وجہ سے دھندلا گیا ہے۔
- **تنویرِ باطن :** جب طبیب "دوسرے شہر" کا نام لیتا ہے، تو وہ دراصل مرید کے باطن پر ایک ایسی روشنی ڈالتا ہے جس سے اس کے چھپے ہوئے عیب یا عشق ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں باطل کا اندھیرا چھٹتا ہے اور حق کا نور ظاہر ہوتا ہے۔

خلاصہِ معرفت

مولانا روم ہمیں یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ:

انسان کا باطن ایک ایسی کتاب ہے جس کے حروف صرف وہی پڑھ سکتا ہے جس کی آنکھیں دنیا کی چمک دمک سے اندھی نہ ہوئی ہوں اور جس کا دل نورِ معرفت سے منور ہو۔

وہ "شہر دگر" (دوسرا شہر) دراصل وہ مقام ہے جہاں انسان کی انا (Ego) مٹتی ہے اور اسے اپنی اصل حقیقت کا پتا چلتا ہے۔

مولانا روم کا یہ شعر اپنی فطرت میں **تشخیصی اور حکیمانہ** ہے۔ مولانا یہاں ایک قصہ گو کی حیثیت سے انسانی نفسیات کی تہیں کھول رہے ہیں۔ جب ہم اس شعر کے موضوع (یعنی مرضِ عشق کی تشخیص اور محبوب کی تلاش) کو عراقی، سعدی اور حافظ جیسے عظیم شعراء کے کلام کے آئینے میں دیکھتے ہیں، تو رنگ بدل جاتا ہے۔

ان شعراء کے ہاں اس کیفیت کی تعبیر درج ذیل ہے:

۱. فخر الدین عراقی: (سوز و گداز اور تجلیات)

عراقی **عشقِ محض** کے شاعر ہیں۔ رومی کے ہاں جہاں "طبیب" ایک کردار ہے، عراقی کے ہاں وہ "تجلی" بن جاتا ہے۔

- **تعبیر**: عراقی کے نزدیک وہ "شہر" جہاں سے کنیز کا تعلق ہے، دراصل **'عالمِ ارواح'** ہے۔ عراقی کہیں گے کہ طبیب شہروں کے نام نہیں لے رہا، بلکہ وہ ان پردوں کو ہٹا رہا ہے جو روح اور اللہ کے درمیان حائل ہیں۔
- **نقطہ نظر**: عراقی کے ہاں "شہر دگر" (دوسرا شہر) اس وحدت کی علامت ہے جہاں پہنچ کر کثرت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

نخستین بادہ اندر جام کردند ✪ ز چشم مست ساقی وام کردند

(پہلی شراب جب جام میں ڈالی گئی، تو وہ ساقی کی مست آنکھوں سے مستعار لی گئی تھی)۔

۲. شیخ سعدی شیرازی: (حقیقت پسندی اور انسانی نفسیات)

سعدی **'سہلِ ممتنع'** اور انسانی جذبات کے حقیقت پسندانہ بیان کے امام ہیں۔ مولانا کے اس شعر میں جو "طبیب اور مریض" کا رشتہ ہے، سعدی اسے ایک اخلاقی اور انسانی تجربے کے طور پر دیکھتے ہیں۔

- **تعبیر**: سعدی کے ہاں عشق چھپائے نہیں چھپتا۔ اگر رومی کا طبیب نبض دیکھ رہا ہے، تو سعدی کہیں گے کہ عاشق کا چہرہ ہی اس کا شہر اور اس کا حال پکار پکار کر بتا رہا ہے۔
- **نقطہ نظر**: سعدی اس "شہرِ دگر" کو ایک ایسی منزل قرار دیں گے جہاں پہنچ کر مسافر کو سکون ملتا ہے۔ سعدی فرماتے ہیں:

دوست مشفق و طبیب حاذق   ہر دو بر بالینِ من اند

(مہربان دوست اور ماہر طبیب دونوں میرے سرہانے ہیں، مگر میرا علاج صرف دیدارِ یار ہے)۔

۳. لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی: (رندی اور اسرارِ الٰہی)

حافظ کے ہاں یہ پورا منظر ایک **'راز'** (Mystery) 'بن جاتا ہے۔ رومی کا طبیب اگر نبض شناس ہے، تو حافظ کا طبیب "پیرِ مغاں" ہے جو جامِ جم میں سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔

- **تعبیر**: حافظ اس شعر کو **'رندانہ'** رنگ دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ طبیب کو شہروں کے نام لینے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ "عشق کا راستہ" کسی نقشے یا شہر کا محتاج نہیں۔
- **نورانی پہلو**: حافظ کے نزدیک "شہرِ دگر" وہ مقام ہے جسے وہ **'منزلِ جاناں'** کہتے ہیں۔ وہ طبیب کو مشورہ دیتے ہیں کہ نبض چھوڑ کر "بوئے یار" (محبوب کی خوشبو) تلاش کرے۔
- **موازنہ**: جہاں رومی "نام بُرد" (نام لیا) کہہ رہے ہیں، حافظ وہاں "اشارہ" کی بات کریں گے:

طبیبِ عشق مسیحادم است و مشفق، لیک / چو دردِ در تو نہ بیند، کہ را دوا بکند؟

(عشق کا طبیب مسیحا نفس ہے، مگر جب تک تمہارے اندر تڑپ نہ دیکھے، وہ کس کی دوا کرے؟)

موازنہ کی میز (تعبیرِ عرفانی و نورانی)

شاعر	طبیب کی حیثیت	"شہر" کی علامت	علاج کا طریقہ
رومی	پیرِ کامل / مرشد	مادی و روحانی وابستگیاں	نفسیاتی کرید اور تشخیص
عراقی	تجلیِ الٰہی	عالمِ اعیان و صفات	سوزِ دروں اور محویت
سعدی	مخلص دوست	جائے پناہ اور انسانی تعلق	صبر اور تسلیم و رضا
حافظ	پیرِ مغاں / صاحبِ سر	منزلِ مقصود (لاہوت)	ذوقِ نظر اور جامِ معرفت

جامع خلاصہ

- **رومی** کے ہاں یہ شعر **تعلیم** ہے (کہ مرشد کیسے مرید کی گرہیں کھولتا ہے)۔
- **عراقی** کے ہاں یہ **تڑپ** ہے (کہ روح اپنی اصل کی طرف کیسے لوٹتی ہے)۔
- **سعدی** کے ہاں یہ **حقیقت** ہے (کہ انسانی جبلت محبت کے سامنے کیسی بے بس ہے)۔
- **حافظ** کے ہاں یہ **راز** ہے (کہ دل کی دھڑکنیں ناموں کی محتاج نہیں بلکہ کیفیات کی اسیر ہیں)۔

نورانی لحاظ سے : ان تمام شعراء کا اتفاق اس بات پر ہے کہ جب تک "میں" کا شہر (خود پرستی) مسمار نہیں ہوتا، "شہرِ دگر" (عشقِ الٰہی کا شہر) آباد نہیں ہو سکتا۔

مولانا روم کے اس شعر میں بیان کردہ طریقہ کار محض ایک کہانی نہیں، بلکہ یہ **قدیم طب** اور **جدید نفسیاتی سائنس** کا ایک ایسا سنگ میل ہے جسے آج بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

طبی اور سائنسی لحاظ سے اس کی وضاحت درج ذیل ہے:

۱. قدیم طب (یونانی طب اور ابنِ سینا کا طریقہ کار)

تاریخی طور پر یہ واقعہ **بو علی سینا** سے منسوب ایک مشہور طبی معائنے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس دور میں "عشق" کو ایک باقاعدہ بیماری) **مالیخولیا-ئے-عشقی** (سمجھا جاتا تھا۔

- **تشخیصِ نبض :(Sphygmology)** قدیم اطباء نبض کی صرف رفتار نہیں، بلکہ اس کی ٹھوکر، لچک اور تال (Rhythm) سے باطنی کیفیات کا اندازہ لگاتے تھے۔
- **نفسیاتی ٹیسٹ :** جب طبیب نے شہروں کے نام لیے، تو وہ دراصل مریضہ کے **'نظامِ اعصاب '** کو تحریک (Stimulate) دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ نام آیا جس سے مریضہ کا جذباتی تعلق تھا، اس کے دل کی دھڑکن اور نبض کی ترتیب بدل گئی، جس سے مرض کی اصل وجہ (Psychosomatic cause) سامنے آگئی۔

جدید نفسیات (Psychology)

سائنسی نقطہ نظر سے اس عمل کو **'لفظی تلازمہ (Word Association Test)'** کہا جاتا ہے، جسے جدید نفسیات میں کارل جنگ (Carl Jung) نے متعارف کرایا۔

- **تحت الشعور کی ٹٹول:** انسان بہت سی باتیں شعوری طور پر چھپاتا ہے، لیکن اس کا **تحت الشعور (Subconscious)** مخصوص الفاظ یا ناموں پر ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔
- **جذباتی محرکات (Emotional Triggers):** طبیب کا ایک ایک کر کے شہروں کا نام لینا دراصل 'Stimulus' (محرک) فراہم کرنا تھا۔ سائنسی طور پر جب ہم کسی ایسی چیز کا نام سنتے ہیں جس سے ہمارا گہرا تعلق ہو، تو دماغ کا حصہ **'ایمیگڈالا (Amygdala)'** فوری طور پر فعال ہو جاتا ہے جو جسمانی ردِ عمل پیدا کرتا ہے۔

فزیالوجی اور پولی گراف (Lie Detector) کا اصول

آج کا **پولی گراف ٹیسٹ (جھوٹ پکڑنے والی مشین)** بالکل اسی سائنسی اصول پر کام کرتا ہے جس کا ذکر رومی نے ۷۰۰ سال پہلے کیا۔

- **خودکار نظامِ اعصاب (ANS):** جب انسان جذباتی دباؤ یا سچائی کو چھپانے کی کوشش میں کسی خاص محرک (نام یا جگہ) کا سامنا کرتا ہے، تو اس کا **Sympathetic Nervous System** بیدار ہو جاتا ہے۔
- **جسمانی تبدیلیاں:** اس کے نتیجے میں:
  1. بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔
  2. سانس کی رفتار بدلتی ہے۔
  3. نبض کی رفتار (Heart Rate) تیز ہو جاتی ہے۔

طبیب نے یہی سائنسی تبدیلی اپنی انگلیوں کی پوروں سے محسوس کی تھی۔

۴۔ تقابلی جائزہ (ٹیبل)

پہلو	رومی کا طبیب	جدید سائنس / طب
آلۂ تشخیص	انسانی انگلیاں (نبض)	ECG اور پولی گراف مشین
طریقہ کار	ناموں کا پکارنا (ذکرِ شہر)	Word Association / Stimuli
نظریہ	جسم اور روح کا ملاپ	Mind-Body Connection
مرض کی نوعیت	جذباتی الجھن (عشق)	Psychosomatic Disorder

سائنسی خلاصہ

سائنسی لحاظ سے یہ شعر **"سائیکو فزیولوجی (Psycho-physiology)"** کی بہترین مثال ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ انسانی جذبات محض خیالی نہیں ہوتے، بلکہ ان کے ٹھوس کیمیائی اور حیاتیاتی اثرات انسانی جسم پر مرتب ہوتے ہیں۔ رومی کا طبیب دراصل ایک ماہرِ نفسیات تھا جس نے 'کاؤنٹر کنڈیشننگ' کے ذریعے یہ معلوم کیا کہ مریضہ کی زندگی کا "مرکزِ ثقل (Center of Gravity)" کہاں ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کو اگر ہم **شعری محاسن، فنی نزاکتوں اور بلاغت** کے پیمانے پر پرکھیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے کس طرح نہایت سادہ الفاظ میں ایک پیچیدہ نفسیاتی اور ڈرامائی صورتحال کو سمو دیا ہے۔

اس شعر کے اہم شعری محاسن درج ذیل ہیں:

۱. سہلِ ممتنع (Simplicity and Profundity)

یہ شعر 'سہلِ ممتنع' کی بہترین مثال ہے۔ مولانا نے کوئی مشکل لفظ یا ثقیل تراکیب استعمال نہیں کیں، لیکن مفہوم اتنا گہرا ہے کہ پوری انسانی نفسیات اس میں سمٹ آئی ہے۔

- **خوبی:** عام فہم الفاظ (دوست، شہر، نام) کے ذریعے ایک ایسی کیفیت بیان کی گئی ہے جسے بیان کرنے کے لیے عام طور پر طویل نثر کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲. حسنِ ترتیب اور مراعات النظیر

شعر کے الفاظ کے درمیان ایک منطقی اور فطری ربط موجود ہے جسے علمِ بدیع میں **'مراعات النظیر'** کے قریب سمجھا جا سکتا ہے۔

- **ربط** " : دوستوں "، " شہر " اور پھر " شمار کرنا " (بر شِمُرد) کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جب کسی شہر کا ذکر ہوتا ہے تو وہاں کے رہنے والے دوستوں کا خیال خود بخود آتا ہے۔ مولانا نے ان تلازمات کو بڑی خوبصورتی سے یکجا کیا ہے۔

۳. ایجاز و اختصار (Conciseness)

ایجاز کا مطلب ہے کم سے کم الفاظ میں سمندر کو کوزے میں بند کرنا۔

- **فن :** طبیب نے کتنی دیر معائنہ کیا؟ کتنے شہروں کے نام لیے؟ اس طویل عمل کو مولانا نے صرف دو مصرعوں میں سمیٹ دیا۔ " بر شِمُرد " (گننا / شمار کرنا) کا ایک لفظ پورے طویل طبی معائنے کی عکاسی کر رہا ہے۔

۴. تجسس اور ڈرامائی کیفیت (Suspense)

شعر میں ایک خاص قسم کا ڈرامائی تسلسل پایا جاتا ہے جو قاری کو اگلے شعر کی طرف کھینچتا ہے۔

- **پہلا مصرع** " : اس کے دوستوں اور شہر کا ذکر کیا " (یہ ایک عام بات ہے)۔
- **دوسرا مصرع** " : بعد از آن شہری دِگر را نام بُرد " (اس کے بعد ایک دوسرے شہر کا نام لیا)۔
- **خوبی :** یہاں لفظ '**دِگر**' (دوسرا) میں سارا تجسس چھپا ہے۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے کہانی کا رخ بدلتا ہے اور قاری کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرا شہر کون سا تھا اور اس کا اثر کیا ہوا؟

۵. بحر اور آہنگ (Meter and Rhythm)

یہ شعر بحرِ رمل (مثمن مخبون محذوف) میں ہے : **فاعلاتن فاعلاتن فاعلن**۔

- **آہنگ :** اس بحر کی روانی نبض کی حرکت سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس میں ایک دھیما پن اور تسلسل ہے، جو ایک طبیب کے ٹھہرے ہوئے لہجے اور معائنے کے پر سکون ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔

۶. صنعتِ کنایہ (Allusion)

مولانا نے براہِ راست یہ نہیں کہا کہ طبیب اسے آزما رہا تھا، بلکہ " نام لینے " اور " شمار کرنے " کو '**کنایہ**' کے طور پر استعمال کیا ہے جو طبیب کی مہارت اور مریضہ کی جذباتی کیفیت کے درمیان ہونے والی خاموش گفتگو کو ظاہر کرتا ہے۔

۷ .نفسیاتی مرقع نگاری(Psychological Sketching)

شعر کا سب سے بڑا حسن اس کی **تصویر کشی** ہے۔

- پہلے مصرعے میں "ماضی" اور "مانوس یادوں" (اپنا شہر اور دوست) کا ذکر ہے۔
- دوسرے مصرعے میں "اجنبی" یا "مطلوبہ" مقام کی طرف منتقلی ہے۔ یہ انسانی فطرت کی عکاسی ہے کہ جب ہم اپنے پیاروں کا تذکرہ سنتے ہیں تو ردِ عمل اور ہوتا ہے، لیکن جب اس 'خاص' ہستی یا جگہ کا ذکر آئے جو دل کا مرکز ہو، تو خاموشی بھی بول اٹھتی ہے۔

حاصلِ کلام: فنی اعتبار سے یہ شعر '**بیانیہ شاعری** (Narrative Poetry)' کا شاہکار ہے۔ مولانا نے الفاظ کو معلومات دینے کے لیے نہیں بلکہ "کیفیت" پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

مولانا روم کا یہ شعر اور ان کا فلسفہ دورِ جدید کے انسان کے لیے محض ایک حکایت نہیں بلکہ ایک '**روڈ میپ**' ہے۔

آج کا انسان مادی ترقی کے عروج پر ہونے کے باوجود جس اندرونی خلفشار، تناؤ (Stress) اور اداسی کا شکار ہے، اس کا حل اسی 'رومی طرزِ تشخیص' میں چھپا ہے۔

دورِ جدید اور اس شعر کی ہم آہنگی کو ہم درج ذیل چار بڑے پہلوؤں سے سمجھ سکتے ہیں:

نفسیاتی صحت اور 'سائیکو سومیٹک' امراض

آج کی جدید میڈیکل سائنس یہ تسلیم کرتی ہے کہ ۸۰ فیصد بیماریاں (جیسے بلڈ پریشر، شوگر، مائیگرین) '**سائیکو سومیٹک**' (نفسیاتی و جسمانی) ہوتی ہیں۔

- **ہم آہنگی:** رومی کا طبیب کہتا ہے کہ دوا سے پہلے دعا اور گفتگو ضروری ہے۔ آج کا 'سائیکو تھراپسٹ' بھی وہی کر رہا ہے جو اس طبیب نے کیا؛ یعنی مریض کے ماضی، اس کی محرومیوں اور اس کے 'شہروں' (یادوں) کو کریدنا تاکہ مرض کی جڑ تک پہنچا جا سکے۔

۲ .ڈیجیٹل دور اور الگورتھم(Algorithms)

حیرت انگیز طور پر، آج کے دور کا **سوشل میڈیا الگورتھم** بالکل اسی 'طبیب' کی طرح کام کر رہا ہے، مگر ایک مختلف مقصد کے لیے۔

- **ہم آہنگی:** آپ کا فون آپ کے 'دوستوں اور شہروں' (براؤزنگ ہسٹری) کو شمار کرتا ہے اور پھر آپ کے سامنے وہ 'دوسرا شہر' (اشتہار یا مواد) لاتا ہے جس میں آپ کا دل اٹکا ہوتا ہے۔
- **فرق:** رومی کا طبیب آپ کو آزاد کرنے کے لیے آپ کا راز ڈھونڈتا ہے، جبکہ جدید دور کا الگورتھم آپ کو اپنی خواہشات کا قیدی بنانے کے لیے آپ کی 'نبض' پکڑتا ہے۔

مادہ پرستی بمقابلہ مقصدیت (Meaning of Life)

جدید انسان 'سمرقند' (دنیاوی کامیابی) کے پیچھے بھاگ رہا ہے لیکن اس کی روح بیمار ہے۔

- **ہم آہنگی:** مولانا بتاتے ہیں کہ جب تک انسان کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی تڑپ کی اصل وجہ کیا ہے، وہ غلط شہروں میں سکون ڈھونڈتا رہے گا۔ آج کا انسان ڈپریشن میں ہے کیونکہ اس نے 'شہروں اور دوستوں' کی گنتی تو بہت کر لی، لیکن وہ اس **'شہرِ دگر'** (حقیقی مقصد / خدا) کو بھول گیا ہے جہاں اسے اطمینان ملنا تھا۔

مصنوعی ذہانت (AI) اور انسانی لمس

آج ہم چیٹ بوٹس اور AI سے مشورے لے رہے ہیں، لیکن رومی کا یہ شعر **'انسانی ہمدردی** (Empathy)' کی اہمیت بتاتا ہے۔

- **ہم آہنگی:** طبیب نے صرف مشین کی طرح ڈیٹا جمع نہیں کیا، بلکہ اس نے نبض پر ہاتھ رکھ کر مریضہ کے دکھ کو محسوس کیا۔ دورِ جدید میں جہاں ڈاکٹر صرف نسخہ لکھتے ہیں، رومی کا فلسفہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ شفا 'الفاظ' اور 'احساس' میں ہے، صرف مشینوں میں نہیں۔

ایک موازنہ: دورِ جدید کا المیہ اور رومی کا حل

پہلو	**دورِ جدید کی صورتحال**	**مولانا روم کا فلسفہ**
مرض	ڈپریشن اور انزائٹی (بے چینی)	فراقِ اصل (حقیقت سے دوری)
تشخیص	ادویات اور ٹیسٹ	نبض شناسی اور گفتگو (تزکیہ)

مسئلہ ہم دوسروں کے 'شہروں' میں خوشی ڈھونڈتے ہیں اپنا 'سمرقند' خود پہچاننا ہوگا

نتیجہ وقتی سکون دائمی شفا (عشقِ الٰہی)

خلاصہ:

مولانا روم کا یہ شعر آج کے دور میں '**باطنی سکینر**' کا کام کرتا ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ اپنی بے چینی کا علاج باہر کی دنیا میں ڈھونڈنے کے بجائے اپنے اندر چھپے ہوئے 'راز' اور 'تعلق' میں ڈھونڈیں جس سے ہماری روح کو حقیقی زندگی ملتی ہے۔

گفت چون بیرون شُدی از شہرِ خویش

در کدامین شہر بودَستی تو بیش؟

مشکل الفاظ کے معنی

گفت: کہا، پوچھا۔۔۔ چون: جب، جبکہ۔۔۔ بیرون شُدی: نکلے، باہر آئے۔۔۔ شہرِ خویش: اپنا شہر، اپنا وطن

در کدامین: کس، کس ایک۔۔۔ شہر: شہر، مقام، منزل۔۔۔ بودَستی: تم رہے تھے، تم مقیم تھے (ماضی بعید کا صیغہ)

تو بیش: تم زیادہ، تم زیادہ تر

(اس نے) پوچھا: جب سے تم اپنے شہر (وطن) سے باہر نکلے ہو، تم نے سب سے زیادہ وقت کس شہر میں گزارا ہے؟

اس شعر کو دو پہلوؤں سے سمجھا جاسکتا ہے:

1۔ ظاہری مفہوم: ایک مسافر جب طویل سفر کے بعد کسی سے ملتا ہے، تو اس سے عموماً یہی پوچھا جاتا ہے کہ "میاں! تم تو بڑے جہان دیدہ ہو، اپنے گھر سے نکلنے کے بعد کس شہر نے تمہیں سب سے زیادہ متاثر کیا یا تم کہاں سب سے زیادہ مقیم رہے؟" یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ وہ تجربات کی بنیاد پر مقامات کا موازنہ کرتا ہے۔

2۔ صوفیانہ و باطنی مفہوم (رومی کا اصل مقصد): مولانا رومیؒ کے ہاں "شہرِ خویش" (اپنا شہر) سے مراد **عالمِ ارواح** یا وہ مقامِ قرب ہے جہاں روح پیدا ہوئی تھی۔ "باہر نکلنا" سے مراد اس دنیا میں آنا اور جسم کے قید خانے میں مقید ہونا ہے۔

- **حقیقی وطن کی یاد:** رومیؒ اکثر یہ پیغام دیتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں مسافر ہے اور اس کا اصل وطن اللہ کی قربت ہے۔ اس سوال کے ذریعے وہ انسان کو جھنجھوڑتے ہیں کہ اس دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر کیا تم اپنے اصل وطن کو بھول گئے ہو؟
- **دل کا قیام:** اس شعر کا ایک جواب جو اگلی ابیات میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ "عاشق اسی شہر میں زیادہ رہتا ہے جہاں اس کا محبوب رہتا ہے"۔ یعنی انسان کی قدر و قیمت اس بات سے نہیں ہے کہ وہ جسمانی طور پر کہاں ہے، بلکہ اس بات سے ہے کہ اس کی سوچ اور محبت کا مرکز (قبلہ) کیا ہے۔

خلاصہ: یہ شعر دراصل انسان سے اس کی **ترجیحات** کے بارے میں سوال کر رہا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ کن کاموں یا کن سوچوں (شہروں) میں گزار دیا ہے۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر بظاہر ایک سادہ سوال ہے، لیکن قرآن و سنت کی روشنی میں یہ انسان کی **تخلیق، مقصدِ زندگی اور تصورِ آخرت** کی پوری داستان بیان کرتا ہے۔

ذیل میں اس شعر کی روشنی میں قرآن و سنت کے حوالے سے سیر حاصل بحث پیش ہے:

شہرِ خویش" اور میثاقِ ازل (ہمارا اصل وطن)

شعر میں "شہرِ خویش" (اپنا شہر) سے مراد وہ مقامِ قرب ہے جہاں روحیں پیدا ہوئیں۔ قرآنِ کریم اس کی تصدیق **عہدِ الست** سے کرتا ہے:

:وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنۢ بَنِيٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ- قَالُوا۟ بَلَىٰ ۛ-شَهِدْنَآ ۛ

- " اور جب تمہارے رب نے آدم کی پشت سے ان کی اولاد نکالی اور انہیں خود ان پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: کیوں نہیں! (بیشک تو ہی ہمارا رب ہے) "(سورۃ الاعراف:172)۔
- **بحث:** صوفیاء کے نزدیک انسان کا اصل وطن یہی مقامِ قربِ الٰہی ہے۔ اس دنیا میں آنا ایک طرح کی "مسافرت" ہے۔ رومی پوچھ رہے ہیں کہ اس اصل وطن کو چھوڑنے کے بعد تمہارا دل کس "شہر" (خیال یا مقام) میں اٹکا رہا؟

دنیا بحیثیت مسافر خانہ (غربت اور مسافرت)

جب رومی "بیرون شُدی" (باہر نکلنے) کی بات کرتے ہیں، تو یہ دنیا کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ سنتِ نبویؐ ہمیں بتاتی ہے کہ اس دنیا میں ہماری حیثیت کیا ہونی چاہیے۔

- **حدیثِ نبویؐ**
- حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَبِيبِ بْنِ عَرَبِيٍّ، حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ، عَنْ لَيْثٍ، عَنْ مُجَاهِدٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعْضِ جَسَدِي، فَقَالَ: "يَا عَبْدَ اللَّهِ، كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ، أَوْ كَأَنَّكَ عَابِرُ سَبِيلٍ، وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ أَهْلِ الْقُبُورِ".
- :حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا:
- عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم کا بعض حصہ (کندھا) تھاما اور

فرمایا" : عبداللہ! دنیا میں ایسے رہو گویا تم اجنبی ہو یا مسافر، اور اپنے

آپ کو قبر والوں میں شمار کرو"۔] سنن ابن ماجہ / کتاب الزھد / حدیث:4114[

قرآن و سنت کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ دنیا ہمارا مستقل قیام گاہ نہیں ہے۔ "کدامین شہر" کا سوال ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ کیا ہم نے اس عارضی قیام گاہ کو ہی اپنا اصل گھر تو نہیں سمجھ لیا؟

3. "کدامین شہر" - دل کی بستیاں اور اعمال

انسان جسمانی طور پر جس شہر میں بھی ہو، اس کی روح اور سوچ کسی نہ کسی "حالت" میں مقیم ہوتی ہے۔ قرآن دل کی مختلف حالتوں کو بیان کرتا ہے:

- **شہرِ غفلت :**
- اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱

جہاں انسان دنیا کی زینت میں کھو جاتا ہے۔ "تمہیں کثرت کی طلب نے غافل کر دیا " (سورۃ التکاثر:1)۔

- **شہرِ اطمینان :** جہاں روح اللہ کے ذکر میں بستی ہے۔ "خبردار! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے "(سورۃ الرعد:28)۔

رومی کا سوال دراصل یہ ہے کہ تمہاری زندگی کا زیادہ وقت کن کاموں میں گزرا؟ کیا وہ "شہرِ نفس" تھا یا "شہر عشقِ الٰہی"؟ سنتِ نبویؐ کے مطابق بہترین زندگی وہ ہے جس کا ہر لمحہ اللہ کی رضا کے "شہر" میں گزرے۔

4. واپسی کا سفر (رجوع الی اللہ)

شعر میں چھپا ہوا ایک اور پہلو یہ ہے کہ مسافر سے واپسی پر ہی پوچھا جاتا ہے کہ وہ کہاں رہا۔ یہ **محاسبہ** (Accountability) کی طرف اشارہ ہے۔

- **قرآنی حوالہ" :** بیشک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے "(سورۃ البقرہ:156)۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ یہی سوال فرمائے گا کہ تم دنیا میں کتنا عرصہ رہے اور وہاں کیا کرتے رہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس دن انسان کو محسوس ہو گا کہ وہ دنیا میں صرف ایک دن یا اس کا کچھ حصہ رہا (سورۃ النازعات)۔ رومی ہمیں متنبہ کر رہے ہیں کہ اس مختصر وقت میں اپنے "مقامِ قیام" کا درست انتخاب کر لو۔

حاصلِ بحث

مولانا رومیؒ کا یہ شعر قرآنی آیت "**فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ** "(تم کہاں جا رہے ہو؟) کی شعری تفسیر ہے۔ یہ شعر ہمیں دعوت دیتا ہے کہ:

1. ہم اپنی **اصل (روحانی وطن)** کو نہ بھولیں۔
2. دنیا کو منزل کے بجائے **راستہ** سمجھیں۔
3. اپنے دل کو **محبتِ الٰہی** کے شہر میں آباد کریں تا کہ جب واپسی ہو تو ہم شرمندہ نہ ہوں۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر ایک ایسی کلید ہے جو انسانی شعور کے مختلف دروازے کھولتی ہے۔ اس کے روحانی، وجدانی اور انقلابی پہلو انسانی زندگی کے تین اہم رخوں (باطن، احساس اور عمل) کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ذیل میں ان تینوں پہلوؤں کی تفصیل پیش ہے:

1. روحانی پہلو (The Spiritual Dimension)

روحانی طور پر یہ شعر "**تزکیہ** "اور "**رجوع** "کا درس دیتا ہے۔

- **عینِ حقیقت کی تلاش**: روح جب "شہرِ خویش" (عالمِ قرب) سے نکلتی ہے تو اس مادی دنیا کے کثیف شہروں میں بھٹک جاتی ہے۔ روحانیت کا تقاضا ہے کہ انسان مسلسل اپنا محاسبہ کرے کہ اس کی روح کا قیام کہاں ہے؟ کیا وہ "نفسِ امارہ" کے شہر میں مقیم ہے یا "نفسِ مطمئنہ" کی طرف گامزن ہے؟
- **غربت اور تڑپ**: رومیؒ کے نزدیک روحانیت کا آغاز تب ہوتا ہے جب انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ یہاں "پردیسی" ہے۔ جب تک انسان اس دنیا کے شہر کو اپنا اصل گھر سمجھتا رہے گا، وہ روحانی ترقی نہیں کر سکتا۔ یہ شعر اسی "احساسِ اجنبیت" کو بیدار کرتا ہے۔

.2 **وجدانی پہلو** (The Intuitive/Ecstatic Dimension)

وجدانی طور پر یہ شعر **"عشق اور وارداتِ قلبی"** کا عکاس ہے۔

- **حیرت اور استغراق**: وجدان میں سوال و جواب کا منطقی ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ یہاں "کدامین شہر" کا سوال ایک وجدانی جھٹکا (Shock) دیتا ہے کہ اے شخص! تو جس دنیا میں اتنا مگن ہے، کیا کبھی تو نے اپنے اندر کے "شہرِ جمال" کی سیر بھی کی ہے؟
- **وحدتِ الوجود کا رنگ**: وجدانی کیفیت میں عاشق کو ہر شہر "شہریار" نظر آتا ہے۔ رومیؒ یہاں ایک صوفیانہ رمز بیان کر رہے ہیں کہ اگر تمہارے دل میں محبوب کی یاد "بیش" (زیادہ) ہے، تو تم جنگل میں رہ کر بھی اپنے اصل شہر میں ہو۔ وجدان یہ ہے کہ انسان جسمانی طور پر کہیں بھی ہو، اس کا دل "عرشِ الٰہی" کا مکین رہے۔

.3 **انقلابی پہلو** (The Revolutionary Dimension)

یہ اس شعر کا وہ رخ ہے جو انسان کو جمود سے نکال کر **"تحریک"** دیتا ہے۔

- **جمود کے خلاف اعلانِ جنگ :** انقلاب کا پہلا قدم "ہجرت" ہے—خواہ وہ مکان کی ہو یا افکار کی۔ رومیؒ کا یہ کہنا کہ "جب تم اپنے شہر سے نکلے"، یہ ثابت کرتا ہے کہ ترقی اور انقلاب کے لیے پرانے، بوسیدہ اور روایتی "شہرِ فکر" کو چھوڑنا ضروری ہے۔
- **ترجیحات کی تبدیلی :** انقلابی پہلو یہ ہے کہ انسان سے پوچھا جائے کہ تمہاری توانائی اور تمہارا وقت (بیش) کہاں صرف ہو رہا ہے؟ اگر ایک قوم کا "بیش" وقت مصلحت پسندی، بزدلی اور غفلت کے شہر میں گزر رہا ہے، تو وہ کبھی انقلاب نہیں لا سکتی۔
- **مقصدی زندگی :** یہ شعر انسان کو ایک "کائناتی انقلابی" بناتا ہے جو مادی مفادات کے چھوٹے شہروں میں قید ہونے کے بجائے "تسخیرِ کائنات" اور "رضائے الٰہی" کے عظیم شہر کی تعمیر کے لیے نکل پڑتا ہے۔

رومیؒ کا یہ شعر دراصل انسان کو **"بے مرکزیت (Purposelessness)** " سے نکال کر **"مرکزِ حقیقی** " **(The Ultimate Goal)** کی طرف لانے کی ایک بھرپور کوشش ہے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کے مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) پہلوؤں پر غور کرنے کا مطلب ہے کہ ہم مادی دنیا کی حدود سے نکل کر **روح (Soul)** اور **وجود (Existence)** کے سفر کا مطالعہ کریں۔ رومیؒ کے ہاں یہ شعر محض ایک مکالمہ نہیں، بلکہ روح کی "کائناتی جلاوطنی" کی داستان ہے۔

ذیل میں اس کے اہم مابعد الطبیعیاتی پہلو درج ہیں:

قوسِ نزول اور قوسِ صعود (The Circle of Existence)

مابعد الطبیعیات کی زبان میں روح کا ایک سفر ہے جو خدا سے شروع ہو کر واپس خدا پر ختم ہوتا ہے۔

- **نزول (Descent):** جب روح "شہرِ خویش" (عالمِ ارواح) سے نکل کر اس مادی دنیا میں آئی۔ یہ روح کا تنزل ہے جہاں وہ لطیف سے کثیف (مٹی) کی طرف آئی۔

- **صعود :(Ascent)** اب روح کا کام واپس اپنے اصل کی طرف جانا ہے۔ رومیؒ کا سوال یہ ہے کہ اس واپسی کے سفر میں تم نے کس "مقام" (شہر) پر سب سے زیادہ قیام کیا؟ کیا تم مٹی کے ہو کر رہ گئے یا لطافت کی طرف بڑھے؟

2.وجودی غربت(Ontological Exile)

مابعد الطبیعیاتی طور پر انسان اس دنیا میں ایک "**اجنبی** " ہے۔

- رومیؒ کے نزدیک روح کی اصل حقیقت "لا مکان" (پتہ کے بغیر کا مقام) ہے۔ جب وہ "شہرِ خویش" سے نکلی تو وہ زمان و مکان (Time and Space) کی قید میں آ گئی۔
- **بیش قیام کا مسئلہ :** اگر روح اس دنیا کے "شہر" (مادی لذتوں) میں بہت زیادہ وقت گزارتی ہے، تو وہ اپنی مابعد الطبیعیاتی اصل کو بھول جاتی ہے۔ رومیؒ پوچھ رہے ہیں کہ کیا تم نے اس مسافر خانے کو اپنا مستقل ٹھکانہ سمجھ لیا ہے؟

زمانِ سرمدی بمقابلہ زمانِ فانی(Eternity vs. Time)

اس شعر میں "بودستی" (تم رہے) کا لفظ وقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مابعد الطبیعیات میں وقت کی دو قسمیں ہیں:

1. **دہر :(Eternity)** خدا کا وقت جہاں کوئی ماضی یا مستقبل نہیں (شہرِ خویش)۔
2. **زمان :(Linear Time)** دنیا کا وقت جہاں سیکنڈ اور منٹ گزرتے ہیں۔

- **نکتہ :** رومیؒ یہ سوال کر رہے ہیں کہ کیا تم "زمانِ فانی" کی قید میں اتنے گم ہو گئے ہو کہ تمہیں "دہر" (اپنی ازلی حقیقت) یاد ہی نہیں رہی؟

4.مراتبِ وجود(Levels of Reality)

صوفیانہ مابعد الطبیعیات میں وجود کے مختلف شہر (عوالم) ہیں:

- **عالمِ ناسوت :** مادی دنیا۔
- **عالمِ ملکوت :** فرشتوں اور ارواح کی دنیا۔
- **عالمِ جبروت :** اسماء وصفاتِ الٰہیہ کی دنیا۔
- **عالمِ لاہوت :** ذاتِ حق۔

رومی کا سوال **"کدامین شہر "** دراصل یہ پوچھ رہا ہے کہ تمہاری روح کی فریکوئنسی (تعدد) کس عالم سے زیادہ جڑی رہی؟ کیا تم صرف "ناسوت" (مٹی) کے شہر میں مقیم رہے یا تمہاری روح "ملکوت" کی سیر بھی کرتی رہی؟

مابعد الطبیعیاتی خلاصہ (جدول)

اصطلاح	مابعد الطبیعیاتی حقیقت
شہرِ خویش	وحدت (Oneness) ، مقامِ وصال، عالمِ ارواح۔
بیرون شُدی	کثرت (Multiplicity) میں ظہور، روح کا بدن میں قید ہونا۔
کدامین شہر	کائنات کے مختلف درجات (مادہ، خیال، عشق، عقل)۔
بیش (زیادہ)	روح کی وابستگی اور توجہ کا مرکز۔

مابعد الطبیعیاتی نقطہ نظر سے رومیؒ یہ کہہ رہے ہیں کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کا پاؤں مٹی میں ہے مگر سر عرش پر۔ المیہ یہ ہے کہ ہم نے مٹی کے شہر میں "بیش" (زیادہ) قیام کر لیا ہے اور عرش کے شہر (اپنے اصل گھر) کو صرف ایک خواب سمجھ لیا ہے۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر جتنا روحانی ہے، اتنا ہی نفسیاتی (Psychological) اور طبی (Medical) گہرائی بھی رکھتا ہے۔ جب ہم "اپنے شہر سے نکلنے" اور "دوسرے شہر میں رہنے" کو انسانی ذہن اور جسم پر لاگو کرتے ہیں، تو کئی دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں:

1. نفسیاتی نقطہ نظر (Psychological Perspective)

نفسیات کی رو سے اس شعر کو **"توجہ کا مرکز (Focus of Attention)"** اور **"ذہنی سکونت"** کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ذہنی ہجرت اور بیگانگی (Alienation)

- **نفسیات میں:** "شہرِ خویش" انسان کی وہ فطری حالت یا "Core Self" ہے جہاں وہ پرسکون ہوتا ہے۔ جب انسان سماجی دباؤ، حسد، یا موازنے کی وجہ سے اپنے اصل مزاج (Self) سے باہر نکل جاتا ہے، تو وہ نفسیاتی طور پر "مہاجر" بن جاتا ہے۔ رومی کا سوال دراصل یہ ہے کہ: "تم اپنی ذات سے نکل کر کن وسوسوں، فکروں اور خیالی دنیاؤں میں آباد رہے ہو؟"
- **خیالی دنیا (Maladaptive Daydreaming):** کئی لوگ حال میں رہنے کے بجائے ماضی کے پچھتاووں یا مستقبل کے خوف کے "شہر" میں مقیم رہتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر یہ سوال ایک **تھراپی (Therapy)** ہے جو انسان کو واپس "حال (Present Moment)" میں لانے کی کوشش کرتی ہے۔
- **شناخت کا بحران (Identity Crisis):** "کدامین شہر" کا سوال انسان کو اپنی شناخت ڈھونڈنے پر مجبور کرتا ہے۔ کیا آپ کا ذہنی قیام امن کے شہر میں ہے یا انارکی اور ہیجان کے شہر میں؟ آپ کی شخصیت وہی بن جاتی ہے جہاں آپ کا ذہن سب سے زیادہ وقت گزارتا ہے۔

2. طبی و سائنسی نقطہ نظر (Medical/Biological Perspective)

طب اور حیاتیات کی نظر میں اس شعر کو **اعصابی نظام** (Nervous System) اور **ہومیو سٹیسس** (Homeostasis) کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

- **نیوروپلاسٹی سٹی (Neuroplasticity):** جدید سائنس کہتی ہے کہ دماغ کے وہ خلیے (Neurons) جو ایک ساتھ متحرک ہوتے ہیں، وہ آپس میں جڑ جاتے ہیں۔ "جس شہر میں تم زیادہ رہے" کا طبی مطلب یہ ہے کہ آپ نے کن اعصابی راستوں (Neural Pathways) کو زیادہ استعمال کیا۔ اگر آپ مسلسل تناؤ (Stress) کے شہر میں رہے ہیں، تو آپ کا دماغ جسم کو مستقل "Fight or Flight" کی حالت میں رکھتا ہے، جو کہ بیماری کا باعث ہے۔
- **سائیکوسومیٹک اثرات (Psychosomatic Effects):** اگر آپ کا ذہنی قیام منفی سوچوں کے شہر میں ہے، تو اس کا اثر براہِ راست آپ کے جسم پر پڑتا ہے۔
  - **کورٹیسول (Cortisol):** مسلسل پریشانی کے شہر میں رہنے سے یہ ہارمون بڑھ جاتا ہے، جو مدافعتی نظام کو کمزور اور دل کے امراض کو جنم دیتا ہے۔
  - **ڈوپامائن (Dopamine):** اگر آپ لذت اور عارضی خوشی کے شہر میں مقیم ہیں، تو آپ کا جسم اس کا عادی (Addict) ہو جاتا ہے۔
- **جسمانی توازن (Homeostasis):** طبی لحاظ سے "شہرِ خویش" جسم کی وہ متوازن حالت ہے جہاں تمام اعضاء درست کام کرتے ہیں۔ بیماری دراصل اس "شہر" سے باہر نکلنے کا نام ہے۔ رومی کا سوال ایک طبیبانہ تشخیص ہے کہ تمہاری بیماری کی جڑ وہ "شہر" (غلط طرزِ زندگی یا غلط سوچ) ہے جہاں تم نے سب سے زیادہ وقت گزارا ہے۔

طبی اور نفسیاتی طور پر یہ شعر ہمیں "**ذہنی ہجرت**" سے روک کر "**ذات کی مرکزیت**" کی طرف بلاتا ہے۔

- **نفسیاتی صحت** یہ ہے کہ انسان اپنے "شہرِ خویش" (اپنی اصل فطرت) میں واپس آئے۔

- **جسمانی صحت** یہ ہے کہ انسان ان بیرونی "شہروں" (تناؤ، بے اعتدالی، منفی عادات) سے نکلے جہاں وہ طویل عرصے سے مقیم ہے۔

آپ کی صحت اور شخصیت کا دارومدار جغرافیائی شہر پر نہیں، بلکہ اس **"خیالی شہر "** پر ہے جہاں آپ کی سوچیں سب سے زیادہ قیام کرتی ہیں۔

فارسی کے کلاسیکل شعراء کے ہاں "شہر" محض اینٹ پتھر کی بستی نہیں، بلکہ **"حال (State of Being)** "اور **"مقام "** کی علامت ہے۔ رومیؒ کے اس سوال پر کہ "تم کس شہر میں زیادہ رہے؟"، فارسی کے ان عظیم اساطین کا جواب ان کے مخصوص رنگِ سخن میں کچھ یوں بنتا ہے:

.1 فخر الدین عراقی: "شہر ہو ہو" اور دیارِ عشق

عراقی صوفیانہ شاعری میں "عشقِ محض" کے نمائندے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان جب سے اپنے اصل وطن (عالمِ ارواح) سے نکلا ہے، وہ ہر جگہ "غریب" (اجنبی) ہے۔

- **فرمانِ عراقی :** عراقی کہیں گے کہ میں "لامکان" کے شہر سے نکلا تھا اور اب جس شہر میں سب سے زیادہ مقیم ہوں، وہ **"حیرت "** کا شہر ہے۔
- **مشہور قول و رنگ :** ان کے نزدیک عاشق کا کوئی مستقل جغرافیائی پتہ نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں:

نخستین بادہ کاندر جام کردند / ز چشم مستِ ساقی وام کردند) جب پہلے دن جام میں مے ڈالی گئی، تو وہ ساقی کی مست آنکھوں سے مستعار لی گئی تھی(

- **رومی کے سوال کا جواب :** عراقی کے لیے "بیش" (زیادہ قیام) کا شہر وہ ہے جہاں "خودی" ختم ہو جائے اور صرف "محبوب" باقی رہے۔

.2 شیخ سعدی شیرازی: "شہرِ انسانیت اور اقلیمِ وفا"

سعدی جہاں ایک سیاح (Traveler) تھے، وہیں وہ اخلاقیات کے شہر کے باسی تھے۔ ان کے نزدیک وطن وہ نہیں جہاں انسان پیدا ہو، بلکہ وطن وہ ہے جہاں انسان کو سکون ملے۔

- **فرمانِ سعدی :** سعدی رومی کے سوال کا جواب اپنی مشہور فکر سے دیتے ہیں کہ **"وطن وہ ہے جہاں محبوب ہو"**۔

- **فارسی شعر:**

سعدیا حب وطن گرچہ حدیثی است صحیح / نتوان مرد بہ سختی کہ من اینجا زادم

(سعدی! حبِ وطن اگرچہ صحیح حدیث ہے، مگر اس سختی میں مرنا دانشمندی نہیں کہ "میں یہاں پیدا ہوا تھا")۔

- **نقطہ نظر :** سعدی کے نزدیک وہ شہر جہاں وہ سب سے زیادہ رہے، وہ **"قناعت "** اور **"مشاہدہ "** کا شہر ہے۔ وہ مسافرت کو روح کی تربیت سمجھتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک "شہرِ خویش" سے نکلنا کمالِ انسانیت ہے۔

3. خواجہ حافظ شیرازی: "شہرِ قدس اور گوشہ میخانہ"

حافظ کے ہاں "شہر" کی اصطلاح بہت گہری ہے۔ وہ اس دنیا کو "دیرِ خراب" (ویران ٹھکانہ) کہتے ہیں اور انسانی روح کو "طائرِ گلشنِ قدس" (جنت کے باغ کا پرندہ)۔

- **فرمانِ حافظ :** رومی کے سوال پر حافظ کا جواب بہت واضح ہے: "میں تو اس شہرِ دنیا میں صرف چند دن کے لیے قید ہوں، میرا اصل قیام تو **ازل کی محفل** میں تھا"۔

- **مشہور شعر:**

من ملک بودم و فردوس برین جایم بود / آدم آورد در این دیر خراب آبادم

(میں فرشتہ تھا اور فردوسِ بریں میرا گھر تھا؛ آدمؑ مجھے اس اجاڑ دنیا میں لے آئے)۔

- **بیش قیام (زیادہ رہائش) :** حافظ کے نزدیک انہوں نے سب سے زیادہ وقت **"نیاز "** اور **"رندی "** کے شہر میں گزارا ہے۔ وہ دنیا کے ہنگاموں سے دور دل کے کسی گوشے میں مقیم رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

کلاسیکل شعراء کا مشترکہ خلاصہ

ان تمام شعراء کے کلام کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو رومی کے سوال کے جواب میں تین بڑے "شہر" سامنے آتے ہیں:

1. **شہرِ ازل :**(The City of Pre-eternity) جہاں ہم سب خدا کے ساتھ تھے۔ رومی، حافظ اور عراقی سب متفق ہیں کہ یہی ہمارا "شہرِ خویش" ہے۔
2. **شہرِ حیرت :**(The City of Bewilderment) کلاسیکل شعراء کے نزدیک دنیا میں سب سے طویل قیام "حیرت" میں ہوتا ہے—خالق کی قدرت دیکھ کر دنگ رہ جانا۔
3. **شہرِ دل :**(The City of the Heart) سعدی اور حافظ کے نزدیک، اگر تم نے اپنے دل کے اندر قیام کرنا سیکھ لیا، تو تم خواہ شیراز میں ہو یا قونیہ میں، تم اپنے "اصل شہر" میں ہی ہو۔

حاصلِ بحث

کلاسیکل فارسی شاعری میں رومی کا یہ سوال دراصل ایک **آئینہ** ہے۔

- **عراقی** اس میں **درد** دیکھتے ہیں۔
- **سعدی** اس میں **حکمت** ڈھونڈتے ہیں۔
- **حافظ** اس میں **ازلی رشتہ** تلاش کرتے ہیں۔

ان سب کے نزدیک، بدنصیب وہ ہے جو اس مسافر خانے (دنیا) کو اپنا اصل شہر سمجھ کر بیٹھ جائے اور واپسی کا رختِ سفر تیار نہ کرے۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر اپنی ظاہری سادگی کے باوجود فنی اور معنوی محاسن کا ایک شاہکار ہے۔ اسے بلاغت کی زبان میں "**سہلِ ممتنع**" کہا جاتا ہے، یعنی ایسا کلام جو بظاہر بہت آسان معلوم ہو لیکن ویسا لکھنا نہایت مشکل ہو۔

ذیل میں اس شعر کے اہم شعری و فنی محاسن (Poetic Beauties) درج ہیں:

1. صنعتِ استفہام (Rhetorical Question)

شعر کا دوسرا مصرع ایک سوال پر مبنی ہے۔ رومیؒ نے یہاں "**استفہامِ تقریری**" کا استعمال کیا ہے۔ وہ محض معلومات نہیں پوچھ رہے، بلکہ مخاطب (اور قاری) کو ایک گہری سوچ میں مبتلا کر رہے ہیں۔ یہ سوال قاری کے ذہن پر دستک دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا حساب کرے۔

2. استعارہ اور تمثیل (Metaphor & Allegory)

اس شعر کی بنیاد "**شہر**" کے استعارے پر ہے۔

- "**شہرِ خویش**" (اپنا شہر): یہ عالمِ ارواح، فطرتِ انسانی یا بندگی کا استعارہ ہے۔
- "**کدامین شہر**" (کون سا شہر): یہ دنیا کی مختلف حالتوں، خواہشات، اور نفسیاتی کیفیات کا استعارہ ہے۔

رومیؒ نے ایک مادی لفظ (شہر) کو استعمال کر کے ایک نہایت ہی غیر مادی اور تجریدی (Abstract) کیفیت کو مجسم کر دیا ہے۔

3. صنعتِ تضاد (Antithesis)

شعر میں دو متضاد حالتوں کو آمنے سامنے لایا گیا ہے:

- **باہر نکلنا (بیرون شُدی)**: جو سفر، جدائی اور حرکت کی علامت ہے۔
- **قیام کرنا (بودَستی)**: جو ٹھہراؤ اور سکونت کی علامت ہے۔

ان دونوں کے ملاپ سے انسانی زندگی کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے کہ انسان مسلسل سفر میں رہ کر بھی کہیں نہ کہیں ٹھہرا ہوا ہوتا ہے۔

4.زبان و بیان کی قدامت (Archaic Charm)

شعر میں لفظ "**بودستی**" کا استعمال اسے کلاسیکی وقار عطا کرتا ہے۔ یہ قدیم فارسی صیغہ ہے جو "تم رہے" یا "تم مقیم رہے" کے معنی میں آتا ہے۔ یہ لفظ شعر میں ایک خاص قسم کی موسیقیت اور تاریخی تسلسل کا احساس پیدا کرتا ہے۔

5.ایجاز و اختصار (Conciseness)

رومیؒ نے صرف دو مصرعوں میں پوری انسانی تاریخ اور نفسیات کو سمو دیا ہے۔ "ہجرت" (اپنے اصل سے دوری) اور "مسافرت" (دنیا میں قیام) کے اتنے بڑے موضوع کو اتنے کم الفاظ میں بیان کرنا کمالِ فن ہے۔

6.موسیقیت اور بحر (Rhythm and Meter)

یہ شعر بحرِ رمل (مثمن محذوف) میں ہے: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔

یہ بحر بیانیہ شاعری اور قصہ گوئی کے لیے بہترین مانی جاتی ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کا اتار چڑھاؤ ہے جو گفتگو (Dialogue) کے لیے نہایت موزوں ہے، اسی لیے مصرعہ "گفت..." سے شروع ہو کر ایک فطری روانی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

شعری محاسن کا خلاصہ

خوبی	تفصیل
سہلِ ممتنع	سادہ الفاظ میں نہایت گہرا فلسفہ۔
تمثیل نگاری	انسانی زندگی کو ایک شہر اور مسافرت کے طور پر دکھانا۔

ڈرامائی عنصر لفظ "گفت" (اس نے کہا) سے ایک مکالمے کی فضا بنانا۔

نفسیاتی گہرائی انسان کو اس کے لاشعور میں جھانکنے پر مجبور کرنا۔

رومیؒ کا یہ سوال آج کے **"گلوبل ویلج (Global Village)** "اور ڈیجیٹل دور میں پہلے سے کہیں زیادہ معتبر اور چونکا دینے والا ہو گیا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ رومیؒ کا یہ قدیم فلسفہ آج کے جدید دور کی **بیگانگی (Alienation)** اور نفسیاتی مسائل کا کیسے احاطہ کرتا ہے:

" .1 شہر مجازی" اور ڈیجیٹل ہجرت

آج اگر رومیؒ ہم سے پوچھیں کہ "تم کس شہر میں زیادہ رہے؟ "تو ہمارا جواب لاہور، کراچی یا لندن نہیں ہو گا، بلکہ ہم میں سے اکثر کا قیام **"سوشل میڈیا کے شہر "** میں سب سے زیادہ ہے۔

- **بیش قیام :(Maximum Stay)** ہم جسمانی طور پر اپنے گھر (شہر خویش) میں ہوتے ہیں، لیکن ذہنی طور پر ہم انسٹاگرام، فیس بک یا ٹک ٹاک کے "شہروں" میں مقیم ہوتے ہیں۔
- **نتیجہ :** یہ "ڈیجیٹل ہجرت" ہمیں اپنی ذات سے اتنا دور لے گئی ہے کہ ہم اپنے اصل "نفس" کے لیے اجنبی (Stranger) بن چکے ہیں۔

.2 گلوبل ویلج اور "اندرونی بے گھری"

جدید دور نے پوری دنیا کو ایک گاؤں تو بنا دیا، لیکن انسان کے اندر ایک **"بے گھری "** پیدا کر دی۔

- **تضاد :** ہم پوری دنیا سے جڑے ہوئے ہیں (Connected) ، مگر اپنی روح سے کٹے ہوئے (Disconnected) ہیں۔

- **رومی کا نکتہ :** رومیؒ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ جب تم "شہر خویش" (اپنی اصل فطرت اور سکون) سے باہر نکل کر دوسروں کی زندگیوں کے "شہروں" میں جھانکتے ہو، تو تم اپنی شناخت کھو دیتے ہو۔ یہ جدید دور کی Identity Crisis کی اصل جڑ ہے۔

.3 بیگانگی (Alienation) کا طبی و نفسیاتی پہلو

جدید فلسفے (مثلاً کارل مارکس یا سارتر) میں بیگانگی کا مطلب ہے کہ انسان اپنی محنت، اپنے معاشرے اور اپنی ذات سے کٹ جائے۔

پہلو	قدیم (رومی کا دور)	جدید (آج کا دور)
شہر سے نکلنا	روح کا بدن میں آنا۔	فطرت سے دور ہو کر ٹیکنالوجی میں کھو جانا۔
زیادہ قیام	ذکر یا دنیاداری میں۔	اسکرین ٹائم اور نوٹیفیکیشنز کی زد میں۔
علاج	رجوع الی اللہ (دھیان)۔	مائنڈ فلنس (Mindfulness) اور ڈیجیٹل ڈی ٹاکس۔

" .4 کدامین شہر" - مقابلہ اور حسد کا شہر

آج کا انسان جس شہر میں "بیش" (زیادہ) قیام کرتا ہے، وہ **"موازنے "(Comparison)** کا شہر ہے۔

- ہم دوسروں کی چکا چوند دیکھ کر مسلسل ایک احساسِ کمتری میں رہتے ہیں۔
- رومیؒ کا سوال ایک **تشخیصی سوال (Diagnostic Question)** ہے: "اے مسافر! تو جس شہر حسد میں اتنی دیر سے مقیم ہے، کیا وہ تیرا اصلی گھر ہے؟ کیا وہاں تجھے سکون ملا؟"

.5 واپسی کا راستہ: "شہر ذات" کی طرف

جدید نفسیات اب جس **"Inner Peace"** یا **"Self-Awareness"** کی بات کر رہی ہے، رومیؒ اسے صدیوں پہلے "شہر خویش" کہہ چکے ہیں۔

- **موجودہ حل :** آج کے دور میں رومی کے اس شعر پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم روزانہ کچھ وقت "آف لائن" ہو کر اپنی ذات کے شہر میں گزاریں۔
- جس طرح جسم کو گھر کی ضرورت ہے، روح کو بھی ایک "گھر" (سکونِ قلب) کی ضرورت ہے، ورنہ وہ دنیا کے شور میں بھٹکتی رہے گی۔

حاصلِ گفتگو

رومیؒ کا یہ شعر آج کے انسان کے لیے ایک **الارم** ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ:

1. دنیا کی رنگینیوں میں "**سیاح (Tourist)** "بن کر رہو، "**مقیم (Resident)** "نہ بنو۔
2. اپنا سب سے زیادہ وقت (بیش) اس مقام پر صرف کرو جو تمہیں تمہارے **خالق** اور تمہاری **اصل** سے جوڑ دے۔

نامِ شہرے گفت وزان ہم دَر گُذشت
رَنگِ روی و نَبضِ او دیگر نگَشت

مشکل الفاظ کے معنی

نامِ شہرے: کسی شہر کا نام، یہاں ظاہری پہچان یا محض زبانی دعویٰ کے معنی میں ....۔ گفت: کہا، بیان کیا

زان: اس سے، پھر۔۔۔ ہم دَر گُذشت: وہیں سے گزر گیا، اس بات کو چھوڑ دیا، آگے بڑھ گیا

رَنگِ روی: چہرے کا رنگ، ظاہر کی کیفیت، ظاہری حالت۔۔۔ نَبضِ او: اس کی نبض، باطنی کیفیت، دل اور جان کی اصل حالت

دیگر نگَشت: بدلی نہیں، تبدیل نہ ہوئی

(طبیب نے) ایک شہر کا نام لیا اور پھر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا (یعنی دوسرے شہر کا نام لیا)، لیکن (اس شہر کے ذکر پر) نہ تو اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور نہ ہی اس کی نبض کی رفتار میں کوئی تبدیلی آئی۔

اس شعر میں مولانا رومیؒ انسانی نفسیات اور عشق کے جسم پر اثرات کو بیان کر رہے ہیں۔ تشریح کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱. نفسیاتی طریقہِ علاج : کہانی کے پس منظر میں، کنیز بظاہر جسمانی طور پر بیمار تھی لیکن کوئی دوا اثر نہیں کر رہی تھی۔ جب اللہ والا طبیب آیا تو اس نے پہچان لیا کہ بیماری جسمانی نہیں بلکہ روحانی (عشق) ہے۔ وہ کنیز کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر مختلف شہروں اور علاقوں کے نام لینا شروع کرتا ہے تاکہ یہ دیکھ سکے کہ کس جگہ کا نام سن کر کنیز کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے۔

۲. بے تعلقی کا اظہار : اس مخصوص شعر میں طبیب کسی ایک شہر کا نام لیتا ہے، لیکن کنیز پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شہر سے کنیز کی کوئی جذباتی وابستگی یا یادیں جڑی ہوئی نہیں تھیں۔ اس کا چہرہ سپاٹ رہا اور نبض کی رفتار معمول پر رہی، جس سے طبیب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کا محبوب اس شہر میں نہیں رہتا۔

۳. عشق اور جسمانی علامات : رومیؒ یہاں یہ نکتہ سمجھا رہے ہیں کہ جب انسان کسی سے سچی محبت کرتا ہے، تو اس کا ذکر آتے ہی بدن میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ چہرے کا رنگ بدل جانا (زرد ہونا یا شرم سے سرخ ہونا) اور نبض کا تیز ہو جانا اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ روح کا اس مقام یا شخص سے گہرا تعلق ہے۔

۴. حکیمِ حاذق کی مہارت : یہ شعر طبیب کی دانائی کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ جلد بازی کے بجائے صبر سے ایک ایک شہر کا نام لے کر تشخیص کر رہا ہے تاکہ اصل "مرض" (محبوب کا پتا) تک پہنچ سکے۔

- جب روح یا دل کسی صدمے، محبت یا پریشانی میں مبتلا ہو تو اس کے اثرات نبض، رنگت اور صحت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اسے آج کی سائنس Psychosomatic (نفسیاتی و جسمانی) تعلق کہتی ہے۔

۲. فراستِ مومن (Spiritual Insight)

رومیؒ نے جس طبیب کا ذکر کیا ہے، وہ کوئی عام ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک "ولی اللہ" یا مردِ کامل ہے جو "فراست" سے کام لے رہا ہے۔

- **حدیثِ مبارکہ**
- حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ، حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ أَبِي الطَّيِّبِ، حَدَّثَنَا مُصْعَبُ بْنُ سَلَّامٍ، عَنْ عَمْرِو بْنِ قَيْسٍ، عَنْ عَطِيَّةَ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اتَّقُوا

فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ، ثُمَّ قَرَأَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِينَ سورة الحجر آية 75، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ، إِنَّمَا نَعْرِفُهُ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْ بَعْضِ أَهْلِ الْعِلْمِ فِي تَفْسِيرِ هَذِهِ الْآيَةِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِينَ سورة الحجر آية 75، قَالَ: لِلْمُتَفَرِّسِينَ.

- ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے“، پھر آپ نے آیت «إن في ذلك لآيات للمتوسمين» ”بیشک اس میں نشانیاں ہیں سمجھ داروں کے لیے ہے“ (الحجر: ۷۵)، تلاوت فرمائی۔ امام ترمذی کہتے ہیں: ۱- یہ حدیث غریب ہے، ۲- ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں، بعض اہل علم نے اس آیت «إن في ذلك لآيات للمتوسمين» کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس میں نشانیاں ہیں اصحاب فراست کے لیے۔ (جامع ترمذی)
- فراست کیا ہے؟ یہ ذہانت، ہوشیاری اور بصیرت ہے جس سے کسی کی صورت دیکھ کر اس کی سیرت اور حقیقت جان لی جائے۔
- اللہ کے نور سے دیکھنا: اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں سچی بات ڈال دیتا ہے یا اسے حق و باطل میں فرق کرنے کی خصوصی بصیرت عطا کرتا ہے۔
- یہ حدیث مومن کی پاکیزگی اور حق شناسی پر دلالت کرتی ہے۔

یہ حدیث یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ مومن کی نظر عام نظر نہیں رہتی۔

1 . نظر اور بصیرت میں فرق، ہر انسان دیکھتا ہے، مگر ہر دیکھنے والا سمجھتا نہیں۔

• نظر (دیکھنا): آنکھ کا کام ہے، بصیرت (سمجھنا): دل اور عقل کا کام ہے، بصیرت وہ نظر ہے، جس میں خواہش، تعصب اور جلد بازی شامل نہیں ہوتی۔

2 . مومن کی نظر کیوں مختلف ہوتی ہے؟ مومن کی نظر: گناہ سے آلودہ نہیں ہوتی، نیت سے جڑی ہوتی ہے

• اور اللہ کی یاد سے روشن ہوتی ہے

اسی لیے حدیث کہتی ہے کہ

وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے، یعنی اس کی سوچ، تجزیہ اور فیصلہ، اللہ کی ہدایت کے زیر اثر ہوتا ہے۔

فراست کیا ہے؟

فراست: کسی بات کو گہرائی سے سمجھ لینا، الفاظ کے پیچھے چھپی نیت کو بھانپ لینا، حالات کے انجام کو پہلے سے محسوس کر لینا، یہ کوئی جادو نہیں، بلکہ دل کی صفائی کا نتیجہ ہے۔

4 . نظر اور سماعت — دونوں کا امتحان

انسان کے پاس دو بڑے دروازے ہیں: آنکھ، کان، یہ دونوں: ہدایت کی طرف بھی لے جاسکتے ہیں، اور گمراہی کی طرف بھی

مومن وہ ہے جو: ہر دیکھی چیز پر یقین نہیں کرتا، ہر سنی بات کو سچ نہیں مانتا، بلکہ وہ سوچ، تحقیق اور تدبر کرتا ہے۔

5 . آج کے دور میں اس حدیث کی اہمیت

آج کے دور میں: معلومات بہت ہیں، مگر بصیرت کم ہے، خبریں تیز ہیں، مگر سچ دھندلا ہے

اس ماحول میں مومن کی فراست: فتنوں کو پہچاننے کا ذریعہ بنتی ہے، جھوٹے بیانیے سے بچاتی ہے، اور جذباتی فیصلوں سے روکتی ہے

بصیرت کیسے پیدا ہوتی ہے؟

بصیرت: ذکر سے، قرآن سے، سچائی سے، اور نفس کی اصلاح سے پیدا ہوتی ہے جو دل گناہ سے بوجھل ہو،

وہ حقیقت کو صاف نہیں دیکھ سکتا۔ ہر نظر بصیرت نہیں ہوتی، ہر علم ہدایت نہیں بنتا، اور ہر بات حقیقت نہیں ہوتی

مومن کی اصل پہچان یہ ہے کہ

وہ چیزوں کو اللہ کے نور میں پرکھتا ہے، نہ کہ صرف اپنی خواہش میں۔ یا اللہ! ہمیں آنکھوں کی روشنی کے ساتھ

دل کی روشنی بھی عطا فرما، اور ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما، جو دیکھ کر دھوکا نہیں کھاتے، بلکہ سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں

- **اسلامی علوم کا نکتہ :** اسلامی نفسیات (Ilm-al-Nafs) کے مطابق، اللہ کے نیک بندے محض ظاہری علامتوں سے نہیں بلکہ باطنی نور سے بیماری کی جڑ تک پہنچ جاتے ہیں۔ طبیب کا نبض تھام کر شہروں کے نام لینا اسی بصیرت کا حصہ ہے۔

قرآن اور شفائے قلوب

قرآن کریم نے دل کی بیماریوں (حسد، غم، بے چینی، عشقِ مجازی کی حد سے بڑھی ہوئی تڑپ) کا ذکر کیا ہے اور اپنا تعارف بطور "شفا" کرایا ہے۔

- **قرآنی آیت :** وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ- (82)
- "اور ہم قرآن میں وہ چیز نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔" (سورہ بنی اسرائیل: ۸۲)

رومیؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب تک بیماری کی اصل وجہ (جو کہ یہاں ایک نفسیاتی گرہ تھی) معلوم نہ ہو، جسمانی ادویات بے کار ہیں۔ اسلام ظاہری علاج کے ساتھ ساتھ باطنی اصلاح پر زور دیتا ہے۔

عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر

اسلامی تصوف میں یہ مانا جاتا ہے کہ انسان کی کسی ہستی سے بے پناہ محبت (اگر وہ حدود میں ہو) اسے پاکیزہ بنا سکتی ہے اور یہ محبت اسے اللہ کی محبت (عشقِ حقیقی) کی طرف لے جانے کا ایک ذریعہ بن سکتی ہے۔

- رومیؒ کے اس قصے میں، طبیب نے اس لڑکی کے عشق کو گناہ یا عیب نہیں سمجھا، بلکہ اسے ایک "بیماری" سمجھ کر اس کا علاج کیا تا کہ اسے سکون مل سکے۔ یہ اسلام کا **مظہرِ رحمت** ہے کہ وہ انسانی جذبات کی نفی نہیں کرتا بلکہ ان کی درست سمت میں رہنمائی کرتا ہے۔

خلاصہ

اسلامی علوم کی رو سے یہ شعر ثابت کرتا ہے کہ:

1. **انسان صرف مٹی کا ڈھیر نہیں**، بلکہ اس کے جذبات اس کی جسمانی صحت پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔
2. **حکمت اور دانائی** (Wisdom) مومن کی گمشدہ میراث ہے، جس کے ذریعے وہ پوشیدہ حقائق تک پہنچتا ہے۔
3. **علاجِ باطن** کے بغیر علاجِ ظاہر اکثر ادھورا رہتا ہے۔

خواجگان و شہرہا ایک بہ یَک
باز گفت از جائے و از نان و نَمک

مشکل الفاظ کے معنی

خواجگان: خواجہ کی جمع؛ آقاؤں، مالکوں، بزرگوں یا معزز لوگوں۔۔۔**شہرہا:** شہر کی جمع؛ یعنی بہت سے شہر۔

یک بہ یک: ایک ایک کر کے، ترتیب وار، تفصیل کے ساتھ۔۔۔**باز گفت:** بیان کیا، پوچھا، ذکر کیا۔

جائے: جگہ، مقام، وطن۔۔۔**نان و نمک:** روٹی اور نمک؛ (مراد) کسی کے ہاں قیام و طعام، تعلقات، یا گزرا ہوا وقت۔

ترجمہ: (اس حکیم نے) ایک ایک کر کے وہاں کے بزرگوں اور شہروں کا ذکر چھیڑا؛ اور مختلف جگہوں اور وہاں کے بود و باش (رہن سہن) کے بارے میں باتیں کیں۔

پس منظر: ایک بادشاہ کی کنیز بیمار ہو گئی اور تمام اطباء اس کا علاج کرنے میں ناکام رہے۔ تب اللہ کی طرف سے ایک "حکیمِ الٰہی" (روحانی معالج) بھیجا گیا۔ اس دانا حکیم نے بھانپ لیا کہ لونڈی کا مرض جسمانی نہیں بلکہ نفسیاتی اور قلبی ہے (یعنی وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے)۔

تشریح: اس شعر میں مولانا رومی اس نفسیاتی طریقہ علاج (Psychotherapy) کی منظر کشی کر رہے ہیں جو وہ حکیم اپنا رہا ہے:

ا. **اعتماد کی بحالی:** حکیم نے براہِ راست لونڈی سے اس کے محبوب کا نام نہیں پوچھا، بلکہ بڑی حکمت سے اس کا دل ٹٹولنا شروع کیا۔ اس نے لونڈی کو باتوں میں لگایا اور پرانے قصے چھیڑ دیے۔

۲ . **سراغ رسانی**" **:** خواجگان و شہرہا" سے مراد وہ شہر اور وہ مالکان ہیں جن کے پاس وہ کنیز ماضی میں رہی تھی۔ حکیم ایک ایک کر کے شہروں کا نام لیتا گیا تا کہ دیکھ سکے کہ کس شہر یا کس شخص کے ذکر پر لونڈی کی نبض تیز ہوتی ہے یا اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے ہیں۔

۳ . **نان و نمک کا استعارہ**" **:** نان و نمک " سے مراد وہ وفاداریاں اور تعلقات ہیں جو انسان کے کسی جگہ قیام کے دوران پیدا ہو جاتے ہیں۔ حکیم نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں رہی ہو؟ کس کا نمک کھایا ہے؟ وہاں کے لوگ کیسے تھے؟

یہ شعر ظاہر کرتا ہے کہ مولانا روم انسانی نفسیات سے کتنے گہرے واقف تھے۔ وہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ جب تک انسان کے ماضی، اس کی یادوں اور اس کے قلبی تعلقات کو نہ کھنگالا جائے، اس کے باطنی دکھوں کا علاج ممکن نہیں ہے۔ حکیم نے "نان و نمک " کے بہانے اس کے ماضی کے دریچے کھولے تا کہ اس "گرفتارِ محبت "کا پتا لگا سکے جس کی وجہ سے وہ بیمار تھی۔

مولانا روم کے اس شعر کو اگر ہم قرآنی علوم، حکمتِ دین اور سنتِ نبوی ﷺ کے تناظر میں دیکھیں، تو اس میں **نفساتی بصیرت(Firasah)** ، **حکمتِ الٰہی** اور **تزکیہ نفس** کے گہرے پہلو نظر آتے ہیں۔

۱ . قرآنی حکمت اور بصیرت(Firasah)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"**إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ**) "(سورہ الحجر:75)

(ترجمہ: بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو صاحبِ فراست / اہلِ بصیرت ہیں۔)

مولانا روم کے شعر میں حکیم کا ایک ایک شہر اور ایک ایک مالک کا حال پوچھنا دراصل وہ **فراستِ مومن** ہے جس کا ذکر حدیث میں بھی آیا ہے۔ قرآن اہل اللہ کو یہ بصیرت عطا کرتا ہے کہ وہ ظاہری علامات (بیماری) کو دیکھ کر باطنی حقیقت (عشق یا گناہ) تک پہنچ جاتے ہیں۔ حکیم کا سوال و جواب کرنا محض تجسس نہیں، بلکہ اس "نشانی" کی تلاش ہے جو مریض کے دل میں چھپی ہے۔

۲ . سنتِ نبوی ﷺ اور نفسیاتی اسلوبِ گفتگو

رسول اللہ ﷺ کی سنت مبارکہ میں یہ طریقہ واضح ملتا ہے کہ آپ ﷺ سائل یا پریشان حال شخص کی ذہنی اور قلبی کیفیت کے مطابق اس سے گفتگو فرماتے۔

- **تالیفِ قلب:** آپ ﷺ لوگوں کے احوال دریافت فرماتے، ان کے پس منظر سے آگاہی حاصل کرتے تاکہ ان کے اصل مسئلے کا حل پیش کر سکیں۔
- **حکمتِ تدریجی:** حکیم کا "یک بہ یک" (ایک ایک کرکے) پوچھنا سنتِ نبوی ﷺ کے اس پہلو کی عکاسی کرتا ہے کہ کسی کی اصلاح یا علاج میں **تدریج** (Gradualism) ضروری ہے۔ آپ ﷺ نے بھی دین کی تعلیمات کو بتدریج لوگوں کے دلوں میں اتارا۔ حکیم بھی اچانک اصل بات نہیں پوچھتا، بلکہ پہلے شہروں اور ماضی کے "نان و نمک" کا ذکر کرکے لونڈی کا اعتماد حاصل کرتا ہے۔

"**فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ**" (ان کے دلوں میں بیماری ہے)۔

جس طرح ظاہری معالج جسم کا علاج کرتا ہے، انبیاء اور اولیاء "طبیبِ ارواح" ہوتے ہیں۔ اس شعر میں حکیم کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ لونڈی کا دل کہاں اٹکا ہوا ہے۔ سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق، انسان کے اعمال کا دارومدار اس کی نیت اور قلبی وابستگی پر ہے۔ حکیم "جائے اور نان و نمک" کے ذریعے اس کے **قلبی تعلق** کی جڑ تلاش کر رہا ہے تاکہ اسے "مرضِ عشقِ مجازی" سے نکال کر صحت کی طرف لایا جا سکے۔

نان و نمک اور حقوق العباد کا شعور

اسلام میں "نمک حلالی" اور احسان شناسی کی بڑی اہمیت ہے۔

- شعر میں "نان و نمک" کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جن جگہوں پر رہتا ہے یا جن کا رزق کھاتا ہے، وہاں سے اس کی یادیں اور اثرات وابستہ ہو جاتے ہیں۔
- قرآنی نقطہ نظر سے انسان اپنے ماضی کے اثرات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ حکیم کا یہ اندازِ تفتیش یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس مریضہ نے کہاں سے "اثر" قبول کیا ہے، کیونکہ اسلام میں صحبت اور ماحول (Environment) کو شخصیت سازی میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

قرآنی و نبوی علوم کی روشنی میں یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ:

1. **حکمت** (Wisdom) مومن کی گمشدہ میراث ہے، جسے وہ تشخیصِ حالات کے لیے استعمال کرتا ہے۔

2. کسی کے دکھ کا علاج کرنے کے لیے اس کے ساتھ **ہمدردی اور اپنائیت** (Rapport building) ضروری ہے، جیسا کہ حکیم نے "نان و نمک" کی باتیں کر کے کیا۔

3. **باطنی صفائی** کے لیے ماضی کے ان تمام بتوں یا یادوں کو کھنگالنا ضروری ہے جو انسان کی روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ (مرض) بنے ہوئے ہیں۔

مولانا روم کے کلام کی خاصیت یہی ہے کہ اس کی تہیں (Layers) ظاہری قصے سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ جب ہم اس شعر کو **روحانی، علمِ باطن، وجدانی اور عرفانی** تناظر میں دیکھتے ہیں، تو یہ محض ایک طبیب اور مریضہ کا مکالمہ نہیں رہتا، بلکہ یہ **روح اور اللہ** کے درمیان کا ایک گہرا راز بن جاتا ہے۔

ا. روحانی تعبیر (The Spiritual Perspective)

روحانی طور پر یہ شعر **مرشدِ کامل اور مرید** کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

- **حکیمِ الٰہی:** وہ مرشدِ کامل ہے جو مرید کی روح کا علاج کرنے آیا ہے۔
- **خواجگان و شہرہا:** مرید کی زندگی کے وہ تمام مراحل، صحبتیں اور اس کے دل کے وہ گوشے جہاں اس نے اب تک وقت گزارا ہے۔
- **تعبیر:** مرشد مرید کے باطن میں اتر کر اس کے ماضی کے ایک ایک نقش کو اس لیے کریدتا ہے تا کہ وہ جان سکے کہ مرید کی روح کن دنیوی محبتوں یا "تعلقات" میں قید ہے۔ جب تک پرانی وابستگیاں (خواجگان) اور پرانے ٹھکانے (شہرہا) واضح نہیں ہوں گے، روح کی آزادی (شفا) ممکن نہیں۔

علمِ باطن کی تعبیر (The Esoteric/Batin Perspective)

علمِ باطن کے مطابق، یہ شعر **"سفرِ روح"** کی نشاندہی کرتا ہے۔

- **شہرہا (مقامات):** یہ عالمِ ناسوت، عالمِ ملکوت اور عالمِ جبروت کے وہ مقامات ہیں جہاں سے روح گزر کر اس مادی دنیا (قید خانے) میں آئی ہے۔
- **نان و نمک:** وہ روحانی رزق اور وہ عہد و پیمان (میثاقِ ازل) جو روح نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا۔

- **تعبیر :** باطنی طور پر حکیم (عقلِ کُل) روح کو یاد دلا رہا ہے کہ تیرا اصل وطن کہاں ہے؟ تو کن کن منزلوں سے گزری ہے؟ یہ دراصل روح کو اس کی **اصل (Origin)** کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ہے تاکہ اسے یاد آئے کہ اس کی بیماری کی وجہ "اپنے اصل مرکز سے دوری" ہے۔

۳. وجدانی تعبیر (The Intuitive/Ecstatic Perspective)

وجدانی طور پر یہ شعر **تڑپ اور یادِ رفتہ** کی کیفیت ہے۔

- **یک بہ یک بازگفت :** یہاں "کہنا" صرف لفظی نہیں، بلکہ ایک ایسی کیفیت پیدا کرنا ہے کہ مریضہ کا وجدان بیدار ہو جائے۔
- **تعبیر :** جب حکیم مختلف شہروں کا نام لیتا ہے، تو وہ دراصل لونڈی کے دل کے تاروں کو چھیڑ رہا ہے۔ وجدانی کیفیت تب پیدا ہوتی ہے جب کسی خاص "ذکر" پر دل دھڑکنے لگے۔ عرفِ عام میں اسے **"خفتہ یادوں کو بیدار کرنا "** کہتے ہیں۔ وجدان کی رو سے، جب انسان کے سامنے اس کے مطلوب (محبوب) کا تذکرہ آتا ہے، تو اس کی روح وجد میں آ جاتی ہے، اور یہی وہ لمحہ ہے جہاں سے علاج شروع ہوتا ہے۔

۴. عرفانی تعبیر (The Gnostic/Irfani Perspective)

معرفتِ الٰہی کے نقطہ نظر سے یہ شعر **"پہچان (Recognition) "** کا درجہ رکھتا ہے۔

- **خواجگان (مجازی خدا) :** انسان کے دل میں بسے ہوئے وہ بت یا وہ سہارے جن پر اس نے اللہ کو چھوڑ کر بھروسہ کیا ہوا ہے۔
- **جائے ونان ونمک :** وہ دنیاوی لذتیں جنہوں نے انسان کو حقیقتِ حق سے غافل کر دیا ہے۔
- **تعبیر :** عارف (پہچان رکھنے والا) جانتا ہے کہ جب تک انسان اپنے "مجازی تعارف" (میں فلاں کا بیٹا ہوں، اس شہر کا ہوں، یہ میری جائیداد ہے) سے بلند نہیں ہوتا، وہ معرفتِ الٰہی نہیں پا سکتا۔ حکیم کا "نان ونمک" کے بارے میں پوچھنا دراصل اس **"حجاب (Veil) "** کو تلاش کرنا ہے جو بندے اور خدا کے درمیان حائل ہے۔ عرفانی رمز یہ ہے کہ "اپنے نفس کو پہچانو تاکہ اپنے رب کو پہچان سکو" (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ)۔

خلاصہ کلام (لبِ لباب)

یہ شعر صوفیانہ سلوک کے اس مقام کی عکاسی کرتا ہے جہاں **تزکیہ** کے لیے **محاسبہ** ضروری ہے۔ حکیمِ الٰہی (خدا کی طرف سے بھیجی گئی عقل یا مرشد) مرید کی پوری زندگی کا اسکین (Scan) کر رہا ہے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کی روح کا "نان و نمک" (وابستگی) حق کے ساتھ ہے یا باطل کے ساتھ۔

آیئے، عظیم شعراء کے کلام کی روشنی میں اس کی وجدانی اور عرفانی تعبیر کو سمجھتے ہیں:

۱. مرزا عبدالقادر بیدل: حیرت اور باطنی جستجو

بیدل کے ہاں "دل" ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہزاروں عالم پوشیدہ ہیں۔ رومی کا حکیم جب شہروں کا پوچھتا ہے، تو بیدل کی فکر میں وہ دراصل "آئینہ خانۂ دل" کی گرد جھاڑ رہا ہوتا ہے۔

بیدل" : بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ، من اندازِ قدت را می شناسم"

تو جس رنگ میں چاہے لباس بدل کر آ، میں تیری قامت کے انداز کو پہچانتا ہوں۔ بیدل کے نزدیک روح کئی لبادے (شہر اور مالکان) بدلتی ہے، لیکن عارف (حکیم) ہر لبادے کے پیچھے چھپی اصل تڑپ کو پہچان لیتا ہے۔ حکیم کا "یک بہ یک" پوچھنا دراصل اس "قدِ یار" کی پہچان ہے جو مختلف یادوں کے پردے میں چھپا ہے۔

۲. حافظ شیرازی: پیرِ مغاں کی رمز شناسی

حافظ کے ہاں "پیرِ مغاں" وہی کردار ہے جو رومی کا "حکیم" ہے۔ حافظ بتاتے ہیں کہ مرید کے دل کا حال صرف وہی جانتا ہے جو خود اس راستے کا مسافر ہو۔

حافظ" : بیانِ شوق چہ حاجت کہ سوزِ آتشِ دل، کُنَد حکایت کرما بہ رگ رگِ جانم"

شوق کے بیان کی کیا حاجت؟ میرے دل کی آگ کا سوز میرے بدن کی ایک ایک رگ سے ظاہر ہو رہا ہے۔

حکیم کا شہروں کا پوچھنا محض رسمی ہے، ورنہ وہ "رگِ جاں" (نبض) پر ہاتھ رکھتے ہی جان گیا تھا کہ آگ کہاں لگی ہے۔ حافظ کے مطابق "نان و نمک" کا تذکرہ اس لیے ہے تا کہ وہ "رازِ دروں" زبان پر لایا جا سکے جو رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہا ہے۔

۳. فخر الدین عراقی: سوزِ ہجرت اور طلب کا سفر

عراقی سوز و گداز اور ہجرتِ روح کے شاعر ہیں۔ ان کے نزدیک روح ایک غریب الوطن مسافر ہے جو ہر شہر میں اپنا گھر ڈھونڈتی ہے۔

عراقی: نخستیں بادہ کاں در جام کردند ز چشمِ مستِ ساقی وام کردند

"وہ پہلی شراب جو جام میں ڈالی گئی، وہ ساقی کی مست آنکھوں سے ادھار لی گئی تھی۔

عراقی کے عرفانی زاویے سے، حکیم لونڈی سے اس لیے پوچھ رہا ہے کہ تو نے کس کا "نان و نمک" کھایا ہے، یعنی تو نے کس "جام" سے مستی کشید کی ہے؟ وہ اسے اس کے "ازلی ساقی" کی یاد دلا رہا ہے۔

۴. علامہ اقبال: خودی کا سفر اور مقام شوق

اقبال کے نزدیک یہ شعر "منزلوں کی جستجو" ہے۔ انسان کئی مقامات (شہروں) سے گزرتا ہے لیکن اس کی روح کو قرار صرف اپنے اصل مرکز (خدا/خودی) پر ملتا ہے۔

اقبال"" : بھٹک گیا ہے جو راہی، اسے مقام دکھا ، مقامِ شوق دکھا، اسے اپنا نام دکھا"

تعبیر : اقبال کی روشنی میں، حکیم اس لونڈی کو "مقاماتِ شوق" کی یاد دلا رہا ہے۔ "خواجگان و شہرہا" وہ عارضی قیام گاہیں ہیں جہاں روح بھٹک گئی ہے۔ حکیم اسے یہ احساس دلا رہا ہے کہ تو ان شہروں کی قیدی نہیں ہے، تیری اصل پرواز کہیں اور ہے۔

۵. شیخ سعدی شیرازی: انسانی رشتوں کی لطافت

سعدی اخلاق اور محبت کے امتزاج کا نام ہے۔ ان کے ہاں "نان و نمک "کا حق پہچاننا معرفت کی پہلی سیڑھی ہے۔

سعدی" : غریباں را دل از بہرِ وطن سوزد، مرا از بہرِ تو"

غریب الوطن لوگوں کا دل اپنے وطن کے لیے جلتا ہے، لیکن میرا دل صرف تیرے لیے جلتا ہے۔

سعدی کے عرفانی اسلوب میں، حکیم یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کیا لونڈی کی تڑپ صرف "وطن" (ماضی کے شہروں) کے لیے ہے یا اس "محبوب" کے لیے جس کا حقِ نمک اس کی روح پر ہے۔ سعدی کے نزدیک وفاداری ہی وہ صفت ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز اور خدا کے قریب کرتی ہے۔

شہر شہر و خانہ خانہ قِصّہ کرد
نہ رَگَش جُنبید و نہ رُخ گشت زَرد

مشکل الفاظ کے معنی

شہر شہر ایک شہر سے دوسرے شہر تک۔۔۔**خانہ خانہ** گھر گھر، در بہ در

قِصّہ کرد قصہ بیان کیا، حالات سنائے۔۔۔**نہ رَگَش جُنبید** اس کی کوئی رگ نہ ہلی، ذرا بھی اضطراب نہ ہوا

نہ رُخ گشت زَرد چہرہ زرد نہ ہوا، خوف یا کمزوری ظاہر نہ ہوئی۔۔۔**رُخ** چہرہ۔۔۔**زَرد** پیلا، کمزوری یا خوف کی علامت

شعر کا پس منظر (حکایتِ رومی)

اس قصے میں ایک بادشاہ کی کنیز بیمار ہو جاتی ہے اور دنیا بھر کے حکیم اس کا علاج کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بالآخر ایک اللہ والا طبیب (حکیمِ الٰہی) آتا ہے اور وہ بھانپ جاتا ہے کہ کنیز کی بیماری جسمانی نہیں بلکہ "عشق" ہے۔

وہ طبیب کنیز کی نبض پکڑ کر مختلف شہروں اور گھروں کے نام لینا شروع کرتا ہے تاکہ یہ جان سکے کہ اس کا محبوب کہاں رہتا ہے۔ یہ شعر اسی کیفیت کو بیان کرتا ہے:

شہر شہر و خانہ خانہ قِصّہ کرد نہ رَگَش جُنبید و نہ رُخ گشت زَرد

1. **پہلا مصرع:** طبیب نے اس لڑکی کے سامنے ایک ایک کر کے مختلف شہروں اور بستیوں کے قصے چھیڑے اور مختلف گھروں کا تذکرہ کیا۔ (وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ کس شہر کا نام سن کر لڑکی کی کیفیت بدلتی ہے)۔
2. **دوسرا مصرع:** جب تک طبیب ان شہروں کا نام لیتا رہا جن سے لڑکی کا کوئی تعلق نہ تھا، تب تک "**نہ رگش جنبید**" یعنی نہ تو اس کی نبض (رگ) کی رفتار تیز ہوئی اور "**نہ رخ گشت زرد**" اور نہ ہی (شرم یا جذبات کی وجہ سے) اس کا چہرہ زرد یا متغیر ہوا۔

مولانا روم یہاں یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ جب تک انسان کا دل کسی چیز سے وابستہ نہ ہو، وہ اس کے تذکرے پر خاموش اور لاتعلق رہتا ہے۔ لیکن جیسے ہی اس حکایت میں آگے چل کر طبیب نے **"سمرقند"** کا نام لیا، تو لڑکی کی نبض تیز ہو گئی اور چہرہ سرخ ہو گیا۔

یہ شعر اس بات کی علامت ہے کہ سچا عشق چھپائے نہیں چھپتا، اور جسمانی علامات (نبض کی حرکت اور چہرے کا رنگ) دل کے رازوں کی گواہی دے دیتی ہیں۔

قرآن مجید میں سچے مومنین کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ جب اللہ کا ذکر ہو تو ان کے دلوں پر کیا اثر ہوتا ہے:

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ"

جس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔) "(سورہ الزمر:23)

مولانا رومی اس شعر میں دکھا رہے ہیں کہ جب تک غیر متعلقہ (دنیاوی) چیزوں کا ذکر ہو رہا تھا، لڑکی کا جسم خاموش تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا وجود اسی وقت "ردِ عمل (Reaction) " دیتا ہے جب اس کے **محبوب** کا ذکر آئے۔ اگر ذکرِ الٰہی پر ہمارے دل میں تڑپ پیدا نہیں ہوتی، تو ہمیں اپنے ایمان کی نبض چیک کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ شعر **سچائی اور منافقت** کے فرق کو بھی واضح کرتا ہے۔ انسان زبان سے کچھ بھی کہے، لیکن اس کی جسمانی زبان (Body Language) جھوٹ نہیں بول سکتی۔

- **سنت کی روشنی میں:** منافق کی پہچان اس کے اضطراب سے ہوتی ہے جب اسے حق کی طرف بلایا جائے۔

طبیب نے اسے آزمایا کہ اس کا دل کہاں اٹکا ہوا ہے۔ قرآن و سنت ہمیں سکھاتے ہیں کہ ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں کہ ہماری خوشی اور غم کا مرکز کیا ہے؟ کیا ہم دنیا کے نقصان پر زرد پڑ جاتے ہیں یا اللہ کی ناراضگی پر؟

مرشدِ کامل (طبیبِ روحانی) کی ضرورت

جس طرح اس قصے میں ایک "حکیمِ الٰہی" نے نبض دیکھ کر پوشیدہ بیماری کا پتہ لگا لیا، دین میں بھی ہمیں **محسنین اور اہل اللہ** کی صحبت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہماری روح کی بیماریوں (حسد، کبر، دنیا کی محبت) کو پہچان سکیں۔

- قرآن فرماتا ہے" : **كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ** "(سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ)۔
- یہ شعر ہمیں بتاتا ہے کہ ایک ماہر مربی ہی یہ جان سکتا ہے کہ مرید کا دل کہاں الجھا ہوا ہے اور اس کا علاج کیسے کرنا ہے۔

قرآنی نقطہ نظر سے اس شعر کا پیغام یہ ہے کہ **انسان کا اصل اس کا باطن (دل) ہے**۔

- اگر دل دنیا کی عارضی چیزوں میں اٹکا ہے، تو وہ وہیں تڑپے گا۔
- اگر دل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں ہے، تو اس کا سکون اور بے چینی صرف وہیں ہو گی۔

یہ شعر ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنا **خود احتسابی (Self-Accountability)** کریں: کیا اللہ کے ذکر سے ہماری "رگِ جنبیدی" (دل تڑپتا) ہے؟ یا ہم دنیا کے قصوں میں ہی مگن ہیں؟

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ انسانی جسم ایک مملکت کی طرح ہے، جس کا بادشاہ **"دل "** ہے۔ اس تناظر میں آپ کے پوچھے گئے شعر کے تین اہم نکات یہ ہیں:

دل کا آئینہ اور مخفی علامات

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے باطن میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کے اثرات ظاہر (جسم) پر ضرور نمودار ہوتے ہیں۔ رومی کے شعر میں طبیب نے جو لڑکی کی نبض تھامی، امام غزالیؒ اسے **"آئینہ "** قرار دیتے ہیں۔

- اگر دل میں سچی محبت یا خوفِ خدا ہو، تو چہرے کی زردی اور دھڑکن کی تیزی اسے چھپنے نہیں دیتی۔
- اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ اسے اللہ سے محبت ہے، لیکن گناہ کرتے وقت اس کے ہاتھ نہ کانپیں یا ذکرِ الٰہی پر اس کی آنکھ نہ بھیگے، تو امام غزالیؒ کے نزدیک وہ اپنے دعوے میں سچا نہیں۔

دنیاوی علائق (تعلقات) کی جڑیں

مولانا رومی نے "شہر شہر اور خانہ خانہ" کا تذکرہ کیا، امام غزالیؒ اسے **"حبِ دنیا "** کے جال سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسان کا دل ہزاروں تاروں (تعلقات) سے بندھا ہوتا ہے۔ جب تک وہ تار حرکت میں نہ آئے جس سے دل کا کوئی گہرا مفاد جڑا ہے، انسان خاموش رہتا ہے۔

- **قرآنی نکتہ :** اسی لیے اللہ نے فرمایا" :(قیامت کے دن) نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، سوائے اس کے جو "قلبِ سلیم "(پاکیزہ دل) لے کر آیا۔ "(سورہ الشعراء)۔
- رومی کے شعر میں طبیب اسی "قلبِ سلیم" کی تلاش میں تھا کہ کہیں یہ کسی غیر اللہ کی محبت میں تو بیمار نہیں؟

معرفتِ نفس کی اہمیت

امام غزالیؒ کا مشہور قول ہے" : جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ "اس شعر میں طبیب کا عمل دراصل **معرفتِ نفس** کا ایک طریقہ ہے۔

- وہ لڑکی کو یہ احساس دلا رہا ہے کہ تمہاری بیماری جسمانی (بخار یا درد) نہیں بلکہ تمہاری روح کہیں اور اٹکی ہوئی ہے۔
- سنتِ نبوی ﷺ میں بھی اپنے نفس کا جائزہ لینے (محاسبہ) پر زور دیا گیا ہے۔ جب تک انسان یہ تسلیم نہ کرے کہ اس کا دل کن دنیاوی بتوں سے وابستہ ہے، وہ روحانی شفاء نہیں پا سکتا۔

خلاصہ کلام

امام غزالیؒ کی تعلیمات کی روشنی میں اس شعر کا پیغام یہ ہے کہ **: ہمارا وجود ایک حساس آلہ ہے؛** اگر ہمارے دل میں ایمان کی حرارت ہوگی، تو حق کی پکار پر ہمارا رنگ بھی بدلے گا اور رگیں بھی تڑپیں گی۔ اور اگر دل مردہ ہو چکا ہو، تو پھر چاہے کتنا ہی بڑا حق سامنے آ جائے، انسان "شہر شہر اور خانہ خانہ" کے قصوں کی طرح بے حسی سے سب کچھ سنتا رہتا ہے اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

نَبْضِ او بر حالِ خود بُد بی گَزند
تا بِپُرسید از سَمَرقَندِ چو قَند

مشکل الفاظ کے معانی

نَبْض: دھڑکن، رگ کی حرکت (Pulse) ---**بر حالِ خود بُد:** اپنی حالت پر قائم تھی، معمول کے مطابق تھی

بی گَزند: بے ضرر، بغیر کسی خرابی یا تبدیلی کے--- **تا:** یہاں بمعنی "یہاں تک کہ"-- **بپُرسید:** اس نے پوچھا

سمرقند: وسطی ایشیا کا مشہور شہر--- **چو قند:** شکر کی طرح میٹھا

ترجمہ

اس (کنیز) کی نبض اپنی حالت پر بالکل نارمل (پرسکون) تھی، یہاں تک کہ اس (طبیب) نے شکر جیسے میٹھے شہر سمرقند کے بارے میں پوچھا۔

مولانا روم اس قصے میں بیان کرتے ہیں کہ ایک بادشاہ کی کنیز بیمار ہو گئی اور کوئی بھی دنیاوی حکیم اسے ٹھیک نہ کر سکا۔ آخر کار ایک اللہ والے طبیب نے آکر تشخیص کی کہ یہ بیماری جسمانی نہیں بلکہ "عشق" ہے۔

۱. **نفسیاتی تشخیص:** طبیب نے تشخیص کا ایک منفرد طریقہ اپنایا۔ اس نے کنیز کا ہاتھ اپنی گرفت میں لیا (نبض پر ہاتھ رکھا) اور مختلف شہروں، گلیوں اور لوگوں کے نام لینا شروع کیے۔ جب تک وہ دوسرے شہروں کا ذکر کرتا رہا، کنیز کے دل کی دھڑکن اور نبض بالکل نارمل رہی (بی گزند)۔ یعنی ان جگہوں سے اس کا کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔

۲. **سمرقند کا ذکر:** جیسے ہی طبیب نے **سمرقند** کا نام لیا، کنیز کی نبض تیز ہو گئی اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مولانا نے سمرقند کو "چو قند" (شکر جیسا) اس لیے کہا کیونکہ اس شہر میں کنیز کا محبوب (زرگر) رہتا تھا، اور محبوب کا شہر ہمیشہ میٹھا اور پیارا لگتا ہے۔

اس شعر کے ذریعے مولانا روم یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ انسان جتنا بھی اپنی کیفیت کو چھپائے، اس کے اندر چھپا ہوا راز (عشق یا لگن) کسی نہ کسی طرح ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ یہ شعر موجودہ دور کی "سائیکالوجی" اور "لائی ڈیٹیکٹر" (جھوٹ پکڑنے والی مشین) کے تصور کی قدیم اور لطیف مثال ہے۔

اس قصے میں حکیم (طبیب) نے جس طرح کنیز کے دل کا راز معلوم کیا، وہ دراصل اللہ کی عطا کردہ اس صفت کا عکس ہے جس کا ذکر قرآن میں بارہا آیا ہے کہ انسان کے اندر کیا چھپا ہے، وہ اللہ سے مخفی نہیں: ارشاد فرمایا

"وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِهٖ نَفۡسُهٗ) "سورہ ق، آیت:۱۶

" اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں جو اس کے جی میں وسوسے گزرتے ہیں۔"

مولانا روم یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جو لوگ اللہ والے ہوتے ہیں، اللہ انہیں "علمِ لدنی" عطا فرماتا ہے، جس سے وہ دوسروں کے نفس کے وسوسے اور دل کی پوشیدہ تڑپ (جیسے سمرقند کی یاد) کو بھانپ لیتے ہیں۔

شعر میں ذکر ہے کہ جب سمرقند کا نام لیا گیا تو نبض کی حالت بدلی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے منافقین اور مخلصین کی پہچان کے لیے "لحن" (اندازِ گفتگو) اور "سیما" (علامات) کا ذکر کیا ہے:

"وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِىۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ) "سورہ محمد، آیت:۳۰

" اور تم ضرور انہیں ان کے طرزِ گفتگو سے پہچان لوگے۔"

"تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ) "سورہ البقرہ، آیت:۲۷۳" (تم انہیں ان کے چہروں کے آثار (علامات) سے پہچان لوگے۔"

جس طرح ایک مومن کا چہرہ یا اس کی گفتگو اس کے اندر کے ایمان کی گواہی دیتی ہے، اسی طرح کنیز کی بدلتی ہوئی نبض اور اس کے بولنے کا انداز اس کے اندر چھپے "عشق" کی علامت بن گیا۔ حکیم نے اسی "لحنِ قول" اور علامات سے تشخیص کی۔

کنیز کا سمرقند کے زرگر (سنار) کی طرف مائل ہونا اور اس کی یاد میں بیمار پڑ جانا اس انسانی جبلت کی عکاسی ہے جسے قرآن نے "تزئین" (خوبصورت بنا کر دکھانا) سے تعبیر کیا ہے:

"زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ) "... سورہ آل عمران، آیت: ۱۴ (

"لوگوں کے لیے مرغوب چیزوں کی محبت خوشنما بنادی گئی ہے، جیسے عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر۔۔۔"

سمرقند کا زرگر یہاں اسی دنیاوی کشش کی علامت ہے۔ انسان جب کسی فانی چیز (مخلوق) کو اپنا مرکزِ نگاہ بنالیتا ہے، تو وہ روحانی طور پر بیمار ہو جاتا ہے۔ مولانا روم بتاتے ہیں کہ یہ "سمرقند" (دنیاوی معشوق) محض ایک دھوکہ ہے، اصل سکون اللہ کی یاد میں ہے۔

اس قصے کا حکیم اپنی حکمتِ عملی سے علاج کرتا ہے۔ قرآن میں حکمت کو بہت بڑی دولت قرار دیا گیا ہے:

"يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا) " سورہ البقرہ، آیت: ۲۶۹(

"وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے، اور جسے حکمت مل گئی، اسے بہت بڑی خیر (بھلائی) مل گئی۔"

حکیم کا نبض پر ہاتھ رکھ کر شہروں کے نام لینا ایک **"حکمت"** تھی۔ یہ وہ دانش ہے جو کتابوں سے نہیں بلکہ تقویٰ اور اللہ کے قرب سے حاصل ہوتی ہے۔

کنیز کی حالت دیکھ کر شاہی طبیب مایوس ہو چکے تھے، لیکن الٰہی طبیب نے اسے "بیماری" سمجھ کر علاج کیا۔

"مَا أَنْزَلَ اللَّهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً) " صحیح بخاری (

"اللہ نے کوئی ایسی بیماری نہیں اتاری جس کی شفا (دوا) نازل نہ کی ہو۔"

مولانا روم کا پیغام یہ ہے کہ چاہے عشق کی بیماری ہو یا نفس کی برائی، اگر انسان کسی کامل "روحانی طبیب" (مرشدِ کامل) سے رجوع کرے، تو ہر مرض کا علاج ممکن ہے۔

حاصلِ کلام

یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ:

- ہمارا جسم ہمارے دل کا آئینہ دار ہے۔

- باطنی امراض (حسد، کینہ، غیر اللہ کی محبت) کی تشخیص کے لیے "اہلِ بصیرت" کی ضرورت ہوتی ہے۔
- اللہ کی یاد کے علاوہ جس چیز میں بھی انسان سکون ڈھونڈتا ہے، وہ "سمرقند" کی طرح عارضی اور مٹنے والی ہے۔

عارفین (Gnostics) کے نزدیک کائنات میں کوئی بھی حرکت اتفاقی نہیں ہے۔ مولانا روم یہاں یہ نکتہ سمجھا رہے ہیں کہ **جسم، روح کا لباس ہے**۔ جب روح کسی چیز کی طرف مائل ہوتی ہے یا کسی صدمے سے دوچار ہوتی ہے، تو اس کا اثر جسم کی لہروں (نبض) پر ظاہر ہونا لازمی ہے۔

- **عرفانی نکتہ:** انسان کتنا ہی بڑا "رازداں" کیوں نہ بن جائے، اس کے وجود کی تاریں (نبض) اس کے باطن کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔ جب "محبوب" یا "مطلوب" (سمرقند) کا ذکر آتا ہے، تو روح وجد میں آتی ہے اور نبض گواہی دیتی ہے۔ گویا حق چھپائے نہیں چھپتا۔

عِلمِ حقیقی: "علت اور معلول" (Cause and Effect)

علمِ حقیقی سے مراد وہ علم ہے جو ظاہری علامات کے پیچھے چھپی ہوئی **"اصل وجہ"** تک پہنچ جائے۔

- عام حکیموں نے بخار اور کمزوری کا علاج کیا، کیونکہ ان کا علم "ظاہری" (علمِ صورت) تھا۔
- الٰہی طبیب کا علم "حقیقی" (علمِ معنی) تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ مرض مادی نہیں بلکہ **تعلق** کا ہے۔
- **حقیقی فکر:** سمرقند یہاں محض ایک شہر نہیں، بلکہ اس "تعلقِ خاطر (Attachment)" کی علامت ہے جس نے روح کو قید کر رکھا ہے۔ علمِ حقیقی یہ ہے کہ انسان پہچان لے کہ اس کی بے چینی کی اصل جڑ کس دنیاوی شے سے بندھی ہوئی ہے۔

۳. وجدانی فکر: "بے اختیاری کا عالم"

وجدانی فکر اس لمحے کو کہتے ہیں جہاں عقل ہار جائے اور احساس غالب آ جائے۔

- کنیز اپنی بیماری کو چھپا رہی تھی (یہ عقل تھی)۔
- لیکن جیسے ہی سمرقند کا نام لیا گیا، اس کا **وجدان** بیدار ہو گیا اور اس کے قابو سے باہر ہو گیا۔

- **وجدانی نکتہ :** سمرقند کا نام سنتے ہی نبض کا بے قابو ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ "محبت" عقل کے تابع نہیں ہوتی۔ وجدان سچائی کا وہ مقام ہے جہاں انسان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ نبض کی وہ تیزی دراصل روح کا وہ "وجد" تھا جو سمرقند کی یاد میں تڑپ اٹھا۔

۴ . روحانی فلسفہ: "غیر اللہ سے وابستگی"

روحانیت کی رو سے یہ شعر ایک بہت بڑی تنبیہ ہے۔

- **سمرقند** یہاں استعارہ ہے ہر اس دنیاوی لذت اور محبت کا جو انسان کو اللہ (اصل بادشاہ) سے دور کر دیتی ہے۔
- جب تک انسان کے دل میں "سمرقندِ چو قند" (دنیا کی میٹھی لذتیں) موجود ہیں، اس کی روح بیمار رہے گی اور اس کی نبض (زندگی کا توازن) بگڑی رہے گی۔
- **روحانی شفا :** شفا تب ہی ممکن ہے جب انسان اپنے باطنی "سمرقند" (دنیاوی بتوں) کو پہچان لے اور ان کی حقیقت سے آگاہ ہو کر ان سے پیچھا چھڑائے۔

حاصلِ کلام (خلاصہِ فکر)

علمِ حقیقی اور وجدان ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ:

1. **تشخیصِ نفس :** اپنے اندر کے "سمرقند" کو پہچانو کہ تمہاری بے چینی کہاں سے جڑی ہے۔
2. **صدقِ باطن :** تم زبان سے کچھ بھی کہو، تمہارا وجود (نبض) وہی کہے گا جو تمہارے دل میں ہے۔
3. **مرشدِ کامل :** جس طرح اس حکیم نے نبض سے راز پایا، اسی طرح ایک مرشدِ کامل مرید کے باطنی امراض کو اس کی گفتگو اور کیفیت سے بھانپ لیتا ہے۔

نَبُض جَست وروئ سُرخ وزَرد شُد
کَز سَمَر قندیِّ زر گر فَرد شُد

مشکل الفاظ کے معنی

نَبُض: دل کی دھڑکن، نبض۔۔۔ **جَست:** اچھلی، تیز ہوئی۔۔۔ **رُوی:** چہرہ۔۔۔ **سُرخ وزَرد شُد:** کبھی سرخ ہوا، کبھی زرد پڑ گیا

کَز: کہ از (کہ جب / کیونکہ)۔۔۔ **سَمَرقَندی:** سمرقند کا رہنے والا۔۔۔ **زَرگر:** سنار، سونے چاندی کا کاریگر

فَرد شُد: جدا ہوا، الگ ہوا

ترجمہ

جب (طبیب کی زبان سے) سمرقند کے سنار کا ذکر ہوا۔ تو (کنیز کی) نبض اچھلنے لگی اور چہرہ (مارے شرم اور اضطراب کے) کبھی سرخ اور کبھی زرد ہونے لگا۔

مولانا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان کے باطن (روح یا دل) میں جو کچھ چھپا ہوتا ہے، اس کے اثرات جسم پر ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ کنیز اپنی بیماری کی اصل وجہ (محبت) کو چھپا رہی تھی، لیکن جیسے ہی اس کے محبوب (سمرقندی سنار) کا نام لیا گیا، اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی۔

قدیم طب میں طبیب نبض کے ذریعے نہ صرف جسمانی بیماری بلکہ مریض کے جذباتی احوال کا بھی پتہ لگاتے تھے۔ یہاں "نبض کا جست کرنا" (اچھلنا) اس بات کی علامت ہے کہ کنیز کا راز فاش ہو چکا ہے۔

چہرے کا سرخ ہونا "حیا اور جوشِ محبت" کی علامت ہے، جبکہ زرد ہونا "خوف اور جدائی کے دکھ" کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ رنگ بدلنا اس بات کا ثبوت تھا کہ اس بیمار لڑکی کا اصل مرض کوئی جسمانی تکلیف نہیں بلکہ "عشق" ہے۔

یہ شعر اس روحانی طبیب (پیرِ کامل) کی فراست کو بھی ظاہر کرتا ہے جو باتوں ہی باتوں میں مرید یا طالب کے دل میں چھپے ہوئے دنیاوی علائق اور بتوں کو پہچان لیتا ہے۔

دراصل یہ شعر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ عشق ایک ایسی آگ ہے جسے جتنا بھی چھپایا جائے، وہ کسی نہ کسی صورت (رنگ، ڈھنگ یا دھڑکن) سے ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ مولانا کے نزدیک اصل طبیب وہی ہے جو ظاہری علامات کے بجائے باطنی جڑوں تک پہنچے۔

یہ شعر دراصل **دل کی کیفیت، محبت کی شدت اور باطنی وابستگی** کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن و حدیث میں اس مضمون کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں مزید آیات و احادیث کی روشنی میں وضاحت پیش ہے:

دل کی کیفیت چہرے اور جسم پر ظاہر ہوتی ہے

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَنْ لَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمَاهُمْ ۚ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ (30) (سورۃ محمد: 29–30)

کیا جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ اس گھمنڈ میں ہیں کہ اللہ ان کے چھپے ہوئے بغض و کینے کو ظاہر نہ فرمائے گا۔ اور اگر ہم چاہتے تو تمہیں وہ منافقین دکھا دیتے تو تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لیتے اور ضرور تم انہیں گفتگو کے انداز میں پہچان لوگے اور اللہ تمہارے اعمال جانتا ہے۔

اللہ فرماتا ہے کہ دل کی بیماری آخرکار چہروں اور علامات سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

شعر میں بھی یہی ہوا۔ دل میں محبت چھپی تھی، مگر **نبض** اور **چہرے کے رنگ** نے راز فاش کر دیا۔

إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا (سورۃ آل عمران: 119)

اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں برا لگتا ہے اور اگر تمہیں کوئی برائی پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں

دل کا حال انسان کے ظاہری ردِّ عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔ محبت، حسد، نفرت — سب چہرے اور حرکات سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (سورۃ الکہف: 28)

تیری (محبت اور توجہ کی) نگاہیں اُن سے نہ ہٹیں۔ کیا تو (اُن فقیروں سے دِھیان ہٹا کر) دُنیوی زندگی کی آرائش چاہتا ہے؟

دل جب دنیا کی زینت میں الجھ جائے تو کیفیت بدل جاتی ہے۔

محبت کا اثر جسم پر — حدیث کی روشنی میں

محبت اور تعلق

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ** (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

انسان کا انجام اسی کے ساتھ ہو گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

یعنی محبت محض جذباتی کیفیت نہیں، بلکہ انسان کی شناخت اور انجام کا تعین کرتی ہے۔

فتنۂ عورت و دنیا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

حَدَّثَنَا آدَمُ، حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ سُلَيْمَانَ التَّيْمِيِّ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا عُثْمَانَ النَّهْدِيَّ، عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: "مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ". (صحیح بخاری)

ہم سے آدم نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، ان سے سلیمان تیمی نے بیان کیا، انہوں نے ابو عثمان نہدی سے سنا اور انہوں نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں کے فتنہ سے بڑھ کر نقصان دینے والا اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا ہے۔ (صحيح البخاري/كتاب النكاح/حدیث:5096)

اس میں یہ اشارہ ہے کہ شہوت میں اصل عورتیں ہیں اور ان کا فتنہ بہت سخت ہے کیونکہ یہ مردوں کو قطع رحمی اور اللہ تعالی کی معصیت پر ابھارتی ہیں۔

ایک حدیث میں ہے:

”عورتوں سے بچو کیونکہ پہلا پہلا فتنہ جو بنی اسرائیل میں رونما ہوا وہ عورتوں کی وجہ سے تھا۔

)" صحیح مسلم، الرقاق، حدیث:6948(2742(

، وفتح الباري:173/9(2) (

کہا جاتا ہے کہ زر، زمین اور زن فتنوں کی بنیاد ہیں۔

بعض دفعہ عورتوں کے فتنے میں قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

عورتوں کی بابت فسادات تاریخ انسانی میں ہمیشہ ہوتے چلے آئے ہیں۔

قرآن کریم نے عزیز مصر اور زنانِ مصر کے فتنے کو نمایاں طور پر بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"بلاشبہ تم عورتوں کا مکر و فریب بہت بھاری ہوتا ہے۔

) "یوسف:28(

ایک اور حدیث میں دنیا کو سب سے بڑی آزمائش کہا گیا۔ یہ بتاتا ہے کہ شدید جذباتی وابستگی انسان کے لیے فتنہ بن سکتی ہے۔

اصل مطلوب کیفیت یہ ہے کہ **دل اللہ کے نام سے متاثر ہو، نہ کہ دنیاوی ناموں سے۔**

شعر میں "سمرقندی سنار" کا نام آتے ہی راز فاش ہو گیا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے دلوں کے بھیدوں کے بارے میں فرمایا:

- **قرآن" :وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ** "(اور جو کچھ سینوں میں ہے وہ ظاہر کر دیا جائے گا)۔(سورۃ العادیات:10)
- اگرچہ یہ آیت قیامت کے تناظر میں ہے، لیکن صوفیا کے نزدیک دنیا میں بھی انسان کے اعمال اور شدید جذبات اس کے چہرے کی رنگت اور آنکھوں سے جھلکتے ہیں، جسے قرآن "**سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ** "(ان کی علامت ان کے چہروں پر ہے) سے تعبیر کرتا ہے۔

عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سبق

مولانا رومی اس قصے سے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اگر ایک انسان کی محبت (سنار) کا نام لینے سے نبض اچھل سکتی ہے، تو جب بندہ اپنے اصل محبوب (اللہ تعالیٰ) کا ذکر سچے دل سے سنتا ہے، تو اس کی کیا کیفیت ہونی چاہیے؟

- **قرآن" :إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ)** "
- مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے **دل تھرّا اٹھتے ہیں**(۔(سورۃ الانفال:2)

رومی کے اس شعر پر تحقیقی نظر ڈالی جائے تو یہ محض ایک شاعرانہ تخیل نہیں، بلکہ اس میں قرونِ وسطیٰ کی **طب (Medicine)**، **نفسیات (Psychology)** اور **تصوف** کے گہرے اسرار پوشیدہ ہیں۔

آئیں اس کے مختلف تحقیقی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ تاریخی و طبی پس منظر: ابنِ سینا کا طریقۂ تشخیص

تحقیقی طور پر یہ واقعہ شیخ الرئیس **ابنِ سینا (Avicenna)** کے ایک مشہور طبی تجربے سے مماثلت رکھتا ہے۔ ابنِ سینا نے ایک شہزادے کا علاج اسی طریقے سے کیا تھا۔

- **نبض بطور بائیو فیڈبیک (Bio-feedback):** قدیم اطباء (جیسے ابنِ سینا اور الرازی) کا ماننا تھا کہ "عشق" ایک دماغی اور نفسیاتی مرض ہے جس کا براہِ راست تعلق قلب (Heart) سے ہے۔
- جب انسان اپنے محبوب کا نام سنتا ہے، تو اس کا **نظامِ اعصاب (Autonomic Nervous System)** فوراً ردِ عمل دیتا ہے۔ رومی نے "نبض جست" (نبض کا اچھلنا) کہہ کر اسی سائنسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جسے آج ہم 'ٹیکی کارڈیا (Tachycardia) ' یا دل کی دھڑکن کا اچانک بڑھ جانا کہتے ہیں۔

رنگوں کی نفسیات (Psychology of Colors)

شعر میں چہرے کے **سرخ اور زرد** ہونے کا ذکر نفسیاتی ہیجان کی عکاسی کرتا ہے:

- **سرخ رنگ:** یہ "جوش" اور "خجالت (Shame/Blushing) " کی علامت ہے جب خون کی گردش چہرے کی طرف بڑھ جاتی ہے۔
- **زرد رنگ:** یہ "خوف" اور "جدائی کے صدمے (Anxiety/Anemia of Soul) " کی علامت ہے۔
- تحقیقی نکتہ یہ ہے کہ رومی نے ان دو متضاد رنگوں کے ذریعے مریضہ کی **تذبذب (Conflict)** والی کیفیت دکھائی ہے: ایک طرف ملنے کی خوشی (سرخی) اور دوسری طرف راز فاش ہونے یا جدائی کا ڈر (زردی)۔

عمرانی اور جغرافیائی استعارہ (Samarkand & Goldsmith)

- **سمرقند:** اس دور میں سمرقند علم، ہنر اور حسن کا مرکز تھا۔ رومی نے سمرقند کا انتخاب کر کے ایک "دور دراز کی خواہش" یا "اعلیٰ معیارِ حسن" کو علامت بنایا ہے۔

- **زرگر (سنار) :** سنار سونے کو پگھلاتا اور سنوارتا ہے۔ یہاں سنار سے مراد وہ "دنیاوی چمک دمک" ہے جو عارضی ہے۔ تحقیقی طور پر رومی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان اکثر ظاہری چمک (سونا/زر) سے دھوکا کھا کر اپنی روح (کنیز) کو بیمار کر لیتا ہے۔

۴. فلسفیانہ نکتہ: "تشخیصِ علت (Causal Diagnosis)"

رومی اس شعر کے ذریعے یہ فلسفیانہ بحث چھیڑتے ہیں کہ **"مرض"** وہ نہیں جو نظر آرہا ہے (بخار یا کمزوری)، بلکہ مرض وہ ہے جو باطن میں چھپا ہے (محبت یا خواہش)۔

- جدید **سائیکوسومیٹک (Psychosomatic)** طب میں بھی یہ مانا جاتا ہے کہ بہت سی جسمانی بیماریوں کی جڑیں انسانی ذہن اور اس کے جذباتی صدمات میں ہوتی ہیں۔ رومی نے 800 سال پہلے اس کی نشاندہی کر دی تھی۔

فنی تحقیق: "فردشد" کی معنویت

لفظ **"فردشد"** پر محققین کے دو آراء ہیں:

1. **نام لیا گیا :** یعنی جب باتوں کے دوران سمرقندی سنار کا تذکرہ الگ سے (Individually) کیا گیا۔
2. **یکسو ہونا :** یعنی جیسے ہی اس کا نام آیا، کنیز کی تمام تر توجہ (Concentration) دنیا و مافیا سے کٹ کر صرف اس ایک نام پر مرکوز ہو گئی۔

خلاصہ تحقیق

یہ شعر ثابت کرتا ہے کہ رومی صرف ایک صوفی نہیں تھے، بلکہ وہ انسانی **اناٹومی (Anatomy)** اور **سائیکی (Psyche)** کے ماہر تھے۔ انہوں نے دکھایا کہ "زبان" جھوٹ بول سکتی ہے لیکن "نبض" اور "رنگت" کبھی جھوٹ نہیں بولتے کیونکہ وہ روح کے براہِ راست تابع ہیں۔

چون زِرَ نجور آن حکیم این راز یافت

اَصلِ آن دَرد و بَلا را باز یافت

مشکل الفاظ کے معنی

چون: جب، جیسے ہی...۔رنجور: بیمار، دکھی، رنج میں مبتلا۔۔۔ حکیم: دانا طبیب، صاحبِ حکمت۔۔۔ راز: بھید، پوشیدہ حقیقت

یافت: پایا، معلوم کیا۔۔۔اصل: بنیاد، جڑ۔۔۔ درد: بیماری، تکلیف۔۔۔بلا: مصیبت، آفت

بازیافت دوبارہ پالیا، دریافت کر لیا

ترجمہ : جب اس حکیم (حاذق) نے اس بیمار (کنیز) سے اس (خفیہ) راز کو پالیا، تو اسے اس کی تمام تر تکلیف اور مصیبت کی اصل جڑ معلوم ہو گئی۔

اس شعر میں مولانا روم نفسیاتی اور روحانی علاج کے ایک گہرے نکتے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ قصہ یوں ہے کہ ایک بادشاہ کی کنیز بیمار ہو گئی اور دنیاوی اطباء اس کا علاج کرنے میں ناکام رہے کیونکہ وہ صرف جسمانی علامات (بخار، نبض وغیرہ) کا علاج کر رہے تھے۔ پھر ایک "حکیمِ الٰہی" (اللہ والا طبیب) تشریف لائے جنھوں نے جان لیا کہ یہ بیماری جسمانی نہیں بلکہ **"عشق "** ہے۔

1۔ **تشخیصِ باطنی :(Internal Diagnosis)** مولانا فرماتے ہیں کہ جب اس دانشمند طبیب نے کنیز سے گفتگو کی اور مختلف شہروں کا ذکر چھیڑا، تو سمرقند کے ذکر پر کنیز کی نبض کی رفتار بدل گئی۔ یہاں "راز یافتن" (راز پالینے) سے مراد وہ نفسیاتی گرہ ہے جسے طبیب نے اپنی فراست سے کھولا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی مصائب کی جڑ اکثر ظاہر میں نہیں بلکہ باطن کے کسی پوشیدہ دکھ یا ادھوری خواہش میں چھپی ہوتی ہے۔

2۔ **درد و بلا کی اصل :(The Root of Suffering)** "اصلِ آن درد و بلا" سے مراد وہ محرک (Trigger) ہے جو انسان کو بے چین رکھتا ہے۔ تصوف کی زبان میں، جب تک سالک اپنے مرض کی حقیقی جڑ (خواہشِ نفس یا کسی غیر اللہ سے وابستگی) کو نہیں پہچان لیتا، اس کا علاج ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں حکیم نے جان لیا کہ کنیز کی ظاہری بیماری محض ایک علامت ہے، جبکہ اصل "بلا" وہ جدائی اور عشق ہے جو اسے اندر ہی اندر گھلائے جا رہا ہے۔

3۔ادبی و علمی پہلو : اس شعر میں مولانا نے **"رنجور "** اور **"حکیم "** کے تقابل سے یہ واضح کیا ہے کہ کامل رہبر یا مرشد وہی ہے جو مرید کے دل میں جھانک کر اس کے اصل روحانی مرض کا سراغ لگا لے۔ علمی اعتبار سے یہ شعر اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ "علمِ ابدان" (طب) کے ساتھ ساتھ "علمِ ادیان" اور علمِ معرفت کا ہونا ناگزیر ہے تاکہ انسان کے کلی وجود (روح اور جسم) کا علاج کیا جا سکے۔

یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ مسائل کے ظاہری حل ڈھونڈنے کے بجائے ان کی گہرائی اور بنیاد تک پہنچنا چاہیے۔ جب سبب (Cause) معلوم ہو جائے تو مداوا (Cure) آسان ہو جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کی روشنی میں

اصلِ مرض: دل کی بیماری، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا (البقرہ:10)

ترجمہ: ان کے دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری بڑھا دی۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اصل مرض جسمانی نہیں بلکہ باطنی اور قلبی ہوتا ہے۔ جب حکیم (مرشد یا داعی) دل کا راز پا لیتا ہے تو وہ مرض کی اصل پہچان لیتا ہے۔

شفا صرف ظاہری نہیں، باطنی بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: **وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ** (بنی اسرائیل:82) قرآن کو شفا کہا گیا—کیونکہ وہ انسان کے دل کی جڑ تک پہنچتا ہے۔ یہی "بازیافت" ہے—اصل سبب تک رسائی۔

"شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ"

قرآن کریم نے بیماریوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: امراضِ جسمانی اور امراضِ قلبی (باطنی)۔

- **آیتِ مبارکہ** " : **يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ**) "یونس:57(

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی ہے اور وہ (قرآن) ان بیماریوں کی شفا ہے جو سینوں میں ہیں۔"

- **تحقیقی نکتہ :** مولانا کے شعر میں "راز" پانا دراصل اسی **"مَا فِي الصُّدُورِ"** (جو سینوں میں ہے) تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ جدید طب جسے **Psychosomatic Medicine** کہتی ہے، وہ قرآن کے اسی تصور کی توثیق کرتی ہے کہ جب تک "صدر" (باطن) کا بوجھ یا راز حل نہ ہو، جسم شفایاب نہیں ہو سکتا۔

جدید تحقیقی پہلو (Modern Perspectives)

آج کی سائنس اور نفسیات مولانا روم کے اس شعر کی تائید درج ذیل بنیادوں پر کرتی ہے:

الف: نفسیاتی تحلیل (Psychoanalysis)

فرائیڈ اور یونگ جیسے ماہرینِ نفسیات کا سارا نظریہ اسی "راز" کے گرد گھومتا ہے۔ انسان کے لاشعور (Unconscious) میں چھپی ہوئی کوئی محرومی یا صدمہ (Trauma) جسمانی بیماری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا کا حکیم دراصل ایک ماہرِ نفسیات کی طرح "باطنی گرہ" کھول رہا ہے۔

ب: اسٹریس ہارمونز اور حیاتیات (Bio-Psychology)

جدید تحقیق ثابت کرتی ہے کہ جب انسان کسی جذباتی "راز" یا "دکھ" کو چھپاتا ہے، تو جسم میں Cortisol کی مقدار بڑھ جاتی ہے، جو مدافعتی نظام (Immune System) کو تباہ کر دیتی ہے۔

شعر کی مطابقت: "اصلِ آن درد و بلا" دراصل وہ جذباتی تناؤ (Emotional Stress) ہے جس کا سراغ لگاتے ہی جسمانی علاج ممکن ہو گیا۔ مولانا روم کا یہ شعر محض ایک کہانی کا حصہ نہیں، بلکہ ایک مکمل **"میڈیکل پروٹوکول "** ہے جو بتاتا ہے کہ حقیقی شفا کے لیے مریض کے سماجی، جذباتی اور روحانی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ حکیم نے "راز" پا کر یہ ثابت کیا کہ

علاج خلیوں (Cells) کا نہیں، انسان (Human) کا ہونا چاہیے۔

سیرتِ نبوی ﷺ کے آئینے میں انتہائی واضح اور بصیرت افروز نظر آتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ "طبیبِ کامل" تھے جو محض ظاہری عمل کو نہیں بلکہ دلوں کے مخفی ارادوں اور نیتوں کو بھانپ لیتے تھے۔

غزوہ تبوک اور منافقین کے رویوں کے تناظر میں اس شعر کی علمی و سیرت نگاری کے حوالے سے تشریح درج ذیل ہے:

1. غزوہ تبوک اور "راز" کی تشخیص

غزوہ تبوک (9ہجری) ایک کڑا امتحان تھا جسے قرآن نے **"ساعۃ العسرۃ "**(تنگی کی گھڑی) کہا ہے۔ یہاں دو طرح کے "رنجور" (بیمار) سامنے آئے، اور آپ ﷺ نے دونوں کے "راز" کو الگ الگ رنگ میں پایا:

الف: منافقین کا جھوٹا عذر (ظاہری بیماری بمقابلہ اصل مرض)

جب لشکر کی تیاری شروع ہوئی تو بہت سے منافقین آپ ﷺ کے پاس آئے اور گرمی، لمبا سفر یا گھریلو مجبوریوں کے بہانے بنائے۔ ظاہری طور پر وہ "مجبور" نظر آ رہے تھے، لیکن:

- **حکیم کی تشخیص:** اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر ان کا "راز" فاش کر دیا کہ ان کا اصل درد گرمی یا دوری نہیں، بلکہ **"نفاق اور ایمان کی کمزوری "**ہے۔
- **قرآنی گواہی" :** وہ کہتے ہیں کہ اس گرمی میں نہ نکلو، (اے نبی) کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے "(التوبہ: 81)۔
- **ربطِ شعر :** یہاں "راز یافتن" یہ تھا کہ آپ ﷺ نے جان لیا کہ ان کی زبان پر عذر ہے مگر دل میں کفر چھپا ہے۔

ب: حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ (صدقِ مقال)

تین مخلص صحابہ (بشمول کعب بن مالکؓ) بھی پیچھے رہ گئے تھے۔ جب وہ آپ ﷺ کے سامنے آئے، تو انہوں نے جھوٹا عذر پیش نہیں کیا۔

- **حکیم کی تشخیص :** آپ ﷺ نے ان کے چہرے اور سچائی سے یہ "راز" پالیا کہ یہ منافق نہیں ہیں، بلکہ وقتی سستی اور غفلت کا شکار ہوئے ہیں۔
- **علاج (بازیافت) :** آپ ﷺ نے ان کا علاج "سماجی بائیکاٹ "سے کیا تا کہ ان کے دل کی وہ تڑپ واپس آئے جو غفلت سے دب گئی تھی۔ یہ کڑوی دوا ان کی "اصلِ درد "(غفلت) کا بہترین علاج ثابت ہوئی اور ان کی توبہ قبول ہوئی۔

منافقین کے حالات اور "باطنی اسکیننگ"

منافقین مدینہ میں آپ ﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے، مگر ان کا "درد و بلا" کچھ اور تھا۔

- **عبداللہ بن ابی کا "راز":** "وہ بظاہر مسلمان تھا، لیکن اس کے اندر "ریاست کی چھن جانے والی کرسی" کا دکھ تھا۔ آپ ﷺ اس کے اس "راز" سے واقف تھے، اسی لیے آپ ﷺ نے اس کے ساتھ ہمیشہ وہ رویہ رکھا جو ایک حکیم ایک ایسے مریض کے ساتھ رکھتا ہے جس کا مرض لاعلاج ہو مگر اسے معاشرے کے لیے نقصان دہ ہونے سے بچانا ہو۔
- **مسجدِ ضرار کا واقعہ:** بظاہر ایک عبادت گاہ بنائی گئی، مگر آپ ﷺ نے وحیِ الٰہی (اور اپنی فراست) سے اس کے پیچھے چھپا ہوا "راز" (یعنی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا) پا لیا۔

شعر کا اطلاق: آپ ﷺ نے اس عمارت کی ظاہری خوبصورتی کو نہیں دیکھا، بلکہ اس "فتنے کی اصل" کو پا لیا اور اسے گرانے کا حکم دیا۔

علمی و تحقیقی نکتہ: "نفسیاتی بصیرت"

سیرتِ نبوی ﷺ سے ہمیں یہ تحقیقی نکتہ ملتا ہے کہ **قیادت** (Leadership) اور **اصلاح** (Reform) کے لیے محض قانون کافی نہیں، بلکہ "حکیمانہ فراست" ضروری ہے۔

- **تحقیق:** جدید نفسیات میں اسے "Root Cause Analysis" کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے کبھی بھی صرف "عمل" پر سزا نہیں دی، بلکہ ہمیشہ "نیت" اور "حالتِ قلب" کو دیکھا۔
- **مثال:** ایک شخص نے قتل کیا تو اسے سزا دی، لیکن ایک صحابی سے جب لغزش ہوئی تو ان کی سابقہ قربانیوں (جیسے اہلِ بدر) کو دیکھ کر ان کے "رازِ درونِ پردہ" (مجبوری) کو اہمیت دی۔

حاصلِ کلام

مولانا روم کا "حکیم" دراصل اسی **نبوی فراست** کا ایک پرتو ہے جو انسان کے لہجے، اس کی نبض اور اس کے چھپے ہوئے خوف سے اس کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں سکھاتی ہے کہ:

1. ہر شکایت کرنے والا "مریض" نہیں ہوتا (جیسے منافقین)۔
2. ہر خاموش رہنے والا "صحت مند" نہیں ہوتا (جیسے کعب بن مالکؓ کی باطنی تڑپ)۔

3. **حقیقی شفا** تب ہی ممکن ہے جب مصلح (طبیب) علامات کو چھوڑ کر "اصلِ درد" (ایمان یا نفاق، سچ یا جھوٹ) تک پہنچ جائے۔

حدیث میں آیا: "إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق"

آپ ﷺ کا مشن صرف قانون نافذ کرنا نہیں تھا بلکہ دلوں کی اصلاح تھا۔

آپ ﷺ: کسی کے چہرے کی کیفیت سے حال سمجھ لیتے، سوال کے انداز سے نیت پہچان لیتے، مرضِ نفاق کو واضح فرماتے یہی کامل حکیم کی صفت ہے۔

گفت: کُوئے او کُدام است در گُذر؟
او سَرِ پُل گفت و کُوئے غاتِفَر

مشکل الفاظ کے معنی

کُوئے: محلہ، گلی۔۔۔ **کُدام**: کون سا۔۔۔ **گُذر**: راستہ، گزر گاہ۔۔۔ **سَرِ پُل**: پل کے سرے پر، پل کے قریب

کُوئے غاتِفَر: ایک خاص محلہ یا گلی کا نام (شہر سمرقند میں ایک مقام)

ترجمہ

(حکیم نے) پوچھا: اس (تیرے محبوب) کی گلی اس شہر (سمرقند) میں کہاں ہے؟ (کنیز نے) جواب دیا: "سرپل" (پل کا کنارہ) اور "غاتفر" کا محلہ۔

مولانا رومی یہاں یہ سمجھا رہے ہیں کہ انسانی دکھوں کا علاج اکثر باتوں میں اور ماضی کے ان گوشوں میں چھپا ہوتا ہے جنہیں انسان ظاہر نہیں کرتا۔ حکیم نے کنیز کی نبض تھام رکھی تھی اور جیسے ہی اس نے "سمرقند" اور پھر "غاتفر" کا نام لیا، اس کی نبض کی رفتار تیز ہو گئی، جس سے حکیم کو معلوم ہو گیا کہ اس کا محبوب کہاں رہتا ہے۔

غاتفر اور سمرقند کی علامتی اہمیت: قدیم فارسی ادب میں سمرقند اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور تھا۔ "غاتفر" وہاں کا ایک خاص علاقہ تھا۔ یہاں یہ محض ایک جغرافیائی پتا نہیں ہے بلکہ اس **مقامِ سکون** کی نشاندہی ہے جہاں انسان کا دل اٹکا ہوتا ہے۔

روحانی مفہوم : صوفیانہ نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ شعر اس "تلاش" کی علامت ہے جو ایک مرشدِ کامل اپنے مرید کے دل میں کرتا ہے۔ مرشد مرید کے دل کی تہوں میں چھپی ان خواہشات یا تعلقات کو تلاش کرتا ہے جو اسے اصل حقیقت (اللہ) سے دور رکھتے ہیں یا اسے بے چین رکھتے ہیں۔

یہ شعر انسانی جذبات کی عکاسی کرتا ہے کہ کس طرح ایک خاص جگہ یا گلی کا نام انسان کے اندر چھپے ہوئے پرانے زخموں یا محبتوں کو تازہ کر دیتا ہے۔ حکیم نے اس پتے کے ذریعے اس سنار (محبوب) کا سراغ لگا لیا جس کے فراق میں کنیز بیمار تھی۔

مولانا رومی کی مثنوی کو "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" (فارسی زبان میں قرآن) کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے قصص محض کہانیاں نہیں بلکہ قرآنی حقائق اور احادیثِ نبوی ﷺ کی تمثیلی تشریح ہیں۔

کنیز کا "غاتفر کے سنار" سے لگاؤ دراصل **متاعِ دنیا** سے محبت کی علامت ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

"زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ) "... لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت مزین کر دی گئی ہے، جیسے عورتیں، بیٹے، اور سونے چاندی کے ڈھیر — (... سورۃ آل عمران:14

کنیز جب تک "غاتفر" (دنیاوی مرکز) کے خیال میں گم تھی، وہ گھلتی رہی۔ حکیم کا اس گلی کا پتا پوچھنا دراصل انسان کے اس **نقطہِ کمزوری** کو تلاش کرنا ہے جو اسے اللہ کی یاد سے غافل کر کے غموں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ہدایت کے لیے وسیلہ اور رہبر

قرآن کریم میں ارشاد ہے "**: وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ** "(اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو)۔ جس طرح کنیز خود اپنا علاج نہیں کر سکتی تھی اور بادشاہ کی تدبیریں بھی ناکام ہو گئیں، یہاں تک کہ اللہ کا بھیجا ہوا حکیم آیا، اسی طرح انسان جب تک کسی **ہادی یا مرشدِ کامل** کی راہنمائی نہیں لیتا، وہ اپنے نفس کی الجھنوں (سمرقند اور غاتفر کے گلی کوچوں) میں بھٹکتا رہتا ہے۔

مولانا رومی نے اس واقعے میں جس طبی مہارت کا ذکر کیا ہے، وہ آج کے دور میں **"نفسیاتی طب** Psychosomatic) " Medicine) اور **"کلینیکل سائیکالوجی** "کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔

طبی نقطہ نظر سے اس شعر اور اس پورے منظرنامے سے درج ذیل اہم نکات اخذ ہوتے ہیں:

١. ذہنی اور جسمانی صحت کا گہرا ربط (Psychosomatic Link)

طبی لحاظ سے یہ ثابت ہے کہ انسانی جذبات (غم، خوشی، خوف یا محبت) براہِ راست جسمانی افعال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کنیز بظاہر جسمانی طور پر بیمار تھی، لیکن اس کی بیماری کی جڑ اس کے ذہن اور جذبات میں تھی۔ اسے **"عشقِ پنہاں "**(چھپی ہوئی محبت) کا عارضہ تھا، جسے قدیم طب میں **"مالخولیا "** کی ایک قسم مانا جاتا تھا۔

نبض شناسی بطور بائیو فیڈ بیک(Biofeedback)

حکیم نے کنیز کا ہاتھ اپنی گرفت میں رکھا ہوا تھا اور وہ مختلف شہروں اور گلیوں کے نام لے رہا تھا۔ طبی سائنس کے مطابق:

- جب انسان کسی ایسی چیز یا جگہ کا ذکر سنتا ہے جس سے اس کا جذباتی لگاؤ ہو، تو جسم میں **ایڈرینالین (Adrenaline)** کا اخراج بڑھ جاتا ہے۔
- اس سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور خون کا دباؤ (Blood Pressure) بڑھتا ہے۔
- مولانا رومی نے دکھایا کہ جیسے ہی "سمرقند" اور "غاتفر" کا نام آیا، کنیز کی نبض کی رفتار بدل گئی۔ یہ آج کے دور کے **"لائی ڈیٹیکٹر (Polygraph) "** ٹیسٹ جیسا ہی اصول ہے، جہاں جسمانی ردِ عمل سے سچ کا پتا لگایا جاتا ہے۔

۳. تلازمِ خیالات(Word Association Technique)

نفسیات کے ماہرین (جیسے فرائیڈ یا یونگ) نے صدیوں بعد وہ طریقہ اپنایا جو رومی کے حکیم نے یہاں استعمال کیا۔ اسے **"تلازمِ خیالات "** کہتے ہیں۔

- حکیم نے براہِ راست نہیں پوچھا کہ تمہارا محبوب کون ہے؟
- اس نے غیر محسوس طریقے سے جغرافیائی سوالات کیے تاکہ مریضہ کا دفاعی نظام (Defense Mechanism) متحرک نہ ہو اور وہ لاشعوری طور پر اپنے اصل مرکزِ توجہ (محبوب کا پتا) کا اظہار کر دے۔

۴. تشخیصِ فارق(Differential Diagnosis)

بادشاہ کے دیگر طبیب صرف مادی علامات (بخار، کمزوری) کا علاج کر رہے تھے، جو کہ ناکام رہا۔ رومی کا حکیم **" تشخیصِ فارق "** کرتا ہے، یعنی وہ دیکھتا ہے کہ کیا یہ مرض جسمانی ہے یا نفسیاتی؟ جب مادی دوائیں کام نہ کریں تو معالج کو مریض کے سماجی اور جذباتی پس منظر کی طرف جانا چاہیے۔

۵ . ہمدردی اور اعتماد (Rapport Building)

ایک طبیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ مریض کا اعتماد جیتے۔ حکیم نے کنیز سے اس کے وطن کی باتیں کیں، جس سے وہ ذہنی طور پر پرسکون ہوئی اور اس نے وہ راز اگل دیا جو وہ چھپانا چاہتی تھی۔ طبی دنیا میں اسے **"Rapport"** قائم کرنا کہتے ہیں، جس کے بغیر درست تشخیص ممکن نہیں۔

خلاصہ : طبی نقطہ نظر سے یہ شعر ثابت کرتا ہے کہ **"علاج محض گولی یا شربت کا نام نہیں، بلکہ مریض کے اندرونی کرب اور اس کے ماحول کو سمجھنے کا نام ہے۔"**

گفت دانستم کہ رَنجَت چِیست، زود
در خَلاصَت سِحرہا خواہم نِمود

مشکل الفاظ کے معنی

گفت: کہا۔۔۔دانستم: میں نے جان لیا۔۔۔رنجت: تیرا دکھ، تیری بیماری۔۔۔چیست: کیا ہے۔۔۔زود: جلدی، فوراً

در خلاصت: تیری نجات کے لیے۔۔۔سحرہا: جادو، تدبیریں، حکمتیں (یہاں مراد حکیمانہ تدبیریں ہیں)

خواہم نمود: میں ظاہر کروں گا / میں کروں گا

ترجمہ

حکیم نے کہا: میں نے جان لیا کہ تمہاری بیماری کیا ہے، اب میں جلد ہی تمہاری نجات کے لیے حیرت انگیز تدبیریں اختیار کروں گا۔

اس شعر میں مولانا روم انسانی نفسیات اور روحانی علاج کے ایک گہرے نکتے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

1. **تشخیص کی اہمیت :** جب تک بیماری کی اصل جڑ معلوم نہ ہو، علاج ممکن نہیں۔ یہاں طبیب (جو کہ ایک مرشدِ کامل کی علامت ہے) نے مریض کے دل کا حال جان لیا ہے کہ اس کی تکلیف جسمانی نہیں بلکہ روحانی یا جذباتی ہے۔

2. **امید اور تسلی:** طبیب کا یہ کہنا کہ "میں جان گیا ہوں" مریض کے لیے آدھی شفا کے برابر ہے۔ یہ ایک ماہر معالج کا اعتماد ہے جو مریض کو مایوسی کے اندھیرے سے نکال کر امید کی روشنی میں لے آتا ہے۔

3. **حکمتِ عملی":** سحر" سے مراد کالا جادو نہیں، بلکہ ایسی اعلیٰ درجے کی حکمت اور تدبیر ہے جو عام عقل والوں کو جادو کی طرح حیران کر دے۔ یعنی وہ ایسے طریقے اپنائے گا جس سے مشکل گرہ بھی کھل جائے گی۔

حاصلِ کلام: یہ شعر ہمیں بتاتا ہے کہ جب انسان کو کوئی ایسا رہنما یا ہمدرد مل جائے جو اس کے دکھ کی اصل وجہ سمجھ لے، تو آدھی مشکل وہیں ختم ہو جاتی ہے۔

اسلامی علوم، خاص طور پر **تصوف اور اخلاقیات** (Sufism & Ethics) کے تناظر میں مولانا روم کے اس شعر کے بہت گہرے معنی ہیں۔ یہاں طبیب سے مراد 'مرشدِ کامل' یا 'ہادی' ہے اور مریض سے مراد 'سالک' (روحانی راستے کا مسافر) یا 'نفس کا اسیر انسان' ہے۔

اسلامی علوم کی روشنی میں اس کی تشریح درج ذیل نکات سے کی جا سکتی ہے:

تزکیہ نفس اور تشخیصِ باطن

اسلامی روحانیت میں انسان کی سب سے بڑی بیماری **'امراضِ قلب'** (روحانی بیماریاں) ہیں، جیسے حسد، تکبر، حرص اور دنیا کی محبت۔

- اس شعر میں "رنج" سے مراد وہ باطنی بے چینی ہے جو انسان کو اللہ سے دور کر دیتی ہے۔
- مرشدِ کامل (طبیب) اپنی بصیرت اور نورِ ایمانی سے مرید کے دل کے ان خفیہ چوروں کو پہچان لیتا ہے جن سے خود مرید ناواقف ہوتا ہے۔

2. پیرِ کامل کی ضرورت

جس طرح جسمانی بیماری کے لیے ڈاکٹر ضروری ہے، اسی طرح اسلامی علوم میں روحانی امراض کے لیے ایک رہبر کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

- **"دانستم" (میں نے جان لیا):** یہ ایک ولی اللہ یا مرشد کی اس قوتِ فراست کی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں حدیثِ قدسی ہے کہ "مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

3. "سحر" سے مراد 'کیمیائے سعادت'

اسلامی اصطلاح میں یہاں سحر (جادو) سے مراد جادوگری نہیں، بلکہ **توجہ اور دعا** ہے۔

- بزرگوں کی صحبت اور ان کی "توجہ" مرید کے دل کی حالت کو پلک جھپکنے میں بدل دیتی ہے۔ اسے **'کیمیاگری'** بھی کہا جاتا ہے، یعنی مٹی کو سونا بنا دینا۔

نظر جنہاں دی کیمیا سونا کردے وٹ

قوم اُتے موقوف نہیں کیا سیّد کیا جٹ

جن لوگوں کی نظر کیمیا ہے اور اکسیر کی خاصیت رکھتی ہے وہ ایک ہی نگاہ سے مٹی کو خالص سونا بنا دیتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا فیض ہے خواہ وہ سیّد ہو یا جٹ (زمیندار / کھیتی باڑی کرنے والا

- وہ ایسی تدابیر (ذکر، فکر، اور مجاہدہ) سکھاتے ہیں جو عام انسان کے لیے کسی کرشمے سے کم نہیں ہوتیں۔

4. خلاصی (نجات) کا راستہ

اسلامی علوم کا مقصود انسان کو **'نفسِ امارہ'** (برائی پر اکسانے والا نفس) کی قید سے نکال کر **'نفسِ مطمئنہ'** کی منزل تک پہنچانا ہے۔

- "خلاصت" سے مراد گناہوں کی لٹی لٹی زندگی سے توبہ اور اللہ کی قربت کی طرف ہجرت ہے۔

خلاصہ

اسلامی علوم کے مطابق یہ شعر **تعلق باللہ** کی بحالی کا استعارہ ہے۔ جب ایک بندہ سچے دل سے تڑپتا ہے، تو اللہ تعالی اسے کسی ایسے 'طبیبِ روحانی' (ولی یا مصلح) سے ملوا دیتا ہے جو اس کے دکھ کی تشخیص کر کے اسے ذکرِ الٰہی اور سنتِ نبوی ﷺ کے ذریعے سکونِ قلب فراہم کرتا ہے۔

"خبردار! اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔" (القرآن)

شاد باش و فارغ و آمِن کہ من
آن کُنم با تو کہ باران با چَمَن

مشکل الفاظ کے معنی

شاد باش: خوش رہ۔۔۔۔فارغ: بے فکر، غم سے خالی۔۔۔آمِن: امن میں، محفوظ۔۔۔آن کنم: وہ کروں گا

باران: بارش۔۔۔۔چمن: باغ، سبزہ زار

ترجمہ: خوش رہو، بے فکر اور مطمئن رہو، میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو بارش باغ کے ساتھ کرتی ہے۔

اس شعر میں مولانا روم نے ایک بہترین استعارے (Metaphor) کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بندے کی پرورش کا ذکر کیا ہے۔ اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱. **مکمل سپردگی اور اطمینان**: شعر کے پہلے مصرعے میں تین احکامات دیے گئے ہیں: "شاد باش" (خوش رہ)، "فارغ باش" (دنیا و آخرت کے غموں سے آزاد ہو جا) اور "آمِن باش" (پر امن اور بے خوف ہو جا)۔ یہ دراصل بندے کو "توکل" کی دعوت ہے کہ جب تمہارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، تو پریشانی کیسی؟

۲. **بارش اور چمن کا استعارہ**: دوسرے مصرعے میں ایک کائناتی سچائی کو مثال بنایا گیا ہے۔ بارش جب کسی خشک اور مرجھائے ہوئے باغ پر برستی ہے تو وہ کیا کرتی ہے؟

- وہ مٹی اور غبار کو دھو دیتی ہے۔
- وہ مردہ زمین میں زندگی دوڑا دیتی ہے۔
- وہ کلیوں کو پھول بناتی ہے اور باغ کو خوشبوؤں سے بھر دیتی ہے۔

۳. **روحانی بالیدگی**: جس طرح بارش کے بغیر چمن کبھی ہرا بھرا نہیں ہو سکتا، اسی طرح اللہ کی رحمت اور عنایت کے بغیر انسانی روح شاداب نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہارے دل کی بنجر زمین کو اپنی رحمت کی بارش سے سیراب کروں گا، تمہارے دکھوں کے گرد و غبار کو دھو ڈالوں گا اور تمہاری زندگی میں وہ نکھار لاؤں گا جو ایک لہلہاتے ہوئے باغ میں ہوتا ہے۔

دراصل یہ شعر مایوسی کے اندھیروں میں امید کا چراغ ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ اگر ہم خود کو اللہ کے سپرد کر دیں، تو اس کی رحمت ہمیں ایسے ہی سنوار دے گی جیسے برسات کا موسم ایک اجڑے ہوئے باغ کو جنت نظیر بنا دیتا ہے۔

مولانا روم کا یہ شعر محض شاعری نہیں بلکہ قرآنی تعلیمات اور سنتِ نبوی ﷺ کے مفاہیم کا ایک خوبصورت نچوڑ ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی تشریح درج ذیل نکات سے واضح ہوتی ہے:

۱۔ خوف اور غم سے آزادی (لاخوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون)

شعر کا پہلا حصہ) **شاد باش و فارغ و آمِن** (قرآنِ کریم کی اس آیت کی بازگشت ہے:

"أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ) "خبردار! جو اللہ کے دوست ہیں، انہیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ — (سورہ یونس:62

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو پیغام دیتا ہے کہ جب تم نے مجھ پر توکل کر لیا، تو اب غم (ماضی کا پچھتاوا) اور خوف (مستقبل کی فکر) سے آزاد ہو جاؤ۔ یہ "آمِن" (امن والا) ہونا ایمان کی علامت ہے۔

۲۔ حسنِ ظن اور امید (میں ویسا ہوں جیسا بندہ گمان کرے)

دوسرا مصرعہ) **آن کُنم با تو** (... اللہ تعالیٰ کے بارے میں "حسنِ ظن" کی عکاسی کرتا ہے۔ حدیثِ قدسی ہے:

"أنا عند ظن عبدي بي) "میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے بارے میں گمان رکھتا ہے۔ (— صحیح بخاری

اگر بندہ اللہ سے یہ امید رکھے کہ وہ اس کی زندگی کو بارش کی طرح شاداب کر دے گا، تو اللہ کی رحمت اس کے گمان سے بڑھ کر اسے نوازتی ہے۔

۳۔ بارش اور حیاتِ نو کا قرآنی استعارہ

مولانا روم نے **باران** (بارش) اور **چمن** کی جو مثال دی ہے، وہ براہِ راست قرآن سے ماخوذ ہے۔ قرآن میں کئی جگہ بارش کو اللہ کی "رحمت" اور مردہ زمین کو زندگی دینے کا ذریعہ بتایا گیا ہے:

"وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنشُرُ رَحْمَتَهُ) "اور وہی ہے جو لوگوں کے نا امید ہو جانے کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے۔ — (سورہ الشوریٰ:28

جس طرح بارش مردہ زمین کو لہلہاتے باغ میں بدل دیتی ہے، اسی طرح اللہ کا ذکر اور اس کی عنایت ایک مرجھائے ہوئے دل اور پریشان حال زندگی کو رونق عطا کر دیتی ہے۔

۴ . استقامت اور تسلی (سنتِ نبوی ﷺ کا پہلو)

ہجرت کے موقع پر جب حضرت ابو بکر صدیقؓ غارِ ثور میں فکر مند ہوئے، تو رسول اللہ ﷺ نے وہی تسلی دی جو اس شعر کا روحِ رواں ہے:

"لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا) "غم نہ کھاؤ، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ — (سورہ التوبہ:40

یہ "شاد باش" اور "آمِن" کی عملی تصویر ہے کہ جب اللہ ساتھ ہے تو کائنات کی کوئی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

یہ شعر بندے کو "**مقامِ رضا** "پر فائز ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے:

- **شاد باش :** اللہ کی تقدیر پر خوش رہنا۔ **فارغ باش :** دنیاوی پریشانیوں کو اللہ کے سپرد کر کے ذہنی سکون پانا (توکل)۔
- **باران با چمن :** اللہ کی رحمت کا ایسا نزول جو ظاہری اور باطنی کایا پلٹ دے۔

مولانا روم کے اس شعر کو اگر ہم **علومِ زرعیہ** (**Agricultural Sciences**) اور **طب** (**Medical Sciences**) کی نظر سے دیکھیں، تو یہ ایک "حیاتیاتی معجزے (Biological Miracle) "کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ بارش اور چمن کا تعلق محض شاعرانہ نہیں بلکہ خالصتاً سائنسی اور تشفی بخش ہے۔

۱ . علومِ زرعیہ (Agricultural Sciences) کے لحاظ سے

زرعی نقطہ نظر سے "باران" (بارش) اور "چمن" (باغ) کا رشتہ **حیاتِ نو** کا رشتہ ہے۔

- **خوابیدگی کا خاتمہ :(Breaking Seed Dormancy)** ایک بیج یا مرجھایا ہوا پودا "فارغ" (ساکن) حالت میں ہوتا ہے۔ بارش کا پانی مٹی میں مل کر کیمیائی تعاملات شروع کرتا ہے جس سے بیج کے اندر موجود انزائمز بیدار ہوتے ہیں۔ یہ وہی "آن کُنم" (جو میں کروں گا) کی عملی تصویر ہے کہ مردہ بیج سے زندگی پھوٹتی ہے۔

- **غذائی اجزاء کی ترسیل :(Nutrient Solubilization)** مٹی میں موجود نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹاشیم اس وقت تک پودے کی جڑوں تک نہیں پہنچ سکتے جب تک پانی (بارش) انہیں محلول (Solution) کی شکل نہ دے دے۔ بارش پودے کے لیے "خوراک کا پیغام رساں" بن کر آتی ہے۔

- **ضیائی تالیف :(Photosynthesis)** بارش نہ صرف پانی دیتی ہے بلکہ پودوں کے پتوں سے گرد و غبار دھو کر مسام (Stomata) کھول دیتی ہے، جس سے پودا بہتر طریقے سے سورج کی روشنی جذب کر کے اپنی غذا بناتا ہے اور فضا کو آکسیجن دیتا ہے۔

- **خلیاتی دباؤ :(Turgor Pressure)** بارش کا پانی پودے کے خلیوں میں بھر کر انہیں تناؤ اور مضبوطی دیتا ہے، جس سے مرجھائی ہوئی شاخیں دوبارہ سیدھی کھڑی ہو جاتی ہیں۔

۲۔ علمِ طب (Medical Sciences) کے لحاظ سے

طب اور نفسیات میں اس شعر کو "شفایابی (Healing Process) " کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے:

- **خلیاتی تجدید :(Cellular Regeneration)** انسانی جسم کے خلیات کو زندہ رہنے کے لیے ہائیڈریشن (Hydration) کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح بارش چمن کو تازگی دیتی ہے، اسی طرح پانی اور مناسب رطوبت انسانی جسم کے زہریلے مادوں (Toxins) کو خارج کر کے خلیوں کو نئی زندگی دیتی ہے۔

- **نفسیاتی شفا :(Psychosomatic Healing)** پہلے مصرعے کے الفاظ **"شاد"**، **"فارغ"** اور **"آمن"** طبِ نفسی میں "Stress-free state" کی علامت ہیں۔ جدید میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ جب انسان ذہنی طور پر پرسکون (Stress-free) ہوتا ہے، تو اس کے جسم میں **اینڈورفنز (Endorphins)** اور **سیروٹونن (Serotonin)** جیسے ہارمونز پیدا ہوتے ہیں جو مدافعت (Immunity) کو بارش کی طرح طاقتور بنا دیتے ہیں۔

- **ہومیوسٹیسس :(Homeostasis)** بارش زمین کے درجہ حرارت کو متوازن کرتی ہے۔ طب میں جسمانی توازن (Homeostasis) ہی صحت ہے۔ اللہ کا بندے سے یہ وعدہ کہ "میں تمہارے ساتھ وہ کروں گا جو بارش چمن کے ساتھ کرتی ہے" دراصل جسم اور روح کے بگڑے ہوئے توازن کو دوبارہ صحت کی طرف لانے کا استعارہ ہے۔

- **نشوونما :(Growth)** جس طرح بارش پودے کی نمو (Growth) کے لیے ناگزیر ہے، اسی طرح الہامی تسلی انسانی اعصاب کو وہ توانائی فراہم کرتی ہے جو کسی بھی دوا سے بہتر کام کرتی ہے۔

حاصلِ بحث

- **زرعی لحاظ سے :** یہ شعر **"بقا اور نمو** (Survival & Growth) **"** کا پیغام ہے۔
- **طبی لحاظ سے :** یہ شعر **"تجدیدِ صحت اور ذہنی سکون** (Rejuvenation & Mental Health) **"** کی ضمانت ہے۔

مولانا روم بتانا چاہ رہے ہیں کہ جس طرح ایک بنجر باغ خود کو بارش کے سپرد کرکے لہلہا اٹھتا ہے، اگر انسان بھی خود کو "خالقِ کائنات" کے سپرد کرکے پرسکون ہو جائے، تو اس کی زندگی میں بھی وہی ہریالی اور شادابی آ جائے گی جو ایک سرسبز چمن کا خاصہ ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کا مرکزی تخیل **"امید، توکل اور الٰہی فیض"** ہے۔ فارسی اور عربی کے عظیم شعراء نے اسی مفہوم کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے، جہاں اللہ کی رحمت کو بارش اور انسانی وجود کو ایک پیاسے چمن سے تشبیہ دی گئی ہے۔

آیئے اس آفاقی سچائی کو دیگر عظیم شعراء کے کلام سے سمجھتے ہیں:

۱۔ حافظ شیرازی (فارسی)

حافظ نے بھی رومی کی طرح "فیض" اور "تجدیدِ حیات" کو مسیحا کی پھونک اور ابرِ بہار سے تشبیہ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید   دیگران هم بکنند آنچه مسیحا می کرد

ترجمہ: اگر روح القدس (جبرائیلؑ یا الٰہی فیض) کی مدد دوبارہ شاملِ حال ہو جائے، تو دوسرے (عام انسان) بھی وہی کر دکھائیں گے جو حضرت عیسیٰؑ (مردوں کو زندہ کرنا) کیا کرتے تھے۔

رابطہ: رومی کے ہاں "بارش" زندگی دیتی ہے، حافظ کے ہاں "الٰہی فیض" مردہ روحوں کو مسیحا کی طرح زندہ کرتا ہے۔

۲۔ امام شافعیؒ (عربی)

مولانا کے پہلے مصرعے (**فارغ و آمن**) کی گونج امام شافعیؒ کے اس مشہور پند نامہ میں ملتی ہے، جہاں وہ تقدیر پر بھروسے اور ذہنی سکون کی تلقین کرتے ہیں:

دَعِ الأَيَّامَ تَفْعَلُ مَا تَشَاءُ وَطِبْ نَفْساً إِذَا حَكَمَ القَضَاءُ

ترجمہ: زمانے کو چھوڑ دو کہ وہ جو چاہے کرے (تم پریشان نہ ہو)، اور جب قضا کا فیصلہ آ جائے تو اپنے نفس کو مطمئن اور خوش رکھو۔ **رابطہ:** یہ رومی کے "شاد باش و فارغ" کا عربی ورژن ہے، کہ جب معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے تو فکر کیسی؟

۳. سعدی شیرازی (فارسی)

شیخ سعدی "بارانِ رحمت" کے اسی تصور کو اپنی مخصوص فصاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی عنایت کسی کی محتاج نہیں:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانی بہ کف آری و بہ غفلت نخوری

ترجمہ: بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان سب کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تم (اے انسان) رزق پا سکو اور اسے غفلت میں نہ کھاؤ۔ **رابطہ:** رومی اللہ کی رحمت کو "بارش" کہہ رہے ہیں، سعدی پوری کائنات کو اللہ کا وہ انتظام بتا رہے ہیں جو انسان (چمن) کی پرورش کے لیے سرگرم ہے۔

۴. ابن الفارض (عربی - سلطان العاشقین)

عربی کے عظیم صوفی شاعر ابن الفارض نے الٰہی محبت کے اثر کو اس طرح بیان کیا کہ وہ مرجھائے ہوئے وجود میں روح پھونک دیتی ہے:

وَمِن فَيضِ ما أَسأَرتُ ثُوبَ مَراضُهُم فَعاشوا وَبَعضُ القَومِ مَوتى مِنَ الرَدى

ترجمہ: (محبت کے) اس فیض سے جو میں نے پیچھے چھوڑا، بیماروں کو شفا ملی اور وہ جی اٹھے، جبکہ کچھ لوگ تو ہلاکت کی موت مر چکے تھے۔ **رابطہ:** یہاں بھی وہی "فیض" کا تصور ہے جو رومی کی "بارش" میں ہے۔

۵. علامہ اقبال (فارسی / اردو)

اقبال نے اسی فلسفے کو خودی اور رحمت کے تناظر میں پیش کیا۔ وہ "بارانِ رحمت" کے منتظر رہنے کے بجائے خود کو اس قابل بنانے کی بات کرتے ہیں کہ وہ رحمتِ الٰہی کو کھینچ سکے:

تیرے دریا میں طوفان کیوں نہیں ہے؟خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟عبث ہے شکوہِ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

اور فارسی میں فرماتے ہیں کہ جب اللہ کا فیض (**باران**)ہوتا ہے تو ذرہ بھی آفتاب بن جاتا ہے۔

خلاصہ کلام

ان تمام شعراء کے ہاں ایک قدرِ مشترک ہے:

1. **بندہ (چمن):** جو پیاسا ہے، عاجز ہے اور طلبگار ہے۔
2. **خالق (باران):** جو سراپا فیض ہے، دینے والا ہے اور بے نیاز ہے۔

رومی کا یہ شعر دراصل **"تسلیم و رضا"** کی انتہا ہے، جہاں اللہ بندے کو یقین دلا رہا ہے کہ تیری ترقی اور شادابی میری ذمہ داری ہے، تو بس "مطمئن" ہو جا۔

بیدل یہ واضح کرتے ہیں کہ اللہ کا "بارش" بن کر برسنا برحق ہے، لیکن اس بارش سے فائدہ اٹھانے کے لیے دل کے برتن کو انا کے زہر سے **"فارغ "** کرنا ضروری ہے۔ بیدل کے ہاں **"شادباش "** کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ہستی کو اللہ کی ہستی میں گم کر دو، پھر تم نہیں رہو گے بلکہ تمہارے ذریعے اللہ کی قدرت کے کرشمے (چمن کی بہار) ظاہر ہوں گے۔

من غَمِ تو می خورَم، تو غَم مَخوَر
بر تو من مُشفِقِ تَرَم از صد پدر

ا . مشکل الفاظ کے معنی
غم خوردن (غم کھانا/پینا): کسی کی فکر کرنا، کسی کا بوجھ اپنے اوپر لے لینا۔۔۔ مَخوَر: مت کھاؤ، فکر نہ کرو (فعلِ نہی)۔
مُشفِق: نہایت مہربان، شفقت کرنے والا، ہمدرد۔۔۔ صد: سو (فارسی شاعری میں 'صد' سے مراد کثرت یا بے انتہالی جاتی ہے)۔
ترجمہ:
میں تمہارا غم خوار ہوں (تمہاری فکر میں ہوں)، اس لیے تم غم نہ کرو؛ میں تم پر سو باپوں سے بھی زیادہ شفیق اور مہربان ہوں۔

اس شعر کے پس منظر میں گہرے روحانی حقائق پوشیدہ ہیں، جنہیں درج ذیل نکات میں سمجھا جا سکتا ہے:
مولانا رومی فرماتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی کی مشکلات، رزق کی تنگی یا مستقبل کے خوف میں مبتلا ہو کر پریشان رہتا ہے۔ یہاں ربِ ذوالجلال (یا اس کا نمائندہ مرشدِ کامل) بندے سے مخاطب ہے کہ: "اے انسان! جب میں تیرا نگران ہوں اور تیری تمام ضرورتوں کا کفیل ہوں، تو تو کیوں پریشان ہے؟"
دنیا میں باپ کو تحفظ اور شفقت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ایک باپ اپنے بچے کے لیے ہر مصیبت جھیلنے کو تیار ہوتا ہے۔ رومی کہتے ہیں کہ اللہ کی اپنے بندے پر شفقت ایک یا دو نہیں، بلکہ سینکڑوں باپوں کی مجموعی محبت سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ یہ اس قرآنی تصور اور حدیثِ مبارکہ کی عکاسی ہے جس میں اللہ کی محبت کو ستر ماؤں سے زیادہ بتایا گیا ہے۔
"من غمِ تو می خورم" کا ایک لطیف مفہوم یہ بھی ہے کہ جب بندہ اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتا ہے (توکل)، تو اللہ اس کے غموں کا بوجھ خود اٹھالیتا ہے۔ بندے کا کام صرف "بندگی" رہ جاتا ہے، اور اس کی "فکر" اللہ کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔
یعنی یہ شعر انسان کو مایوسی سے نکال کر امید اور توکل کی طرف لاتا ہے۔ یہ پیغام دیتا ہے کہ تم اکیلے نہیں ہو، تمہارا خالق تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ تمہارے حالات سے باخبر اور تمہارا بہترین خیر خواہ ہے۔
مولانا رومیؒ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مفاہیم کو شاعری کا لبادہ پہنا دیتے ہیں۔ یہ شعر دراصل **توکل** اور **رحمتِ الٰہی** کے ان ابدی اصولوں پر مبنی ہے جو ہمیں قرآن و سنت میں ملتے ہیں۔
اس شعر کی قرآنی اور نبویؐ تناظر میں وضاحت درج ذیل ہے:

اللہ کی کفالت اور توکل (غم نہ کرنے کی وجہ)

شعر کا پہلا مصرعہ) **من غمِ تو می خورم، تو غم مخور** (براہِ راست قرآن کی اس تعلیم کی عکاسی کرتا ہے کہ جب بندہ اللہ پر بھروسہ کر لیتا ہے، تو اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

- **فرمایا** "أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ" (کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟) — سورہ الزمر: 36
- **ایک اور جگہ فرمایا**: "وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ" (اور جو اللہ پر بھروسہ کرے، تو وہ اس کے لیے کافی ہے) — سورہ الطلاق: 3
- **سنتِ نبویؐ**: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
- حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ سَعِيدٍ الْكِنْدِيُّ، حَدَّثَنَا ابْنُ الْمُبَارَكِ، عَنْ حَيْوَةَ بْنِ شُرَيْحٍ، عَنْ بَكْرِ بْنِ عَمْرٍو، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ هُبَيْرَةَ، عَنْ أَبِي تَمِيمٍ الْجَيْشَانِيِّ، عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُونَ عَلَى اللَّهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ، لَرُزِقْتُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُو خِمَاصًا

وَتَرُوحُ بِطَانًا"، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ، لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هَذَا الْوَجْهِ، وَأَبُو تَمِيمٍ الْجَيْشَانِيُّ اسْمُهُ: عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَالِكٍ.

- عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم لوگ اللہ پر توکل (بھروسہ) کرو جیسا کہ اس پر توکل (بھروسہ) کرنے کا حق ہے تو تمہیں اسی طرح رزق ملے گا جیسا کہ پرندوں کو ملتا ہے کہ صبح کو وہ بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو آسودہ واپس آتے ہیں"۔

امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے، اسے ہم صرف اسی سند سے جانتے ہیں۔ [سنن ترمذي/كتاب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم/حدیث:2344]

نتیجہ: رومی کا کہنا کہ "تو غم نہ کر" دراصل اللہ کی صفتِ 'وکیل' اور 'کفیل' پر کامل یقین کی دعوت ہے۔

اللہ کی شفقت اور والدین کی محبت (تقابلی پہلو)

دوسرے مصرعے میں) **بر تو من مُشفق ترم از صد پدر** (اللہ کی محبت کو باپ کی محبت سے تشبیہ دی گئی ہے، بلکہ اسے بڑھ کر بتایا گیا ہے۔ احادیث میں اس سے بھی زیادہ خوبصورت مثال "ماں" کی دی گئی ہے۔

- **حدیثِ مبارکہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:**
- **"قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْيٌ، فَإِذَا امْرَأَةٌ مِنَ السَّبْيِ قَدْ تَحْلُبُ ثَدْيَهَا تَسْقِي، إِذَا وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ أَخَذَتْهُ فَأَلْصَقَتْهُ بِبَطْنِهَا وَأَرْضَعَتْهُ، فَقَالَ لَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَتُرَوْنَ هَذِهِ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّارِ قُلْنَا: لَا، وَهِيَ تَقْدِرُ عَلَى أَنْ لَا تَطْرَحَهُ فَقَالَ: لَلَّهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هَذِهِ بِوَلَدِهَا". [صحيح البخاري: 5999]**
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے قیدیوں میں ایک عورت تھی جس کا پستان دودھ سے بھرا ہوا تھا اور وہ دوڑ رہی تھی، اتنے میں ایک بچہ اس کو قیدیوں میں ملا اس نے جھٹ اپنے پیٹ سے لگا لیا اور اس کو دودھ پلانے لگی۔ ہم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے ہم نے عرض کیا کہ نہیں جب تک اس کو قدرت ہو گی یہ اپنے بچے کو آگ میں نہیں پھینک سکتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ اللہ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ رحم کرنے والا ہے جتنا یہ عورت اپنے بچہ پر مہربان ہو سکتی ہے۔
- **قرآنی صفت:** اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے بارے میں فرمایا: "**وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ**" (اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے) — سورہ الاعراف: 156

رومی نے "صد پدر" (سو باپوں) کا استعارہ اس لیے استعمال کیا کیونکہ فارسی روایت اور اس دور کے معاشرے میں باپ کو "سائبان" اور "کفیل" کی علامت مانا جاتا تھا۔

اللہ کی قربت اور خیر خواہی

شعر میں 'مشفق' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے وہ جو سراپا شفقت ہو۔ اللہ تعالیٰ بندے کا ایسا خیر خواہ ہے جو بندے کی اپنی ذات سے بھی بڑھ کر اس کے قریب ہے۔

- **قرآن**" :وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ" (اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں) — سورہ ق:16

خلاصہ بحث

قرآن و سنت کی روشنی میں رومی کے اس شعر کا پیغام یہ ہے:

1. **پریشانی کا علاج** :اپنی فکریں اللہ کے سپرد کر دینا۔
2. **خوف کا خاتمہ** :یہ یقین رکھنا کہ کائنات کا مالک میرا خیر خواہ ہے۔
3. **محبت کا معیار** :دنیاوی رشتوں (ماں، باپ) کی محبت اللہ کی بے پناہ رحمت کا محض ایک چھوٹا سا عکس ہے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کی تہوں میں علم، تصوف اور معرفت کے سمندر پوشیدہ ہیں۔ اس کی تین مختلف پہلوؤں سے گہری تشریح درج ذیل ہے:

۱ . نظری تشریح (Theoretical Perspective)

نظری اعتبار سے یہ شعر "**نظریہ کائنات و خالق**" کے اس تعلق کو واضح کرتا ہے جسے ہم "ربوبیت" کہتے ہیں۔

- **انسان کی محدودیت** : نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنی عقل اور تدبیر پر بھروسہ کر کے خود کو تنہا اور بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کائنات کا پہیہ اس کی فکر سے چل رہا ہے۔
- **عقیدۂ توکل** :رومی یہاں یہ نظریہ پیش کر رہے ہیں کہ کائنات کا ایک "ناظم (Organizer) "ہے جو "مسبب الاسباب" ہے۔ جب نظامِ ہستی کا خالق خود نگہبان ہے، تو مخلوق کا فکر مند ہونا اس کی قدرت پر شک کرنے کے مترادف ہے۔
- **حقیقی فاعلیت** : نظریاتی طور پر یہ شعر اس فلسفے کی تائید کرتا ہے کہ مریدؔ (بندہ) اپنی مرضی کو مرادِ الٰہی میں ضم کر دے، کیونکہ تدبیر سے زیادہ تقدیر اور رب کی عنایت کارگر ہوتی ہے۔

۲ . روحانی تشریح (Spiritual Perspective)

روحانیت کا تعلق **"قلب کی کیفیات "** اور باطنی سکون سے ہے۔

- **اضطراب کا علاج :** انسانی روح جب دنیاوی مصائب میں گھیرتی ہے تو وہ "قبض" (تنگی) کی کیفیت میں چلی جاتی ہے۔ رومی کا یہ شعر روح کے لیے ایک "نسخۂ شفا" ہے جو اسے "بسط" (کشادگی) کی طرف لاتا ہے۔
- **تعلق مع اللہ :** روحانی طور پر یہ شعر بندے کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ "لاوارث" نہیں ہے۔ جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ میرا غم بانٹنے والی ایک ہستی موجود ہے، تو اس کا بوجھ آدھا رہ جاتا ہے۔
- **محبت کا غلبہ :** روحانیت میں "خوف" پر "محبت" کو فوقیت حاصل ہے۔ "سو باپوں سے زیادہ شفقت" کا استعارہ روح کو اللہ سے ڈرانے کے بجائے اس کی آغوشِ رحمت میں پناہ لینے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ روح کو مایوسی کی تاریکی سے نکال کر امید کی روشنی میں لانے کا عمل ہے۔

عرفانی تشریح (Gnostic/Mystical Perspective)

عرفان (Gnosis) معرفتِ الٰہی کا وہ درجہ ہے جہاں بندہ کائنات کی حقیقت کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہاں "من" (میں) سے مراد حقیقتِ حقہ یا مرشدِ کامل ہے۔

- **فنا و بقا :** عرفانی نقطہ نظر سے، جب تک انسان کا "نفس (Ego) "زندہ ہے، وہ غم زدہ رہتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تیرا غم میں کھاتا ہوں"، یعنی تیری ہستی میری ہستی میں گم ہو جانی چاہیے۔ جب "تو" رہے گا ہی نہیں، تو "غم" کسے ہوگا؟ یہ **مقامِ فنا** کی طرف اشارہ ہے۔
- **وحدتِ شہود :** عارف یہ دیکھتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ مشیتِ الٰہی ہے۔ "صد پدر" (سو باپوں) کی شفقت بھی دراصل اللہ ہی کی صفتِ رحیمی کا ایک ادنیٰ پرتو ہے۔ عارف کثرت (باپ، ماں، دوست) میں وحدت (صرف ایک رب) کو دیکھتا ہے۔
- **سرِ تسلیم و رضا :** عرفان کا عروج یہ ہے کہ بندہ "رضا" کے مقام پر فائز ہو جائے۔ یعنی جو رب کو پسند ہے، وہی بندے کو پسند آ جائے۔ جب بندہ اللہ کی رضا میں راضی ہو جاتا ہے، تو کائنات کی کوئی تکلیف اسے "غم" محسوس نہیں ہوتی، بلکہ وہ اسے محبوب کی طرف سے بھیجا گیا "تحفہ" سمجھتا ہے۔

خلاصہ : نظری طور پر یہ **اعتماد** ہے، روحانی طور پر یہ **سکون** ہے، اور عرفانی طور پر یہ **حق کا مشاہدہ** ہے کہ کائنات میں سوائے رحمتِ باری تعالیٰ کے کچھ اور موجود ہی نہیں ہے۔

"غم" تب تک ہے جب تک "میں" (انا) ہے؛ جب "میں" مٹ گئی اور "وہ" رہ گیا، تو صرف "خوشی ہی خوشی" ہے۔

ہاں وہاں این راز را باکَس مگو

گر چہ از تو شَہ کُند بَس جُست وجو

مشکل الفاظ کے معنی

ہاں وہاں: خبر دار، ہوشیار رہو (تاکید کے لیے استعمال ہوتا ہے)..... **ایں راز:** یہ راز، یہ بھید۔۔۔ **با کس مگو:** کسی سے نہ کہنا، کسی کو مت بتانا۔۔ **گر چہ:** اگر چہ، چاہے۔۔۔ **شَہ (شاہ):** بادشاہ (یہاں مراد مرشدِ کامل، مقتدر ہستی یا ظاہری حاکم ہو سکتا ہے) **بس جست وجو:** بہت زیادہ تلاش، بہت تحقیق یا پوچھ گچھ

ترجمہ

"خبر دار! خبر دار! اس راز کو کسی سے بھی نہ کہنا، خواہ (وقت کا) بادشاہ تم سے اس کے بارے میں کتنی ہی زیادہ پوچھ گچھ (اور تلاش) کیوں نہ کرے۔"

اس شعر میں مولانا رومیؒ انسانی نفس اور سالکِ راہِ حق کو ایک بہت اہم اخلاقی اور روحانی سبق دے رہے ہیں۔ اس کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

1. **رازداری کی اہمیت:** تصوف اور سلوک کی راہ میں جب بندہ اللہ کے قریب ہوتا ہے، تو اسے کچھ ایسے مشاہدات اور قلبی کیفیات نصیب ہوتی ہیں جنہیں "اسرار" (بھید) کہا جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ان کیفیات کو ہر، ایرے، غیرے کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے۔

2. **بڑی شخصیت کا دباؤ:** لفظ 'شَہ' (بادشاہ) کا استعمال اس لیے کیا گیا ہے تاکہ بتایا جا سکے کہ اگر کوئی بہت بااثر، صاحبِ اقتدار یا معتبر شخص بھی تم سے وہ راز اگلوانے کی کوشش کرے، تب بھی اپنی زبان بند رکھو۔ یعنی کسی کے مرتبے سے مرعوب ہو کر امانتِ الٰہی میں خیانت نہ کرو۔

3. **ظرف کی آزمائش:** کہا جاتا ہے کہ "راز" ایک امانت ہے اور اس کا سینے میں چھپا رہنا تمہارے بلند ظرف کی علامت ہے۔ اگر انسان روحانی بھیدوں کو عام کرنا شروع کر دے، تو وہ اپنی تاثیر کھو دیتے ہیں اور بسا اوقات فتنہ پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔

4. **مرشد اور مرید کا تعلق:** بعض اوقات اس سے مراد وہ باطنی علوم ہوتے ہیں جو مرشد اپنے مرید کو عطا کرتا ہے۔ مرید کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنی روحانی ترقی کو چھپا کر رکھے تاکہ نظرِ بد اور غرور سے بچا رہے۔ : یہ شعر خاموشی کی فضیلت اور امانت داری کا

درس دیتا ہے۔ یہ سکھاتا ہے کہ ہر بات ہر انسان کے سامنے کرنے والی نہیں ہوتی، خاص طور پر وہ باتیں جن کا تعلق دل کی گہرائیوں اور معرفت سے ہو۔

یہ شعر ہمیں حضرت علیؓ کا وہ قول یاد دلاتا ہے: یہ قول نہج البلاغہ میں آیا ہے

"لو کشف الغطاء ماازددت یقیناً" اگر پردہ ہٹ جائے تو بھی میرے یقین میں اضافہ نہ ہوگا

یعنی بعض حقائق اہلِ باطن کے درمیان امانت ہوتے ہیں۔

قرآن میں بھی اشارہ ہے:

"وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ"(العنکبوت:۴۳)

یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں مگر انہیں سمجھتے وہی ہیں جو علم والے ہیں۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر دراصل **"کتمانِ سر"** (راز کو چھپانے) کی اس صوفیانہ روایت پر مبنی ہے جس کی جڑیں قرآن وسنت میں بہت گہری ہیں۔ اسلام میں راز کی حفاظت کو امانت، ایمان کا حصہ اور حکمت قرار دیا گیا ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں اس موضوع پر مفصل تحقیق درج ذیل ہے:

.1 قرآنِ کریم کی روشنی میں

قرآن مجید میں راز کی حفاظت اور مصلحت کے تحت اسے پوشیدہ رکھنے کی کئی مثالیں موجود ہیں:

- **حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ :** جب حضرت یوسفؑ نے اپنا خواب اپنے والد حضرت یعقوبؑ کو سنایا، تو انہوں نے فرمایا:

" قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾

4. انہوں نے کہا: اے میرے بیٹے! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا، ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی پُر فریب چال چلیں گے۔ بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہےo(سورہ یوسف:5)

تحقیق : یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی نعمت یا الٰہی اشارے کو فتنہ سے بچنے کے لیے قریبی لوگوں سے بھی چھپانا شرعی طور پر درست اور حکمتِ عملی ہے۔

- **امانت کی پاسداری :** قرآن کریم میں مومنین کی صفت بیان کی گئی ہے:

" وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ(8)

اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" (سورہ المومنون:8) مفسرین کے نزدیک "راز" بھی ایک امانت ہے، اور اس کا افشا کرنا خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔

- **حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کا واقعہ :** سورہ کہف میں حضرت خضرؑ کے افعال (کشتی توڑنا، لڑکے کو قتل کرنا) دراصل وہ "تکوینی راز" تھے جنہیں وقت سے پہلے بتانا منع تھا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بعض حقائق کا ایک خاص وقت تک پوشیدہ رہنا ہی مصلحتِ الٰہی ہے۔

.2 احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں

احادیث میں صراحت کے ساتھ راز چھپانے کی فضیلت اور اسے کاموں کی کامیابی کا ذریعہ بتایا گیا ہے:

- **رازداری اور کامیابی :** نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"استعينوا على إنجاح الحوائج بالكتمان" "(اپنے) کاموں کو پورا کرنے کے لیے (ان میں) رازداری سے مدد لیا کرو، کیونکہ ہر صاحبِ نعمت سے حسد کیا جاتا ہے۔" (طبرانی، بیہقی)

- **مجلس کا راز امانت ہے :** ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"جب کوئی شخص بات کرے اور (ادھر ادھر) التفات کرے (یعنی یہ چاہے کہ کوئی دوسرا نہ سنے) تو وہ بات امانت بن جاتی ہے۔" (جامع ترمذی)

- **حضرت حذیفہ بن یمانؓ (رازدارِ رسول ﷺ) :** رسول اللہ ﷺ نے منافقین کے ناموں کی لسٹ صرف حضرت حذیفہؓ کو عطا فرمائی تھی اور حکم دیا تھا کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو۔ بڑے بڑے صحابہ (بشمول حضرت عمرؓ) کے پوچھنے پر بھی انہوں نے یہ راز فاش نہیں کیا۔ یہ رومی کے شعر "با کس مگو" (کسی سے نہ کہنا) کی عملی تصویر ہے۔

معرفت اور "اسرارِ الٰہی" (خصوصی علم)

مولانا رومی کا شعر خاص طور پر ان روحانی اسرار کے بارے میں ہے جو اللہ اپنے خاص بندوں پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کی اصل **حضرت ابوہریرہؓ** کی یہ روایت ہے:

حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ، قَالَ: حَدَّثَنِي أَخِي، عَنِ ابْنِ أَبِي ذِئْبٍ، عَنْ سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: "حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَاءَيْنِ، فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هَذَا الْبُلْعُومُ".

" ہم سے اسماعیل نے بیان کیا، ان سے ان کے بھائی (عبدالحمید) نے ابن ابی ذئب سے نقل کیا۔ وہ سعید المقبری سے روایت کرتے ہیں، وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (علم کے) دو برتن یاد کر لیے ہیں، ایک کو میں نے پھیلا دیا ہے اور دوسرا برتن اگر میں پھیلاؤں تو میرا یہ نرخرا کاٹ دیا جائے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ « بلعوم » سے مراد وہ نرخرا ہے جس سے کھانا اترتا ہے۔ [صحيح البخاري / كتاب العلم / حديث:120]

تحقیق: اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ علم کی ایک قسم وہ ہے جو عوام کے لیے نہیں بلکہ مخصوص ظرف والے لوگوں کے لیے ہوتی ہے۔ اگر اسے نااہل لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے تو وہ فتنہ، کفر کے فتووں یا الجھن کا شکار ہو سکتے ہیں۔

شاہ (بادشاہ) کے جستجو کرنے کی حکمت

شعر میں "شَہ" (بادشاہ) سے مراد دنیاوی طاقت یا وہ عقلِ معاش ہو سکتی ہے جو ہر چیز کو منطق کے ترازو میں تولنا چاہتی ہے۔

- **شرعی نکتہ:** اگر کوئی حاکم یا طاقتور شخص آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان موجود کسی قلبی کیفیت یا امانت کو ظاہر کرنے پر مجبور کرے، تو اس پر خاموشی اختیار کرنا ہی "استقامت" ہے۔
- صوفیا کے نزدیک، اگر آپ نے اللہ کے دیے ہوئے "حال" کو ظاہر کر دیا، تو وہ رخصت ہو جاتا ہے۔

مولانا رومیؒ دراصل اس "**باطنی غیرت**" کی بات کر رہے ہیں کہ جب تم پر اللہ کی محبت کا کوئی راز کھلے، تو اسے نمائش کا ذریعہ نہ بناؤ، بلکہ اسے سینے میں دفن رکھو تاکہ تمہاری روحانیت پروان چڑھے۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر اپنی سادگی کے باوجود فنی اور معنوی اعتبار سے بلاغت کا شاہکار ہے۔ اس کے شعری محاسن درج ذیل نکات میں سموئے جا سکتے ہیں:

1. صنعتِ تکرار (Repetition)

شعر کا آغاز "**ہان وہان**" سے ہوتا ہے۔ علمِ بیان میں جب کسی لفظ کو دہرایا جائے تو اس کا مقصد "تاکید" اور "توجہ دلانا" (Alertness&Emphasis) ہوتا ہے۔ یہ اسلوب کلام میں ایک خاص قسم کی گھمبیرتا اور خطیبانہ رنگ پیدا کر رہا ہے، جیسے کوئی بہت بڑی تنبیہ کی جا رہی ہو۔

2. سہلِ ممتنع (Deceptive Simplicity)

رومیؒ کا کلام "سہلِ ممتنع" کی بہترین مثال ہے۔ یعنی دیکھنے میں الفاظ بہت سادہ اور روزمرہ کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے چھپا ہوا مفہوم نہایت گہرا اور عمیق ہے۔ اس شعر میں کوئی ثقیل (بھاری بھرکم) لفظ استعمال نہیں کیا گیا، مگر پیغام آفاقی ہے۔

3. صنعتِ مبالغہ اور غلو (Hyperbole)

شعر کے دوسرے مصرعے میں "**شاہ**" (بادشاہ) کا ذکر کر کے رومیؒ نے بات کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

- **نکتہ:** ایک عام آدمی کے لیے بادشاہ کا حکم ٹالنا یا اس سے بات چھپانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہاں بادشاہ کا ذکر کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ راز کی حفاظت "ہر قیمت پر" ضروری ہے، چاہے کتنا ہی بڑا سیاسی یا سماجی دباؤ کیوں نہ ہو۔

4. ایجاز و اختصار (Brevity)

صرف دو مصرعوں میں رومیؒ نے پوری "نفسیاتِ خودی" اور "اخلاقِ تصوف" کو سمو دیا ہے۔ یہاں "راز" کی وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ کیا ہے، بلکہ "راز داری کے سلیقے" پر زور دیا گیا ہے۔ یہ اختصار قاری کو خود سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ کون سا راز ہو سکتا ہے جو بادشاہ سے بھی چھپانا واجب ہے۔

5. استعارہ (Metaphor)

اس شعر میں **"شاہ"** محض ایک دنیاوی حکمران نہیں، بلکہ یہ ایک **استعارہ** ہے:

- یہ "عقلِ معاش" کا استعارہ ہو سکتا ہے جو روحانی تجربات کو منطق کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتی ہے۔
- یہ "نفس" کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے جو انسان کو اپنی کیفیات ظاہر کر کے واہ واہ سمیٹنے پر اکساتا ہے۔

6. صوتی آہنگ (Musicality)

فارسی بحر کا انتخاب اور نونِ غنہ والے الفاظ (ہاں، ہاں، ایں، کُنَد) شعر میں ایک خاص قسم کی گونج اور نغمگی پیدا کر رہے ہیں، جو پڑھنے والے کے کانوں میں ایک دستک کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔

7. ڈرامائی کیفیت (Dramatic Quality)

شعر میں ایک مکالماتی اور ڈرامائی رنگ موجود ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرشد اپنے مرید کا ہاتھ پکڑ کر اسے کائنات کے کسی بڑے خطرے سے آگاہ کر رہا ہے اور اسے راز داری کا حلف دے رہا ہے۔

خلاصہ: اس شعر کا سب سے بڑا حسن اس کی **"تاثیر"** ہے۔ یہ محض معلومات نہیں دے رہا بلکہ ایک **"کیفیت"** منتقل کر رہا ہے کہ "خاموشی" بذاتِ خود ایک طاقت ہے اور راز کو سینے میں قید رکھنا صاحبِ ظرف ہونے کی دلیل ہے۔

گورُ خانہ ئے رازِ تو چون دل شود

آن مُرادَت زود تَر حاصِل شود

مشکل الفاظ کے معنی

گور خانہ: قبرستان، قبروں کی جگہ۔۔۔ **راز:** بھید، باطنی حقیقت، اسرارِ الٰہی۔۔۔ **چون:** جب، جس وقت

دل شود: دل بن جائے، دل کی کیفیت اختیار کرے۔۔۔ **مرادت:** تیری مراد، مطلوب، مقصود

زود تر: جلدی، پہلے۔۔۔ **حاصل شود:** حاصل ہو جائے

ترجمہ

"جب تمہارا دل تمہارے راز کا قبرستان بن جائے گا (یعنی تم اسے اپنے سینے میں دفن کر لوگے)، تو تمہاری وہ مراد اور مقصد جلد ہی پورا ہو جائے گا۔"

اس شعر میں مولانا روم انسانی نفسیات اور کامیابی کا ایک سنہری اصول بیان کر رہے ہیں۔ اس کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

1. **رازداری کی اہمیت (کتمانِ راز):** مولانا فرماتے ہیں کہ جب انسان اپنے ارادوں، منصوبوں یا اپنی منزل کو پانے سے پہلے ہی اس کا چرچا شروع کر دیتا ہے، تو اس میں رکاوٹیں پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں "دل کو گورخانہ بنانا" ایک خوبصورت استعارہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ راز کو دل میں اس طرح چھپا دو جیسے مردہ قبر میں چھپ جاتا ہے، جہاں سے وہ باہر نہیں نکل سکتا۔

2. **کامیابی کا فلسفہ:** حدیثِ نبوی ﷺ کا مفہوم ہے کہ "اپنے کاموں کی تکمیل میں خاموشی سے مدد لیا کرو۔" جب آپ اپنے مقصد کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے، تو آپ کی پوری توانائی (Energy) اس کام کو کرنے میں صرف ہوتی ہے، نہ کہ لوگوں کو بتانے اور ان سے داد وصول کرنے میں۔

3. **حسد اور رکاوٹوں سے بچاؤ:** دنیا میں ہر شخص آپ کا خیر خواہ نہیں ہوتا۔ راز ظاہر کر دینے سے حاسدین متحرک ہو جاتے ہیں یا منفی خیالات رکھنے والے لوگ آپ کے ارادوں میں شکوک و شبہات پیدا کر سکتے ہیں۔ جب راز سینے میں دفن رہتا ہے، تو دشمن یا حاسد کو وار کرنے کا موقع نہیں ملتا اور آپ خاموشی سے اپنی منزل پا لیتے ہیں۔

4. **عزمِ مصمم:** یہ شعر اس بات کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ جس شخص کے ارادے مضبوط ہوتے ہیں، وہ باتوں کے بجائے عمل پر یقین رکھتا ہے۔ اس کی خاموشی اس کے عزم کی نشانی ہوتی ہے۔

خلاصہ: اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی دعائیں قبول ہوں اور آپ کے منصوبے کامیاب ہوں، تو جب تک کامیابی حاصل نہ ہو جائے، اسے اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھیں۔

"حسد" سے بچاؤ اور "حکمتِ عملی"

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے انسانی نفسیات اور سماجی رکاوٹوں کے حوالے سے واضح اشارے دیے ہیں۔

- **سورہ یوسف کی گہرائی :** حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف کو خواب چھپانے کا حکم صرف اس لیے نہیں دیا تھا کہ بھائیوں سے ڈر تھا، بلکہ اس لیے کہ **"نعمت کا اظہار، حسد کو بیدار کرتا ہے"**۔ مولانا روم کے شعر میں "گورخانہ" (قبرستان) کا استعارہ اسی لیے ہے کہ جس طرح مردہ قبر میں محفوظ ہو جاتا ہے، اسی طرح آپ کا منصوبہ حاسد کی نظر سے محفوظ ہو جائے۔

- **خفیہ تدبیر (سورہ کہف) :** حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں حضرت خضر نے اپنے کاموں کی حکمت (کشتی میں سوراخ کرنا، دیوار بنانا وغیرہ) کو اس وقت تک چھپائے رکھا جب تک وہ مکمل نہ ہو گئے۔ اگر وہ پہلے بتا دیتے تو مقصد فوت ہو جاتا۔ یہ "کتمانِ راز" (راز چھپانا) کی بڑی قرآنی مثال ہے۔

.2سنتِ نبوی ﷺ: عمل کا "باطنی تحفظ"

نبی کریم ﷺ کی زندگی سے ہمیں "راز" کو سینے میں دفن کرنے کے عملی طریقے ملتے ہیں:

- **حدیثِ مبارکہ (استعانت علیٰ قضاء الحوائج) :** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" :اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے (انہیں چھپانے سے) مدد حاصل کرو، کیونکہ ہر صاحبِ نعمت کے ساتھ حسد کیا جاتا ہے۔ "(سنن بیہقی)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک آپ کی "مراد" پوری نہ ہو جائے، اسے زبان پر نہ لائیں۔ کیونکہ جب آپ کسی کو اپنا ارادہ بتاتے ہیں، تو وہ شخص لاشعوری طور پر آپ کے خلاف رکاوٹ بن سکتا ہے یا اس کی "نظرِ بد" آپ کے عزم کو کمزور کر سکتی ہے۔

- **ہجرتِ مدینہ کا خفیہ منصوبہ :** رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا تو اسے اس قدر خفیہ رکھا کہ صرف حضرت ابو بکر صدیقؓ اور چند خاص افراد جانتے تھے۔ یہاں تک کہ روانگی کے وقت حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹایا تاکہ دشمن دھوکے میں رہے۔ یہ "دل کو راز کا گورخانہ" بنانے کی سب سے بڑی سنت ہے۔

.3(تصوف اور اخلاقیات) کے باریک نکات

علماء اور صوفیاء نے اس شعر کی روح کو مزید واضح کیا ہے:

- **نیت کا اخلاص :(Sincerity)** علومِ اسلامیہ کے مطابق، عمل کی قبولیت کا دارومدار "نیت" پر ہے۔ نیت کا مقام دل ہے۔ جب آپ اپنے ارادے کا چرچا کرتے ہیں، تو نفس میں "عجب" (خود پسندی) اور "ریا" (دکھاوا) پیدا ہونے کا

خطرہ ہوتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ جب ارادہ صرف دل تک محدود رہتا ہے، تو وہ خالص اللہ کے لیے ہوتا ہے، اور اللہ مخلص بندوں کی مراد جلد پوری فرماتا ہے۔

- **شیطانی وسوسوں سے حفاظت:** صوفیاء فرماتے ہیں کہ "فرشتہ" صرف اس نیت کو جانتا ہے جو زبان سے ادا ہو یا عمل بن جائے، اور "شیطان" بھی تبھی حملہ آور ہوتا ہے جب اسے خبر ہو۔ جب راز دل کے قبرستان میں دفن ہوتا ہے، تو وہ شیطانی وسوسوں اور بیرونی مداخلت سے محفوظ رہتا ہے، جس سے اس کی تکمیل کی قوت بڑھ جاتی ہے۔
- **نفسیاتی توانائی (Psychological Energy):** علمِ اخلاق کے مطابق، جب ہم اپنے کسی بڑے منصوبے کے بارے میں دوسروں کو بتاتے ہیں، تو ہمارا دماغ اس "تعریف" سے وہ تسکین حاصل کر لیتا ہے جو اصل میں کام مکمل کرنے کے بعد ملنی چاہیے تھی۔ اس سے ہماری عملی قوت (Willpower) کمزور پڑ جاتی ہے۔ "مراد کا جلد حاصل ہونا" اسی لیے ہے کہ آپ کی تمام تر توانائی باتوں کے بجائے عمل میں صرف ہوتی ہے۔

4. حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اقوال کی روشنی میں

بابِ العلم، حضرت علیؓ کے ارشادات اس شعر کی بہترین تشریح ہیں:

- "تمہارا سینہ تمہارے راز کا سب سے محفوظ صندوق ہے۔"
- "جو اپنے راز کو چھپاتا ہے، اس کا انجام اس کے اپنے ہاتھ میں رہتا ہے۔"

خلاصہ

مولانا روم کا یہ شعر دراصل اس اسلامی اصول کی منظوم تشریح ہے کہ **"کامیابی خاموشی مانگتی ہے"**۔ جب بندہ اپنے ارادوں کو اللہ اور اپنے درمیان رکھتا ہے، تو غیبی نصرت اس کے شاملِ حال ہو جاتی ہے اور دنیا کی رکاوٹیں (حسد، نظرِ بد، مداخلت) اس کا راستہ نہیں روک پاتیں۔

گفت پیغامبر کہ ہر کہ سِرّ نَہُفت

زود گردد با مُرادِ خویش جُفت

مشکل الفاظ کے معنی

گفت: کہا۔۔۔پیغامبر: نبی، رسول۔۔۔۔ہر کہ: جو کوئی۔۔۔سِرّ: راز، بھید، باطنی معاملہ۔۔۔۔نَہُفت: چھپایا، پوشیدہ رکھا

زود: جلدی، فوراً۔۔۔گردد: ہو جائے۔۔۔۔بامُرادِ خویش: اپنی مراد کے ساتھ۔۔۔جُفت: ملا ہوا، ہمکنار، کامیاب

ترجمہ

پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی نے (اپنے) راز کو پوشیدہ رکھا، وہ جلد ہی اپنی مراد (مقصد) کو پالے گا۔

یا

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے، وہ جلد ہی اپنی مراد کو پالیتا ہے۔

س شعر میں مولانا روم زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت اور کامیابی کا گر بتا رہے ہیں۔ اس کا پس منظر وہ مشہور روایت ہے جس کا مفہوم ہے" : اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے (منصوبوں کو) چھپا کر مدد حاصل کرو۔"

اس تشریح کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

.1حاسدین سے بچاؤ : انسانی فطرت ہے کہ جب کسی بڑے منصوبے یا نعمت کا تذکرہ کام مکمل ہونے سے پہلے کیا جائے، تو حاسدین اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راز کو سینے میں دفن رکھنا دراصل اپنے مقصد کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنا ہے۔

.2نفسیاتی توانائی کا ارتکاز : نفسیاتی طور پر جب ہم اپنے کسی ارادے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، تو گفتگو کی لذت ہمیں وہ "فرضی سکون" دے دیتی ہے جو اصل میں کام مکمل کرنے کے بعد ملنا چاہیے تھا۔ اس سے عمل کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔ خاموشی انسان کی ذہنی توانائی کو منتشر ہونے سے بچاتی ہے اور اسے مقصد پر مرکوز رکھتی ہے۔

.3صوفیانہ نکتہ : تصوف کی رو سے سالک (راہِ حق کا مسافر) جب اپنے روحانی مشاہدات یا کیفیات کو عام کرنا شروع کر دیتا ہے، تو وہ ان کے ثمرات سے محروم ہو جاتا ہے۔ مصلحتِ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ جب تک بیج زمین کے نیچے چھپا رہتا ہے، تبھی تک اس کے درخت بننے کے امکانات محفوظ رہتے ہیں۔ جیسے ہی بیج باہر نکالا جائے، وہ ضائع ہو جاتا ہے۔

.4عزمِ صمیم : شعر کا دوسرا مصرع **"زود گردد بامرادِ خویش جفت "** اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ کامیابی کا راستہ زبان کے چٹخاروں میں نہیں بلکہ خاموش جدوجہد میں ہے۔ جو شخص اپنے منصوبے کو "پہلے کر کے دکھانے" پر یقین رکھتا ہے، کامیابی خود اس کا استقبال کرتی ہے۔

خلاصہ : کامیابی کا پودا خاموشی کی زمین میں تیزی سے پروان چڑھتا ہے۔ اگر آپ اپنی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں تو اس وقت تک خاموش رہیں جب تک آپ کا عمل خود بولنے نہ لگے۔

مولانا روم کا یہ شعر محض ایک اخلاقی مشورہ نہیں ہے بلکہ یہ براہِ راست ایک **حدیثِ نبوی ﷺ** کا منظوم مفہوم ہے اور اس کی تائید **قرآنِ کریم** کے واقعات سے بھی ہوتی ہے۔

ذیل میں اس پیغام کی مدلل وضاحت قرآن و سنت کی روشنی میں پیش ہے:

.1 سنتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

مولانا روم کا یہ شعر دراصل اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے جسے امام طبرانی اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے:

"اسْتَعِينُوا عَلَى إِنْجَاحِ الْحَوَائِجِ بِالْكِتْمَانِ، فَإِنَّ كُلَّ ذِي نِعْمَةٍ مَحْسُودٌ "

(ترجمہ: اپنی ضرورتوں (مقاصد) کی تکمیل کے لیے انہیں چھپا کر مدد حاصل کرو، کیونکہ ہر صاحبِ نعمت سے حسد کیا جاتا ہے)۔

قَالَ صلی اللہ علیہ وسلم : اسْتَعِينُوا عَلَى إِنْجَاحِ الْحَوَائِجِ بِالْكِتْمَانِ، فَإِنَّ كُلَّ ذِي نِعْمَةٍ مَحْسُودٌ.

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے رازداری کے ساتھ کام لیا کرو کیونکہ ہر نعمت والے سے حسد کیا جاتا ہے۔ (السلسلۃ الصحیحہ ۲۵۷)

رسول اللہ ﷺ نے یہ سنہری اصول بیان فرمایا کہ جب تک کوئی منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ جائے، اسے ہر ایک کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی نعمت یا کامیابی کا چرچا ہوتا ہے، تو حاسدین اسے روکنے کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں۔

.2 قرآنِ کریم کی روشنی میں

قرآنِ مجید میں **حضرت یوسف علیہ السلام** کا واقعہ اس نظریے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ جب حضرت یوسفؑ نے اپنا خواب (جس میں بلند مرتبے کی خوشخبری تھی) اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنایا، تو انہوں نے نصیحت فرمائی:

"قَالَ يَابُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا) "... سورہ یوسف:5

((ترجمہ: اے میرے پیارے بیٹے! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا، ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی چال چلیں گے)۔

- **استدلال:** اللہ کے نبی حضرت یعقوبؑ جانتے تھے کہ نعمت کا اظہار (قبل از وقت) اپنوں میں بھی حسد پیدا کر سکتا ہے جو مقصد کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ لہٰذا، راز کو چھپانا انبیاء کی سنت اور حکمتِ عملی ہے۔

اسوہِ رسول ﷺ اور عملی حکمتِ عملی

نبی کریم ﷺ کی زندگی (سیرت) سے ہمیں 'راز داری' کے کئی عملی نمونے ملتے ہیں:

- **ہجرتِ مدینہ:** آپ ﷺ نے ہجرت کا ارادہ اور سفر کا وقت **مکمل** راز میں رکھا۔ یہاں تک کہ سفر شروع ہونے تک حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بڑے مقاصد کے لیے حکمتِ عملی اور رازداری ضروری ہے۔

- **غزوات کی تیاری:** کتبِ سیرت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ جب کسی مہم کا ارادہ فرماتے تو عموماً اسے ظاہر نہ کرتے تھے تاکہ دشمن کو پیشگی اطلاع نہ ملے (سوائے غزوۂ تبوک کے جس کے حالات مختلف تھے)۔

خلاصہ اور جامع نکتہ

قرآن و سنت کی ان دلیلوں سے ثابت ہوتا ہے کہ **"راز کو سینے میں رکھنا "** بزدلی نہیں بلکہ **عزم و استقلال اور دانشمندی** ہے۔ اس کے پیچھے دو بڑی حکمتیں ہیں:

1. **حفاظت:** حاسد کی نظر اور دشمن کی شرارت سے بچاؤ۔
2. **توجہ: (Focus)** جب انسان خاموشی سے کام کرتا ہے تو اس کی تمام تر توانائیاں مقصد پر مرکوز رہتی ہیں۔

نکتہ : جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "بیج جب تک مٹی کے سینے میں چھپا رہتا ہے، تب ہی وہ ایک تناور درخت بننے کی صلاحیت پاتا ہے۔ اگر اسے زمین سے نکال کر لوگوں کو دکھایا جائے تو وہ کبھی تناور درخت نہیں بن سکتا۔"

قدیم عربی اور فارسی ادب میں **"کتمانِ سر "**(راز چھپانے) کو عقل و دانش کی معراج اور کامیابی کی کلید مانا گیا ہے۔ مولانا روم کا یہ شعر دراصل اس وسیع فکری روایت کا حصہ ہے جو صدیوں سے مشرق کے شعری و نثری ادب میں موجود ہے۔

ذیل میں عربی اور فارسی کے نامور شعراء کے کلام سے اس کی فنی اور فکری تشریح پیش ہے:

عربی شعراء اور حکمتِ رازداری

عربی ادب میں راز کو ایک "امانت" اور "قیدی" سے تشبیہ دی گئی ہے۔

- **امام علی ابن ابی طالب (رض) کی طرف منسوب قول (جو عربی ادب کا حصہ ہے):**

"سِرُّكَ أَسِيرُكَ، فَإِذَا تَكَلَّمْتَ بِهِ صِرْتَ أَسِيرَهُ "(ترجمہ: تمہارا راز تمہارا قیدی ہے، لیکن جب تم اسے زبان سے نکال دیتے ہو تو تم اس کے قیدی بن جاتے ہو)۔

مولانا روم کے شعر میں "مراد سے جڑ جانے" کی شرط یہی ہے کہ آپ اپنے راز کے حاکم رہیں، نہ کہ اس کے غلام۔

- **ابو تمام (مشہور عرب شاعر) :** عربی کا ایک مشہور شعر ہے (جو بعض اوقات دیگر شعراء سے بھی منسوب ہے):

إِذَا ضَاقَ صَدْرُ الْمَرْءِ عَنْ سِرِّ نَفْسِهِ　　فَصَدْرُ الَّذِي يُسْتَوْدَعُ السِّرَّ أَضْيَقُ

(ترجمہ: جب انسان کا اپنا سینہ اپنے راز کے لیے تنگ ہو جائے، تو جس کے پاس وہ راز امانت رکھا جائے گا اس کا سینہ تو اور بھی زیادہ تنگ ہو گا)۔

یہ شعر مولانا کے اس پیغام کی تائید کرتا ہے کہ اگر آپ خود اپنے مقصد کی حفاظت نہیں کر سکتے تو دوسرے سے خیر کی امید رکھنا فضول ہے۔

فارسی شعراء اور کتمانِ سر

فارسی ادب میں "راز" کو صوفیانہ اور دنیاوی دونوں پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے۔

- **شیخ سعدی شیرازی (گلستان و بوستان)**: سعدی رازداری کے معاملے میں بہت سخت گیر ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

خامشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش   با کسی گفتن و گفتن کہ مگو !

(ترجمہ: اس سے بہتر خاموشی ہے کہ تم اپنے دل کی بات کسی کو بتاؤ اور پھر اسے کہو کہ "کسی کو نہ بتانا")۔

سعدی کے نزدیک "مگو" (نہ کہنا) کہنے کی نوبت ہی نہ آئے، یہی کامیابی کا راستہ ہے۔

- **حافظ شیرازی**: حافظ کے ہاں راز چھپانا عشق کی پہلی شرط ہے:

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز   ورنہ در مجلسِ رِندان خبری نیست کہ نیست

(ترجمہ: یہ مصلحت کے خلاف ہے کہ راز پردے سے باہر آئے، ورنہ رندوں کی محفل میں ایسی کوئی خبر نہیں جو موجود نہ ہو)۔

حافظ بتاتے ہیں کہ دانائی "پردہ پوشی" میں ہے، فاش کرنے میں نہیں۔

- **نظامی گنجوی**: نظامی نے اپنی مثنویوں میں رازداری کو کامیابی کا ذریعہ قرار دیا:

چو در بستہ باشد چہ داند کسی   کہ جوہر فروش است یا نخ بسی

(ترجمہ: جب تک دروازہ بند ہے، کوئی نہیں جانتا کہ اندر جواہر بیچے جا رہے ہیں یا معمولی دھاگہ)۔

یہ مولانا روم کے "مراد کے ساتھ جفت ہونے" کی بہترین تمثیل ہے کہ جب تک آپ کا کام مکمل نہ ہو جائے، اسے مخفی رکھیں۔

ان تمام شعراء کے کلام کو اگر مولانا روم کے شعر کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ایک **تکوینی حکمت** سامنے آتی ہے:

1. **عربی شعراء** اسے "**طاقت اور قید**" کے تناظر میں دیکھتے ہیں (راز بتا دیا تو آپ کمزور ہو گئے)۔
2. **سعدی و نظامی** اسے "**عقلمندی اور مصلحت**" کے طور پر پیش کرتے ہیں (کامیابی کے لیے خاموشی ڈھال ہے)۔
3. **مولانا روم** اسے "**روحانی قانون اور غیبی مدد**" قرار دیتے ہیں (کہ خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ خاموش محنت کرنے والوں کی مرادیں پوری کرتا ہے)۔

جامع نکتہ : قدیم شعراء کے نزدیک "زبان" مقصد کی چھت سے گرنے والا وہ پرنالہ ہے جو اگر وقت سے پہلے بہہ نکلے تو بنیادیں کمزور کر دیتا ہے۔ مولانا اسی لیے کہتے ہیں کہ "سِرّ" (راز) کو "نُہُفت" (چھپا) کر رکھو تاکہ وہ "مُراد" (کامیابی) کی صورت میں ظاہر ہو۔

مولانا روم کا یہ شعر محض ایک اخلاقی نصیحت نہیں ہے، بلکہ یہ **انسانی نفسیات (Human Psychology)** اور **نیورو سائنس** کے ان گہرے اصولوں پر مبنی ہے جنہیں جدید سائنس اب ثابت کر رہی ہے۔

اس شعر میں نفسیات کے درج ذیل **چار بڑے راز** پوشیدہ ہیں:

"فرضی سماجی حقیقت" کا دھوکہ (Social Reality)

نفسیات میں ایک نظریہ ہے جسے **"Identity Goals"** کہا جاتا ہے۔ جب ہم اپنا کوئی بڑا ارادہ کسی کو بتاتے ہیں، اور وہ ہمیں داد دیتا ہے، تو ہمارا دماغ اس داد کو "کامیابی کا متبادل" سمجھ لیتا ہے۔

- **نفسیاتی نکتہ :** دماغ کو وہ سکون اور "ڈوپامائن (Dopamine)" پہلے ہی مل جاتا ہے جو اصل میں کام مکمل ہونے کے بعد ملنا چاہیے تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی تڑپ اور محنت کرنے کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اگر "مُراد" تک پہنچنا ہے تو اس ڈوپامائن کو کام مکمل ہونے کے لیے بچا کر رکھو۔

ذہنی توانائی کا تحفظ (Conservation of Mental Energy)

انسان کی ذہنی توانائی محدود ہوتی ہے۔ جب ہم اپنے کسی منصوبے کی وضاحت (Explain) دوسروں کے سامنے کرتے ہیں، تو ہمیں "منطق" اور "دلیل" کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

- **نفسیاتی نکتہ :** وضاحتیں پیش کرنے میں جو توانائی خرچ ہوتی ہے، وہ دراصل اس عمل (Execution) کا حصہ تھی جو آپ کو منزل تک پہنچاتا۔ خاموشی آپ کی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو ایک ہی نقطے پر مرکوز (Focus) کر دیتی ہے، جس سے کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

بیرونی مداخلت اور "منفی فیڈبیک" سے بچاؤ

نفسیاتی طور پر ہر انسان کے اندر "خود اعتمادی" کا ایک نازک پودا ہوتا ہے، خصوصاً نئے منصوبوں کے آغاز میں۔

- **نفسیاتی نکتہ :** جب ہم اپنا راز فاش کرتے ہیں، تو ہم خود کو دوسروں کی تنقید، شک اور مشوروں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ منفی تبصرے لاشعوری طور پر ہمارے ارادے میں لرزش پیدا کر دیتے ہیں۔ "سِرّ نہفتن" (راز چھپانا) دراصل اپنے ارادے کو دوسروں کے "ذہنی زہر" سے محفوظ رکھنے کا ایک حفاظتی ڈھال (Shield) ہے۔

"انکیوبیشن پیریڈ (Incubation Period) "

تخلیقی نفسیات کے مطابق، ہر بڑے آئیڈیا کو پکنے کے لیے اندھیرے اور تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ یا زمین کے نیچے بیج۔

- **نفسیاتی نکتہ :** اگر کسی آئیڈیا کو وقت سے پہلے "روشنی" (عوام کی نظر) میں لا دیا جائے، تو اس کی نمو رک جاتی ہے۔ مولانا کا اشارہ اسی طرف ہے کہ اسے چھپا کر رکھو تاکہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہو سکے۔

خلاصہ کلام

جدید نفسیات دان (جیسے ڈیرک سیورز - Derek Sivers) کا بھی یہی کہنا ہے کہ **"Keep your goals to yourself"**۔ مولانا روم نے صدیوں پہلے یہ نفسیاتی گر بتا دیا تھا کہ:

زبان کا چٹخارہ، مقصد کی توانائی کو چاٹ جاتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کے **شعری محاسن** **(Poetic Beauties)** اس کی سادگی اور اثر آفرینی میں پوشیدہ ہیں۔ مولانا کا فن یہ ہے کہ وہ مشکل ترین فلسفے کو اتنے سادہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ ضرب المثل بن جاتا ہے۔

اس شعر کے اہم فنی اور معنوی محاسن درج ذیل ہیں:

1. **تلمیح (Allusion)**

اس شعر کا سب سے بڑا حسن **صنعتِ تلمیح** کا استعمال ہے۔

- مولانا نے "گفت پیغامبر" (پیغمبر ﷺ نے فرمایا) کہہ کر شعر کی بنیاد ایک **مستند شرعی حقیقت** (حدیثِ نبوی ﷺ) پر رکھی ہے۔
- اس سے شعر میں ایک خاص قسم کا تقدس اور وزن پیدا ہو گیا ہے، اور قاری اسے محض ایک شاعرانہ خیال سمجھنے کے بجائے ایک "آفاقی سچائی" کے طور پر قبول کرتا ہے۔

.2ایجاز و اختصار (Conciseness)

اس شعر میں **"سمندر کو کوزے میں بند"** کیا گیا ہے۔

- "کتمانِ سر" (رازداری) کی پوری نفسیات، اس کے فوائد اور اس کا حتمی نتیجہ صرف دو مصرعوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔
- کسی قسم کی لفاظی یا غیر ضروری صفت کا استعمال نہیں کیا گیا، جو کہ مثنوی کے "سہلِ ممتنع" (آسان مگر ناقابلِ تقلید) ہونے کی دلیل ہے۔

.3صنعتِ تضاد و تقابل (Contrast & Relation)

شعر میں دو حالتوں کا تقابل کیا گیا ہے:

- **نہُفت (چھپانا)** : یہ "تاریکی" اور "خاموشی" کی علامت ہے۔
- **مُراد (مقصد)** : یہ "روشنی" اور "ظہور" کی علامت ہے۔
- مولانا بتاتے ہیں کہ جو جتنا زیادہ "چھپانے" کی گہرائی میں جائے گا، وہ اتنی ہی جلدی "ظہور" (کامیابی) کی بلندی تک پہنچے گا۔

.4قافیہ اور صوتی آہنگ (Rhyme & Phonetics)

- **نہُفت** اور **جُفت** کا قافیہ صوتی اعتبار سے بہت جاندار ہے۔

- لفظ 'نَہُفت' میں ایک طرح کا "بندش" کا احساس ہے، جبکہ 'جُفت' میں "میلان اور ملاپ" کی خوشی ہے۔ یہ صوتی اثرات مضمون کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

5. اِرسالُ المثل (Proverbial Nature)

یہ شعر فارسی اور اردو ادب میں ایک **"کہاوت "** بن چکا ہے۔ جب کوئی شاعر ایسی بات کہے جو عام لوگوں کی زبان پر چڑھ جائے اور اسے بطور دلیل استعمال کیا جانے لگے، تو یہ اس کے کلام کا بہت بڑا حسن مانا جاتا ہے۔

6. تاثیر کلام (Impact)

مولانا نے "زود" (جلدی) کا لفظ استعمال کر کے انسانی جبلت (جلد بازی) کو مخاطب کیا ہے۔ انسان اپنی مراد جلدی چاہتا ہے، اور مولانا نے اسے لالچ دیا ہے کہ اگر تم جلدی کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اپنی زبان پر تالا لگالو۔ یہ نفسیاتی اثر انگیزی اس شعر کا خاصہ ہے۔

خلاصہ : اس شعر کا حسن اس کی **حکمت** میں ہے نہ کہ صرف لفظی سجاوٹ میں۔ یہ شعر زبان کی لطافت اور معنی کی گہرائی کا ایک حسین امتزاج ہے۔

دانہ چون اَندَر زمین پنہاں شود
سِرِّ او سَر سَبزیِ بُستان شود

مشکل الفاظ کے معنی

دانہ: بیج ۔۔۔ اندر: کے اندر ۔۔۔ زمین: مٹی ۔۔۔ پنہاں: چھپا ہوا ۔۔۔ سِرّ: راز ۔۔۔ سر سبزی: ہریالی، شادابی

بُستان: باغ

شعر کا مفہوم

"جب دانہ زمین کے اندر چھپ جاتا ہے (مٹ جاتا ہے)، تو اس کا یہی راز (پوشیدہ ہونا) پورے باغ کی ہریالی اور شادابی بن کر ظاہر ہوتا ہے۔"

یہ شعر ہمیں زندگی کے چند گہرے حقائق سکھاتا ہے:

- **خاکساری اور عاجزی:** دانہ جب تک اپنی ہستی کو نہیں مٹاتا اور مٹی میں نہیں ملتا، وہ کبھی تناور درخت نہیں بن سکتا۔ اسی طرح انسان کو بھی بلندی پانے کے لیے پہلے اپنی انا (Ego) کو ختم کرنا پڑتا ہے۔
- **پوشیدہ محنت کا ثمر:** کامیابی اکثر خاموشی اور تنہائی میں کی گئی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو چیزیں آج دنیا کو "سرسبز و شاداب" نظر آتی ہیں، ان کے پیچھے کسی "دانے" کی زمین میں دبنے والی قربانی چھپی ہوتی ہے۔
- **فنا سے بقا کا سفر:** رومی ہمیں بتاتے ہیں کہ مٹ جانا دراصل ختم ہونا نہیں ہے، بلکہ ایک نئی اور بہتر شکل میں ظاہر ہونے کا پیش خیمہ ہے۔

ایک اہم نکتہ

مولانا رومی اسی تسلسل میں آگے فرماتے ہیں کہ انسان کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ جب تک وہ اپنی "خود پسندی" سے باہر نہیں نکلتا، اس کی اصل صلاحیتیں اور روحانی خوبصورتی دنیا کے سامنے نہیں آپاتیں۔

مولانا رومی کا یہ شعر دراصل قرآنی تمثیلات اور احادیثِ مبارکہ کے مفاہیم کی ایک شعری تشریح ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کے کئی گہرے پہلو نمایاں ہوتے ہیں:

موت کے بعد زندگی اور حشر (البعث بعد الموت)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی جگہوں پر مردہ زمین کے زندہ ہونے اور بیج سے پودا نکلنے کی مثال سے انسانوں کے دوبارہ جی اٹھنے کو واضح کیا ہے۔

- **قرآنی آیت":** اور تم دیکھتے ہو کہ زمین خشک (اور بے جان) ہے، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ تر و تازہ ہو جاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما نباتات اگاتی ہے۔) "سورہ الحج:5)

جس طرح دانہ زمین میں چھپ کر (بظاہر ختم ہو کر) ایک نئی اور خوبصورت زندگی پاتا ہے، اسی طرح انسان کی موت بھی فنا نہیں بلکہ ایک عظیم تر ابدی زندگی کا آغاز ہے۔

2.تواضع اور عاجزی (Humility)

اسلامی تعلیمات میں بلندی کا راستہ عاجزی سے ہو کر گزرتا ہے۔ دانہ جب اپنے آپ کو مٹی میں ملا دیتا ہے (اپنی انا کو ختم کر دیتا ہے)، تبھی وہ سرسبزی کا مقام پاتا ہے۔

- **حدیثِ مبارکہ**
- **وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ".**
- :رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" : جس نے اللہ کے لیے عاجزی اختیار کی، اللہ اسے بلندی عطا فرماتا ہے۔) " صحیح مسلم(

رومی اسی نبوی اصول کو بیان کر رہے ہیں کہ جب تک بندہ اپنی "میں" کو خاک میں نہیں ملاتا، اس کے اندر کی روحانی شادابی ظاہر نہیں ہوتی۔

اخلاص اور پوشیدہ اعمال (The Secret of Sincerity)

شعر میں لفظ **"سِرّاو "**(اس کا راز) بہت اہم ہے۔ یہ ان نیک اعمال کی طرف اشارہ ہے جو انسان دکھاوے کے بغیر، اللہ کے لیے تنہائی میں کرتا ہے۔

- **حدیثِ مبارکہ :** اللہ کے عرش کے سائے میں جگہ پانے والے سات لوگوں میں سے ایک وہ ہے جس نے "صدقہ اتنے راز میں دیا کہ بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلا کہ دائیں نے کیا خرچ کیا"۔)متفق علیہ(

جیسے دانے کا زمین کے نیچے چھپنا اس کے سرسبز ہونے کا "راز" ہے، ویسے ہی مومن کے وہ اعمال جو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں، آخرت میں اس کی کامیابی اور جنت کی ہریالی کا سبب بنیں گے۔

4.ایثار اور قربانی (Sacrifice)

اللہ کی راہ میں کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ دانہ اپنی انفرادیت اور شکل و صورت کی قربانی دیتا ہے تو اسے "باغ" کی شکل میں کثرت حاصل ہوتی ہے۔

- **قرآنی آیت" :** تم ہر گز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں۔) "سورہ آلِ عمران:92(

خلاصہ

قرآن و سنت کے تناظر میں یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ:

1. **فنا** (اپنی انا کو مٹانا) ہی **بقا** (روحانی زندگی) کا راستہ ہے۔
2. کامیابی کے لیے **صبر** اور **گمنامی** کے دور سے گزرنا ضروری ہے۔
3. انسان کا اصل جوہر تب کھلتا ہے جب وہ احکامِ الٰہی کے سامنے خود کو تسلیم (Surrender) کر دیتا ہے۔

قدیم عربی اور فارسی شاعری میں "دانے کا خاک میں ملنا" اور "خود کو مٹانے سے نمو پانا" ایک بہت ہی مقبول استعارہ رہا ہے۔ صوفیانہ اور حکیمانہ شاعری میں اسے "فنا سے بقا" کے فلسفے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

رومی کے اس مفہوم کو ہم دیگر بڑے شعراء کے کلام سے یوں سمجھ سکتے ہیں:

1 . شیخ سعدی شیرازی (فارسی)

سعدی نے رومی کے اسی فلسفے کو "عاجزی" اور "تواضع" کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ ان کی مشہور حکایت ہے کہ بارش کا ایک قطرہ جب سمندر میں گرا تو اپنی ہستی کو ہیچ (معمولی) سمجھ کر شرما گیا، مگر اس کی اسی عاجزی نے اسے موتی بنا دیا۔ وہ فرماتے ہیں:

بلندی از آن یافت کو پست شد

درِ نیستی کوفت تا ہست شد

)بلندی اسے ملی جو پست (عاجز) ہوا، جس نے 'نیستی' (مٹ جانے) کا دروازہ کھٹکھٹایا وہی حقیقت میں 'ہست' (موجود) ہوا(

2 . میرزا عبدالقادر بیدل دہلوی (فارسی / سبکِ ہندی)

بیدل، جو اپنی باریک بینی کے لیے مشہور ہیں، دانے کی مثال کو ایک الگ اور بصیرت انگیز زاویے سے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک دانہ خاک میں چھپا ہے، وہ محفوظ اور ترقی پذیر ہے:

دانہ تا در خاک پنہاں است نشو و نما دارد

چوں بروں آید ہدفِ سنگِ طفلاں می شود

)دانہ جب تک خاک میں چھپا رہتا ہے، وہ بڑھتا اور پھولتا رہتا ہے۔ جیسے ہی وہ (پودا بن کر) باہر نکلتا ہے، بچوں کے پتھروں کا نشانہ بن جاتا ہے(

مطلب: گمنامی اور عاجزی میں جو سلامتی اور روحانی ترقی ہے، وہ نمائش اور شہرت میں نہیں۔

3. المتنبی (قدیم عربی)

عربی شاعری میں اگرچہ "دانے" کی مثال کم ہے، لیکن "مشقت اور مٹ کر بلندی پانے" کا ذکر بہت زیادہ ہے۔ مشہور عرب شاعر المتنبی کہتا ہے:

وإذا كانت النفوس كباراً

تعبت في مرادها الأجسام

)اور جب روحیں بڑی (عظیم) ہو جاتی ہیں، تو جسم ان کے ارادوں کی تکمیل میں تھک جاتے ہیں(

ربط: جیسے دانے کو مٹی کے نیچے دبنے کی 'تکلیف' سہنی پڑتی ہے تاکہ وہ ایک بڑا درخت بن سکے، ویسے ہی عظیم مقاصد کے لیے نفس کی قربانی ضروری ہے۔

4. صوفیانہ عربی کلام (ابن الفارض یا دیگر)

عربی کے صوفی شعراء کے ہاں "حُبُّ الظُّهُورِ قَاصِمُ الظُّهُورِ" (نمائش کی محبت کمر توڑ دیتی ہے) کا تصور عام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا ثمر (پھل) ظاہر ہو، تو اپنی جڑ کو چھپا کر رکھو۔

ایک مشہور عربی مقولہ جو شعری رنگ میں بھی استعمال ہوتا ہے:

اِدْفِنْ وُجُودَكَ فِي أَرْضِ الْخُمُولِ

)اپنے وجود کو گمنامی کی زمین میں دفن کر دو(

تشریح: کیونکہ جو بیج دفن نہیں کیا جاتا، وہ کبھی صحیح معنوں میں بارآور (پھلدار) نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام

ان تمام شعراء کا نچوڑ یہ ہے کہ:

ظہور (Appearing) کے لیے بطون (Hiddenness) شرط ہے۔

اگر آپ پھلدار درخت بننا چاہتے ہیں، تو پہلے مٹی میں دب کر "گمنامی" کا ذائقہ چکھنا ہوگا۔

فارسی شعراء نے اسے عاجزی سے جوڑا، جبکہ عربی شعراء نے اسے عزم اور اخلاص کا نام دیا۔

اردو میں بھی اسی مفہوم کو علامہ اقبال نے کیا خوب بیان کیا:

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے

کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

مولانا رومی کا یہ شعر محض ایک اخلاقی سبق نہیں بلکہ **علمِ نباتات** (Botany) اور **زرعی سائنس** (Agricultural Science) کے ایک بنیادی اور حیرت انگیز عمل کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر ہم اسے ایک کسان یا ماہرِ زراعت کی نظر سے دیکھیں تو اس میں درج ذیل سائنسی اور فنی نکات پوشیدہ ہیں:

1. بیج کا جینیاتی کوڈ (The Genetic Blueprint)

بیج بظاہر ایک بے جان پتھر یا لکڑی کا ٹکڑا نظر آتا ہے، لیکن اس کے اندر ایک پورا "سافٹ ویئر" یا **DNA** موجود ہوتا ہے۔ رومی جسے **"سِرّ" (راز)** کہہ رہے ہیں، سائنسی زبان میں وہ اس بیج کا جینیاتی نقشہ ہے۔

- **زرعی نکتہ:** جب تک بیج زمین کے اندر نہیں جاتا، وہ اپنی اس چھپی ہوئی صلاحیت (Potential) کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ زمین کے اندر کا اندھیرا دراصل اس "ڈیٹا" کو "پروگرام" میں تبدیل کرنے کا وقت ہوتا ہے۔

2. حیاتیاتی تبدیلی (Biochemical Transformation)

ایک بیج جب تک اپنی اصل حالت (Structure) کو برقرار رکھتا ہے، وہ درخت نہیں بن سکتا۔ زراعت کے علم میں اسے (**Germination اگاؤ**) کا عمل کہتے ہیں۔

- **عمل :** زمین کی نمی اور گرمائش بیج کے سخت خول کو توڑ دیتی ہے۔ بیج کے اندر موجود نشاستہ (Starch) ٹوٹ کر شکر (Glucose) میں بدل جاتا ہے جو ننھے پودے کی خوراک بنتا ہے۔
- **نتیجہ :** یعنی بیج کو اپنی پرانی شکل کو "فنا" کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ پودے کی نئی شکل میں "بقا" پا سکے۔ اگر بیج اپنی شکل بچانے کی کوشش کرے گا، تو وہ مٹی میں پڑے پڑے سڑ جائے گا مگر "باغ" نہیں بنے گا۔

3. گمنامی اور تحفظ (Protection and Incubation)

زراعت میں بیج کو زمین کے اوپر نہیں پھینکا جاتا بلکہ ایک خاص گہرائی میں دبایا جاتا ہے۔

- **سائنس :** یہ "پنہاں" (چھپنا) ہونا بیج کو بیرونی خطرات (پرندوں، تیز دھوپ، اور ہوا کے تھپیڑوں) سے بچاتا ہے۔
- **حکمت :** پودے کی ابتدائی زندگی بہت نازک ہوتی ہے۔ زمین کی آغوش اسے وہ **Micro-climate** (مناسب درجہ حرارت اور نمی) فراہم کرتی ہے جو اس کے "سر سبز" ہونے کے لیے ضروری ہے۔

4. جڑوں کا قیام (Root Establishment)

بیج کا پہلا قدم اوپر (آسمان کی طرف) نہیں بلکہ نیچے (زمین کی گہرائی میں) ہوتا ہے۔

- جب تک بیج اندھیرے میں اپنی جڑیں مضبوط نہیں کرتا، وہ باہر کی روشنی میں تناور درخت نہیں بن سکتا۔
- **زرعی سبق :** جتنا گہرا بیج "پنہاں" ہو گا، اس کا درخت اتنا ہی مضبوط اور "سر سبر" ہو گا۔

خلاصہ: زراعت کا ریاضی

اگر ہم اسے ایک مساوات (Equation) میں دیکھیں تو:

$$بیج (انا) + مٹی (عاجزی) + اندھیرا (تنہائی / محنت) = درخت (کامیابی)$$

ایک دلچسپ حقیقت : ایک ماہرِ زراعت جانتا ہے کہ اگر وہ بیج کو الماری میں سجا کر رکھے گا تو وہ صرف ایک "دانہ" رہے گا، لیکن اگر وہ اسے "قیدِ تنہائی" (زمین کے نیچے) میں ڈال دے گا تو وہ اسے ہزاروں دانوں میں بدل دے گا۔ یہی رومی کا اصل فلسفہ ہے" : **کثرت پانے کے لیے وحدت کو مٹانا پڑتا ہے۔"**

زَرّ و نُقرہ گر نبودندی نہان
پَرورش کِی یافتَندی زیرِ کان؟

مشکل الفاظ کے معنی

زَرّ: سونا۔۔۔نُقرہ: چاندی۔۔۔نبودندی: نہ ہوتے۔۔۔نہان: پوشیدہ، چھپے ہوئے۔۔۔پرورش: نشوونما، تربیت

کی: کیسے۔۔۔یافتندی: پاتے۔۔۔زیرِ کان: کان (معدن) کے نیچے

ترجمہ

اگر سونا اور چاندی (زمین میں) پوشیدہ نہ ہوتے، تو وہ کان کے اندر (مقامِ کمال تک پہنچنے کے لیے) پرورش کیسے پاتے؟

مولانا روم اس تمثیل کے ذریعے انسانی روح کی بالیدگی اور "سلوک (Spiritual Journey)" کے چند اہم حقائق بیان کرتے ہیں:

۱. **خلوت اور مجاہدہ (Spiritual Seclusion):** مولانا فرماتے ہیں کہ جس طرح سونا شروع میں محض مٹی یا خام دھات ہوتا ہے اور اسے "خالص سونا" بننے کے لیے برسوں زمین کی اندھیری گہرائیوں میں رہنا پڑتا ہے، اسی طرح انسان کو بھی اپنی اصلاح اور روحانی ترقی کے لیے "خلوت" (تنہائی) اور "مجاہدہ" کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک انسان دنیا کی نمائش اور شور و غل سے کٹ کر اپنی ذات کے اندر نہیں اترتا، وہ "کندن" نہیں بن سکتا۔

۲. **شہرت کی آفت سے بچاؤ:** صوفیاء کے نزدیک شہرت ایک "نفسانی بت" ہے۔ مولانا یہاں یہ نکتہ سمجھا رہے ہیں کہ اگر سونا زمین سے باہر ہوتا تو لوگ اسے پختہ ہونے سے پہلے ہی نکال لیتے اور وہ اپنی پوری قیمت حاصل نہ کر پاتا۔ اسی طرح، اگر ایک سالک (راستہ چلنے والا) اپنی عبادات اور روحانی کیفیات کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دے، تو اس کا روحانی سفر رک جاتا ہے۔ "چھپا رہنا" دراصل "پروان چڑھنے" کی شرط ہے۔

۳ . **مصیبت اور دباؤ کا فلسفہ :** کان کے اندر سونا شدید گرمی اور زمین کے بوجھ (Pressure) کے نیچے رہتا ہے۔ مولانا کے نزدیک یہ "دباؤ" اللہ کی طرف سے آنے والی آزمائشیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے انسان! اگر تجھ پر تنگی آئے تو گھبرا مت، کیونکہ یہ تنگی تجھے "خام مٹی" سے "خالص سونا" بنانے کے لیے ضروری ہے، جیسے کان کی سختی سونے کے لیے ضروری ہے۔

۴ . **باطن کی پرورش :** اس شعر کا ایک گہرا پہلو یہ ہے کہ جو چیز جتنی قیمتی ہوتی ہے، اسے اتنا ہی پردے میں رکھا جاتا ہے۔ انسانی روح (جو کہ الٰہی جوہر ہے) اس مٹی کے بدن کی "کان" میں چھپی ہوئی ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اس بدن کے اندر رہ کر ہی روح کو وہ تپش ملتی ہے جو اسے کمال تک پہنچاتی ہے۔

حاصلِ کلام

مولانا روم ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ **"ظہور" (نمائش) سے پہلے "بطون" (پوشیدہ رہنا) ضروری ہے۔** اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی صلاحیتیں اور آپ کا کردار اثر انگیز ہو، تو پہلے خاموشی اور صبر کے ساتھ اپنی ذات پر کام کریں، بالکل ویسے ہی جیسے سونا کان کے اندھیرے میں اپنی چمک تیار کرتا ہے۔

"درخت کے نیچے جڑیں چھپی ہوتی ہیں تبھی اوپر پھل نظر آتے ہیں۔"

مولانا روم اس تمثیل کے ذریعے انسانی روح کی بالیدگی اور "سلوک (Spiritual Journey) " کے چند اہم حقائق بیان کرتے ہیں:

۱ . **خلوت اور مجاہدہ (Spiritual Seclusion):** مولانا فرماتے ہیں کہ جس طرح سونا شروع میں محض مٹی یا خام دھات ہوتا ہے اور اسے "خالص سونا" بننے کے لیے برسوں زمین کی اندھیری گہرائیوں میں رہنا پڑتا ہے، اسی طرح انسان کو بھی اپنی اصلاح اور روحانی ترقی کے لیے "خلوت" (تنہائی) اور "مجاہدہ" کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک انسان دنیا کی نمائش اور شور و غل سے کٹ کر اپنی ذات کے اندر نہیں اترتا، وہ "کندن" نہیں بن سکتا۔

۲ . **شہرت کی آفت سے بچاؤ :** صوفیاء کے نزدیک شہرت ایک "نفسانی بت" ہے۔ مولانا یہاں یہ نکتہ سمجھا رہے ہیں کہ اگر سونا زمین سے باہر ہوتا تو لوگ اسے پختہ ہونے سے پہلے ہی نکال لیتے اور وہ اپنی پوری قیمت حاصل نہ کر پاتا۔ اسی طرح، اگر ایک سالک (راستہ چلنے والا) اپنی عبادات اور روحانی کیفیات کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دے، تو اس کا روحانی سفر رک جاتا ہے۔ "چھپا رہنا" دراصل "پروان چڑھنے" کی شرط ہے۔

۳. مصیبت اور دباؤ کا فلسفہ: کان کے اندر سونا شدید گرمی اور زمین کے بوجھ (Pressure) کے نیچے رہتا ہے۔ مولانا کے نزدیک یہ "دباؤ" اللہ کی طرف سے آنے والی آزمائشیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے انسان! اگر تجھ پر تنگی آئے تو گھبرا مت، کیونکہ یہ تنگی تجھے "خام مٹی" سے "خالص سونا" بنانے کے لیے ضروری ہے، جیسے کان کی سختی سونے کے لیے ضروری ہے۔

۴. باطن کی پرورش: اس شعر کا ایک گہرا پہلو یہ ہے کہ جو چیز جتنی قیمتی ہوتی ہے، اسے اتنا ہی پردے میں رکھا جاتا ہے۔ انسانی روح (جو کہ الٰہی جوہر ہے) اس مٹی کے بدن کی "کان" میں چھپی ہوئی ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اس بدن کے اندر رہ کر ہی روح کو وہ تپش ملتی ہے جو اسے کمال تک پہنچاتی ہے۔

حاصلِ کلام

مولانا روم ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ **"ظہور" (نمائش) سے پہلے "بطون" (پوشیدہ رہنا) ضروری ہے۔** اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی صلاحیتیں اور آپ کا کردار اثر انگیز ہو، تو پہلے خاموشی اور صبر کے ساتھ اپنی ذات پر کام کریں، بالکل ویسے ہی جیسے سونا کان کے اندھیرے میں اپنی چمک تیار کرتا ہے۔

"درخت کے نیچے جڑیں چھپی ہوتی ہیں تبھی اوپر پھل نظر آتے ہیں۔"

مولانا روم کا یہ شعر علمِ ارضیات (Geology) اور معدنیات (Mineralogy) کے بنیادی اصولوں کی ایک بہترین شاعرانہ تمثیل پیش کرتا ہے۔ اگر ہم اس شعر کو خالص سائنسی نظر سے دیکھیں، تو اس کی قدر و قیمت درج ذیل ارضیاتی حقائق میں پوشیدہ نظر آتی ہے:

۱. معدنیاتی عملِ تشکیل (Mineralization Process)

ارضیات کی رو سے سونا اور چاندی زمین کی سطح پر پیدا نہیں ہوتے، بلکہ یہ **Hydrothermal Fluids** (انتہائی گرم آبی محلول) کے ذریعے بنتے ہیں۔

- **تشریح:** سونا اور چاندی زمین کی گہرائیوں میں، جہاں درجہ حرارت اور دباؤ بہت زیادہ ہوتا ہے، مائع حالت میں چٹانوں کی دراڑوں میں جمع ہوتے ہیں۔ اگر یہ "نہاں" (پوشیدہ) نہ ہوتے اور سطحِ زمین پر ہوتے، تو درجہ حرارت اور دباؤ کی وہ کیمیائی میسر نہ آتی جو ان کی **Crystallization** (قلمی ترتیب) کے لیے ضروری ہے۔

۲. ارضیاتی وقت (Geological Time)

شعر میں "پرورش" کا لفظ ارضیاتی وقت (Millions of years) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

- **سائنسی نکتہ:** سونے اور چاندی کی کچ دھات (Ore) کو ایک خاص مقدار (Grade) تک پہنچنے کے لیے لاکھوں سال درکار ہوتے ہیں۔ زمین کے اندر "پوشیدہ" رہ کر ہی یہ دھاتیں آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی ہیں اور اپنی خالص حالت اختیار کرتی ہیں۔ اگر یہ سطح پر ہوتیں تو کٹاؤ (**Erosion**) اور موسمیاتی اثرات (**Weathering**) انہیں بکھیر دیتے اور یہ کبھی "کان" کی شکل اختیار نہ کر پاتیں۔

۳۔ کیمیائی استحکام (Chemical Stability)

اگرچہ سونا ایک "Noble Metal" ہے (جو جلد کسی سے تعامل نہیں کرتا)، لیکن چاندی اور دیگر معاون دھاتیں بیرونی ماحول (آکسیجن اور نمی) سے متاثر ہو کر اپنی اصل حالت کھو سکتی ہیں۔

- **ارضیاتی قدر:** زمین کی تہوں کے نیچے آکسیجن کی کمی (Reducing Environment) ان دھاتوں کو محفوظ رکھتی ہے۔ مولانا کا یہ کہنا کہ وہ "زیرِ کان" پرورش پاتے ہیں، سائنسی طور پر اس **Geochemical Environment** کی عکاسی کرتا ہے جو ان قیمتی دھاتوں کے ذخائر بننے کے لیے ناگزیر ہے۔

۴۔ مرتکز ہونے کا عمل (Concentration)

معدنیات میں ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے جسے **Secondary Enrichment** کہتے ہیں۔

- **سائنسی نکتہ:** بارش کا پانی جب زمین میں رستا ہے تو وہ دھاتوں کو اوپر سے نیچے کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ زمین کے نیچے دوبارہ جمع (Deposit) ہوتی ہیں۔ اس عمل کے لیے زمین کے اندر کا "پردہ" ضروری ہے۔ اگر سونا چاندی زمین کی گہرائی میں نہ چھپے ہوتے، تو وہ اتنی بڑی مقدار میں ایک جگہ جمع نہ ہو پاتے کہ ہم اسے "کان" کہہ سکیں۔

ارضیاتی خلاصہ (Geological Summary)

شعری اصطلاح	ارضیاتی مماثلت	سائنسی مفہوم
نہاں (Hidden)	Subsurface Environment	سطحِ زمین سے نیچے کا مخصوص ماحول جہاں دباؤ زیادہ ہو۔

پرورش(Nourish) Ore Genesis / Crystallization چٹانوں کے اندر ایٹمی سطح پر دھاتوں کا ترتیب پانا۔

زیرِکان(Under Mine) Lithosphere / Host Rock وہ چٹانی ڈھانچہ جو دھات کو محفوظ رکھ کر اسے پکنے دیتا ہے۔

نتیجہ : جیولوجی کی نظر میں مولانا کا یہ شعر اس سائنسی حقیقت کی تصدیق کرتا ہے کہ **قیمتی دھاتوں کی معاشی قدر (Economic Value) ان کے مخصوص حالات میں، زمین کی گہرائیوں میں طویل عرصے تک پوشیدہ رہنے مرہونِ منت ہے۔** اگر ارضیاتی قوتیں انہیں "چھپا" کر نہ رکھتیں، تو آج سونا اور چاندی محض عام مٹی کی طرح بکھرے ہوئے ہوتے۔

مولانا روم کا یہ شعر محض ایک صوفیانہ خیال نہیں، بلکہ ایک ایسی **عملی حکمتِ عملی (Strategy)** ہے جسے اگر ہم اپنی روزمرہ زندگی میں اپنا لیں، تو ہماری کامیابی اور ذہنی سکون کی شرح کئی گنا بڑھ سکتی ہے۔

روزمرہ زندگی میں اس کی اہمیت درج ذیل پہلوؤں سے واضح ہوتی ہے:

۱ . منصوبوں کی رازداری(Privacy of Plans)

آج کے دور میں ہم کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے اس کا چرچا کر دیتے ہیں۔ مولانا سکھاتے ہیں کہ جب تک آپ کا "آئیڈیا" یا "منصوبہ" پختہ نہ ہو جائے، اسے ظاہر نہ کریں۔

- **مثال :** اگر آپ کوئی نیا کاروبار شروع کر رہے ہیں یا کسی امتحان کی تیاری کر رہے ہیں، تو اسے تب تک "نہاں" (پوشیدہ) رکھیں جب تک وہ نتیجہ نہ دے دے۔ شور مچانے سے حاسدین کی نظر اور آپ کی اپنی توجہ (Focus) بٹ جاتی ہے۔

۲ . سوشل میڈیا اور "نمائش" کا فتنہ

ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں جہاں ہر چھوٹی خوشی اور عمل کی نمائش (Oversharing) کی جاتی ہے۔

- **عملی سبق :** سونا اپنی قیمت اس لیے رکھتا ہے کیونکہ وہ ہر جگہ مٹی کی طرح بکھرا ہوا نہیں ملتا۔ اپنی نجی زندگی، اپنی عبادات اور اپنے نیک اعمال کو جتنا "پردے" میں رکھیں گے، آپ کی شخصیت میں اتنی ہی **وقار اور گہرائی** پیدا ہو گی۔ جس طرح سونا کان میں "پرورش" پاتا ہے، آپ کی شخصیت کی اصل نشوونما تنہائی اور خاموشی میں ہوتی ہے۔

۳. مشکل حالات میں صبر (Resilience)

زندگی میں کبھی کبھی ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم "اندھیروں" میں گھر گئے ہیں (جیسے سونا کان کے اندھیرے میں ہوتا ہے)۔

- **عملی سبق:** جب آپ پر برا وقت آئے، تو سمجھ لیں کہ آپ "زیرِ کان" ہیں یعنی آپ کی تربیت ہو رہی ہے۔ یہ اندھیرا آپ کو ختم کرنے کے لیے نہیں، بلکہ آپ کو "**خالص**" بنانے کے لیے ہے۔ اگر سونا زمین کی سختی سے گھبرا کر باہر آ جاتا، تو وہ کبھی قیمتی دھات نہ بنتا۔ اپنی مشکلات کو اپنی "پرورش" کا ذریعہ سمجھیں۔

۴. گہرا مطالعہ اور مہارت (Deep Work)

کسی بھی فن یا علم میں مہارت حاصل کرنے کے لیے دنیا سے کٹ کر وقت لگانا پڑتا ہے۔

- **عملی سبق:** اگر آپ کوئی ہنر سیکھ رہے ہیں، تو اسے "خاموشی" سے سیکھیں۔ آج کل لوگ سیکھنے سے زیادہ سکھانے کے دعوے کرتے ہیں۔ یہ شعر کہتا ہے کہ پہلے خود کو "کمال" تک پہنچائیں، پھر دنیا کے سامنے آئیں۔ کچی دھات کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، قیمت صرف اس سونے کی ہے جو کان سے **مکمل** ہو کر نکلتا ہے۔

۵. رشتوں میں گہرائی اور بھرم

رشتوں میں ہر بات کا چرچا کرنا یا ہر اختلاف کو ظاہر کرنا تعلق کو کمزور کر دیتا ہے۔

- **عملی سبق:** اچھے اور مضبوط رشتے وہ ہیں جن کے معاملات "گھر کی دیواروں" کے اندر رہیں۔ جتنا آپ اپنے تعلقات کا بھرم رکھیں گے، اتنی ہی ان کی قدر بڑھے گی۔

خلاصہ (Takeaway)

روزمرہ زندگی میں اس شعر کا نچوڑ یہ ہے:

"خاموشی سے محنت کرو اور اپنی کامیابی کو شور مچانے دو۔"

آپ کی صلاحیتیں "سونا" ہیں اور آپ کی محنت "کان" کا اندھیرا۔ اس اندھیرے سے گھبرانے کے بجائے اسے اپنی پرورش کا ذریعہ بنائیں۔

وَعدہ ہا و لُطف ہائے آن حکیم
کرد آن رَنجور را آمِن زِ بیم

مشکل الفاظ کے معنی

حکیم: دانا، طبیب، مرشدِ کامل، اللہ کا ولی۔۔۔ لطف ہائے: مہربانیاں، نوازشیں (لطف کی جمع)۔۔۔ رنجور: بیمار، دکھ کا مارا ہوا، غمزدہ۔ آمن (آمن کرنا): امن دینے والا، بے خوف کرنے والا، مطمئن کرنے والا۔ بیم: خوف، ڈر، اندیشہ۔

ترجمہ

"اس حکیم (دانا طبیب) کے وعدوں اور نوازشوں نے اس بیمار (رنجور) کو ہر طرح کے خوف سے بے خوف اور مطمئن کر دیا۔

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ جب بادشاہ کی محبوب کنیز بیمار ہو گئی اور دنیاوی طبیب اسے ٹھیک کرنے میں ناکام رہے، تو اللہ کی طرف سے ایک "حکیمِ الٰہی" (روحانی معالج) بھیجا گیا۔ یہ شعر اس معالج کے طریقہ علاج کی ایک جھلک دکھاتا ہے۔

نفسیاتی پہلو: مولانا روم یہاں ایک گہری نفسیاتی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ کسی بھی بیماری (چاہے وہ جسمانی ہو یا روحانی) کے علاج میں سب سے اہم قدم مریض کے دل سے **خوف** کو نکالنا ہوتا ہے۔ جب وہ حکیم اس بیمار لڑکی کے پاس آیا، تو اس نے اسے ڈرانے یا سخت ادویات دینے کے بجائے اسے تسلی دی، پیار سے بات کی اور اچھے مستقبل کے وعدے کیے۔ ان تسلیوں کا اثر یہ ہوا کہ مریضہ کا ذہنی دباؤ ختم ہو گیا اور وہ خود کو محفوظ محسوس کرنے لگی۔

روحانی پہلو: تصوف کی رو سے "حکیم" سے مراد **مرشدِ کامل** یا اللہ کا وہ بندہ ہے جو انسانی روح کا علاج کرتا ہے۔

- **بیمار (رنجور):** ہم سب (انسان) جو دنیاوی خواہشات اور گناہوں کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔
- **وعدے اور لطف:** اللہ کی رحمت کی بشارتیں اور توبہ کی قبولیت کی امید۔ جب ایک سچا رہنما طالبِ حق کو اللہ کی رحمت کی امید دلاتا ہے اور اسے مایوسی کے اندھیروں سے نکالتا ہے، تو طالب کا دل "بیم" (خوف اور بے چینی) سے نکل کر "اطمینانِ قلب" کی طرف آجاتا ہے۔

حاصلِ کلام: شفاء کا پہلا قدم **امید** ہے۔ جب تک انسان خوفزدہ رہتا ہے، اس کی ہمت پست رہتی ہے۔ اللہ کا ولی یا ایک اچھا معالج پہلے انسان کے دل کو ڈھارس بندھاتا ہے، کیونکہ مطمئن دل ہی شفاء کی طرف پہلا قدم اٹھا سکتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کا فلسفہ قرآن و سنت کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اسلام میں مایوسی کو کفر (یا کفر کے قریب) قرار دیا گیا ہے اور امید، تسلی اور اللہ کی رحمت پر یقین کو "شفاء" کی بنیاد مانا گیا ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت درج ذیل نکات سے کی جا سکتی ہے:

مایوسی کی ممانعت اور امید کی اہمیت

رومی کے شعر میں حکیم نے مریض کو "وعدوں اور نوازشوں" سے نوازا، جس کا مقصد اسے مایوسی سے نکالنا تھا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ"

ترجمہ: اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو — (سورہ الزمر: 53)

ایک مومن کے لیے اللہ کی رحمت کا وعدہ ہی وہ سب سے بڑی "نوازش" ہے جو اسے ہر طرح کے خوف (بیم) سے نجات دلا کر اطمینان (آمن) عطا کرتی ہے۔

سنتِ نبوی ﷺ: مریض کی دلجوئی (تنفیس)

حدیثِ مبارکہ میں مریض کی عیادت کے وقت اسے امید دلانے کی خاص تاکید آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَأَبُو كُرَيْبٍ، قَالَا: حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ شَقِيقٍ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا حَضَرْتُمُ الْمَرِيضَ أَوِ الْمَيِّتَ، فَقُولُوا خَيْرًا فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ يُؤَمِّنُونَ عَلَى مَا تَقُولُونَ". قَالَتْ: فَلَمَّا مَاتَ أَبُو سَلَمَةَ، أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ أَبَا سَلَمَةَ قَدْ مَاتَ، قَالَ: "قُولِي اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَلَهُ، وَأَعْقِبْنِي مِنْهُ عُقْبَى حَسَنَةً". قَالَتْ: فَقُلْتُ: فَأَعْقَبَنِي اللَّهُ مَنْ هُوَ خَيْرٌ لِي مِنْهُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم مریض یا مرنے والے کے پاس جاؤ تو بھلائی کی بات کہو کیونکہ جو تم کہتے ہو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔“ کہا: جب ابو سلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: ”اے اللہ کے رسول! ابو سلمہ وفات پا گئے ہیں۔“ آپ نے فرمایا: ”تم (یہ کلمات) کہو: ’اے اللہ! مجھے اور اس کو معاف فرما اور اس کے بعد مجھے اس کا بہترین بدل عطا فرما۔‘“ کہا: میں نے (یہ کلمات) کہے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کے بعد وہ دے دیا جو میرے لیے ان سے بہتر ہے، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ [صحیح مسلم / کتاب الجنائز / حدیث:2129]

تحفۃ المسلم میں ہے: مریض یا مرنے والے کے پاس زبان سے کلمات خیر ہی کہنے چاہئیں جس سے نہ مریض اور مرنے والے کے جذبات کو ٹھیس پہنچے اور نہ ہی ان سے جزع اور فزع یا سوء ظن کا اظہار ہو،

کیونکہ وہاں موجود فرشتے حاضرین کی باتوں پر آمین کہتے ہیں جس کی بنا پر ان کی قبولیت اور اثرات کا امکان بڑھ جاتا ہے نیز جب وہ مر جائے تو اس کے ورثاء کو یہ مسنون دعا پڑھنی چاہیے تا کہ اللہ تعالیٰ جو ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لیے کوئی بات ناممکن نہیں۔ وہ انہیں اس کا نعم البدل عنایت فرمائے۔

مولانا روم کا "حکیم" دراصل اسی سنتِ نبوی پر عمل کر رہا ہے کہ وہ مریض کے دل سے موت کا خوف نکال کر اسے اللہ کے کرم کی امید دلا رہا ہے، جو کہ آدھے علاج کے برابر ہے۔

3. خوف کا خاتمہ اور امنِ قلبی

شعر میں ذکر ہے کہ مریض "بیم" (خوف) سے "آمن" (بے خوف) ہو گیا۔ قرآن کریم میں اللہ کے دوستوں (اولیاء اللہ) کی یہی پہچان بتائی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو خوف سے نکالتے ہیں:

"أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ"

)یاد رکھو! جو اللہ کے دوست ہیں ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے — (سورہ یونس:62

حکیم (مرشدِ کامل) کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ انسان کے دل سے دنیاوی اندیشوں کا خوف نکال کر اسے اللہ کی پناہ میں دے دے۔

کلام میں شفاء (نفسیاتی و روحانی علاج)

قرآن خود کو "شفاء" قرار دیتا ہے " **:وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ**"۔ جس طرح قرآن کے وعدے مومن کے دل کو سکون دیتے ہیں، اسی طرح ایک اللہ والے (حکیم) کی گفتگو بھی مریض کے لیے دوا کا کام کرتی ہے۔

قرآنی تصور	**رومی کا شعر**
رحمت و مغفرت کے وعدے	وعدہ ہائے آن حکیم
اللہ کا فضل و کرم	لطف ہائے آن حکیم
سکینہ اور اطمینانِ قلب	آمِن زِ بیم

خلاصہ

اسلامی نکتہ نظر سے، **شفاء صرف دوائی میں نہیں بلکہ "امید" اور "یقین" میں چھپی ہے**۔ جب کوئی مخلص ناصح یا طبیب اللہ کی رحمت کے حوالے سے بات کرتا ہے، تو انسان کا مدافعتی نظام (Immune System) اور اس کی روح دونوں مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مولانا روم کا حکیم دراصل ایک "روحانی مسیحا" ہے جو مریض کا تعلق اللہ کی رحمت سے جوڑ کر اسے ذہنی و جسمانی اذیت سے نجات دلا رہا ہے۔

مولانا روم کا یہ شعر محض تصوف تک محدود نہیں بلکہ **جدید نفسیات (Psychology)** اور **میڈیکل سائنس (Medical Science)** کے چند اہم ترین اصولوں کی عکاسی کرتا ہے۔

نفسیاتی اور طبی لحاظ سے اس کی وضاحت درج ذیل ہے:

1. نفسیاتی پہلو (Psychological Perspective)

نفسیات میں اس عمل کو "**ریپور بلڈنگ (Rapport Building)**" اور "**تسلی کی طاقت** " کہا جاتا ہے۔

- **خوف کا خاتمہ (Reduction of Anxiety):** جب انسان بیمار ہوتا ہے، تو وہ صرف جسمانی تکلیف میں نہیں ہوتا بلکہ "موت کے خوف" یا "نامعلوم کے ڈر (Fear of the Unknown)" میں مبتلا ہوتا ہے۔ رومی کے شعر میں

"آمن زِ بیم" (خوف سے امن دینا) اسی خوف کے خاتمے کی طرف اشارہ ہے۔ نفسیات کے مطابق جب مریض کا اضطراب (Anxiety) ختم ہوتا ہے، تو اس کی آدھی بیماری خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

- **امید کا سہارا" :(Power of Hope)** وعدہ ہائے آن حکیم "سے مراد مریض کو ایک روشن مستقبل کی امید دلانا ہے۔ مثبت نفسیات (Positive Psychology) کہتی ہے کہ "امید" ایک فعال ذہنی عمل ہے جو انسان کے اندر جینے کی امنگ پیدا کرتا ہے۔
- **معالج اور مریض کا تعلق :(Doctor-Patient Relationship)** حکیم کا "لطف" (مہربانی) مریض کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ جب مریض کو معالج پر مکمل اعتماد (Trust) ہو جائے، تو اس کا دماغ "دفاعی پوزیشن" سے نکل کر "شفاء کی پوزیشن" میں آجاتا ہے۔

2.طبی پہلو (Medical/Biological Perspective)

میڈیکل سائنس میں اس شعر کے مفہوم کو **"سائیکونیورو امیونولوجی (Psychoneuroimmunology)** "کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔

- **پلیسیبو اثر :(Placebo Effect)** یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ اگر مریض کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا (خواہ اسے سادہ میٹھی گولی ہی کیوں نہ دی جائے)، تو اس کا جسم خود بخود شفاء کے کیمیکلز پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حکیم کے "وعدے" دراصل پلیسیبو کا کام کر رہے ہیں۔
- **اسٹریس ہارمونز میں کمی :** جب مریض خوف (Bim) میں ہوتا ہے، تو اس کے جسم میں **کورٹیسول (Cortisol)** اور **ایڈرینالین** جیسے ہارمونز بڑھ جاتے ہیں جو مدافعتی نظام (Immune System) کو کمزور کر دیتے ہیں۔ حکیم کی تسلی ان ہارمونز کو کم کر کے جسم کو پر سکون حالت میں لاتی ہے۔
- **اینڈورفنز کا اخراج :(Release of Endorphins)** جب مریض خوش اور مطمئن (Aman) محسوس کرتا ہے، تو دماغ **اینڈورفنز (Endorphins)** اور **ڈوپامائن (Dopamine)** خارج کرتا ہے۔ یہ جسم کے قدرتی "پین کلرز (Painkillers) "ہیں جو درد کو کم کرتے ہیں اور خلیات کی مرمت (Cellular Repair) کے عمل کو تیز کر دیتے ہیں۔

تقابلی جائزہ(خوف بمقابلہ امید)

حالت	جسمانی اثرات(طبی)	ذہنی اثرات(نفسیاتی)
بیم(خوف/ڈر)	مدافعتی نظام کی کمزوری، بلڈ پریشر میں اضافہ	مایوسی، بے چینی، توجہ کی کمی
آمن(امن/اطمینان)	قوتِ مدافعت میں اضافہ، بہتر نیند، تیز شفاء	خود اعتمادی، سکون، جینے کی لگن

خلاصہ

رومی کا "حکیم" ایک ایسا ماہر نفسیات ہے جو جانتا ہے کہ **دوا سے پہلے دعا، تسلی اور اخلاق** کی ضرورت ہے۔ طبی لحاظ سے، ایک مہربان معالج کی گفتگو مریض کے دماغ میں وہ کیمیائی تبدیلیاں لاتی ہے جو مہنگی ترین ادویات بھی نہیں لا سکتیں۔

وَعدہ ہا باشد حقیقی دلْ پَذیر

وَعدہ ہا باشد مَجازی تاسہ گیر

مشکل الفاظ کے معنی

وعدہ: قول، عہد، کسی کام کے کرنے کا یقین دلانا۔۔۔ حقیقی: سچا، اصل، جو واقع ہونے والا ہو۔۔۔۔ دل پذیر: دل کو بھانے والا، تسلی دینے والا۔۔۔۔ مجازی: ظاہری، غیر حقیقی، نمائشی۔۔۔ تاسہ گیر: رنج دینے والا، غمگین کرنے والا، مایوس کن

ترجمہ

سچے وعدے (روح کے لیے) فرحت بخش اور دل کو سکون دینے والے ہوتے ہیں، جبکہ جھوٹے اور بناوٹی وعدے (انسان کو) بے چینی اور گھبراہٹ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

مولانا روم اس شعر میں دو قسم کے اثرات کا موازنہ کر رہے ہیں:

- **سچائی کی خوشبو (حقیقی وعدے): جب کوئی سچا انسان یا اللہ کا ولی کوئی وعدہ کرتا ہے، تو اگرچہ وہ کام ابھی مکمل نہ بھی ہوا ہو، اس کی بات میں ایک ایسی نورانیت اور سچائی ہوتی ہے جو سننے والے کے دل کو فوری اطمینان (Peace) بخشتی**

ہے۔ مومن جب اللہ کے وعدوں کو پڑھتا ہے تو اس کا دل مائل بہ سکون ہو جاتا ہے کیونکہ "حقیقت" میں ایک مقناطیسی کشش ہوتی ہے جو روح کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔

- جھوٹ کا بوجھ (مجازی وعدے): مجازی یا جھوٹے وعدے وہ ہیں جو صرف زبان سے کیے جائیں لیکن ان کے پیچھے نیت صاف نہ ہو۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایسا وعدہ سننے والے کے کانوں کو شاید بھلا لگے، لیکن اس کی روح اسے قبول نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹے وعدوں پر تکیہ کرنے والا انسان اندرونی طور پر "تاسہ (Suffocation)" کا شکار رہتا ہے۔ اسے ایک انجانا سا خوف اور بے چینی گھیرے رکھتی ہے کیونکہ باطل میں استقامت نہیں ہوتی۔

حاصلِ کلام: یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ سچائی صرف زبان کا کھیل نہیں بلکہ اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہے۔ سچ سکون لاتا ہے اور جھوٹ صرف اضطراب اور پریشانی کا باعث بنتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کی تشریح قرآن و سنت کی روشنی میں نہایت گہری اور ایمان افروز ہے۔ یہ شعر بنیادی طور پر "صدق" (سچائی) اور "کذب" (جھوٹ) کے قلبی اثرات کو بیان کرتا ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی تشریح کے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱. اللہ کے وعدے "حقیقی اور دل پذی-ر" ہیں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ) "الرعد:28 (ترجمہ:"سن لو! اللہ کی یاد سے ہی دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے وعدے (جنت، مغفرت، مدد اور نصرت) "حقیقی" ہیں۔ جب ایک مومن ان وعدوں پر یقین رکھتا ہے، تو اسے دنیاوی پریشانیوں کے باوجود ایک اندرونی سکون اور "دل پذیری "(اطمینانِ قلب) حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے) وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا(، اور یہی سچائی روح کو سکون دیتی ہے۔

نفس اور شیطان کے وعدے "مجازی اور تاسہ گیر" ہیں

شیطان اور نفسِ امارہ انسان سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں جو ظاہری طور پر پرکشش معلوم ہوتے ہیں لیکن انجام کار بے چینی (تاسہ) لاتے ہیں۔ قرآن میں شیطان کے بارے میں فرمایا گیا:

"يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَٰنُ إِلَّا غُرُورًا) "النساء:120 (ترجمہ:"وہ(شیطان)ان سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے، اور شیطان ان سے جو وعدے کرتا ہے وہ محض دھوکا ہیں۔"

یہ "مجازی" وعدے (جیسے گناہ میں لذت یا دنیا کی ابدی زندگی کا وہم) انسان کو عارضی خوشی تو دے سکتے ہیں، لیکن آخر کار روح میں "تاسہ "(گھٹن اور اضطراب) پیدا کرتے ہیں کیونکہ انسانی فطرت جھوٹ پر مطمئن نہیں ہو سکتی۔

۳. حدیثِ نبوی ﷺ اور قلبی اطمینان

نبی کریم ﷺ نے سچائی اور جھوٹ کے نفسیاتی اثر کو ایک جامع حدیث میں بیان فرمایا:

"اَلصِّدْقُ طُمَأْنِيْنَةٌ وَالْكَذِبُ رِيْبَةٌ) "جامع ترمذی (ترجمہ" : سچائی اطمینان ہے اور جھوٹ شک (اور بے چینی) ہے۔"

یہ حدیث مولانا روم کے شعر کی بہترین شرح ہے۔

- سچ (حقیقی وعدہ) : دل میں اطمینان اور ٹھہراؤ پیدا کرتا ہے۔
- جھوٹ (مجازی وعدہ) : دل میں ریبہ (شک، کھٹک اور بے چینی) پیدا کرتا ہے۔ جس طرح "تاسہ گیر" وعدہ دم گھونٹتا ہے، اسی طرح جھوٹ انسان کے اندرونی سکون کو غارت کر دیتا ہے۔

۴. منافقت اور وعدہ خلافی

حدیث میں منافق کی نشانیوں میں سے ایک "وعدہ خلافی" بتائی گئی ہے۔ جب کوئی شخص جھوٹا وعدہ کرتا ہے، تو وہ معاشرے میں بھی "تاسہ "(بے اعتباری اور بے چینی) کا سبب بنتا ہے۔ جبکہ ایک مومن کا وعدہ "حقیقی" ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے بھی باعثِ راحت ہوتا ہے۔

خلاصہ : قرآن و سنت کی رو سے، سچائی اللہ کی صفت ہے اس لیے وہ روح کو غذا اور سکون فراہم کرتی ہے۔ جھوٹ شیطانی صفت ہے، اس لیے وہ انسانی فطرت کے خلاف ہے اور روح کے لیے بوجھ اور بے چینی کا باعث بنتا ہے۔ مولانا روم اسی نبوی حکمت کو شعری پیراہن میں بیان کر رہے ہیں۔

جبلتی (Instinctive) اور نفسیاتی لحاظ سے مولانا روم کا یہ شعر انسانی فطرت کی ایک گہری سچائی کو بیان کرتا ہے۔ جدید نفسیات اور انسانی جبلت کے مطالعے سے یہ بات درج ذیل نکات میں واضح ہوتی ہے:

۱ . فطرت کا سچائی کی طرف میلان(The Truth Instinct)

انسانی جبلت اصل میں "خیر (Goodness) "اور "سچ "پر ڈیزائن کی گئی ہے۔ نفسیاتی طور پر جب انسان کسی سچی بات یا حقیقی وعدے کا سامنا کرتا ہے، تو اس کا لاشعور اسے قبول کر لیتا ہے، جس سے دماغ میں سکون پیدا کرنے والے کیمیکلز) جیسے Endorphins(خارج ہوتے ہیں۔ یہی وہ "دل پذیری "ہے جس کا ذکر مولانا کر رہے ہیں۔ سچ فطرت کے مطابق ہے، اس لیے وہ جبلت کو بوجھل نہیں کرتا۔

۲ . جھوٹ اور "نفسیاتی دباؤ(Cognitive Dissonance) "

جبلتی طور پر جھوٹ بولنا یا جھوٹے وعدے پر یقین کرنا انسانی اعصابی نظام (Nervous System) کے لیے ایک بوجھ ہے۔

- تاسہ گیر :(Suffocation) جب کوئی شخص جھوٹا وعدہ کرتا ہے یا سنتا ہے، تو اس کے اندر ایک "تضاد "پیدا ہوتا ہے جسے نفسیات میں Cognitive Dissonance کہتے ہیں۔
- یہ تضاد انسان کے اندر تناؤ(Stress) ، بے چینی اور بلڈ پریشر میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "لائی ڈیٹیکٹر (Lie Detector) "مشین جسم کی اسی جبلتی بے چینی (نبض کی تیزی، پسینہ آنا) کو ناپ کر جھوٹ پکڑتی ہے۔ مولانا نے اسی جسمانی و نفسیاتی گھٹن کو "تاسہ گیر "کے لفظ سے بیان کیا ہے۔

۳ . لاشعوری وجدان(Subconscious Intuition)

انسان کے اندر ایک جبلتی "ڈیٹیکٹر "ہوتا ہے جسے ہم "چھٹی حس "یا وجدان کہتے ہیں۔

- بعض اوقات ہم کسی کے وعدے کو لفظی طور پر تو مان لیتے ہیں، لیکن ہمارا باطن (Inward self) اسے قبول نہیں کر رہا ہوتا۔
- وہ وعدہ ہمارے اندر ایک "گرہ "لگا دیتا ہے، ہم بے چین رہتے ہیں کیونکہ ہماری جبلت بھانپ لیتی ہے کہ یہ "مجازی " (بناوٹی) ہے۔ اس کے برعکس حقیقی وعدہ روح کی گہرائیوں میں اتر کر اطمینان پیدا کرتا ہے۔

۴ . بقا کا مادہ(Survival Instinct)

انسانی جبلت میں بقا (Survival) کے لیے "بھروسہ "بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

- **حقیقی وعدہ :** جبلت کو تحفظ (Security) کا احساس دلاتا ہے، جس سے خوف ختم ہوتا ہے۔
- **مجازی وعدہ :** جبلت کو خطرے (Insecurity) کا سگنل دیتا ہے، جس سے بے چینی اور "تاسہ" (گھبراہٹ) جنم لیتی ہے۔

خلاصہ

جبلتی طور پر سچائی "راحت (Relaxation)" ہے اور جھوٹ "تناؤ (Tension)" ہے۔ مولانا روم نے صدیوں پہلے انسانی اعصاب اور روح کے اس تعلق کو پہچان لیا تھا کہ سچا وعدہ دل کو وسعت دیتا ہے اور جھوٹا وعدہ روح کا دم گھونٹتا ہے۔

وَعدۂ اَہلِ کَرَم، گَنجِ رَوان
وَعدۂ نااَہل شُد رَنجِ رَوان

مشکل الفاظ کے معنی

اہلِ کرم : سخی لوگ، بامروت اور عالی ظرف لوگ۔۔۔**گنج رواں :** چلتا پھرتا خزانہ، وہ دولت جو ہمیشہ فائدہ دے۔

نااہل : وہ شخص جس میں ظرف نہ ہو، کمینہ یا وعدہ خلاف۔۔۔۔**رنج رواں :** مسلسل دکھ، وہ تکلیف جو ختم نہ ہو۔

ترجمہ:

"سخی اور باکردار لوگوں کا وعدہ ایک بہتا ہوا (کبھی نہ ختم ہونے والا) خزانہ ہے، جبکہ نااہل اور کم ظرف لوگوں کا وعدہ روح کے لیے مسلسل دکھ اور عذاب بن جاتا ہے۔"

آسان لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں:

- **پہلی بات :** جب کوئی اچھا اور سچا انسان آپ سے وعدہ کرتا ہے، تو گویا اس نے آپ کو ایک قیمتی دولت دے دی کیونکہ وہ اسے ہر حال میں پورا کرے گا۔
- **دوسری بات :** جب کوئی گھٹیا یا جھوٹا انسان آپ سے وعدہ کرتا ہے، تو وہ آپ کو خوشی نہیں بلکہ مستقل ذہنی پریشانی اور انتظار کی تکلیف دیتا ہے۔

یہ فارسی کا ایک بہت ہی خوبصورت اور سبق آموز شعر ہے، جس میں سخی اور بخیل (یا گھٹیا) انسان کے کردار کا موازنہ کیا گیا ہے۔ دو اہم پہلو ہیں:

۱. **عالی ظرف کی پہچان :** جب کوئی سخی یا بااصول انسان (اہلِ کرم) کسی سے کوئی وعدہ کرتا ہے، تو وہ اسے ہر صورت پورا کرتا ہے۔ اس کا وعدہ محض الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ایک **"گنجِ رواں "**(بہتا ہوا خزانہ) ہوتے ہیں جس سے دوسرے کو سکون اور فائدہ پہنچتا ہے۔ ایسے شخص کی زبان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

۲. **کم ظرف کی حقیقت :** اس کے برعکس، وہ شخص جو اخلاقی طور پر گرا ہوا ہو (نا اہل)، اس کا وعدہ صرف تسلیاں اور جھوٹی امیدیں ہوتی ہیں۔ وہ وعدہ تو کر لیتا ہے لیکن اسے پورا کرنے کی نیت نہیں رکھتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سامنے والا شخص اس کی جھوٹی امیدوں کے سہارے انتظار کی کوفت سہتا رہتا ہے، جس سے اسے ذہنی اذیت ملتی ہے۔ اسی لیے اسے **"رنجِ رواں "** (ایسی تکلیف جو روح کو تھکا دے) کہا گیا ہے۔

خلاصہ : یہ شعر ہمیں نصیحت کرتا ہے کہ ہمیشہ باکردار لوگوں پر بھروسہ کریں اور خود بھی "اہلِ کرم" بنیں تاکہ ہمارے قول و فعل سے کسی کو اذیت نہ پہنچے۔

۱. قرآنِ کریم کی روشنی میں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے سچے لوگوں (اہلِ کرم) کی صفت بیان کی ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور وعدہ خلافی کو گناہ قرار دیا ہے۔

- **وعدے کی باز پرس :** ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا (سورہ بنی اسرائیل:34) "اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں (قیامت کے دن) سوال کیا جائے گا۔"

- **اہلِ ایمان کی صفت :** سورہ المومنون میں کامیاب ایمان والوں کی نشانی یہ بتائی گئی:

وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ (سورہ المومنون:8) "اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی پاسداری کرنے والے ہیں۔"

- **قول و فعل میں تضاد کی مذمت (نااہل کا شیوہ):** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو تم کر نہیں سکتے اس کا وعدہ کرنا سخت ناپسندیدہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (سورہ الصف:2) "اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں؟"

۲. سنتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

نبی کریم ﷺ نے وعدے کی پاسداری کو ایمان کی جڑ اور وعدہ خلافی کو منافقت کی علامت قرار دیا ہے۔

- **منافق کی نشانی (رنجِ رواں):** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، **جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے** اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔" (صحیح بخاری) یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ نااہل کا وعدہ کیوں "رنجِ رواں" ہے، کیونکہ وہ نفاق پر مبنی ہوتا ہے۔

- **دین کی بنیاد:** آپ ﷺ کا فرمان ہے:

"اس شخص کا کوئی دین نہیں جس میں عہد کی پاسداری نہیں۔" (مشکاۃ المصابیح)

شعر میں مذکور "اہلِ کرم" دراصل وہ لوگ ہیں جو قرآنی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اپنی زبان کی لاج رکھتے ہیں، جبکہ "نا اہل" وہ ہیں جو منافقانہ طرزِ عمل اختیار کر کے دوسروں کے لیے ذہنی اور قلبی اذیت (رنجِ رواں) کا باعث بنتے ہیں۔

انسانی نفسیات (Psychology) اس شعر کے مفہوم کی تائید بہت گہرائی سے کرتی ہے۔ "وعدہ" محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ دو انسانوں کے درمیان "**نفسیاتی معاہدہ (Psychological Contract)**" اور "**بھروسے کی بنیاد**" ہے۔

نفسیاتی نقطہ نظر سے اس شعر کی تشریح درج ذیل ہے:

"گنجِ رواں" (خزانہ): اہلِ کرم اور ذہنی سکون

نفسیات کے مطابق جب کوئی باکردار شخص (High Integrity Person) وعدہ کرتا ہے، تو وہ دوسرے شخص کے ذہن میں **"تحفظ کا احساس (Sense of Security)"** پیدا کرتا ہے۔

- **کمیونیکیشن اور ٹرسٹ:** سخی اور مخلص لوگ جب وعدہ نبھاتے ہیں، تو اس سے سامنے والے کے دماغ میں 'آکسی ٹوسن (Oxytocin)' نامی ہارمون خارج ہوتا ہے، جسے "محبت اور بھروسے کا ہارمون" کہا جاتا ہے۔ یہ رشتہ مضبوط کرتا ہے اور ذہنی دباؤ کم کرتا ہے۔

- **سماجی سرمایہ (Social Capital):** اہلِ کرم کا وعدہ ایک خزانہ اس لیے ہے کیونکہ یہ معاشرے میں "اعتبار" پیدا کرتا ہے، جو کسی بھی مالی خزانے سے بڑی نفسیاتی دولت ہے۔

۲. "رنجِ رواں" (مستقل دکھ): نااہل اور ذہنی اذیت

نفسیات میں وعدہ خلافی کو **"اعتماد کی توڑ پھوڑ (Betrayal of Trust)"** کہا جاتا ہے، جو انسانی ذہن پر گہرے منفی اثرات مرتب کرتی ہے:

- **ذہنی تناؤ (Cognitive Dissonance):** جب کوئی نااہل شخص وعدہ کرتا ہے، تو سننے والا اس پر امیدیں قائم کر لیتا ہے۔ جب وہ وعدہ ٹوٹتا ہے، تو انسان کا ذہن ایک تکلیف دہ کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ "رنج" اس لیے "رواں" (مسلسل) ہے کیونکہ ٹوٹا ہوا بھروسہ انسان کو مستقبل میں بھی دوسروں پر اعتبار کرنے سے روک دیتا ہے۔

- **اضطراب اور مایوسی (Anxiety & Frustration):** جھوٹے وعدے انسان کو "معلق (In Limbo)" کر دیتے ہیں۔ وہ نہ تو اس کام کے لیے کوئی متبادل راستہ اختیار کر پاتا ہے اور نہ ہی اسے وہ سہارا ملتا ہے۔ یہ بے یقینی کی کیفیت (Uncertainty) انسانی اعصاب کے لیے بدترین سزا ہے۔

- **گیس لائٹنگ (Gaslighting):** اکثر نااہل لوگ وعدہ خلافی کے بعد اپنی غلطی ماننے کے بجائے بہانے بناتے ہیں، جس سے سامنے والا شخص اپنی ہی سوچ پر شک کرنے لگتا ہے۔ یہ ایک شدید نفسیاتی اذیت ہے۔

۳. شخصیت کا فرق (Personality Traits)

نفسیات ان دو گروہوں کو یوں تقسیم کرتی ہے:

صفت	اہلِ کرم (High Integrity)	نااہل (Low Integrity/Narcissistic)
مقصد	دوسروں کی مدد اور تعلق کی مضبوطی	وقتی فائدہ یا اپنی اہمیت جتانا
نتیجہ	خود اعتمادی اور باہمی احترام	تعلقات میں دراڑ اور سماجی تنہائی
نفسیاتی اثر	سکونِ قلب (Peace of Mind)	جذباتی صدمہ (Emotional Trauma)

حاصلِ کلام:

نفسیاتی طور پر "اہلِ کرم" وہ ہیں جو اپنے قول و فعل میں ہم آہنگی رکھتے ہیں، جس سے معاشرے میں **"نفسیاتی تحفظ "** پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ "نااہل" وہ ہیں جو اپنی غیر ذمہ داری سے دوسروں کے لیے **"جذباتی عدم تحفظ** (Emotional Insecurity) " کا باعث بنتے ہیں۔

فارسی اور عربی ادب میں "وفائے عہد" (وعدہ نبھانا) کو انسانیت کی معراج اور "غدر" (وعدہ خلافی) کو کم ظرفی کی علامت سمجھا گیا ہے۔ شعراء نے ان دونوں کیفیات کو بہت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔

آپ کے پیش کردہ شعر کی وضاحت کے لیے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ا. فارسی شعراء کے کلام سے (اہلِ کرم کا وصف)

فارسی ادب میں **شیخ سعدی شیرازی** اور **حافظ** نے اس موضوع پر کمال بات کی ہے:

- **شیخ سعدی (سخی کے وعدے پر):**

سخاوت سجیّہ است اہلِ کرم را

سخاوت تو اہل کرم کی جبلت اور فطرت ہے

سعدی فرماتے ہیں کہ سخی انسان کے لیے وعدہ پورا کرنا بوجھ نہیں بلکہ اس کی طبیعت کا حصہ ہے، اسی لیے اسے "گنجِ رواں" کہا گیا۔

- **حافظ شیرازی (وعدہ خلافی کی مذمت میں) :** فارسی میں ایک مشہور اصطلاح ہے **"وعدۂ خلاف"**۔ حافظ فرماتے ہیں:

فریبِ مہرِ رُخاں خوردم و خطائے بکار

میں نے حسینوں کی محبت کا فریب کھایا اور کام میں خطا کر بیٹھا

یہاں "رنجِ رواں" کی عکاسی ہوتی ہے کہ جب کوئی وعدہ کر کے توڑتا ہے تو وہ انسان کے لیے عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتا ہے۔

۲. عربی شعراء کے کلام سے (مردِ حر کا وعدہ)

عربی زبان میں ایک مشہور مقولہ (جو شعر کی طرح استعمال ہوتا ہے) اس "گنجِ رواں" کی بہترین تشریح ہے:

- **وعدہ اور قرض:**

"وَعْدُ الْحُرِّ دَيْنٌ عَلَيْهِ"

آزاد اور غیور آدمی کا وعدہ اس پر قرض کی طرح ہوتا ہے

یعنی جس طرح قرض اتارنا واجب ہے، اہل کرم کے نزدیک وعدہ بھی ویسا ہی واجب ہے۔

- **عنترہ بن شداد (جاہلی شاعر) :** عنترہ کہتا ہے کہ اگر میں وعدہ کروں اور اسے پورا نہ کروں تو میری عزت خاک میں مل جائے۔ عربوں کے نزدیک **"وفاء "** (وفاداری) سے بڑی کوئی دولت نہیں تھی۔

- **نااہل کے بارے میں عربی قول:**

"يَعِدُكَ مِنَ الطَّرَفِ لِسَانًا"

وہ زبان کے ایک کونے سے تم سے وعدہ کرتا ہے

یعنی اس کے دل میں وہ بات نہیں ہوتی۔ یہ وہی "رنجِ رواں" ہے کہ زبان سے تسلی دے کر دل کو دکھ پہنچایا جائے۔

۳. اردو ادب سے تقابلی مثال (تا کہ مفہوم مزید واضح ہو)

اردو کے شعراء نے بھی اسی "نااہل کے رنج" کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

- **غالب (رنجِ رواں کی تصویر):**

تیرے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا ی

ہاں غالب بتا رہے ہیں کہ نااہل کا وعدہ اعتبار کے قابل نہیں ہوتا، اور اس کا انتظار صرف اذیت (رنج) دیتا ہے۔

- **مومن خان مومن:**

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ "رنجِ رواں" کی وہ کیفیت ہے جب انسان پرانی باتوں کو یاد کر کے کڑھتا رہتا ہے۔

خلاصہ

ان تمام اشعار کا نچوڑ یہ ہے کہ:

1. **اہلِ کرم** کے نزدیک زبان کی قیمت جان سے زیادہ ہے، اس لیے ان کا قول **"گنج "**(خزانہ) ہے۔
2. **نااہل** کے نزدیک زبان صرف ایک ہتھیار ہے، اس لیے ان کا قول **"رنج "**(تکلیف) ہے۔

بعد از آن بَر خاست و عَزْمِ شاہ کرد

شاہ رازان شَمّہ ءِ آگاہ کرد

مشکل الفاظ کے معنی

بعد از آن: اس کے بعد۔۔۔ بر خاست: اٹھا، کھڑا ہوا۔۔۔ عزم: ارادہ، قصد۔۔۔ شاہ: بادشاہ۔۔۔ کرد: کیا۔۔۔

زان: اس سے، اس بات سے۔۔۔ شمّہءِ: تھوڑی سی خبر، ہلکی سی جھلک، معمولی سا اشارہ۔۔۔ آگاہ کرد: باخبر کیا، اطلاع دی

ترجمہ

پھر وہ اٹھا اور بادشاہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا، اور اس بات کی ایک ہلکی سی خبر (یا معمولی سا اشارہ) بادشاہ کو دے دیا۔

اس شعر میں ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جو کسی اہم واقعہ یا راز سے آگاہ ہوتا ہے۔ وہ پہلے غور و فکر کرتا ہے اور پھر اٹھ کر **بادشاہ کے پاس جانے کا ارادہ کرتا ہے** تاکہ اسے اس معاملے سے آگاہ کرے۔ لیکن وہ بادشاہ کو پورا راز فوراً نہیں بتاتا بلکہ صرف **ایک ہلکا سا اشارہ یا ابتدائی خبر** دیتا ہے۔

لفظ **"شمّہ‌ای"** یہاں بہت اہم ہے۔ فارسی ادب میں اس کا مطلب ہے **کسی بڑی حقیقت کی معمولی سی جھلک یا مختصر اشارہ**۔ یعنی ساری بات ایک دم نہیں کہی جاتی بلکہ حکمت اور مصلحت کے ساتھ آہستہ آہستہ بیان کی جاتی ہے۔

یہ انداز ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ:

1. **اہم معاملات میں حکمت اور تدبر ضروری ہے۔**
2. **ہر بات فوراً اور مکمل طور پر ظاہر نہیں کی جاتی، بلکہ حالات کے مطابق بتائی جاتی ہے۔**
3. اہلِ دانائی اور اہلِ حکمت بڑے معاملات کو **نرمی، تدریج اور سمجھ داری** سے پیش کرتے ہیں۔

عزمِ شاہ (ارادے کی پختگی)

لفظ "برخاست" ظاہر کرتا ہے کہ محض سوچنا کافی نہیں بلکہ عمل کے لیے اٹھنا ضروری ہے۔ جب انسان کسی الجھن سے نکلتا ہے یا کوئی منزل پا لیتا ہے، تو وہ اپنی رپورٹ یا اپنی کامیابی اپنے "مرکز" (بادشاہ یا خدا) کے سامنے پیش کرتا ہے۔

2. شمّہ (مختصر بیان):

مولانا رومی نے یہاں "شمّہ" کا لفظ بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں:

عاجزی: بادشاہ کے سامنے پوری داستان سنانے کے بجائے صرف خلاصہ پیش کرنا ادب کا تقاضا ہے۔

حقیقت کی وسعت: روحانی واردات اتنی وسیع ہوتی ہیں کہ انہیں الفاظ میں مکمل بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا، صرف ایک "شمّہ" یا ہلکی سی جھلک ہی دکھائی جا سکتی ہے۔

3. باہمی ربط:

یہ شعر سکھاتا ہے کہ جب آپ کسی اہم کام سے فارغ ہوں یا کسی نتیجے پر پہنچیں، تو اپنے بڑوں یا اپنے رہنما کو اس سے باخبر کرنا دانشمندی ہے۔ تصوف کی زبان میں، یہ مرید کا اپنے پیر و مرشد کی طرف رجوع کرنا ہے تاکہ جو کچھ اس نے پایا ہے، اس کی تصدیق ہو سکے۔

صوفیانہ مفہوم میں بھی اس شعر کو یوں سمجھا جاتا ہے کہ **عارف یا دانا شخص کسی حقیقت یا رازِ معرفت کو عام لوگوں کے سامنے مکمل طور پر ظاہر نہیں کرتا بلکہ صرف ایک اشارہ دیتا ہے** تاکہ سننے والا خود غور و فکر کرے اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

اگر ہم اس شعر کے مفہوم کو **قرآن و سنت** کی روشنی میں دیکھیں، تو یہ عمل "مشاورت"، "امانت" اور "ارادے کی پختگی" کے اسلامی اصولوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آئے یا کوئی فیصلہ کرنا ہو، تو اسے تنہا چھوڑنے کے بجائے اللہ اور اس کے مقرر کردہ ذمہ داروں (صاحبِ امر) کی طرف رجوع کیا جائے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کے چند اہم پہلو یہ ہیں:

عزم اور توکل (عزمِ شاہ کرد)

شعر میں "برخاست اور عزم کیا" کا پہلو قرآن کی اس آیت کے عین مطابق ہے:

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ سورۃ آل عمران:159 " (پھر جب آپ (کسی کام کا) پختہ ارادہ کر لیں، تو اللہ پر بھروسہ کریں۔"

اسلامی نکتہ نظر سے جب انسان کسی صحیح کام کا ارادہ کر لیتا ہے، تو اسے سستی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہونا چاہیے، جیسا کہ شعر میں "برخاست" (اٹھا) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اولو الامر یا رہنما کو باخبر کرنا (شاہ را آگاہ کرد)

شعر میں بادشاہ کو آگاہ کرنے کا عمل نظم و ضبط اور امانت داری کی علامت ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ)... سورۃ النساء: 83" (اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آتی ہے تو اسے پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اسے رسول (ﷺ) اور اپنے میں سے صاحبانِ امر (ذمہ داروں) کی طرف لوٹاتے (تو بہتر تھا)۔"

یہاں "شاہ" سے مراد وہ اتھارٹی یا رہنما ہے جس کی طرف رجوع کرنا نظمِ جماعت اور فلاح کے لیے ضروری ہے۔

۳۔ اختصار اور ادب (شمّہ - ذرا سی بات)

سنتِ نبوی ﷺ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب بھی کسی بڑے یا حاکم کے سامنے بات رکھی جائے تو وہ **جامع اور مختصر** ہونی چاہیے۔

- آپ ﷺ **جوامع الکلم** (مختصر الفاظ میں بڑی بات کہنا) پسند فرماتے تھے۔
- حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی جب بادشاہ کو خواب کی تعبیر بتائی یا انتظام سنبھالا، تو حکمت اور اختصار کے ساتھ اپنی بات پیش کی۔

۴ .روحانی مفہوم (خدا کی طرف رجوع)

اگر ہم "شاہ" سے مراد **اللہ تعالیٰ** (احکم الحاکمین) لیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب بھی کسی حال میں ہو، اسے چاہیے کہ وہ اپنے دل کا حال (اگرچہ اللہ سب جانتا ہے) دعا اور التجا کی صورت میں اپنے رب کے سامنے پیش کرے۔ یہ "عرضِ حال" بندگی کا خاصہ ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں یہ شعر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ:

1. نیک کام کے لیے **سستی چھوڑ کر عملی جدوجہد** شروع کرنی چاہیے۔
2. اپنے معاملات میں **اپنے بڑوں اور اہلِ علم سے مشورہ** کرنا اور انہیں باخبر رکھنا چاہیے۔
3. اپنی بات کو **حکمت اور ادب** کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔

گفت تَدبیر آن بُوَد کان مَرد را

حاضِر آریم از پِیِ این دَرد را

مشکل الفاظ کے معنی

تدبیر: منصوبہ، حل، حکمتِ عملی۔۔۔ آن بُوَد: وہ یہ ہے، وہی ہے۔۔۔ کان مَرد: کہ اس شخص کو (کہ + آن + مرد)

حاضر آریم: ہم حاضر کریں، لے آئیں۔۔۔ از پِی: کے لیے، کی خاطر، کے واسطے۔۔۔ درد: بیماری، تکلیف (یہاں مراد کنیز کی عشق کی بیماری ہے)

ترجمہ

"(حکیم نے) کہا کہ (اس کا حل اور) تدبیر یہ ہے کہ اس شخص کو (جس کے عشق میں کنیز گرفتار ہے) اس بیماری کے علاج کے لیے یہاں حاضر کیا جائے۔"

اس شعر میں اس وقت کا ذکر ہے جب بادشاہ کے بلانے پر ایک غیبی طبیب آتا ہے اور وہ جان لیتا ہے کہ کنیز کسی جسمانی بیماری میں نہیں بلکہ سمرقند کے ایک **زرگر (سنار)** کے عشق میں بیمار ہے۔

۱ . صحیح تشخیص اور تدبیر : حکیم بادشاہ کو مشورہ دیتا ہے کہ اگر اس لڑکی کو تندرست کرنا ہے، تو اس کے معشوق کو یہاں لانا ہو گا۔ یہ "تدبیر" محض ایک طبی مشورہ نہیں بلکہ ایک گہری نفسیاتی اور روحانی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک درد کی اصل وجہ (Cause) دور نہ ہو، شفا ممکن نہیں۔

۲ . انسانی نفسیات : رومی یہاں یہ سمجھا رہے ہیں کہ انسانی دل کی تسکین کے لیے کبھی کبھی ان مادی اسباب کو فراہم کرنا پڑتا ہے جن کی اسے تڑپ ہوتی ہے، تاکہ بعد میں اسے ان کی حقیقت دکھائی جا سکے۔

اگر ہم پچھلے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اسے اسلامی تعلیمات کے ترازو میں تولیں تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

- **اسباب کا اختیار کرنا :** اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ بیماری کے علاج کے لیے اسباب (Means) اختیار کرنا سنتِ نبوی ﷺ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا" :اللہ نے ایسی کوئی بیماری نہیں اتاری جس کی شفا نہ اتاری ہو " (صحیح بخاری)۔ یہاں حکیم کا "تدبیر" کرنا اسی سنتِ الٰہیہ کی پیروی ہے۔
- **حکمت اور دانائی" :** تدبیر "اصل میں حکمت کا نام ہے۔ قرآن کہتا ہے" : جسے حکمت دی گئی، اسے خیرِ کثیر دی گئی"۔ ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ جذباتی فیصلوں کے بجائے دانشمندی اور تدبیر سے کام لے۔
- **مصیبت کی جڑ تک پہنچنا :** جس طرح حکیم نے "درد" کے پیچھے چھپے "مرد"(اصل وجہ) کو پہچانا، اسلام بھی ہمیں تلقین کرتا ہے کہ برائی یا پریشانی کی ظاہری شکل کے بجائے اس کی جڑ کو ختم کیا جائے۔

مَردِ زَرگر را بِخوان زان شہرِ دور

بازَر و خِلعَت بِدِہ او را غُرور

مشکل الفاظ کے معنی

مَردِ زَرگر: سنار (سونے کا کام کرنے والا شخص)۔۔۔۔ بِخوان: بلاؤ، آواز دو، دعوت دو (فارسی مصدر 'خواندَن' سے)

زان: اس سے (از + آن)۔۔۔ خِلعَت: وہ لباس جو بادشاہ کسی کو عزت دینے کے لیے عطا کرتا ہے (Robe of Honor)

غُرور: یہاں مراد 'دھوکہ'، 'فریب' یا 'لالچ میں ڈالنا' ہے

ترجمہ

"(حکیم نے کہا) اس سنار کو اس دور دراز شہر (سمرقند) سے بلاؤ، اور اسے سونا اور شاہی لباس (خلعت) دے کر دھوکے (یا لالچ) میں مبتلا کر دو (تاکہ وہ خوشی خوشی چلا آئے)۔"

اس شعر میں مولانا رومی ایک بہت گہری انسانی کمزوری کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

۱. **انسانی لالچ کا استعمال:** حکیم جانتا ہے کہ وہ سنار اپنی مرضی سے اپنا شہر چھوڑ کر نہیں آئے گا، اس لیے اسے لانے کے لیے "زر اور خلعت" (مال و دولت اور جاہ و حشمت) کا سہارا لینے کا کہا گیا۔ یہ انسانی جبلت ہے کہ انسان مادیت کی چمک دیکھ کر کھنچا چلا آتا ہے۔

۲. **لفظ 'غرور' کی معنویت:** فارسی اور عربی میں 'غرور' کا ایک مطلب **دھوکہ** بھی ہے۔ حکیم یہاں بادشاہ کو "حکمتِ عملی" سکھا رہا ہے کہ اسے یہ احساس دلاؤ کہ بادشاہ تمہاری بڑی قدر کرتا ہے، تاکہ وہ اپنے کمالِ فن کے دھوکے میں آکر یہاں پہنچ جائے۔

اگر ہم اس شعر کے پیغام کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں تو درج ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

۱. **دنیا بطور "متاع الغرور":** "قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی کے لیے یہی لفظ استعمال فرمایا ہے:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ) سورۃ آل عمران:185" (اور دنیا کی زندگی تو صرف دھوکے کا سامان ہے۔ "رومی کا یہ شعر اسی قرآنی حقیقت کی تصویر کشی ہے کہ انسان کیسے مال (زر) اور منصب (خلعت) کے دھوکے (غرور) میں آکر اپنی اصل جگہ چھوڑ دیتا ہے۔

۲. **حکمتِ عملی اور تدبیر:** اسلام میں جنگ یا کسی بڑے مقصد کے لیے ایسی تدبیر اختیار کرنا جو دشمن یا فریقِ مخالف کو اس کی کمزوری کے ذریعے مغلوب کرے، جائز قرار دی گئی ہے۔ (جیسا کہ حدیث میں ہے" :اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ "یعنی جنگ چال کا نام ہے)۔ یہاں حکیم ایک "روحانی سرجری" کر رہا ہے جس کے لیے سنار کا آنا ضروری ہے۔

۳. **نفس کی آزمائش:** یہ شعر ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ جب ہمیں اچانک بغیر محنت کے بہت زیادہ "زر و خلعت" ملنے لگے، تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کہیں یہ ہمارے لیے کوئی آزمائش یا "استدراج" (ڈھیل) تو نہیں ہے۔

مولانا رومی کی مثنوی محض قصہ گوئی نہیں ہے، بلکہ یہ **"کتابِ میثاق "** ہے جہاں ہر کردار ایک علامت ہے۔ ان اشعار کی روحانی اور عرفانی تعبیر (Mystical Interpretation) انسانی نفس کی اصلاح اور معرفتِ الٰہی کے سفر کو ظاہر کرتی ہے۔

ان اشعار میں تین بڑے علامتی کردار ہیں:

1. **بادشاہ :** روحِ انسانی (Spirit) یا طالبِ حق۔
2. **کنیز :** انسانی دل (Heart) یا نفس جو دنیا کی محبت میں بیمار ہے۔
3. **حکیمِ الٰہی :** مرشدِ کامل، عقلِ کل یا وہ الٰہی نور جو انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔
4. **زرگر (سنار) :** دنیاوی لذتیں، مادی مربی، یا وہ باطل معشوق جو ظاہری طور پر چمکدار (سونے کی طرح) نظر آتا ہے مگر اندر سے فانی ہے۔

اس تناظر میں عرفانی تعبیر درج ذیل ہے:

۱. تشخیصِ مرشد (شاہ را آگاہ کرد)

جب انسان (روح) پریشان ہوتا ہے اور اسے سکون نہیں ملتا، تو وہ اللہ کے کسی ولی یا اپنی عقلِ سلیم (حکیم) کی طرف رجوع کرتا ہے۔ حکیم کا "آگاہ کرنا" دراصل **بصیرت** کا کھلنا ہے۔ مرشد روح کو بتاتا ہے کہ تمہارے دل (کنیز) کی بیماری کی وجہ کوئی جسمانی نقص نہیں، بلکہ **تعلق بالغیر** (غیر اللہ کی محبت) ہے۔

باطل کو ظاہر کرنا (حاضر آریم از پِی ایں درد)

عرفانی نکتہ یہ ہے کہ جب تک وہ "دنیاوی معشوق" یا "نفسانی خواہش" سامنے نہ لائی جائے، اس کا علاج ممکن نہیں۔ صوفی کے نزدیک گناہ یا خواہش کو دبانے کے بجائے اس کی **حقیقت کو فاش کرنا** ضروری ہے۔

- حکیم کا اسے حاضر کرنے کا مشورہ دینا دراصل **تزکیہ** کا پہلا قدم ہے: یعنی اس چھپی ہوئی محبت کو ظاہر کرنا تاکہ اس کا کھوٹ سامنے لایا جا سکے۔

۳. دنیا کا فریب (بازر و خلعت بدہ اوراغرور)

یہاں "زرگر" (سنار) دنیا کی علامت ہے۔ سنار سونے کو پگھلاتا ہے اور عارضی چمک پیدا کرتا ہے۔ دنیا بھی فانی چیزوں پر ملمع کاری کر کے ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔

- **عرفانی نکتہ :** اللہ تعالیٰ کبھی کبھی انسان کو دنیا اس لیے بھرپور طریقے سے عطا کر دیتا ہے (زر و خلعت) تا کہ انسان اس کی حقیقت دیکھ لے۔ یہ ایک طرح کا **"استدراج "** ہے کہ انسان کو اس کے باطل معشوق سمیت بلایا جائے تا کہ جب وہ سامنے آئے، تو روح پر یہ واضح ہو جائے کہ جس کی خاطر وہ تڑپ رہی تھی، وہ کتنا بے حقیقت ہے۔

۴ . "غرور" کی صوفیانہ حقیقت

صوفیاء کے نزدیک دنیا **"متاع الغرور "** (دھوکے کا سامان) ہے۔ حکیم کا یہ کہنا کہ اسے "دھوکے (غرور) سے لاؤ" دراصل اللہ کی اس سنت کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت دنیا اپنی ظاہری چمک دکھا کر نفسِ امارہ کو اپنی طرف بلاتی ہے، تا کہ آخر کار بندہ اس کی بے وفائی دیکھ کر سچی توبہ کر سکے۔

خلاصہِ معرفت

روحانی طور پر ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ:

"اے طالبِ حق! تیرے دل کا سکون اس لیے برباد ہے کہ اس نے فانی چیزوں (زرگر) کو اپنا قبلہ بنالیا ہے۔ تیرا مرشد (حکیم) اس فانی دنیا کی حقیقت تجھ پر اس طرح ظاہر کرے گا کہ پہلے وہ چیزیں تجھے ملیں گی، اور پھر ان کا زوال تیرے سامنے ہو گا، تا کہ تیرے دل سے ان کی قدر نکل جائے اور تو حقیقی بادشاہ (خدا) کی طرف لوٹ آئے۔"

مثنوی مولانا—دفتر اوّل—بخش ۹—فرستادنِ پادشاہُ رَسولانُ بہ سَمَرقَند بہ آوردنِ زَرگر

مثنوی مولانا—دفتر اول—بخش ۹—بادشاہ کا قاصدوں کو سمرقند بھیجنا تا کہ زرگر کو لایا جائے

چون کہ سُلطان از حکیم آن راشَنید
پَندِ او را از دل و جان بَر گُزید

مشکل الفاظ کے معنی

چون کہ: جب / چونکہ ۔۔۔۔ سُلطان: بادشاہ، حکمران ۔۔۔ از: سے ۔۔۔ حکیم: دانا، عقلمند، صاحبِ حکمت شخص

آن را: اس بات کو ۔۔۔ شنید: سنا ۔۔۔ پند: نصیحت، خیر خواہی کی بات ۔۔۔ اورا: اس کی

از دل و جان: دل و جان سے، پورے اخلاص کے ساتھ ۔۔۔ بر گزید: قبول کر لیا، اختیار کر لیا

ترجمہ

ا۔ جب سلطان نے حکیم کی وہ بات سنی تو اس کی نصیحت کو دل و جان سے قبول کر لیا۔

۲۔ "چونکہ بادشاہ نے وہ بات (نصیحت) حکیم سے سنی، اس لیے اس نے حکیم کے مشورے کو دل و جان سے قبول کر لیا۔"

یہ شعر مثنوی کے پہلے قصے **"بادشاہ اور کنیز "** سے ماخوذ ہے۔ اس مقام پر مولانا رومی انسانی نفسیات اور روحانی تسلیم و رضا کی ایک بڑی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔

1۔ پس منظر : بادشاہ ایک کنیز کی محبت میں گرفتار تھا جو بیمار ہو گئی تھی۔ دنیاوی طبیب اسے ٹھیک نہ کر سکے۔ پھر اللہ کی طرف سے ایک "حکیم" (روحانی معالج) آیا جس نے تشخیص کی کہ کنیز کی بیماری جسمانی نہیں بلکہ عشق کی ماری ہے اور اس کا علاج اس کے محبوب سے ملوانے میں ہے۔

2۔ تسلیم و رضا : اس شعر میں بادشاہ کے ردِ عمل کو دکھایا گیا ہے۔ عام طور پر بادشاہ انا پرست ہوتے ہیں، لیکن یہاں سلطان نے اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر حکیم کی بات کو محض ایک مشورہ نہیں سمجھا، بلکہ اسے "دل و جان" سے اپنا لیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ جب انسان کو سچی ہدایت ملتی ہے، تو وہ اپنی منطق چھوڑ کر سچائی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔

3۔ روحانی مفہوم : مولانا رومی کے ہاں "سلطان" سے مراد اکثر انسانی روح ہوتی ہے اور "حکیم" سے مراد مرشدِ کامل یا عقلِ سلیم۔ جب انسان اپنی زندگی کے الجھاؤ میں پھنس جاتا ہے اور اسے کسی صاحبِ بصیرت سے رہنمائی ملتی ہے، تو کامیابی اسی میں ہے کہ اس رہنمائی کو بغیر کسی چوں چرا کے قبول کر لیا جائے۔

حاصلِ کلام : یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ شفا اور کامیابی "مان لینے" میں ہے "جان لینے" میں نہیں۔ جب انسان اپنے معالج (چاہے وہ روحانی ہو یا دنیاوی) پر کامل بھروسہ کرتا ہے، تب ہی اس کے حالات کی درستی کی راہ نکلتی ہے۔

مولانا رومی کی مثنوی کے اس شعر کا بنیادی پیغام **حکمت کی تلاش، نصیحت کی قدر اور اہل نظر کی پیروی** ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کے اہم پہلو درج ذیل ہیں:

حکمت اور دانائی کی اہمیت

شعر میں سلطان کا "حکیم" کی بات کو اہمیت دینا قرآن کے اس تصور کی عکاسی کرتا ہے کہ دانائی اللہ کا عظیم عطیہ ہے۔

- **قرآنِ کریم" :** يُؤۡتِى ٱلۡحِكۡمَةَ مَن يَشَآءُۚ وَمَن يُؤۡتَ ٱلۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ أُوتِىَ خَيۡرٗا كَثِيرٗا"

)وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے، اور جسے حکمت مل گئی، اسے بہت بڑی خیر (بھلائی) مل گئی۔ — (**سورۃ البقرہ:269**

- **مفہوم :** جب انسان کو کوئی سچی اور حکمت بھری بات ملے، تو اسے اپنی انا چھوڑ کر اسے قبول کر لینا چاہیے، چاہے وہ اسے کسی عام انسان سے ہی کیوں نہ ملے۔

اہلِ علم اور ماہرین سے رجوع

شعر میں بادشاہ (سلطان) نے جب دیکھا کہ دنیاوی طبیب ناکام ہو گئے، تو اس نے "حکیم" (اہلِ بصیرت) کی طرف رجوع کیا۔ یہ عین قرآنی حکم ہے۔

- **قرآنِ کریم" :** فَاسۡـَٔلُوٓاْ أَهۡلَ ٱلذِّكۡرِ إِن كُنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ"

)پس تم اہلِ ذکر (علم والوں) سے پوچھ لیا کرو اگر تمہیں خود معلوم نہ ہو۔ — (**سورۃ النحل:43**

- **سنتِ نبوی ﷺ :** رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا اور ماہرین کی رائے کو اہمیت دی۔ جنگِ خندق کے موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر خندق کھودنا اس کی بہترین مثال ہے کہ ایک سربراہ (سلطان) نے ایک دانا کی بات کو "دل و جان" سے قبول کیا۔

نصیحت کی قدر (الدین النصیحۃ)

شعر میں ہے کہ سلطان نے "پند" (نصیحت) کو برگزیدہ کیا۔ اسلام میں نصیحت کی اہمیت دین کا ستون ہے۔

- **حدیثِ مبارکہ" :** الدِّينُ النَّصِيحَةُ"

)دین سراسر خیر خواہی اور نصیحت کا نام ہے۔ — (**صحیح مسلم**

- **مفہوم :** ایک سچا مومن وہی ہے جو حق بات اور مخلصانہ مشورے کو فوراً قبول کرے۔ سلطان کا عمل اس صفتِ مومن کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ حق کے سامنے جھک گیا۔

4۔ تکبر کا خاتمہ اور عاجزی

ایک بادشاہ کا ایک حکیم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا "تواضع" (عاجزی) کی انتہا ہے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ بڑا وہ نہیں جو اپنی بات منوائے، بلکہ بڑا وہ ہے جو حق کو تسلیم کرے۔

- **حدیثِ مبارکہ" :** جس نے اللہ کے لیے عاجزی اختیار کی، اللہ اسے بلندی عطا فرماتا ہے۔ — " **صحیح مسلم**

- **مفہوم :** رومی کا سلطان دراصل وہ "روح" ہے جو جب اللہ کے کسی ولی یا دانا کی بات سنتی ہے، تو اپنی بادشاہت (انا) کو پیچھے چھوڑ کر حق کی مرید ہو جاتی ہے۔

حاصلِ کلام : یہ شعر ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ جب آپ کو زندگی کے کسی موڑ پر کوئی ایسی رہنمائی ملے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو اور آپ کے مسائل کا حل ہو، تو اسے **"دل و جان "** سے قبول کرنا ہی دانشمندی ہے۔ یہ عمل انسان کو بھٹکنے سے بچاتا ہے اور کامیابی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

مولانا رومی کے اس شعر کا مرکزی تخیل **"حکمت کی اطاعت "** اور **"نصیحت کی دل و جان سے قبولیت "** ہے۔ قدیم عربی اور فارسی شاعری میں یہ روایت بہت مضبوط رہی ہے کہ ایک طاقتور بادشاہ (سلطان) کا کسی دانا (حکیم) کے سامنے سر جھکا دینا ہی اس کی اصل کامیابی ہے۔

قدیم شعراء کے کلام سے اس کی تشریح درج ذیل ہے:

1۔فارسی شعراء کے کلام سے موازنہ

شیخ سعدی شیرازی (حکمت اور نصیحت کے امام) : سعدی نے نصیحت کی اہمیت اور اسے "دل و جان" سے قبول کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

نصیحت کہ خالی بود از غرض   چو داروی تلخ است دفعِ مرض

وہ نصیحت جو کسی غرض سے پاک ہو، وہ اس کڑوی دوا کی طرح ہے جو بیماری کو جڑ سے ختم کر دیتی ہے۔

رومی کے شعر میں سلطان کا عمل سعدی کے اسی فلسفے کی عملی شکل ہے کہ اس نے دوا (نصیحت) کی کڑواہٹ کے بجائے شفا (مقصود) پر نظر رکھی۔

حافظ شیرازی (پیرِ دانا کی پیروی) : حافظ کے ہاں "حکیم" یا "پیر" کی بات کو بلا چون و چرا ماننا ہی شرطِ راہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

بشنو پند اے پسر وز مخلصِ مے   جوے عزیز کہ از جان دوست تر

دارند جوانانِ سعادتمند   پندِ پیرِ دانا را) اے بیٹے!

مخلص بزرگ کی نصیحت سنو، کیونکہ سعادت مند نوجوان دانا بزرگ کی نصیحت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔)

رومی کا سلطان اسی "سعادت مند" طبقے سے ہے جس نے نصیحت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز جانا۔

2۔قدیم عربی شعراء کے کلام سے موازنہ

عربی شاعری میں "حکمت (Wisdom) "اور "مشورت (Counsel) "کو تلوار کی طاقت پر فوقیت دی گئی ہے۔

متنبی (عظیم عرب شاعر) : متنبی نے عقل اور مشورے کو بہادری پر مقدم قرار دیتے ہوئے کہا:

الرأيُ قبلَ شَجاعَةِ الشُّجعانِ هُوَ أَوّلٌ وَهِيَ المَحلُّ الثّاني) دانا کی رائے، بہادروں کی بہادری سے مقدم ہے۔ رائے پہلے ہے اور شجاعت کا درجہ دوسرا ہے۔(

رومی کے شعر میں سلطان (جو کہ شجاعت اور طاقت کی علامت ہے) نے حکیم کی رائے (رائے / حکمت) کو اپنا کر متنبی کے اسی قول کی لاج رکھی ہے۔

امام شافعی (حکمت اور خاموشی) : قدیم عربی فکر میں نصیحت قبول کرنا "کمالِ عقل" سمجھا جاتا تھا۔ ایک عربی شعر کا مفہوم ہے:

"جس نے نصیحت کو قبول کیا، اس نے سلامت روی کو چن لیا، اور جس نے تکبر کیا، اس نے ٹھوکر کو اپنا مقدر بنایا۔"

3۔ تقابلی خلاصہ (Synthesis)

ان تمام اشعار کا رومی کے شعر سے موازنہ کریں تو تین بڑے نکات سامنے آتے ہیں:

1. **انا کا خاتمہ :** قدیم شعراء کے نزدیک بڑا وہ نہیں جس کے پاس اقتدار ہے، بلکہ بڑا وہ ہے جو حق بات کے سامنے جھک جائے۔ رومی کا سلطان اپنی "انا (Ego) " کو حکیم کی "حکمت" کے تابع کر دیتا ہے۔
2. **خلوصِ نیت (از دل و جان) :** نصیحت صرف کانوں سے سننا کافی نہیں، بلکہ اسے "دل و جان" میں اتارنا ضروری ہے۔ حافظ اور سعدی دونوں نے اسی دلی قبولیت کو "سعادتمندی" کہا ہے۔
3. **حکیم کا مرتبہ :** عربی و فارسی ادب میں حکیم (دانا) کا مرتبہ بادشاہ سے بلند دکھایا گیا ہے، کیونکہ بادشاہ جسموں پر حکومت کرتا ہے اور حکیم روحوں اور عقلوں پر۔

حاصلِ مطالعہ : مولانا رومی کا یہ شعر دراصل **فردوسی** کے اس قدیم ایرانی نظریے کی بازگشت بھی ہے:

توانا بود ہر کہ دانا بود) وہی طاقتور ہے جو دانشمند ہے۔(

سلطان کی اصل طاقت اس کی بادشاہت میں نہیں، بلکہ اس کی اس صلاحیت میں ہے کہ وہ ایک حکیم کی بات کو پہچان سکے اور اسے اپنی زندگی کا حصہ بنا سکے۔

پَس فرستاد آن طَرَف یک دو رَسول

حاذِق آن و کافیانِ بَس عُدول

مشکل الفاظ کے معنی

پَس : پھر، اس کے بعد۔۔۔ **فرستاد :** بھیجا۔۔۔ **آن طَرَف :** اس طرف، اس جانب۔۔۔ **یک دو :** ایک دو

رَسول : قاصد، پیغام پہنچانے والا۔۔۔۔**حاذِ قان :** ماہر، تجربہ کار، عقل مند لوگ۔۔۔۔**کافیان :** قابل اور اہل

بَس : بہت، نہایت۔۔۔۔**عُدول :** عادل لوگ، دیانت دار افراد

ترجمہ : پھر (بادشاہ نے) اس طرف (سمرقند) ایک دو ایسے قاصد بھیجے جو نہایت ہوشیار، باصلاحیت اور بہت معتبر (عادل) تھے۔

اس شعر میں مولانا رومی نے اس حکمتِ عملی کا ذکر کیا ہے جو بادشاہ نے اپنی محبوبہ (کنیز) کے مرض کا علاج کرنے کے لیے اپنائی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ کنیز کی جان سمرقند کے ایک سنار کی یاد میں گھل رہی ہے، تو اس نے اسے زبردستی بلانے کے بجائے **سیاسی اور حکیمانہ راستہ** اختیار کیا۔

اس شعر کے اہم نکات یہ ہیں:

- **دانشمندانہ انتخاب :** بادشاہ نے عام سپاہی نہیں بھیجے، بلکہ "حاذ قان" (ماہرین) کو چنا۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو انسانی نفسیات کو سمجھتے ہوں اور سنار کو باتوں میں لا کر اسے بادشاہ کے دربار تک آنے پر راضی کر سکیں۔
- **باصلاحیت اور معتبر" :** کافیان وعدول" کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ قاصد اپنے کام میں خود مختار تھے اور اتنے سچے تھے کہ بادشاہ ان پر مکمل بھروسہ کر سکتا تھا کہ وہ راستے میں کوئی خیانت نہیں کریں گے۔
- **روحانی اشارہ :** صوفیانہ نقطہ نظر سے، یہاں "بادشاہ" روح کی علامت ہے اور "قاصد" ان الہامی خیالات یا عقلِ سلیم کی علامت ہیں جو انسان کو دنیاوی محبتوں (سنار) کی حقیقت دکھانے اور اسے اصل مقصد کی طرف لانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔

خلاصہ : بادشاہ نے نہایت سوچ سمجھ کر ایسے سفیر روانہ کیے جو اپنی عقل اور سچائی کے زور پر اس سنار کو قائل کر سکیں کہ وہ اپنا شہر چھوڑ کر بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو جائے۔

مولانا رومی کی مثنوی کو "ہست قرآن در زبانِ پہلوی" (فارسی زبان میں قرآن) کہا جاتا ہے۔ اسلامی علوم، بالخصوص **تصوف (احسان)**، **علمِ کلام** اور **اخلاقیات** کی روشنی میں اس شعر کی تشریح نہایت گہری ہے، کیونکہ رومی کے ہاں ہر ظاہری کردار ایک باطنی حقیقت کا عکاس ہے۔

اسلامی علوم کے تناظر میں اس کی جامع تشریح درج ذیل ہے:

۱. تصورِ رسالت اور نیابت (علمِ کلام و سیرت)

شعر میں استعمال ہونے والا لفظ "**رسول** " اسلامی اصطلاح میں پیغام پہنچانے والے کے لیے ہے۔ اسلامی علوم کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جو "رسول" بھیجے، ان میں وہ تمام صفات موجود تھیں جن کا ذکر رومی نے کیا ہے:

- **حاذق (حکمت) :** قرآن فرماتا ہے" :یُؤتِی الحِکمَۃَ مَن یَشَاء "(وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے)۔ رسول کا صاحبِ حکمت ہونا ضروری ہے تاکہ وہ انسانی نفوس کی پیچیدگیوں کو سمجھ سکے۔
- **کافی (باصلاحیت) :** یہ صفتِ "تبلیغ" کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ پیغام پہنچانے کے لیے ہر لحاظ سے مکمل اور اہل ہوں۔
- **عدول (عادل / معتبر) :** حدیث و فقہ کی اصطلاح میں "عادل" وہ ہے جو کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اور جس کی گواہی معتبر ہو۔ انبیاء علیہم السلام "صادق اور امین" ہوتے ہیں، اسی طرح ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے داعی بھی معتبر ہونے چاہئیں۔

تزکیۂ نفس اور روحانی معالجہ (تصوف)

تصوف کی رو سے اس کہانی میں بادشاہ "**روح** " ہے اور قاصد (رسول) "**عقلِ سلیم** " یا "**مرشدِ کامل** " کی علامات ہیں۔

- **حاذقان و کافیان :** صوفیاء کے نزدیک روحانی بیماریوں کا علاج ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے "طبیبِ حاذق" (ماہر معالج) کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح بادشاہ نے سنار کو لانے کے لیے ماہر لوگ بھیجے، اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کو دنیا (سنار) کی محبت سے نکال کر اپنی طرف بلانے کے لیے انبیاء اور اولیاء کو بھیجتا ہے جو انسانی نفسیات کے ماہر ہوتے ہیں۔
- **عدول (اعتدال) :** تصوف میں "عدل" سے مراد قویٰ کا اعتدال ہے۔ یعنی وہ لوگ جو افراط و تفریط سے پاک ہوں اور طالبِ حق کو سیدھی راہ دکھا سکیں۔

دعوت و تبلیغ کے اصول (اخلاقیات و فقہ الدعوہ)

اسلامی علومِ دعوت میں یہ شعر ایک مکمل ضابطہ فراہم کرتا ہے:

- **حکمتِ عملی :** کسی کو حق کی طرف مائل کرنے کے لیے زبردستی کے بجائے ایسے لوگوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو "کافی" (لائق) اور "حاذق" (بات کرنے کا ڈھنگ جانتے) ہوں۔
- **حوالہ :** قرآن کریم کا حکم ہے" :اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ "(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلاؤ)۔ رومی کے "حاذقان" دراصل اسی قرآنی "حکمت" کی عملی تصویر ہیں۔

حاصلِ تشریح (خلاصہ)

اسلامی تناظر میں اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ **مقصد جتنا بڑا ہو، اس کے حصول کے لیے ذرائع (قاصد / وسیلہ) اتنے ہی معتبر اور صاحبِ علم ہونے چاہئیں۔** اللہ تعالیٰ (بادشاہِ حقیقی) جب کسی بندے کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں ایسے خیالات پیدا کرتا ہے جو عقلِ سلیم پر مبنی ہوتے ہیں، یا اسے کسی مرشدِ کامل سے ملوا دیتا ہے جو اسے دنیاوی فریب (سنار) سے نکال کر حقیقتِ باری تعالیٰ سے آشنا کر دیتے ہیں۔

نکتہ : رومی یہاں یہ سمجھا رہے ہیں کہ حق کی طرف بلانے والے کا صرف سچا ہونا کافی نہیں، بلکہ اس کا **صاحبِ بصیرت (حاذق)** ہونا بھی ناگزیر ہے تاکہ وہ مخاطب کے حال کے مطابق تدبیر کر سکے۔

قرآن کریم میں اس حکیمانہ اسلوب اور قاصدوں کے انتخاب کی کئی نظائر (مثالیں) موجود ہیں۔ مولانا رومی کے اس شعر کا ڈھانچہ اور روح خاص طور پر درج ذیل قرآنی واقعات اور آیات سے مماثلت رکھتی ہے:

۱۔ قاصدوں کی تعداد اور ارسال (سورہ یٰسین)

رومی نے کہا: "یک دو رسول" (ایک یا دو قاصد)۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی طرف قاصد بھیجنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ "جب ہم نے ان کی طرف دو (**قاصد**) بھیجے تو انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا، پھر ہم نے تیسرے کے ذریعے (ان کو) قوت دی" (سورہ یٰسین: ۱۴)

رابطہ : جس طرح اللہ نے ہدایت کے لیے باصلاحیت قاصدوں کی جوڑی بھیجی، اسی طرح بادشاہ نے بھی مہم کی کامیابی کے لیے دو ماہرین کا انتخاب کیا۔

قاصدوں کی صفات: قوی اور امین (سورہ القصص)

رومی نے قاصدوں کو "کافیان" (باصلاحیت / قوی) اور "عدول" (معتبر / امین) کہا ہے۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بطورِ قاصد یا کارکن رکھنے کے لیے یہی دو بنیادی صفات بیان کی گئی ہیں:

إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ "بہترین شخص جسے آپ کام پر رکھیں وہ ہے جو **طاقتور (باصلاحیت)** اور **امانت دار** ہو" (سورہ القصص:۲۶)

رابطہ: رومی کے "کافیان" (باصلاحیت) دراصل قرآن کے "القوی" کی تفسیر ہے اور "عدول" (عادل / سچے) قرآن کے "الامین" کا ہم معنی ہے۔ کسی بھی اہم کام کے لیے علمی و عملی قوت اور اخلاقی امانت داری لازمی ہے۔

۳۔ بادشاہ کا قاصد بھیجنا (سورہ یوسف)

مثنوی کے قصے میں بادشاہ نے سنار کو بلانے کے لیے قاصد بھیجے تاکہ وہ اسے دانائی سے قائل کر کے لائیں۔ اس کی بہترین نظیر سورہ یوسف میں ملتی ہے جب مصر کے بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانے سے بلانے کے لیے قاصد بھیجا:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ "اور بادشاہ نے کہا: اسے (یوسف کو) میرے پاس لے آؤ" (سورہ یوسف:۵۰)

رابطہ: یہاں بھی ایک بادشاہ ایک "صاحبِ علم" (حضرت یوسف) کو بلانے کے لیے قاصد روانہ کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ رومی کی کہانی میں سنار کو دنیاوی کشش سے بلایا گیا، جبکہ قرآنی واقعے میں بادشاہ اپنی سلطنت کے مسائل حل کرنے کے لیے ایک "حاذق" (ماہر) شخصیت کا محتاج تھا۔

۴۔ حکمت اور دانائی سے دعوت (سورہ النحل)

رومی کے قاصد "حاذق" (حکمت والے) تھے۔ قرآن نے دعوت و پیغام رسانی کا اصل اصول ہی حکمت کو قرار دیا ہے:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ "اپنے رب کے راستے کی طرف **حکمت** اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلایئے" (سورہ النحل:۱۲۵)

خلاصہ کلام

قرآنی نظائر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ:

1. **تبلیغ و پیغام رسانی** کے لیے ایسے افراد کا انتخاب سنتِ الٰہیہ ہے جو ذہنی طور پر **ماہر (حاذق)** اور اخلاقی طور پر **معتبر (عادل)** ہوں۔

2. ایک سے زائد قاصدوں کا بھیجنا (جیسا کہ سورہ یٰسین میں ہے) مہم کی **تقویت اور گواہی** کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

رومی دراصل انہی قرآنی اصولوں کو تمثیل کی صورت میں بیان کر رہے ہیں کہ جب "روح کا بادشاہ" کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے، تو وہ اپنی صفتِ "حکمت" اور "عدل" کے قاصد اس کی طرف روانہ کرتا ہے۔

مولانا رومی کے اس شعر میں "قاصدوں کے انتخاب" اور ان کی "صفات" کا جو تذکرہ ہے، اسے احادیثِ مبارکہ اور سنتِ نبوی ﷺ کے درج ذیل اصولوں کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

اہل اور لائق افراد کا انتخاب (کافیان و حاذقان)

حدیثِ مبارکہ میں کسی بھی ذمہ داری کے لیے "اہلیت (Competence)" کو بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔

- **حدیث:** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب معاملہ نااہل لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔" (صحیح بخاری)
- **تطبیق:** رومی کے "حاذقان اور کافیان" وہی لوگ ہیں جو اپنے کام کے ماہر اور اہل ہوں۔ بادشاہ نے کسی عام سپاہی کو نہیں بلکہ اس فن کے ماہرین کو بھیجا، جو سنتِ نبوی ﷺ کے عین مطابق ہے کہ جس کا جو کام ہے وہی اسے سرانجام دے۔

۲. جوڑوں کی شکل میں وفد بھیجنا (یک دو رسول)

رومی کا "ایک دو رسول" کہنا اس نبوی طریقہ کار کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جہاں حضور ﷺ اہم مہمات پر اکثر دو صحابہ کو ساتھ روانہ فرماتے تھے تاکہ وہ ایک دوسرے کی مدد اور گواہی دے سکیں۔

- **مثال:** جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن کی طرف روانہ کیا تو انہیں جوڑے کی شکل میں بھیجا۔

- **ہدایت:** آپ ﷺ نے انہیں نصیحت فرمائی" :خوشخبری دینا اور نفرت نہ پھیلانا، آسانی پیدا کرنا اور تنگی میں نہ ڈالنا، اور آپس میں اتفاق رکھنا۔) " صحیح بخاری(
- **تطبیق:** رومی کے قاصد بھی "حاذق" (حکمت والے) تھے جنہوں نے سنار کو ڈرانے کے بجائے "خوشخبری" (بادشاہ کی نوازشات) سنا کر اسے مائل کیا۔

قاصد کی صفات: عقل، حسن اور دیانت (عدول)

رسول اللہ ﷺ جب کسی قاصد کو بھیجتے تو اس کی ظاہری اور باطنی دونوں صفات کا لحاظ رکھتے۔

- **حدیث:** حضور ﷺ کا ارشاد ہے" :جب تم میری طرف کوئی قاصد بھیجو تو اسے خوبصورت چہرے والا اور اچھے نام والا چن کر بھیجو۔) "بزار، طبرانی(
- **تطبیق:** یہاں "خوبصورتی" سے مراد صرف ظاہری حسن نہیں بلکہ کردار کی کشش اور بات کرنے کا ڈھنگ بھی ہے، جسے رومی نے "عدول" (معتبر اور عادل) اور "حاذق" کہا ہے۔ ایک عادل شخص ہی پیغام کو بغیر کسی کمی بیشی کے پہنچا سکتا ہے۔

حکمت اور نفسیاتِ انسانی کا ادراک

رومی کے قاصد "حاذق" (نفسیات کے ماہر) تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے کچھ بندے "موسمین" (بصیرت والے) ہوتے ہیں۔

- **حدیث" :** مومن کی فراست (بصیرت) سے ڈرو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ")ترمذی(
- **تطبیق:** بادشاہ کے قاصدوں نے اسی بصیرت کا استعمال کیا۔ انہوں نے سنار کو یہ نہیں کہا کہ "بادشاہ تمہاری جان لینا چاہتا ہے" یا "کنیز بیمار ہے"، بلکہ اسے تحفے تحائف دکھا کر اس کی رغبت (Desire) کو اپیل کیا۔ یہ وہی حکمت ہے جسے اسلام "حکمتِ عملی" کہتا ہے۔

روحانی نتیجہ : جس طرح اللہ کے رسول ﷺ انسانیت کو دنیا کے دھوکے (سنار) سے نکال کر اللہ کی محبت (بادشاہ) کی طرف بلانے کے لیے "حکمت اور موعظہ حسنہ" کا استعمال کرتے ہیں، رومی بھی اسی نبوی طریقے کو انسانی اصلاح کے لیے بہترین ماڈل قرار دے رہے ہیں.

تا سَمَرقَند آمدند آن دو امیر

پیشِ آن زَر گر زِ شاہنشَہ بَشیر

مشکل الفاظ

تا : یہاں تک، جب تک.....۔ **سمرقند** : ماوراء النہر کا مشہور تاریخی شہر (ازبکستان میں)۔۔۔۔ **آمدند** : آئے

دوامیر : دو سردار یا معتبر آدمی۔۔۔۔ **پیش** : سامنے، پاس۔۔۔ **زرگر** : سنار، سونے کا کام کرنے والا۔۔۔ **زِ** : سے

شاہنشہ : بادشاہوں کا بادشاہ، عظیم بادشاہ۔۔۔۔ **بشیر** : خوشخبری دینے والا، پیغام لانے والا

ترجمہ: پس وہ دونوں امیر (بادشاہ کے قاصد) سمرقند پہنچے اور اس سنار کے پاس بادشاہ کی طرف سے خوشخبری دینے والے بن کر حاضر ہوئے۔

یہ شعر ایک حکایتی سلسلے کا حصہ ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے دو قابل اور معتمد آدمیوں کو ایک خاص مقصد کے لئے بھیجا۔ وہ دونوں سفر کرتے ہوئے سمرقند پہنچے جہاں ایک زرگر (سنار) رہتا تھا۔

بادشاہ نے انہیں اس سنار کے پاس اس انداز میں بھیجا کہ وہ بشیر یعنی خوشخبری دینے والے بن کر اس کے سامنے جائیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سنار کو یہ محسوس ہو کہ بادشاہ اس سے راضی ہے اور اسے کوئی بڑا انعام یا عزت دینے والا ہے۔

حقیقت میں اس تدبیر کے پیچھے ایک حکمت تھی۔ بادشاہ نے حکیم کے مشورے سے یہ چال چلی تھی تاکہ سنار کو بغیر شک و شبہ کے دربار میں بلایا جاسکے۔ اگر اسے اصل حقیقت معلوم ہوتی تو شاید وہ آنے سے انکار کر دیتا۔ اس لئے سفیروں کو ہدایت دی گئی کہ وہ اس کے سامنے خوشخبری دینے والے کی حیثیت سے پیش ہوں۔

اس شعر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ:

- **بعض اوقات کسی مقصد کے حصول کے لئے حکمت اور تدبیر سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔**
- **بادشاہ کے قاصد نہایت سمجھداری سے اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔**
- **بڑے فیصلوں میں حکیمانہ منصوبہ بندی اہم کردار ادا کرتی ہے۔**

حکمت اور نکتہ آفرینی:

دنیاوی پہلو: یہاں یہ دکھایا گیا ہے کہ جب کسی کو کسی مقصد کے لیے آمادہ کرنا ہو، تو حکمتِ عملی اور خوش اخلاقی (بشارت) کا سہارا لیا جاتا ہے۔ سنار اپنی خوش فہمی اور لالچ میں آکر ان قاصدوں کی باتوں میں آ گیا۔

روحانی پہلو: صوفیانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سنار "نفسِ امارہ" یا "دنیاوی لذت" کی علامت ہے، جو ظاہری چمک دمک اور اعزازات کے دھوکے میں آکر اپنی اصل حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ بلاوا دراصل اس کی موت کا پیغام ہے (کیونکہ کہانی کے آخر میں اسے زہر دے کر مار دیا جاتا ہے تاکہ کنیز کا عشقِ مجازی ختم ہو کر عشقِ حقیقی میں بدل جائے)۔

حاصلِ کلام:

یہ شعر کہانی کے اس اہم موڑ کی نشاندہی کرتا ہے جہاں انسانی تدبیر (بادشاہ کی حکمتِ عملی) اپنا کام شروع کرتی ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اکثر جس چیز کو اپنے لیے خوشخبری اور کامیابی سمجھ رہا ہوتا ہے، بسا اوقات وہی اس کے انجام کا آغاز ہوتی ہے۔

اس شعر اور اس کے پسِ منظر (سنار کو دھوکے سے لانا اور پھر اس کا انجام) کو قرآن و سنت کے ترازو میں تولا جائے تو چند اہم پہلو سامنے آتے ہیں:

دنیا کی بے ثباتی اور "متاعِ غرور"

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ)سورہ آل عمران:185" (اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔"

اس واقعے میں وہ **"دو امیر "** جو **"بشیر "**(خوشخبری دینے والے) بن کر گئے، وہ دراصل اس دنیاوی چمک دمک کی علامت ہیں جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ سنار کو شاہی دربار، سونے اور منصب کا لالچ دیا گیا۔ قرآن و سنت کی روشنی میں یہ سبق ملتا ہے کہ انسان اکثر ظاہری فائدے کو "خوشخبری" سمجھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے، حالانکہ وہ اس کے نفس کی ہلاکت کا سبب بھی ہو سکتا ہے۔

تدبیرِ الٰہی بمقابلہ انسانی تدبیر

اس واقعے میں بادشاہ نے ایک تدبیر کی تاکہ کنیز کی جان بچ سکے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کو بہترین قرار دیا گیا ہے:

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ) سورہ الانفال:30" (وہ (اپنی) چالیں چلتے تھے اور اللہ (اپنی) تدبیر فرماتا تھا، اور اللہ بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔"

سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جب کسی بندے کو عشقِ مجازی (فانی چیزوں کی محبت) سے نکال کر عشقِ حقیقی کی طرف لانا مقصود ہو، تو اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ وہ فانی سہارے (جیسے سنار کا حسن اور مال) ختم ہو جائیں۔

قصہ خضرؑ اور لدنی حکمت (باطنی پہلو)

اس کہانی کے اگلے حصے میں جب سنار کو قتل کیا جاتا ہے، تو عام ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ یہ تو ناانصافی ہے۔ مولانا روم خود اس کا جواب قرآن سے دیتے ہیں۔ وہ اسے **حضرت خضر علیہ السلام** کے اس عمل سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں انہوں نے ایک بچے کو قتل کر دیا تھا (سورہ الکہف)۔

- **قرآنی نکتہ :** حضرت خضرؑ کا عمل بظاہر شر تھا، لیکن باطنی طور پر وہ اللہ کے حکم سے ایک بڑے فتنے کو روکنے کے لیے تھا۔
- **تشریح :** سنار کا قتل دراصل "نفسِ امارہ" کے قتل کی علامت ہے۔ جب تک انسان کی توجہ غیر اللہ (سنار) کی طرف رہے گی، وہ اللہ (بادشاہ / حقیقی محبوب) کی طرف رجوع نہیں کر سکے گا۔

آزمائش اور فتنہ

حدیثِ نبوی ﷺ کے مطابق:

"ہر امت کے لیے ایک فتنہ (آزمائش) ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔) "جامع ترمذی(

سنار کے پاس جب وہ دو امیر آئے، تو یہ اس کے لیے ایک **آزمائش** تھی۔ اسے اپنے فن پر ناز تھا اور وہ مزید مال و جاہ کا طلبگار تھا۔ قرآن و سنت کے مطابق، جب انسان اللہ کی عطا کردہ نعمت (فن یا حسن) کو اپنی بڑائی سمجھنے لگتا ہے اور اس پر اتراتا ہے، تو زوال اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

حاصلِ بحث

قرآن و سنت کی روشنی میں اس واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1. **ظاہر پر فیصلہ نہ کریں:** جو قاصد "بشیر" بن کر آئے تھے، وہ سنار کے لیے "نذیر" (ڈرانے والے) ثابت ہوئے۔
2. **باطنی اصلاح:** بعض اوقات اللہ تعالیٰ انسان سے اس کی محبوب چیز چھین لیتا ہے تا کہ اسے اپنی ذات سے جوڑ دے۔ یہ بظاہر غم ہے، لیکن حقیقت میں رحمت ہے۔
3. **حکمتِ عملی:** حق تک پہنچنے کے لیے صوفیاء کے نزدیک "حکمتِ عملی" (جیسے بادشاہ نے قاصد بھیجے) جائز ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد رضائے الٰہی اور نفس کی اصلاح ہو۔

اخلاقی نقطہ نظر سے اس شعر اور اس کے پسِ منظر میں انسانی رویوں، نیتوں اور نتائج کا ایک گہرا سمندر چھپا ہوا ہے۔ مولانا روم نے ان دو امیروں (قاصدوں) کے ذریعے اخلاقیات کے چند ایسے پہلو اجاگر کیے ہیں جو ہر دور کے انسان کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

اسے ہم درج ذیل اخلاقی عنوانات کے تحت دیکھ سکتے ہیں:

حرص اور طمع کا انجام (عاقبت نااندیشی)

اخلاقی لحاظ سے یہ سنار کے کردار پر ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ جب قاصد "بشیر" (خوشخبری دینے والے) بن کر آئے، تو سنار نے صرف **ظاہری فائدے**، شاہی قربت اور مال و دولت کو دیکھا۔

- **اخلاقی سبق:** انسان جب لالچ میں اندھا ہو جاتا ہے، تو اس کی بصیرت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ ایک اجنبی اسے اتنی بڑی خوشخبری کیوں دے رہا ہے۔ اخلاقیات ہمیں سکھاتی ہیں کہ غیر متوقع "بشارتوں" پر فوراً ایمان لانے سے پہلے حقائق کو پرکھنا چاہیے۔

.2 دھوکہ دہی بمقابلہ حکمتِ عملی (Ethical Deception)

یہاں ایک بڑا اخلاقی بحث طلب پہلو یہ ہے کہ کیا کسی کو دھوکے سے (خوشخبری دے کر) بلانا درست ہے؟

- **توجیہ:** رومی کے نزدیک یہ "دھوکہ" نہیں بلکہ **"جراحی (Surgery)"** ہے۔ جس طرح ایک ڈاکٹر مریض کو کڑوی دوا میٹھی گولی میں چھپا کر دیتا ہے، اسی طرح ان امیروں کا "بشیر" بننا اس بیمار روح (سنار) کو اس کے انجام تک پہنچانے کی ایک تدبیر تھی۔
- **اخلاقی اصول:** اگر مقصد بہت بڑا اور خیر پر مبنی ہو (جیسے انسانی جان بچانا یا کسی کی روحانی اصلاح کرنا)، تو وہاں ظاہری حکمتِ عملی اختیار کرنا اخلاقاً جائز سمجھا جاتا ہے، بشرطیکہ اس میں ذاتی عناد نہ ہو۔

.3 خوشامد اور خود پسندی کی قیمت

سنار ان قاصدوں کی باتوں میں اس لیے آیا کیونکہ اسے اپنی فنکاری پر ناز تھا۔ اسے لگا کہ وہ واقعی اس قدر عظیم ہے کہ بادشاہ اسے بلا رہا ہے۔

- **اخلاقی نکتہ:** **خوشامد (Flattery)** وہ ہتھیار ہے جس سے بڑے بڑے دانا لوگ مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی طور پر یہ شعر ہمیں خبردار کرتا ہے کہ جب کوئی آپ کی حد سے زیادہ تعریف کرے، تو وہ مقامِ فخر نہیں بلکہ مقامِ فکر ہے۔

.4 امانت اور دیانت (قاصدوں کا کردار)

ان دو امیروں نے اپنے بادشاہ کے حکم کی مکمل تعمیل کی۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں اتنی مہارت دکھائی کہ سنار کا دل جیت لیا۔

- **اخلاقی پہلو :** ایک وفادار کارکن یا قاصد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے بہترین طریقہ کار اختیار کرے۔ انہوں نے کوئی جبر نہیں کیا، بلکہ زبان کے شیریں استعمال سے اپنا مقصد حاصل کیا۔ یہ **"حسنِ تدبیر "** کا اخلاقی درس ہے۔

یہ شعر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کے فیصلے کرتے وقت **ظاہری چمک دمک** کے بجائے **باطنی حقیقت** پر نظر رکھنی چاہیے۔ سنار نے سمرقند چھوڑا تو اسے لگا کہ وہ بادشاہ بننے جا رہا ہے، جبکہ وہ اپنی موت کی طرف جا رہا تھا۔

کِی لَطیفُ اُستادِ کامِلُ مَعرِفَت
فاش اَندَر شہرہا از توصِفَت

مشکل الفاظ کے معنی

کِی = کون۔۔۔ لطیف = نرم خو، باریک فہم، صاحبِ لطافت۔۔۔۔ اُستادِ کامل = کامل وماہر استاد۔۔۔ معرفت = پہچان، عرفان، اللہ کی شناخت۔۔۔ فاش = ظاہر، آشکار۔۔۔ اندر شہرہا = شہروں میں۔۔۔ از تو = تجھ سے / تیری۔۔۔ صفت = خوبی، تعریف، وصف

ترجمہ

آپ معرفتِ الٰہی کے کتنے ہی لطیف اور کامل استاد ہیں کہ آپ کی صفات اور خوبیوں کا چرچا تمام شہروں میں عام ہو چکا ہے (یعنی ہر کوئی آپ کی بزرگی کا معترف ہے)۔

مولانا روم کا یہ شعر محض ایک روایتی تعریف نہیں ہے، بلکہ یہ **طریقت اور معرفت** کے ایک گہرے راز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی علمی و روحانی تشریح درج ذیل نکات میں سموئی جا سکتی ہے:

لفظ "لطیف" کی علمی گہرائی

علمی اعتبار سے **لطیف** کا مادہ "لطافت" ہے۔ روحانیت میں لطیف اس ہستی کو کہتے ہیں جس کا نفس کثافت (مادیت، انا، غصہ، لالچ) سے پاک ہو کر نور بن چکا ہو۔

- **روحانی پہلو :** مولانا یہاں اشارہ کر رہے ہیں کہ ایک کامل استاد کا کلام اور اس کی تربیت اتنی "لطیف" ہوتی ہے کہ وہ مرید کے دل پر بوجھ نہیں بنتی بلکہ نسیمِ صبح کی طرح روح میں اتر جاتی ہے۔

استادِ کاملِ معرفت "کا تصور

رومی کے نزدیک معرفت صرف کتابی علم (Information) کا نام نہیں، بلکہ **تجربہ اور مشاہدہ** (Transformation) ہے۔

ایک "کامل" استاد وہ ہے جو خود منزلِ مقصود (خدا) تک پہنچ چکا ہو۔ علمی لحاظ سے اسے **"انسانِ کامل "** کہا جاتا ہے۔ وہ مرید کے باطن کے اندھیروں کو جانتا ہے اور اسے " قال" (باتوں) سے نکال کر " حال" (کیفیت) میں لے جاتا ہے۔

فاش اندر شہرہا"

(ظہورِ صفات)

یہاں ایک بہت بڑا روحانی قاعدہ بیان ہوا ہے " **:الکمالُ لا یُخفیٰ** "(کمال چھپتا نہیں ہے)۔

- **روحانی نکتہ :** جب کسی انسان کے اندر اللہ کی صفات کا نور جھلکنے لگتا ہے، تو اسے اپنی تشہیر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جیسے عطر اپنی خوشبو سے پہچانا جاتا ہے، ویسے ہی ایک کامل عارف کی "صفت" (اس کا اخلاق، اس کا نور، اس کی تاثیر) خود بخود شہروں اور دلوں میں پھیل جاتی ہے۔
- یہ اس آیت کی ترجمانی ہے کہ جب اللہ کسی سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو حکم دیتا ہے کہ زمین والوں کے دلوں میں اس کی مقبولیت ڈال دو۔

مولانا روم اس شعر میں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ:

سچی روحانیت وہ ہے جو انسان کو اندر سے اتنا شفاف (لطیف) کر دے کہ اس کی شخصیت سے خیر اور معرفت کی شعاعیں خود بخود پھوٹنے لگیں۔ جب کوئی استاد معرفت کے کمال کو پہنچ جاتا ہے، تو کائنات کی ہر چیز اس کی گواہی دینے لگتی ہے اور اس کا فیض کسی ایک جگہ قید رہنے کے بجائے "فاش" (عام) ہو جاتا ہے۔

یہ شعر غالباً حضرت **شمس تبریز** کی شان میں ہے، جن کی آمد نے مولانا کی زندگی میں وہ انقلاب برپا کیا کہ ان کا چرچا صدیوں بعد بھی "فاش اندر شہرہا" ہے۔

مولانا روم کا یہ شعر محض ایک شاعرانہ مبالغہ نہیں، بلکہ یہ قرآن و سنت کے ان عمیق حقائق کی عکاسی کرتا ہے جو **تزکیہ، احسان اور ولایت** سے متعلق ہیں۔ اس کی پر مغز تشریح درج ذیل قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں کی جاسکتی ہے:

لطیف" کی حقیقت: تزکیہ اور اخلاقِ الٰہی

شعر میں استاد کو **"لطیف "** کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت **"اللطیف "** ہے (سورۃ الانعام: 103)۔

- **علمی نکتہ :** صوفیائے کرام کے نزدیک بندہ جب تزکیہِ نفس کے ذریعے اپنی کثافتوں (حسد، کبر، حرص) کو ختم کر دیتا ہے، تو اس کے اندر "لطافت" پیدا ہو جاتی ہے۔
- **سنت کا حوالہ :** رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سراپا لطافت تھی۔ قرآن فرماتا ہے " **:فبما رحمة من الله لنت لهم** " (پس اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لیے نرم / لطیف ہو گئے)۔ ایک کامل استاد وہی ہے جس کا اخلاق اتنا لطیف ہو کہ وہ سخت سے سخت دل کو موم کر دے۔

استادِ کاملِ معرفت": وراثتِ انبیاء کا تسلسل

مولانا جس "کامل استاد" کی بات کر رہے ہیں، وہ دراصل **"العلماء ورثة الانبياء "** (علماء انبیاء کے وارث ہیں) کا مظہر ہے۔

- **قرآنی بنیاد :** سورۃ الکہف میں حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا" **:وعلمناه من لدنا علما** "(اور ہم نے اسے اپنے پاس سے علمِ لدنی عطا کیا)۔ معرفت کا استاد وہی ہے جس کا علم صرف کتابی نہ ہو بلکہ "لدنی" (منجانب اللہ) ہو۔
- **روحانی پہلو :** معرفت کا مطلب ہے اللہ کو پہچاننا۔ حدیثِ احسان میں ہے " : تم اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو"۔ جو اس مقامِ مشاہدہ پر فائز ہو، وہی "کاملِ معرفت" کہلانے کا حقدار ہے۔

" .3 فاش اندر شہرہا": مقبولیتِ عامہ اور سنتِ الٰہی

شعر کا دوسرا مصرعہ کہ "آپ کی صفت شہروں میں فاش (مشہور) ہو گئی"، ایک عظیم نبوی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

- **حدیثِ قدسی :** صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے، تو جبریلؑ کو فرماتا ہے: "میں فلاں سے محبت کرتا ہوں، تم بھی کرو"۔ پھر آسمان والے محبت کرتے ہیں، اور آخر کار **"یوضع له القبول فی الارض "** (زمین والوں کے دلوں میں اس کی مقبولیت ڈال دی جاتی ہے)۔

جب ایک صاحبِ معرفت کا باطن اللہ کے نور سے بھر جاتا ہے، تو وہ نور چھپائے نہیں چھپتا۔ اسے اشتہار بازی کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ اللہ خود اس کی "صفت" کو دلوں میں اتار دیتا ہے۔ یہی وہ "فاش" ہونا ہے جس کا ذکر مولانا کر رہے ہیں۔

علمِ نافع اور تاثیر

استادِ کامل کی صفت کا "فاش" ہونا اس کے **"علمِ نافع "** کی دلیل ہے۔

- **دعاِ نبوی :** رسول اللہ ﷺ ہمیشہ "علمِ نافع" کی دعا مانگتے تھے۔ ایسا علم جو صرف زبان تک نہ رہے بلکہ سینوں میں اتر کر معاشرے کی اصلاح کرے۔ مولانا کے نزدیک استادِ کامل کی شہرت اس کے علمی رعب کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کے کردار کی اس خوشبو کی وجہ سے ہے جو شہر شہر پھیل چکی ہے۔

نَک فُلان شَہ از برائے زَرگری

اِختیارت کرد، زیرا مِہتَری

مشکل الفاظ کے معنی

نک = دیکھو، سنو، خبر دار۔۔۔۔ فُلان شَہ = کوئی بادشاہ / ایک خاص بادشاہ۔۔۔۔ بِرائے = کے لیے

زَرگری = سنار کا کام، سونے کا پیشہ۔۔۔۔ اِختیارت کرد = تمہیں منتخب کیا، چن لیا۔۔۔۔ زیرا = کیونکہ

مِہتَری = برتری، فضیلت، قابلیت

ترجمہ

"دیکھ! اس (عظیم) بادشاہ نے تجھے 'زرگری' (یعنی سونا پرکھنے اور اسے نکھارنے) کے لیے منتخب کیا ہے، کیونکہ تو صاحبِ فضیلت اور بزرگی والا (جوہرِ قابل) ہے۔"

اس شعر کی تشریح میں مولانا روم انسانی وجود کی اصل حقیقت اور اس کی اصلاح کے عمل کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرتے ہیں:

انتخابِ الٰہی

1. (Divine Selection): مولانا فرماتے ہیں کہ انسان کو اس کائنات میں یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے (جو حقیقی بادشاہ ہے) انسان کو ایک خاص مقصد کے لیے چنا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: **"وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي** "(اور میں نے تجھے خاص اپنی ذات کے لیے تیار کیا ہے - سورہ طٰہٰ: ۴۱)۔ یہ شعر اسی قرآنی تصور کی عکاسی کرتا ہے کہ بندے کا انتخاب اس کی اندرونی استعداد کی بنا پر کیا گیا ہے۔

۲" . **زرگری"کا استعارہ:** (Spiritual Alchemy) زرگر (سنار) کا کام کھوٹے اور کھرے سونے میں فرق کرنا اور سونے کو آگ میں تپا کر کندن بنانا ہے۔

- **روحانی پہلو:** مرشدِ کامل یا حق تعالیٰ جب کسی بندے کو چنتے ہیں، تو اسے آزمائشوں، مجاہدوں اور ذکر و فکر کی "آگ" سے گزارتے ہیں۔ یہ "زرگری" کا عمل اس لیے ہوتا ہے تاکہ انسان کے اندر سے "خودی"، "تکبر" اور "مادیت" کا کھوٹ نکل جائے اور اس کی روح خالص سونا بن جائے۔

۳" . **مہتری" (بنیادی قابلیت):** اللہ یا اس کا ولی کسی کو کیوں چنتا ہے؟ مولانا کہتے ہیں کہ **"زیرا مہتری "**یعنی تیرے اندر وہ بیج، وہ بڑائی اور وہ جوہر موجود ہے جسے نکھارنے کی ضرورت ہے۔ اگر پتھر میں ہیرا بننے کی صلاحیت نہ ہو تو جوہری اس پر محنت نہیں کرتا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ہر انسان کے اندر "نفخت فیہ من روحی" (میں نے اس میں اپنی روح پھونکی) کا ایک حصہ موجود ہے، جو اسے تمام مخلوقات پر "مہتری" (برتری) عطا کرتا ہے۔

۴ . **تزکیہ اور تربیت:** یہ شعر طالبِ حق کو یہ تسلی دیتا ہے کہ اگر تجھ پر کٹھن وقت آئے یا تجھے سخت روحانی تربیت سے گزرنا پڑے، تو گھبرانا نہیں؛ کیونکہ یہ اس "بادشاہ" کا انتخاب ہے جو تجھے عام مٹی سے نکال کر "خالص سونا" بنانا چاہتا ہے۔

یہ شعر خود آگاہی کا سبق دیتا ہے کہ تم معمولی نہیں ہو، تمہیں ایک عظیم فنکار (خدا) نے ایک عظیم مقصد (معرفت) کے لیے چنا ہے، اور تمہاری یہ تربیت تمہاری اسی اندرونی بڑائی کی وجہ سے ہے جو تمہارے خالق نے تمہارے اندر رکھی ہے۔

مولانا رومؒ نے "زرگری" (سونا ڈھالنے) کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ سونا تب تک قیمتی اور خالص نہیں ہوتا جب تک اسے بھٹی کی آگ میں تپایا نہ جائے۔

- **قرآن کریم میں فرمایا**
- **"لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا "**
- (تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل میں کون بہتر ہے - سورہ الملک:2)۔
- نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے:

حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ، حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ، عَنْ عَاصِمِ بْنِ بَهْدَلَةَ، عَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَيُّ النَّاسِ أَشَدُّ بَلَاءً؟ قَالَ: " الْأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الْأَمْثَلُ، فَالْأَمْثَلُ، فَيُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَإِنْ كَانَ دِينُهُ صُلْبًا اشْتَدَّ بَلَاؤُهُ، وَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ رِقَّةٌ ابْتُلِيَ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَمَا يَبْرَحُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ حَتَّى يَتْرُكَهُ يَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ مَا عَلَيْهِ خَطِيئَةٌ "، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ، وفی الباب عن أَبِي هُرَيْرَةَ، وَأُخْتِ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ أَيُّ النَّاسِ أَشَدُّ بَلَاءً؟ قَالَ: الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ.

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! سب سے زیادہ مصیبت کس پر آتی ہے؟ آپ نے فرمایا: ”انبیاء و رسل پر، پھر جو ان کے بعد مرتبہ میں ہیں، پھر جو ان کے بعد ہیں، بندے کی آزمائش اس کے دین کے مطابق ہوتی ہے، اگر بندہ اپنے دین میں سخت ہے تو اس کی مصیبت بھی سخت ہوتی ہے اور اگر وہ اپنے دین میں نرم ہوتا ہے تو اس کے دین کے مطابق مصیبت بھی ہوتی ہے، پھر مصیبت بندے کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہے، یہاں تک کہ بندہ روئے زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا“۔

- امام ترمذی کہتے ہیں:

- یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس باب میں ابو ہریرہ اور حذیفہ بن یمان کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ مصیبتیں کس پر زیادہ آتی ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انبیاء ورسل پر پھر جو ان کے بعد مرتبہ میں ہیں پھر جو ان کے بعد میں ہوں“۔[سنن ترمذي / كتاب الزهد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم / حدیث: 2398]

”زرگری“ دراصل **تزکیہ نفس** ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ بندوں کو دکھوں، تکلیفوں اور مجاہدوں کی "آگ" میں اس لیے ڈالتا ہے تاکہ ان کے اندر سے انا، تکبر اور حرص کا کھوٹ نکل جائے اور وہ "خالص سونا" (کُندن) بن جائیں۔ یہ "زرگری" بندے کو توڑنے کے لیے نہیں بلکہ اسے قیمتی بنانے کے لیے ہوتی ہے۔

"مہتری" اور تکریمِ آدم (Human Excellence)

مصرعہ "زیرا مہتری" (کیونکہ تو صاحبِ فضیلت ہے) انسان کی اس بنیادی قدر کی طرف اشارہ ہے جو اللہ نے روزِ ازل اسے عطا کی۔

- **قرآن مجید میں بیان ہوا**

- " **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ** " (اور ہم نے یقیناً بنی آدم کو عزت و تکریم عطا کی - سورہ الاسراء: 70)۔ نیز فرمایا: "**وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ** " (اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا - سورہ التین: 4)۔

- اللہ تعالیٰ ہر کسی کو "زرگری" کے عمل سے نہیں گزارتا، بلکہ اسے چنتا ہے جس میں "مہتری" (بزرگی یا جوہرِ قابل) موجود ہو۔ یہ جوہر وہ "روح" ہے جو اللہ نے انسان میں پھونکی۔ رومی کے نزدیک انسان مٹی کا ڈھیر نہیں بلکہ ایک چھپا ہوا خزانہ ہے، اور اللہ (جو حقیقی بادشاہ ہے) اس خزانے کو ظاہر کرنے کے لیے اسے تربیت دیتا ہے۔

صبغتہ اللہ (اللہ کا رنگ)

زرگر جب سونے کو ڈھالتا ہے تو اسے ایک نئی اور خوبصورت شکل دے دیتا ہے۔

- **ارشاد ہوا**

- " صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً "
- (اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہو گا؟-سورہ البقرہ:138)۔
- مولانا رومیؒ یہ سمجھا رہے ہیں کہ جب تم بادشاہ (خدا) کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور دے دیتے ہو، تو وہ تمہیں اپنی صفات کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ تمہارا "اختیار" کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اب تم پر اللہ کی خصوصی کاریگری (زرگری) شروع ہو چکی ہے تاکہ تمہاری روح اپنی اصل چمک حاصل کر سکے۔

حاصلِ کلام: یہ شعر بندۂ مومن کو یہ حوصلہ دیتا ہے کہ زندگی کی سختیاں اور روحانی تربیت کی دشواریاں دراصل اللہ کی "محبت کے نشانات" ہیں۔ اگر تم پر آزمائش سخت ہے، تو سمجھ لو کہ "زرگر" تمہیں بہت قیمتی بنانا چاہتا ہے کیونکہ اس نے تمہارے اندر وہ "مہتری" (قابلیت) دیکھ لی ہے جو دوسروں میں نہیں ہے۔

اینک این خِلْعَتِ بگیر و زَرّ و سیم

چون بیایی، خاص باشیّ و نَدیم

مشکل الفاظ کے معنی

اینک = یہ لو، ابھی، فوراً۔۔۔**خِلْعَت** = خلعت، یعنی بادشاہ کی طرف سے دیا گیا انعامی لباس۔۔۔**بگیر** = لے لو۔۔۔

زَرّ = سونا۔۔۔**سیم** = چاندی۔۔۔۔**چون** = جب۔۔۔**بیایی** = تم آؤ۔۔۔**خاص باشیّ** = خاص بنو گے، مقرب ہو جاؤ گے۔۔۔**نَدیم** = ہم نشین، قریبی ساتھی، درباری مصاحب

ترجمہ

"یہ خلعت اور سونا چاندی لے لو، جب تم (واپس) آؤ گے تو خاص (مقرب) اور میرے ہم نشین بن جاؤ گے۔"

یعنی

"(قاصد نے زرگر سے کہا:) یہ لو، یہ شاہی لباس (خلعت) اور سونا چاندی سنبھالو؛ اور جب تم (ہمارے ساتھ) چلو گے تو وہاں بادشاہ کے خاص مقرب اور ہم نشین بن جاؤ گے۔"

قاصد زرگر کے پاس جا کر اسے سونا، چاندی اور شاہی لباس دکھاتا ہے۔ وہ اسے یہ باور کراتا ہے کہ تمہارے فن کی شہرت بادشاہ تک پہنچی ہے اور وہ تمہاری قدر دانی کرنا چاہتا ہے۔ یہ شعر اس انسانی نفسیات کی عکاسی کرتا ہے کہ انسان دولت اور جاہ و منصب (سونا، چاندی اور بادشاہ کی قربت) کا بہت جلد اسیر ہو جاتا ہے۔ زرگر اس ظاہری چمک دمک کو دیکھ کر دھوکا کھا جاتا ہے اور اپنا شہر چھوڑ کر چلنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

باطنی و تمثیلی پہلو (نفس کی کشش):

مولانا روم یہاں ایک گہرا سبق دے رہے ہیں۔ زرگر یہاں "**نفسِ امارہ** "یا" **دنیاوی خواہشات** "کی علامت ہے۔

- **خلعت اور زر و سیم :** یہ دنیا کی رنگینیاں اور عارضی لذتیں ہیں جو انسان کو اپنی اصل (حقیقت) سے دور لے جانے کے لیے جال کا کام کرتی ہیں۔
- **ندیم ہونا :** یہ اس جھوٹی امید کی علامت ہے جو دنیا انسان کو دیتی ہے کہ تو یہاں کا سردار بنے گا، جبکہ انجام کار (جیسا کہ قصے میں ہوتا ہے) وہ زرگر اپنی موت کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔

صوفیانہ نکتہ : مولانا یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ انسان کو کسی آزمائش یا کسی خاص مقصد کے لیے "عطا" کے ذریعے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن اس مخصوص واقعے میں، یہ پیغام ہے کہ دنیاوی جاہ و حشمت کے پیچھے چھپے ہوئے انجام سے بے خبر نہیں ہونا چاہیے۔ جو چیز بظاہر "خلعت" (عزت) نظر آتی ہے، اگر وہ اللہ کے لیے نہ ہو تو وہ "ہلاکت" کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

حاصلِ کلام : یہ شعر فریبِ دنیا اور انسانی حرص کی تصویر کشی کرتا ہے کہ کس طرح انسان تھوڑی سی مادی منفعت اور سستی شہرت کے بدلے اپنا سب کچھ چھوڑ کر نامعلوم راستوں پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔

مولانا رومؒ کی مثنوی کے اس شعر کو اگر قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھا جائے، تو یہ **حبِ دنیا (دنیا کی محبت)**، **فتنۂ مال** اور **انسانی نفس کی کمزوری** کی ایک بہترین تمثیل بن کر سامنے آتا ہے۔ مولانا روم کا کلام دراصل قرآن و حدیث ہی کی منظوم تشریح ہوتا ہے۔

اس شعر کی قرآن و سنت کی روشنی میں تشریح درج ذیل نکات میں واضح کی جاسکتی ہے:

فریبِ دنیا اور متاعِ غرور

شعر میں "خلعت" (عمدہ لباس) اور "زر و سیم" (سونا چاندی) دراصل ان دنیاوی لذتوں کی علامت ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں کیا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ"... لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت (جیسے) عورتیں، بیٹے، اور **سونے چاندی کے جمع کیے ہوئے ڈھیر** ... مزین کر دیے گئے ہیں۔" (سورہ آل عمران:14)

قاصد کا زرگر کو سونا چاندی دکھانا اسی "تزئین" (سجاوٹ) کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو اپنی اصل منزل سے غافل کر کے کسی اور طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ قرآن اسے **"متاع الغرور "**(دھوکے کا سامان) کہتا ہے، اور یہاں زرگر اسی دھوکے کا شکار ہو رہا ہے۔

حدیثِ مبارکہ میں انسان کی اس فطرت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ مال کی ہوس میں اپنا نقصان کر بیٹھتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي زِيَادٍ، حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ بْنِ سَعْدٍ، حَدَّثَنَا أَبِي، عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ لَأَحَبَّ أَنْ يَكُونَ لَهُ ثَانِيًا، وَلَا يَمْلَأُ فَاهُ إِلَّا التُّرَابُ، وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ تَابَ"، وَفِي الْبَابِ عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، وَأَبِي سَعِيدٍ، وَعَائِشَةَ، وَابْنِ الزُّبَيْرِ، وَأَبِي وَاقِدٍ، وَجَابِرٍ، وَابْنِ عَبَّاسٍ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ.

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” :اگر آدمی کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو اسے ایک تیسری وادی کی خواہش ہو گی اور اس کا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرے گا سوائے مٹی سے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کی توبہ قبول کرتا ہے جو اس سے توبہ کرے “ا۔ امام ترمذی کہتے ہیں:

۱ - اس سند سے یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے،

۲ - اس باب میں ابی بن کعب، ابوسعید خدری، عائشہ، ابن زبیر، ابوواقد، جابر، ابن عباس اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی احادیث آئی ہیں۔]سنن ترمذي/كتاب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم/ حدیث:2337[

زر گر، جو کہ سمرقند میں ایک ماہر فن تھا، محض "زر و سیم" کی لالچ میں اپنا گھر بار چھوڑنے پر تیار ہو گیا۔ یہ اس **حرص** کی عکاسی ہے جو انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ "تمہارے مال اور تمہاری اولاد محض ایک آزمائش ہیں۔" (سورہ التغابن:15)

یہ خلعت اور سونا اس زر گر کے لیے آزمائش (فتنہ) تھی، جس میں وہ ناکام رہا کیونکہ اس نے ظاہری چمک کو دیکھا، اس کے پیچھے چھپی ہلاکت کو نہیں دیکھا۔

قربِ سلطانی بمقابلہ قربِ الٰہی

شعر کا دوسرا مصرعہ **"خاص باشی و ندیم "**(تو خاص مقرب اور دوست بن جائے گا) ایک بڑے فریب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دنیا انسان کو بڑے عہدوں اور مرتبوں کا لالچ دیتی ہے، جبکہ حقیقی "قرب" اور "خاص" ہونا صرف اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔

- **قرآنی نکتہ :** فرعون نے بھی جادوگروں کو یہی لالچ دیا تھا کہ اگر تم موسیٰ (علیہ السلام) پر غالب آ جاؤ تو تمہیں انعام بھی ملے گا اور **"لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ "**(تم میرے مقربین میں شامل ہو جاؤ گے)۔ (سورہ الاعراف:114)
- **سنت کا سبق :** حضور ﷺ نے سکھایا کہ حقیقی شرف مال و منصب میں نہیں بلکہ تقویٰ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔" (صحیح مسلم)

زر گر نے بادشاہ کا "ندیم" (دوست) بننے کو اپنی کامیابی سمجھا، حالانکہ وہ اس کی موت کا پیش خیمہ تھا۔ یہ ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو دنیاداروں کی قربت کے لیے اپنے دین یا اخلاق کا سودا کر لیتے ہیں۔

باطنی بصیرت کا فقدان

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ "حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔" (سورہ الحج:46)

مولانا رومؒ سمجھاتے ہیں کہ زرگر کی آنکھیں تو کھلی تھیں (اس نے سونا چاندی دیکھ لیا) لیکن اس کے دل کی آنکھ اندھی تھی، اس لیے وہ یہ نہ بھانپ سکا کہ یہ سونا اسے موت کی وادی میں لے جانے کا ایک جال ہے۔ اگر اس کے پاس بصیرت ہوتی تو وہ "زر و سیم" کے بجائے عافیت کو ترجیح دیتا۔

خلاصہ کلام

قرآن و سنت کی روشنی میں یہ شعر **"استدراج "**(ڈھیل دینے) کی ایک صورت ہے۔ جب انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو کر صرف مادیت کو ترجیح دیتا ہے، تو دنیا اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، اسے "خلعت" پہنائے جاتے ہیں، اسے "خاص" ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے، لیکن بالآخر یہ سب فانی ثابت ہوتا ہے۔

مَردُ مال و خِلعَتِ بسیار دید
غِرّہ شد، از شہر و فرزندانُ بُرید

مشکل الفاظ کے معنی

مَرد : آدمی، انسان۔۔۔**مال** : دولت، روپیہ پیسہ۔۔۔**خِلعَت** : بادشاہ کی طرف سے دیا گیا خاص لباس یا انعام

بسیار : بہت زیادہ۔۔۔۔**دید** : دیکھا۔۔۔۔**غِرّہ شد** : مغرور ہو گیا، دھوکے میں آ گیا۔۔۔**از شہر** : شہر سے

فرزندان : اولاد، بچے۔۔۔**بُرید** : الگ ہو گیا، تعلق توڑ لیا

ترجمہ

"اس شخص نے جب بہت سامال اور شاہی لباس (عزت و جاہ) دیکھا، تو وہ دھوکے میں آ گیا (اس کا دل لرز گیا) اور اس نے اپنے شہر اور بال بچوں سے ناطہ توڑ لیا۔"

اس شعر میں مولانا رومیؒ انسانی فطرت کے ایک پہلو کو بیان کر رہے ہیں کہ جب انسان کو اچانک دنیاوی مال و دولت اور جاہ و حشم (مرتبہ) ملتا ہے، تو وہ اکثر اپنی اصل اور اپنی بنیادوں کو بھول جاتا ہے۔

اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

- **دنیاوی چمک دمک کا اثر' :** مال'اور 'خلعت' یہاں دنیاوی کامیابیوں اور مادی فائدوں کی علامت ہیں۔ جب انسان کی آنکھیں دنیا کی رنگینیوں سے خیرہ ہو جاتی ہیں، تو اسے وہ رشتے اور وہ جگہ (شہر) حقیر لگنے لگتے ہیں جنہوں نے اسے پالا پوسا ہوتا ہے۔
- **غرہ ہونا (دھوکا کھانا) :** لفظ 'غرہ' بہت جامع ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ عارضی مال و دولت ہی سب کچھ ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ یہی وہ تکبر ہے جو انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔
- **تعلقات کا کٹ جانا (بریدن) :** جب انسان مادی چیزوں کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے، تو سب سے پہلے اس کے قریبی رشتے (فرزندان) اور اس کی جڑیں (شہر) متاثر ہوتی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب اسے ان 'پرانی' چیزوں کی ضرورت نہیں، حالانکہ حقیقی سکون وہیں تھا۔

یہ شعر ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ دنیاوی ترقی اور کامیابی حاصل کرنا برا نہیں، لیکن اس کامیابی کے نشے میں آکر اپنوں کو چھوڑ دینا اور اپنی اصل سے کٹ جانا انسان کی اخلاقی موت ہے۔ یہ ایک طرح کا 'نفس کا دھوکا' ہے جس میں انسان وقتی فائدے کے لیے مستقل اثاثے (رشتے اور محبت) قربان کر دیتا ہے۔

مولانا رومؒ کا یہ شعر دراصل انسانی نفس کی اس کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے جسے قرآن و سنت میں **"حبِ دنیا "** اور **"فریبِ نفس "** کہا گیا ہے۔ جب انسان مادی وسائل کو اپنی منزل سمجھ لیتا ہے، تو وہ اپنی اصل حقیقت اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو جاتا ہے۔

رومی کے شعر میں 'مال و خلعت' (دولت اور اعزاز) کا تذکرہ ہے، جسے قرآن کریم نے " آزمائش " قرار دیا ہے۔

- **قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:**

"الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا..." (الکہف:46)

ترجمہ: "مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (صرف) رونق ہیں۔"

- یہ چیزیں انسان کے لیے امتحان ہیں کہ آیا وہ انہیں پا کر اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے یا ان میں کھو کر اپنوں اور رب کو بھول جاتا ہے۔

استغنا اور سرکشی (غِرّہ شد)

شعر کا دوسرا حصہ 'غرہ ہونے' (دھوکا کھانے) کے بارے میں ہے۔ جب انسان خود کو مالدار دیکھتا ہے، تو وہ سمجھتا ہے کہ اب اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ قرآن اس نفسیات کو یوں بیان کرتا ہے:

- **ارشادِ باری تعالیٰ ہے:**

"كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ" (العلق: 6-7)

ترجمہ: "حق یہ ہے کہ انسان سرکشی کرنے لگتا ہے، اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو غنی (مالدار) دیکھتا ہے۔"

- یہ مادی خوشحالی انسان میں تکبر پیدا کرتی ہے، جو اسے ہدایت کے راستے سے دور کر دیتی ہے۔

۳. قطعِ رحمی (از فرزندان برید)

شعر میں 'فرزندان سے کٹ جانے' کا ذکر ہے، جسے شریعت میں "**قطعِ رحمی**" کہا جاتا ہے اور یہ ایک سنگین گناہ ہے۔

- **فرمانِ نبوی ﷺ ہے:**

"لا يَدْخُلُ الجَنَّةَ قاطِعٌ" (صحیح بخاری)

ترجمہ: "رشتہ داری توڑنے والا جنت میں داخل نہیں ہو گا۔"

- اسلام میں صلہ رحمی (رشتوں کو جوڑنا) ایمان کا حصہ ہے، جبکہ رومی کا یہ کردار مال کی خاطر اپنی جڑوں اور اولاد سے لاتعلق ہو جاتا ہے، جو اخلاقی دیوالیہ پن کی نشانی ہے۔

۴. دنیا کا دھوکا

رومی نے 'غرہ شد' کا لفظ استعمال کیا ہے، جو عین قرآنی اصطلاح "**متاع الغرور**" کی عکاسی کرتا ہے۔

- **قرآن کہتا ہے:**

..."وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ" (آل عمران: 185)

ترجمہ: "اور دنیا کی زندگی تو صرف دھوکے کا سامان ہے۔"

حاصلِ بحث

قرآن وسنت کی روشنی میں رومی کا یہ شعر ایک ایسے شخص کی تصویر کشی کرتا ہے جو **"مادیت پرستی"** کا شکار ہو کر اپنی روحانیت اور معاشرتی اقدار کھو چکا ہے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ مال و دولت اللہ کی نعمت ہیں، لیکن اگر یہ اللہ اور اس کی مخلوق (خاص طور پر اہل و عیال) کے درمیان دیوار بن جائیں، تو یہ کامیابی نہیں بلکہ بدترین ناکامی اور دھوکا ہے۔

مولانا رومیؒ کو اکثر "نفس کا نبض شناس" کہا جاتا ہے، کیونکہ انہوں نے نفسیات کے باقاعدہ علم سے صدیوں پہلے انسانی ذہن کے پیچیدہ گوشوں کو بیان کر دیا تھا۔ نفسیات (Psychology) کی رو سے اس شعر کی تشریح چند اہم نظریات کے ذریعے کی جا سکتی ہے:

دولت اور ہمدردی کا فقدان (The Empathy Gap)

جدید نفسیاتی تحقیق (جیسے **Paul Piff** کے تجربات) یہ ثابت کرتی ہے کہ جیسے جیسے انسان کے پاس مادی وسائل، دولت اور طاقت (خلعت) بڑھتی ہے، اس کی دوسروں کے لیے ہمدردی (Empathy) میں کمی آنے لگتی ہے۔

- **تجزیہ:** شعر میں 'مال و خلعت' دیکھ کر رشتوں سے کٹ جانا اسی نفسیاتی رویے کی عکاسی ہے جہاں انسان مادی برتری کے احساس میں دوسروں کے دکھ درد اور تعلق سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

نرگسیت اور انا کا پھیلاؤ (Narcissism and Ego Inflation)

شعر کا لفظ 'غِرّہ شد' (مغرور ہونا / دھوکے میں آنا) نفسیات میں **Narcissism** (خود پسندی) کی علامت ہے۔

- **تجزیہ:** جب کسی شخص کو اچانک بڑی کامیابی ملتی ہے، تو اس کی 'انا (Ego)' اتنی پھیل جاتی ہے کہ اسے اپنی اصل اور ماضی کی پہچان (شہر اور فرزندان) بوجھ لگنے لگتی ہے۔ وہ خود کو ایک "سپر ہیومن" سمجھنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب اسے ان 'عام' لوگوں کی ضرورت نہیں رہی۔

۳. سماجی بیگانگی (Social Alienation)

نفسیات میں ایک اصطلاح **Alienation** استعمال ہوتی ہے۔ جب انسان اپنی اقدار (Values) بدل لیتا ہے، تو وہ اپنے ماحول سے کٹ جاتا ہے۔

- **تجزیہ'** : شہر اور فرزندان سے بریدن' (کٹ جانا) اس بات کی علامت ہے کہ اس شخص کا **Reference Group** بدل گیا ہے۔ اب اس کی نفسیاتی دنیا میں صرف 'مادہ' اور 'مرتبہ' اہم ہے، جذباتی رشتے اس کے لیے اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔

۴. ہائیڈونک ایڈاپٹیشن (Hedonic Adaptation)

انسان جب نئی آسائشیں دیکھتا ہے، تو وہ تیزی سے ان کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے مزید کی ہوس لگ جاتی ہے۔

- **تجزیہ** : رومی کا وہ شخص 'مال و خلعت' کو دیکھ کر اس لیے اپنوں کو چھوڑ رہا ہے کیونکہ وہ ایک ذہنی سراب (Illusion) کا شکار ہو گیا ہے کہ شاید یہ مادی چیزیں اسے وہ دائمی خوشی دے دیں گی جو اسے گھر والوں سے نہیں مل سکی۔ یہ ایک **Cognitive Distortion** (ذہنی مغالطہ) ہے۔

۵. دفاعی میکانزم (Defense Mechanism - Dissociation)

بعض اوقات انسان اپنی عاجزانہ ماضی کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے شعوری طور پر ان سے کٹ جاتا ہے تاکہ وہ اپنی نئی 'امیرانہ پہچان' کو برقرار رکھ سکے۔

- **تجزیہ** : اپنے شہر اور بچوں کو چھوڑنا دراصل اپنے اس ماضی کو دفن کرنے کی کوشش ہے جو اسے اس کی حقیقت یاد دلاتا تھا۔

خلاصہ

نفسیاتی اعتبار سے یہ شعر **"مادیت پرستی کی انتہا"** کو بیان کرتا ہے، جہاں مادی اشیاء انسان کی **Social Identity** (سماجی شناخت) کو مسخ کر دیتی ہیں اور وہ **Self-Actualization** (حقیقی خود شناسی) کے بجائے **False Self** (مصنوعی شناخت) کا شکار ہو جاتا ہے۔

مولانا رومیؒ کے ہاں مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) نظام میں ہر مادی چیز ایک "سایہ" یا "پردہ" ہے، جو حقیقتِ اصلی کو چھپائے ہوئے ہے۔ اس شعر کا روحانی پہلو انسانی روح کے اس سفر اور اس کی تنزلی (Descent) کو بیان کرتا ہے جو "عالمِ ارواح" سے "عالمِ مادہ" کی طرف ہوتا ہے۔

تصوف اور مابعد الطبیعیات کی روشنی میں اس کے چند اہم نکات یہ ہیں:

کثرت کا پردہ (Veil of Plurality)

مابعد الطبیعیاتی نقطہ نظر سے 'مال و خلعت' محض مادی اشیاء نہیں بلکہ **"کثرت"** کی علامت ہیں۔ صوفی کے نزدیک کثرت (دنیا کی رنگینی) انسان اور "وحدت" (خالق) کے درمیان حجاب بن جاتی ہے۔

- **روحانی حقیقت:** جب انسان مادی صورتوں (Forms) میں الجھ جاتا ہے، تو وہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے اصل 'معنی' (Divine Meaning) کو دیکھنا چھوڑ دیتا ہے۔ یہ **'غرہ ہونا'** دراصل بصیرت کا اندھا پن ہے۔

حقیقی وطن سے بیگانگی (Alienation from the Primordial Home)

رومی کے کلام میں 'شہر' اکثر **"عالمِ قدس"** یا روح کے اصل وطن کی علامت ہوتا ہے جہاں سے وہ آئی تھی۔

- **تجزیہ":** شہر سے کٹ جانے" کا مطلب یہ ہے کہ انسان دنیاوی اعزازات کی خاطر اپنے اس عہدِ الست (Primordial Covenant) کو بھول گیا ہے جو اس نے اپنے رب سے کیا تھا۔ وہ اس مسافر کی طرح ہے جو سرائے کی رنگینی دیکھ کر اپنے اصل گھر کا راستہ بھول جائے۔

صورت اور معنی کا ٹکراؤ (Form vs. Essence)

رومیؒ فرماتے ہیں کہ دنیا ایک "برتن" کی مانند ہے اور اس کے اندر چھپی ہوئی حقیقت "پانی" ہے۔

- **روحانی پہلو':** خلعت' (لباس) محض ایک ظاہری صورت ہے جو فانی ہے۔ جب انسان اس فانی صورت کو دیکھ کر اپنے 'فرزندان' (جو یہاں روحانی نتائج، نیک اعمال یا فطری رشتوں کی علامت ہو سکتے ہیں) کو چھوڑتا ہے، تو وہ دراصل **جوہر (Essence)** کو چھوڑ کر **عرض (Accident)** کو اختیار کر لیتا ہے۔

نفسِ امارہ کی جادوگری

مابعد الطبیعیات میں نفس کو ایک جادوگر یا شعبدہ باز کہا گیا ہے جو حقیر چیز کو عظیم بنا کر پیش کرتا ہے۔

- **تجزیہ:** مال و خلعت کو 'بسیار' (بہت زیادہ) دیکھنا ہی دراصل نظر کا دھوکا ہے۔ روحانی طور پر جو چیز اللہ سے دور کر دے وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، حقیقت میں 'عدم' (کچھ نہیں) ہے۔ 'غرہ ہونا' اس بات کی علامت ہے کہ انسان کا روحانی مرکز (Center) اس کے وجود سے نکل کر بیرونی اشیاء میں منتقل ہو گیا ہے۔

تجلیاتِ الٰہیہ کا غلط استعمال

صوفیا کے نزدیک دنیا کی ہر خوبصورتی اللہ کی تجلی کا عکس ہے۔

- **نکتہ:** المیہ یہ ہے کہ اس شخص نے 'خلعت' میں اللہ کا نور دیکھنے کے بجائے اسے اپنی 'انا' کی خوراک بنا لیا۔ جب تجلی کو اللہ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنی ذات کی طرف منسوب کر لیا جائے، تو یہی وہ مقام ہے جہاں سے 'بُریدن' (خدا اور اس کی مخلوق سے کٹ جانے) کا عمل شروع ہوتا ہے۔

حاصلِ کلام: روحانی اعتبار سے یہ شعر اس **"خود فراموشی"** کی داستان ہے جہاں انسان اپنی ابدی حیثیت کو ایک عارضی 'خلعت' کے بدلے بیچ دیتا ہے۔ رومیؒ ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کائنات کی ہر نعمت ایک سیڑھی ہونی چاہیے تھی اوپر جانے کے لیے، لیکن انسان نے اسے دیوار بنا لیا آگے دیکھنے کے لیے۔

مولانا رومیؒ کا یہ فلسفہ کہ "دنیا کی چمک دمک انسان کو اپنی اصل سے بیگانہ کر دیتی ہے"، عربی اور فارسی کی کلاسیکی شاعری کا ایک مستقل موضوع رہا ہے۔ قدیم شعراء نے اس 'فریبِ نظر' کو بڑے پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔

ذیل میں قدیم عربی اور فارسی شعراء کے چند منتخب اشعار پیش ہیں جو رومی کے اس شعر کی فکری وضاحت کرتے ہیں:

قدیم عربی شاعری (ابو العتاہیہ - زہد و حکمت کا نمائندہ)

عربی ادب میں **ابو العتاہیہ** اپنی 'زہدیات' (دنیا سے بے رغبتی کی شاعری) کے لیے مشہور ہے۔ وہ رومی کے 'غرہ شد' (دھوکہ کھا گیا) کے تصور کو یوں بیان کرتا ہے:

أَلَا إِنَّمَا الدُّنْيَا نَضَارَةُ أَيْكَةٍ... إِذَا اخْضَرَّ مِنْهَا جَانِبٌ

جَفَّ جَانِبٌ تُخَادِعُ مَنْ غَرَّتْ بِمِثْلِ سَرَابِهَا... وَأَضْحَكَتِ الْيَوْمَ الَّذِي هُوَ جَانِبُ

ترجمہ وربط" : خبردار! یہ دنیا ایک گھنے درخت کی ہریالی کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ ہرا ہوتا ہے تو دوسرا سوکھ جاتا ہے۔ یہ اسے دھوکہ دیتی ہے جو اس کے 'سراب' سے فریب کھا جائے، اور جسے آج یہ ہنساتی ہے (مال و دولت دے کر)، کل اسے رلاتی ہے۔"

رومی کے 'مرد' کی طرح ابو العتاہیہ کا کردار بھی 'سراب (Mirage) ' کو حقیقت سمجھ کر اپنی دائمی خوشی برباد کرلیتا ہے۔

قدیم فارسی شاعری (شیخ سعدی شیرازی)

حضرت سعدیؒ، رومی کے اس تصور کو کہ "دولت انسان کو رشتوں سے کاٹ دیتی ہے"، اپنی مثنوی **بوستان** میں ایک نصیحت کے طور پر بیان کرتے ہیں:

نہ مَستیِ خِلعَتِ دَہر پایدار — نہ دَولَتِ بِمانَد نہ بَختِ بَلَند

دل بر این کاروان سرای مَبند — کہ نیاید زِ مہرِ گیتی گند

ترجمہ وربط" : نہ تو شاہی خلعت کی مستی پائیدار ہے، نہ دولت اور بلند بخت ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اس کاروان سرائے (دنیا) سے دل نہ لگا، کیونکہ اس جہان کی محبت سے خیر کی خوشبو نہیں آتی۔"

سعدیؒ یہاں بالکل وہی نکتہ اٹھا رہے ہیں کہ جس 'خلعت' پر انسان فخر کرکے اپنوں سے کٹ جاتا ہے، وہ دراصل ایک عارضی نشہ (مستی) ہے۔

۳. مرزا عبدالقادر بیدل (خیالی اور فلسفیانہ رنگ)

چونکہ آپ کو **مرزا بیدل** کے کلام سے خاص دلچسپی ہے، تو بیدل اس 'مال و خلعت' کی حقیقت کو "حباب" (بلبلے) کی مثال سے واضح کرتے ہیں:

غافل مباش از حباب کہ در چشمِ اعتبار — ایوانِ زرنگار خیالی بیش نیست

ترجمہ وربط" : ببلبے کی حقیقت سے غافل نہ ہو (جو بظاہر بڑا نظر آتا ہے مگر اندر سے خالی ہے)، کیونکہ بصیرت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ سونے سے سجے ہوئے محلات (ایوانِ زرنگار) ایک خیال اور وہم سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔"

بیدل کا یہ شعر رومی کے 'غرہ شد' کی تشریح کرتا ہے کہ جس جاہ و حشم کو دیکھ کر وہ شخص مغرور ہوا، وہ دراصل ببلبے کی طرح بے بنیاد تھا۔

حضرت علیؓ کی طرف منسوب کلام (حکمتِ عربی)

قدیم عربی حکمت میں ایک مشہور قول (جو اشعار کی صورت میں بھی منقول ہے) اس انسانی رویے کی عکاسی کرتا ہے:

هِيَ الدُّنيَا تُقَبِّلُ كُلَّ حِينٍ...فَتَنسى لِلآخِرَةِ الذُّخُورَ

وَمَنْ يَغْتَرّ بِالدُّنيَا فَإِنِّي...رَأَيْتُ الخَلْقَ يَغْتَرُّونَ زُوراً

ترجمہ وربط" : یہ دنیا ہر لمحہ بدلتی ہے، یہ انسان کو آخرت کے ذخیرے سے غافل کر دیتی ہے۔ اور جو اس دنیا سے دھوکہ کھا گیا (یغتر– غرہ شد)، تو میں نے دیکھا ہے کہ لوگ جھوٹی شان و شوکت پر فریب کھاتے ہیں۔"

ان تمام اشعار میں ایک بات مشترک ہے" : **ظاہر کی چمک، باطن کا اندھیرا"**۔ قدیم شعراء کے نزدیک 'مال و خلعت' کا ملنا برائی نہیں تھی، بلکہ ان اشیاء کا انسان کے ہوش و حواس پر غالب آ جانا اور اسے اس کے 'شہر' (حقیقی مقام) اور 'فرزندان' (قریبی رشتوں / فرائض) سے دور کر دینا اصل المیہ ہے۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر اپنی ظاہری سادگی کے باوجود فنِ شاعری اور بلاغت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ اس کے شعری محاسن کو مندرجہ ذیل نکات میں سمجھا جا سکتا ہے:

۱. سہلِ ممتنع (Elegant Simplicity)

رومیؒ کا کمال یہ ہے کہ وہ مشکل ترین فلسفے کو بہت سادہ الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ اس شعر میں کوئی ثقیل یا پیچیدہ لفظ نہیں ہے، لیکن جو بات کہی گئی ہے وہ انسانی نفسیات کی پوری داستان ہے۔ اسے "سہلِ ممتنع" کہتے ہیں—یعنی ایسا کلام جو بظاہر سادہ لگے لیکن اس جیسا کہنا بے حد مشکل ہو۔

۲. منطقی ترتیب (Logical Progression)

شعر میں انسانی زوال کے تین مراحل کو تین فعل (Verbs) کے ذریعے کمالِ مہارت سے ترتیب دیا گیا ہے:

1. **دید (دیکھا)**: پہلے آنکھ نے مادی چمک دمک کو دیکھا (مشاہدہ)۔
2. **شُد (ہو گیا)**: پھر دل اس کے اثر میں آ گیا اور مغرور ہو گیا (ذہنی تبدیلی)۔
3. **بُرید (کاٹ دیا/الگ ہو گیا)**: آخر میں عمل کا مرحلہ آیا اور وہ رشتوں سے کٹ گیا (عملی نتیجہ)۔ یہ 'دیکھنے' سے 'کٹ جانے' تک کا سفر ایک مکمل نفسیاتی ڈرامہ ہے جو صرف دو مصرعوں میں سما گیا ہے۔

۳. صنعتِ تضاد (Contrast)

شعر میں دو متضاد دنیاؤں کا تقابل کیا گیا ہے:

- ایک طرف **'مال و خلعت'** ہے (جو عارضی، مادی اور بیرونی چیز ہے)۔
- دوسری طرف **'شہر و فرزندان'** ہیں (جو مستقل، جذباتی اور فطری رشتے ہیں)۔ رومیؒ نے دکھایا ہے کہ کس طرح ایک 'عارضی' چیز 'مستقل' اثاثے پر غالب آ جاتی ہے۔

۴. علامت نگاری (Symbolism)

- **خلعت**: یہ محض لباس نہیں، بلکہ سماجی رتبے، عہدے اور جھوٹی شان و شوکت کی علامت ہے۔
- **فرزندان**: یہ صرف اولاد نہیں، بلکہ انسان کی جڑوں، اس کی اقدار اور اس کی فطری وابستگیوں کی علامت ہے۔
- **بُرید (کاٹنا)**: یہ لفظ بے حد بلیغ ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تعلق خود بخود نہیں ٹوٹا، بلکہ مادی ہوس نے اسے بے دردی سے کاٹ پھینکا۔

۵. ایجاز و اختصار (Brevity)

کم سے کم الفاظ میں بڑی بات کہنا شاعری کا حسن ہے۔ رومیؒ نے ایک ایسے شخص کی پوری زندگی کا المیہ بیان کر دیا ہے جو "کامیابی" کی دوڑ میں "اپنا آپ" کھو دیتا ہے۔ یہاں 'شہر' کا لفظ اس کی پوری پہچان (Identity) کو سمیٹے ہوئے ہے۔

۶. صوتی آہنگ (Phonetics)

فارسی الفاظ کی صوتی ترتیب (دِید، شُد، بُرید) میں ایک خاص قسم کی کاٹ اور قطعیت ہے۔ خاص طور پر مصرعِ ثانی کے آخر میں **'بُرید'** کا لفظ جب ادا ہوتا ہے، تو وہ ایک صوتی ضرب (Impact) پیدا کرتا ہے، جو اس جدائی اور ٹوٹ پھوٹ کے دکھ کو محسوس کرواتا ہے جس کا ذکر شعر میں ہے۔

حاصلِ کلام : یہ شعر صرف ایک کہانی کا حصہ نہیں بلکہ ایک **"آفاقی تمثیل "** ہے۔ اس کا حسن اس بات میں ہے کہ یہ ہر دور کے انسان پر صادق آتا ہے، چاہے وہ 13 ویں صدی کا کوئی درباری ہو یا آج کے دور کا کوئی مادہ پرست انسان۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کے فنی اور لسانی ڈھانچے پر بات کی جائے تو اس میں فارسی شاعری کی کلاسیکی روایت اور لسانی خوبصورتی کے چند اہم پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

ذیل میں اس کے **بحر و وزن** اور **صرف و نحو** (Grammar) کے نکات پیش ہیں:

ا۔ بحر اور وزن (Prosody)

یہ شعر مثنوی معنوی کے مخصوص اور مشہور وزن پر ہے، جسے **"بحر رمل مسدس مقصور "**یا**" محذوف "** کہا جاتا ہے۔ اس بحر کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں ایک روانی اور غنائیت ہوتی ہے جو طویل قصوں اور حکایتوں کے لیے موزوں ترین ہے۔

اس کے ارکان یہ ہیں:

فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) یا فاعلات (

تقطیع (وزن کی تقسیم):

- **مَر دُمانُ (فاعلاتن)**
- **خِل عتے بَس (فاعلاتن)**
- **یار دِید (فاعلن)**

دوسرا مصرع:

- **غِر رہ شُد از (فاعلاتن)**
- **شَہ رُفَر زَن (فاعلاتن)**

- **داں بُرید (فاعلن)**

اس وزن کی سادگی قاری کو معنی کی گہرائی میں اترنے میں مدد دیتی ہے، کیونکہ الفاظ کا آہنگ بہت فطری محسوس ہوتا ہے۔

۲۔ لسانی اور نحوی نکات (Grammatical Insights)

اس شعر میں فارسی زبان کے کلاسیکی قواعد کا بہترین استعمال کیا گیا ہے:

- **ماضیِ مطلق (Simple Past):** شعر میں تین اہم افعال (Verbs) استعمال ہوئے ہیں: **دِید** (دیکھا)، **شُد** (ہو گیا)، اور **بُرید** (کاٹ دیا)۔ یہ تینوں 'ماضیِ مطلق' کے صیغے ہیں۔ رومیؒ نے یہاں حال کے بجائے ماضی کا استعمال اس لیے کیا ہے تاکہ یہ بات ایک "حتمی حقیقت" یا "وقوعہ" کے طور پر سامنے آئے۔

- **حذفِ اضافت (Omission of Ezafat):** مصرعِ اول میں "**مال وخلعتِ بسیار**" میں 'بسیار' (بہت زیادہ) صفت ہے جو مال اور خلعت دونوں کے لیے آئی ہے۔ یہاں رومیؒ نے اختصار سے کام لیتے ہوئے صفت کو دونوں موصوف کے لیے ایک ہی بار استعمال کیا ہے، جو کلام میں فصاحت پیدا کرتا ہے۔

- **واوِ عطف (The Conjunction 'and'):** "**شہر و فرزندان**" میں 'واو' کا استعمال صرف دو چیزوں کو جوڑنے کے لیے نہیں، بلکہ ایک وسیع دائرے کو سمیٹنے کے لیے ہے۔ 'شہر' اس کی سماجی پہچان ہے اور 'فرزندان' اس کی جذباتی دنیا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ لا کر یہ دکھایا گیا ہے کہ مادی ہوس انسان کی سماجی اور نجی دونوں زندگیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

- **لفظ 'غِرّہ' کی ساخت:** یہ عربی الاصل لفظ ہے جس کے معنی 'دھوکہ' یا 'فریب' کے ہیں۔ فارسی میں اس کے ساتھ 'شُد' لگا کر اسے حالت (State) کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غرور انسان کی اپنی صفت نہیں ہوتی بلکہ وہ باہر کی چیزوں (مال و دولت) سے "مستعار" لیتا ہے اور اس کا شکار ہو جاتا ہے۔

۳۔ ایک خاص ادبی نکتہ: "بُرید" کا استعارہ

فارسی میں 'بریدن' (کاٹنا) صرف جسمانی کاٹنے کے لیے نہیں بلکہ "**تعلق ختم کرنے**" کے لیے ایک نہایت طاقتور لفظ ہے۔ جب رومیؒ کہتے ہیں کہ وہ 'برید' (کٹ گیا)، تو اس سے ایک ایسی جدائی مراد ہے جس میں تکلیف اور بے رحمی شامل ہے۔ یہ لفظ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ دولت کا نشہ انسان کو کتنا "سخت دل" بنا دیتا ہے۔

حاصلِ مطالعہ : یہ شعر اپنی ساخت میں جتنا سادہ ہے، اپنی فنی گہرائی میں اتنا ہی مضبوط۔ رومیؒ نے وزن، صوتی آہنگ اور قواعد کو اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک زندہ المیہ (Tragedy) اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

اَنْدَر آمد شادمان در راہ مَرد
بی خَبَر کان شاہ قَصدِ جانُش کرد

مشکل الفاظ کے معنی

اَنْدَر آمد = اندر داخل ہوا / آ گیا۔۔۔**شادمان** = خوش، مسرور۔۔۔**راہ** = راستہ۔۔۔**مَرد** = آدمی، شخص

بی خَبَر = بے خبر، ناواقف۔۔۔**کان** = کہ (کا مخفف)۔۔۔**شاہ** = بادشاہ۔۔۔**قَصدِ جان** = جان لینے کا ارادہ

کرد = کیا

ترجمہ

"وہ شخص (سنار) بڑی خوشی کے ساتھ راستے پر چل پڑا (سفر کا آغاز کیا)، اس بات سے بالکل بے خبر کہ اس بادشاہ نے اس کی جان لینے کا ارادہ کر رکھا ہے۔"

مولانا رومی کی مثنوی معنوی کا یہ شعر اس مشہور قصے (بادشاہ اور کنیز) کا حصہ ہے جہاں بادشاہ کے کارندے سنار کو سمرقند سے لینے پہنچتے ہیں۔ یہ شعر انسانی غفلت اور ظاہری خوشی کے پیچھے چھپی حقیقتوں کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

اس شعر کے دو پہلو ہیں: ایک وہ جو کہانی سے متعلق ہے اور دوسرا وہ جو ہمیں زندگی کی حقیقت سمجھاتا ہے۔

1. **قصے کا پس منظر (تمثیلی رنگ) :ب**

بادشاہ کی کنیز ایک سنار کی محبت میں بیمار تھی۔ بادشاہ نے حکیم کے مشورے پر سنار کو دھوکے سے بلانے کے لیے تحائف اور زر و جواہر بھیجے۔ سنار ان تحائف کو دیکھ کر سمجھا کہ شاید میری خوش قسمتی کا ستارہ چمک اٹھا ہے اور بادشاہ مجھے اپنا مقرب بنانا چاہتا ہے۔ وہ دنیاوی لالچ اور خوشی میں اندھا ہو کر سفر پر روانہ ہو گیا، لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سونا اور چاندی دراصل اس کی موت کا پھندا ہیں۔

۲ . آفاقی پیغام (اخلاقی وروحانی سبق) : مولانا رومی اس شعر کے ذریعے انسان کی اس '**غفلت** ' کی نشاندہی کر رہے ہیں جس میں وہ اکثر مبتلا رہتا ہے۔

- **دنیاوی دھوکا :** انسان دنیا کی چمک دمک، عہدوں اور مال و متاع کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ کامیابی کی طرف جا رہا ہے، جبکہ بسا اوقات وہی چیزیں اس کی روحانی یا جسمانی ہلاکت کا سبب بن رہی ہوتی ہیں۔
- **تقدیر سے بے خبری :** انسان اپنی تدبیروں اور خوشیوں میں مگن رہتا ہے، جبکہ اسے یہ خبر نہیں ہوتی کہ پردۂ غیب میں اس کے لیے کیا لکھا جا چکا ہے۔
- **نفس کی مثال :** یہاں 'سنار' سے مراد ہمارا '**نفس** ' بھی ہو سکتا ہے جو دنیا کی لذتوں کی طرف خوشی خوشی بھاگتا ہے، مگر اسے احساس نہیں ہوتا کہ یہ لذتیں اسے فنا کی طرف لے جا رہی ہیں۔

خلاصہ : یہ شعر ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ ظاہری چمک دمک پر فدا ہونے سے پہلے حقیقت کو جانچنا ضروری ہے۔ ہر وہ راستہ جو بظاہر خوشیوں بھرا نظر آئے، ضروری نہیں کہ وہ سلامتی کا ہی راستہ ہو۔

مولانا رومی کا یہ شعر دراصل انسانی زندگی کے اس پہلو کی عکاسی کرتا ہے جسے قرآن و سنت میں "**غرورِ دنیا** " (دنیا کا دھوکا) اور "**غفلت** " سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس تصور کو ہم درج ذیل چار بڑے عنوانات کے تحت دیکھ سکتے ہیں:

دنیا کی زندگی: ایک دھوکا (متاع الغرور)

شعر میں سنار کا تحائف دیکھ کر خوش ہونا اور موت کی طرف سفر کرنا قرآن کی اس آیت کا عملی نقشہ ہے:

"**وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ** " (سورہ آل عمران:185)

"اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔"

جس طرح سنار کو شاہی تحائف میں اپنی کامیابی نظر آئی لیکن وہ دراصل اس کی ہلاکت کا سبب بنے، بالکل اسی طرح انسان دنیا کی چمک دمک اور عارضی لذتوں کو اپنی منزل سمجھ بیٹھتا ہے، جبکہ وہ اسے حقیقت سے دور کر رہی ہوتی ہیں۔

۲ . غفلت اور اچانک پکڑ (استدراج)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک قانون بیان ہوا ہے جسے **'استدراج'** (ڈھیل دینا) کہتے ہیں۔ جب انسان اللہ کو بھول کر صرف دنیا میں مگن ہو جاتا ہے، تو بسا اوقات اس پر نعمتوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں تا کہ اس کی آزمائش مکمل ہو:

"فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً

سورہ الانعام: 44" (پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی، تو ہم نے ان پر ہر چیز کے (نعمتوں کے) دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر جو انہیں دی گئی تھیں، خوب مگن (خوش) ہو گئے تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا۔"

رومی کے شعر کا لفظ **"شادمان"** (خوشی سے نہال) اسی قرآنی لفظ **"فَرِحُوا"** (وہ مگن ہو گئے) کی ترجمانی کر رہا ہے، جہاں انسان اپنی ظاہری خوشی میں آنے والے خطرے سے بے خبر ہوتا ہے۔

موت کی بے خبری اور حساب کا قریب ہونا

حدیثِ نبوی ﷺ میں عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی تیاری کرے۔ سنار کی بے خبری اس انسانی حالت کی عکاسی ہے جس کا ذکر سورہ الانبیاء میں ہے:

"اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ)" سورہ الانبیاء: ا

" (لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا ہے اور وہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔"

رومی کے شعر میں سنار کا سفر دراصل ہم سب کا **'سفرِ زندگی'** ہے۔ ہم خوشی خوشی منصوبے بناتے ہیں، مستقبل کی راہیں تلاش کرتے ہیں، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر قدم ہمیں اس "قضا" (موت) کے قریب لے جا رہا ہے جس کا وقت مقرر ہے۔

۴. ظاہر پرستی بمقابلہ بصیرت

نبی کریم ﷺ کی ایک دعا کا مفہوم ہے " : اے اللہ! ہمیں اشیاء کی حقیقت ویسی ہی دکھا جیسی وہ ہیں

"(اللهم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه...)۔

- **سنار** نے صرف "سونا" اور "تحائف" دیکھے (ظاہر پرستی)۔

- **بصیرت** والا وہ ہوتا جو ان تحائف کے پیچھے چھپے مقصد کو بھانپ لیتا۔

اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ مومن کو **"فراست "** سے کام لینا چاہیے کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ سنار کی "بے خبری" دراصل اس فراست کی کمی ہے جو انسان کو دنیا کے جال میں پھنسا دیتی ہے۔

حاصلِ بحث : مولانا رومی کا یہ شعر محض ایک کہانی کا حصہ نہیں بلکہ ایک **تنبیہ** ہے کہ اپنی خوشیوں کی بنیاد صرف ظاہری مادی فوائد پر نہ رکھو۔ قرآن و سنت کا پیغام بھی یہی ہے کہ انسان اپنی اصل منزل (آخرت) کو یاد رکھے تاکہ دنیا کی رنگینیاں اسے سنار کی طرح "بے خبر" نہ کر دیں۔

قدیم فارسی شعراء کے ہاں یہ موضوع — کہ دنیا ایک دھوکا ہے اور انسان اپنی غفلت میں مگن رہتا ہے — ایک مستقل "تصوفانہ اور حکیمانہ روایت" کی حیثیت رکھتا ہے۔ رومی کے اس شعر کا عکس ہمیں حافظ، سعدی، خیام اور عطار کے کلام میں مختلف رنگوں میں ملتا ہے۔

فارسی شعراء نے اس حقیقت کو درج ذیل چار بڑے انداز میں بیان کیا ہے:

حافظ شیرازی: دنیا بطورِ بے وفا دلہن

حافظ کے نزدیک دنیا ایک ایسی بوڑھی عورت (عجوزہ) ہے جو ہر روز نیا روپ دھار کر انسان کو اپنی طرف مائل کرتی ہے، مگر حقیقت میں وہ کسی سے وفا نہیں کرتی۔ رومی کے "سنار" کی طرح جو بادشاہ کے بلاوے پر خوش تھا، حافظ کہتے ہیں:

مجوی درستیِ عہد از جہانِ سست نہاد کہ این عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

(اس کمزور بنیاد والی دنیا سے عہدِ وفا کی امید نہ رکھ، کیونکہ یہ بڑھیا ہزاروں دولہا بدل چکی ہے۔)

حافظ متنبہ کرتے ہیں کہ اس کی ظاہری چمک دمک پر شادمان (خوش) ہونا نادانی ہے، کیونکہ یہ "قصدِ جاں" کرنے میں دیر نہیں لگاتی۔

شیخ سعدی شیرازی: ظاہر اور باطن کا تضاد

سعدی نے "گلستان" اور "بوستان" میں جا بجا اس غفلت کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی مثال اس سبزے کی سی ہے جس کے نیچے سانپ چھپا ہو، یا اس شہد کی سی ہے جس میں زہر ملا ہو۔ رومی کے شعر کے تناظر میں سعدی کا یہ قول مشہور ہے:

درختِ خوش علف رامکن تکیہ بربار کہ ناگاہ بنی بر آوردہ خار)خوشنما پھل والے درخت پر بھروسہ نہ کر، کہ تو ناگاہ دیکھے گا کہ اس نے کانٹے نکال لیے ہیں۔(

سعدی کا پیغام بھی وہی ہے کہ جب حالات بہت سازگار لگ رہے ہوں، تب ہی انسان کو سب سے زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے، کیونکہ "تقدیر" خاموشی سے وار کرتی ہے۔

عمر خیام: وقت کی بے رحمی اور بے خبری

خیام کا پورا فلسفہ ہی اس "لمحاتی خوشی" اور "موت کی بے خبری" کے گرد گھومتا ہے۔ خیام کہتے ہیں کہ یہ کائنات ایک بساط ہے جہاں ہم مہرے ہیں اور تقدیر ہمیں ادھر ادھر گھما رہی ہے:

مالعبتکانیم و فلک لعبت باز از روی حقیقتی نہ از روی مجاز

(ہم تو کٹھ پتلیاں ہیں اور یہ آسمان (تقدیر) کھلاڑی ہے؛ یہ حقیقت ہے، کوئی مجاز یا استعارہ نہیں ہے۔)

رومی کے سنار کی طرح خیام کا انسان بھی مٹی کے پیالے کی طرح ہے جسے قدرت نے بڑی خوبصورتی سے بنایا (شادمان کیا) لیکن آخر میں اسے زمین پر پٹخ کر توڑ دیا۔

شیخ فرید الدین عطار: حرص کا جال

رومی کے مرشدِ معنوی شیخ عطار نے "منطق الطیر" میں پرندوں کی مثال سے یہی بات سمجھائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پرندہ دانے کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور جال (دام) کو نہیں دیکھ پاتا:

چوں بدیدی دانہ، دامش ہم ببچشم تا نیفتی چوں دگر مرغان بخشم

(جب تو دانے کو دیکھے، تو ساتھ ہی جال کو بھی دیکھ، تاکہ تو دوسرے پرندوں کی طرح مصیبت میں نہ پھنس جائے۔)

رومی کے شعر میں سنار کو "دانہ" (بادشاہ کے تحائف) تو نظر آ رہا تھا لیکن "دام" (موت کا ارادہ) نظر نہیں آ رہا تھا۔

خلاصہ کلام

فارسی شعراء کا مجموعی نقطہ نظر یہ ہے کہ:

1. **دنیا کا "ظاہر" خوشنما ہے** :(رومی کا لفظ: شادمان)۔

2. **دنیا کا "باطن" ہلاکت خیز ہے** :(رومی کا لفظ: قصدِ جاں)۔

3. **انسان کا المیہ "بے خبری" ہے** :(رومی کا لفظ: بے خبر)۔

یہ شعراء ہمیں **'ہوشیار باش'** کا پیغام دیتے ہیں کہ عارضی کامیابیوں پر اترا کر حقیقتِ اصلیہ (موت اور خدا) سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

اسپِ تازی بَر نِشَست و شادُ تاخت
خون بَہائے خویش را خِلعَت شِناخت

مشکل الفاظ کے معنی

اَسپِ تازی : عربی نسل کا تیز رفتار گھوڑا۔۔۔۔**بَر نِشَست** : سوار ہوا، اوپر بیٹھ گیا۔۔۔۔**شاد تاخت** : خوشی سے دوڑا، تیزی سے بھاگا۔۔۔۔**خون بَہا** : خون کا بدلہ، دیت۔۔۔۔۔**خویش** : اپنا۔۔۔۔**خِلعَت** : انعامی لباس، شاہی پوشاک

شناخت : پہچانا، سمجھا

ترجمہ

وہ (عربی) گھوڑے پر سوار ہوا اور خوشی خوشی (منزلِ مقصود کی طرف) لپکا؛ اس نے اپنے ہی خون کی قیمت (موت) کو بادشاہ (حقیقی) کی طرف سے عطا کردہ خلعت (اعزاز کا جوڑا) سمجھ کر قبول کیا۔

اس شعر میں مولانا رومیؒ نے انسانی روح کے مادی جسم سے نکل کر عالمِ بالا کی طرف کوچ کرنے کے منظر کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس کے مختلف پہلو درج ذیل ہیں:

روح کا سفر (اسبِ تازی)

مولانا فرماتے ہیں کہ جب انسان کو حقیقت کا عرفان ہو جاتا ہے، تو موت اسے خوفناک نظر نہیں آتی۔ یہاں 'اسبِ تازی' (تیز رفتار گھوڑا) سے مراد وہ جذب اور شوق ہے جو انسان کو اللہ کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ شخص (زرگر) اپنی موت کو فنا نہیں بلکہ ایک سفر سمجھ کر اس پر خوشی خوشی سوار ہو گیا۔

خون بہا اور خلعت کا استعارہ : دنیاوی لحاظ سے کسی کا خون ہونا ایک المیہ ہے جس کا معاوضہ 'خون بہا' ہوتا ہے۔ لیکن صوفیا کے نزدیک اللہ کی راہ میں فنا ہونا یا مادی دنیا سے رخصت ہونا کوئی نقصان نہیں بلکہ ایک سودا ہے۔ زرگر نے سمجھ لیا کہ اس کی جسمانی تکلیف اور موت دراصل وہ قیمت ہے جس کے بدلے اسے اللہ کی قربت مل رہی ہے۔ اس لیے اس نے اپنی موت (خون بہا) کو اللہ کی طرف سے ملنے والا 'خلعت' (عزت کا لباس) سمجھ کر خوشی سے گلے لگا لیا۔

فنا اور بقا کا فلسفہ : اس شعر کا مرکزی پیغام یہ ہے کہ جب بندہ اللہ کی رضا میں راضی ہو جاتا ہے، تو وہ مصیبت میں بھی راحت دیکھتا ہے۔ زرگر جان گیا تھا کہ:

"عشقِ مولیٰ کم از عشقِ لیلیٰ نیست "

(مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کم نہیں ہے)۔

اسے احساس ہو گیا کہ اس کا ظاہری حسن تو ڈھل گیا، لیکن اس کے بدلے اسے وہ ابدی زندگی مل رہی ہے جہاں صرف محبوبِ حقیقی کا جلوہ ہے۔

یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ مردِ مومن کے لیے موت کوئی ڈرنے کی چیز نہیں، بلکہ ایک قیدی کی قید خانے سے رہائی اور اپنے اصل گھر (خالق) کی طرف واپسی کا جشن ہے۔ جب بصیرت کھل جاتی ہے، تو انسان دنیا کی تکلیف کو بھی رب کی عطا کردہ عزت (خلعت) سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

رومی کے اس شعر میں بیان کردہ حقیقت —یعنی موت کو ایک "اعزاز" (خلعت) اور اللہ سے ملاقات کا خوشی بھرا ذریعہ سمجھنا— قرآن و سنت اور اسلامی تصوف کے بنیادی تصورات سے گہری مطابقت رکھتی ہے۔ اسے درج ذیل پہلوؤں سے سمجھا جا سکتا ہے:

قرآنِ کریم: نفسِ مطمئنہ کا تصور

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان نفوس کا ذکر کیا ہے جو اللہ کی رضا میں فنا ہو چکے ہوتے ہیں۔ سورہ الفجر میں ارشاد ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً "اے اطمینان پانے والی روح! اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔"

رومی کا شعر اسی "رجوع" (لوٹنے) کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ جب انسان کا نفس پاک ہو جاتا ہے، تو اسے موت میں "خوف" کے بجائے اپنے رب کی طرف واپسی کی تڑپ نظر آتی ہے، جیسا کہ شعر میں "شاد تاخت" (خوشی سے دوڑنے) کا ذکر ہے۔

حدیثِ نبوی ﷺ: اللہ سے ملاقات کا شوق

حدیثِ مبارکہ میں اس کیفیت کی تصدیق ملتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُسْهِرٍ، عَنْ زَكَرِيَّاءَ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ شُرَيْحِ بْنِ هَانِئٍ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ أَحَبَّ اللَّهُ لِقَاءَهُ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللَّهِ كَرِهَ اللَّهُ لِقَاءَهُ، وَالْمَوْتُ قَبْلَ لِقَاءِ اللَّهِ"،

علی بن مسہر نے زکریا سے، انہوں نے شعبی سے، انہوں نے شریح بن ہانی سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص اللہ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے، اللہ اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو شخص اللہ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، اللہ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور موت اللہ کی ملاقات سے پہلے ہے۔“ (ملاقات کا معاملہ اس کے بعد آئے گا۔)

[بخاری / صحیح مسلم / کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار / حدیث: 6824]

اسلامی علوم کی رو سے، مومن کے لیے موت کی سختی اس کی روح کی صفائی اور درجات کی بلندی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ رومی کا "خون بہا کو خلعت پہچاننا" دراصل اسی حدیث کی شاعرانہ تشریح ہے کہ مومن دنیاوی زندگی (خون) کے بدلے اللہ کا قرب (خلعت) پاتا ہے۔

موت بطورِ 'جسر' (پل)

اسلامی فکر میں ایک مشہور قول ہے" :**الموتُ جِسرٌ یُوصِلُ الحبیبَ إلَی الحبیب** "(موت ایک پل ہے جو ایک دوست کو دوسرے دوست سے ملا دیتا ہے)۔

- **بقاباللہ :**صوفیہ اور علمائے باطن کے نزدیک دنیا ایک قید خانہ ہے (الدنیا سجن المؤمن)۔ جب روح اس قید سے نکلتی ہے تو وہ حقیقت میں اپنی اصل (خالق) سے جا ملتی ہے۔
- **تبدیلیِ مکان :**اسلامی علوم میں موت کو "فنا" (ختم ہونا) نہیں بلکہ "انتقال" (ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا) کہا گیا ہے۔ اسی لیے رومی اسے ایک سفر (گھوڑے پر سوار ہونا) قرار دیتے ہیں۔

تسلیم و رضا کا مقام

اسلامی اخلاقیات (علمِ اخلاق) میں "رضا" ایک بلند مقام ہے۔ جب انسان اللہ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جاتا ہے، تو وہ آزمائش اور تکلیف میں بھی اللہ کی حکمت دیکھتا ہے۔

- رومی کے شعر میں زرگر نے اپنی بیماری اور موت کو اللہ کی طرف سے ایک "تحفہ" (خلعت) جانا کیونکہ اسے ادراک ہو گیا تھا کہ یہ ظاہری زوال دراصل باطنی کمال کا راستہ ہے۔

خلاصہ

اسلامی نقطہ نظر سے یہ شعر 'زہد' اور 'عرفان' کی اس انتہا کو ظاہر کرتا ہے جہاں انسان مادی دنیا کی محبت سے نکل کر اللہ کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ اس قرآنی حقیقت کی ترجمانی ہے کہ ہماری زندگی، موت اور قربانی سب اللہ ہی کے لیے ہے:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (سورہ الانعام)

کلاسیکی عربی اور فارسی شاعری میں موت، فنا اور وصالِ الٰہی کے تصورات کو ایک "مبارک سفر" اور "اعزاز" کے طور پر بیان کرنے کی ایک طویل روایت موجود ہے۔ شعراء نے اسے محض جسم کا ختم ہونا نہیں، بلکہ روح کی قید سے رہائی اور محبوبِ حقیقی سے ملاقات کا نام دیا ہے۔

ذیل میں عربی اور فارسی کے اہم شعراء کے کلام سے اس حقیقت کی چند مثالیں پیش ہیں:

فارسی شاعری: موت بطورِ 'عرس' (شادی)

فارسی شعراء، خاص طور پر صوفی شعراء کے ہاں موت کا تصور "عرس" یعنی شادی اور ملاپ کا ہے۔

- **حافظ شیرازی:** حافظ کے ہاں دنیا ایک ویرانہ ہے اور موت اس ویرانے سے نکل کر محبوب کے دربار تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

خُرم آن روز کزیں منزلِ ویراں بروم

راحتِ جاں طلبم وزپیِ جاناں بروم

)کتنا مبارک ہو گا وہ دن جب میں اس ویران منزل (دنیا) سے رخصت ہوں گا؛ میں اپنی جان کا سکون ڈھونڈوں گا اور اپنے محبوب کے پیچھے چل دوں گا۔(

- **شیخ فرید الدین عطار:** عطار کے نزدیک موت روح کا اپنے اصل وطن کی طرف پرواز کر جانا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حق کے راستے پر چلنے والوں کے لیے موت ایک نئی زندگی کا آغاز ہے:

مرگ، حق کے بندے کے لیے دوسری زندگی ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں قطرہ سمندر بن جاتا ہے۔

- **خسرو دہلوی:** امیر خسرو نے عشقِ الٰہی میں فنا ہونے کو زندگی کی معراج قرار دیا:

خسرو غریب است و گدا، افتادہ در شہر شما

باشد کہ از بہرِ خدا، سوئے غریباں بنگری

)خسرو تو ایک مسافر اور گدا ہے، وہ تو بس اس انتظار میں ہے کہ کب اسے محبوب کی ایک جھلک ملے اور وہ اس پر اپنی جان نثار کر دے۔(

عربی شاعری: موت بطورِ 'حیاتِ ابدی'

عربی شاعری میں، خاص طور پر صوفیانہ اور رزمیہ (Heroic) رنگ میں، موت کو وقار اور بقا کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

- **منصور حلاج:** حلاج کا یہ عربی قول اور شعر تاریخِ تصوف میں امر ہے، جہاں وہ موت کو زندگی کا جوہر قرار دیتے ہیں:

أُقتُلونی یاثِقاتی،إنّ فی قَتلی حَیاتی

وَمَماتی فی حَیاتی،وَحَیاتی فی مَماتی

)اے میرے معتبر دوستو! مجھے قتل کر دو کہ میرے قتل ہونے میں ہی میری زندگی ہے؛ میری موت میری (مادی) زندگی میں ہے اور میری (اصل) زندگی میری موت میں ہے۔(

- **ابن الفارض (سلطان العاشقین):** عربی کے عظیم صوفی شاعر ابن الفارض کے ہاں موت محبوب کے مشاہدے کا پردہ ہٹ جانے کا نام ہے۔ ان کے نزدیک عاشق کے لیے سب سے بڑی خلعت (اعزاز) یہ ہے کہ وہ راہِ عشق میں فنا ہو جائے۔

- **متنبی (رزم وبزم):** اگرچہ متنبی ایک درباری اور رزمیہ شاعر تھے، لیکن انہوں نے بھی موت کو ذلت کی زندگی پر فوقیت دی۔ ان کا مشہور قول ہے:

"موت کو عزت کے ساتھ پانا، زندگی کو ذلت کے ساتھ گزارنے سے بہتر ہے۔" یہ رومی کے اس تصور سے ملتا جلتا ہے کہ موت ایک "خلعت" (عزت کا لباس) ہے۔

کلاسیکی شعراء کے نزدیک زندگی ایک "امانت" تھی اور موت اس امانت کو اصل مالک کے سپرد کرنے کا جشن۔ اسی لیے انہوں نے اسے ماتم کے بجائے "خوشی خوشی دوڑنے" (شاد تاختن) سے تشبیہ دی۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر فنی اور معنوی اعتبار سے بلاغت کا شاہکار ہے۔ اس کے شعری محاسن کو درج ذیل نکات میں سمجھا جا سکتا ہے:

1. استعارہ (Metaphor)

اس شعر کا سب سے بڑا حسن اس کے **استعارات** ہیں۔

- **'اسبِ تازی'** **(عربی گھوڑا)**: یہ محض ایک جانور نہیں بلکہ 'شوقِ الٰہی' یا 'روح کی بے تابی' کا استعارہ ہے۔ جس طرح عربی گھوڑا اپنی تیزی اور اصالت کے لیے مشہور ہے، اسی طرح عارف کی روح بھی اپنے رب کی طرف تیزی سے لپکتی ہے۔
- **'خلعت'** **(شاہی لباس)**: موت کو 'لباسِ فاخرہ' سے تشبیہ دینا ایک اچھوتا استعارہ ہے، جو بتاتا ہے کہ یہ فنا نہیں بلکہ ایک عظیم مرتبے کا حصول ہے۔

2. صنعتِ تضاد و پارادوکس (Paradox)

شعر میں ایک خوبصورت معنوی تضاد پایا جاتا ہے:

- عام طور پر **'خون بہا'** (قیمتِ قتل) کسی نقصان یا جان جانے کے بدلے میں دیا جاتا ہے اور یہ غم کا موقع ہوتا ہے۔
- رومیؒ نے اسے **'خلعت'** (اعزاز) قرار دیا ہے۔ یعنی جس چیز کو دنیا 'خسارہ' سمجھتی ہے، عاشقِ صادق اسے 'انعام' سمجھ رہا ہے۔ یہ تضاد شعر میں گہری معنویت پیدا کر رہا ہے۔

3. متحرک پیکر تراشی (Dynamic Imagery)

رومیؒ نے الفاظ کے ذریعے ایک متحرک تصویر کشی (Visuals) کی ہے:

- **'بر نشست'** **(سوار ہوا)** اور **'شاد تاخت'** **(خوشی سے دوڑا)** ایسے افعال ہیں جو جمود کے بجائے حرکت کو ظاہر کرتے ہیں۔
- قاری کی آنکھوں کے سامنے ایک شہسوار آجاتا ہے جو میدانِ جنگ یا میدانِ عشق میں فتح و کامرانی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ موت کے روایتی "ساکت اور تاریک" تصور کے بالکل برعکس ہے۔

4. ایجاز و اختصار (Conciseness)

اس ایک شعر میں رومیؒ نے زندگی، موت، عرفان، رضا اور وصالِ الٰہی کے پورے فلسفے کو سمو دیا ہے۔

- پہلے مصرعے میں **عزم اور حرکت** ہے (سفر کا آغاز)۔
- دوسرے مصرعے میں **ادراک اور نتیجے کی خوشی** ہے (سفر کا مقصد)۔

5. حسنِ ترتیب اور لفظی مناسبت

شعر کے الفاظ میں ایک خاص ربط ہے:

- گھوڑے (اسب) کے ساتھ '**تاخت**' (دوڑنا) کی مناسبت۔
- شاہی گھوڑے کے ساتھ '**خلعت**' (بادشاہ کا دیا ہوا جوڑا) کی مناسبت۔ یہ لفظی تلازمات شعر کے مجموعی ڈھانچے کو بہت مضبوط اور مربوط بناتے ہیں۔

مختصر یہ کہ: فنی لحاظ سے یہ شعر '**سہلِ ممتنع**' کی بہترین مثال ہے—یعنی بظاہر سادہ الفاظ، لیکن اپنے اندر معانی کا ایک سمندر چھپائے ہوئے۔ رومیؒ نے خوفِ موت کو شوقِ وصال میں بدلنے کے لیے الفاظ کا بہترین انتخاب کیا ہے۔

ای شدہ اَندَر سَفَر با صدرِ رضا

خود بہ پایِ خویش تا سوءُ القَضا

مشکل الفاظ کے معنی

اَی شدہ = اے وہ شخص جو ہو گیا / اے جو بن گیا۔۔۔ **اَندَر سَفَر** = سفر میں۔۔۔ **صَدرِضا** = سو فیصد رضا، مکمل خوشی اور رضامندی۔۔۔ **خود بہ پایِ خویش** = اپنے ہی قدموں سے، اپنی مرضی سے۔۔۔ **تا** = یہاں تک کہ

سوءُالقَضا = بری تقدیر، بُرا انجام، مصیبت یا آفت

ترجمہ: اے وہ شخص! جو (اپنی دانست میں) پوری خوشی اور رضامندی کے ساتھ سفر پر روانہ ہوا، حالانکہ تو خود اپنے پاؤں چل کر اپنی بری تقدیر (مصیبت) کی طرف جا رہا ہے۔

اس شعر میں مولانا روم انسانی نفسیات اور **قضا و قدر** (تقدیر) کے ایک گہرے نکتے کی وضاحت کر رہے ہیں۔ اس کے اہم پہلو درج ذیل ہیں:

۱ . دھوکا اور خوش فہمی : انسان اکثر یہ سمجھتا ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کر رہا ہے، وہ اس کی اپنی عقل اور مرضی کا نتیجہ ہے۔ وہ کسی کام کو کرنے کے لیے بڑے جوش و خروش اور "صدر رضا" (پوری خوشی) کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ انجام کیا ہو گا۔

۲ . تدبیر بمقابلہ تقدیر : مولانا فرماتے ہیں کہ بعض اوقات انسان جس چیز کو اپنے لیے نفع بخش سمجھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے، حقیقت میں وہ اس کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے پاؤں سے چل کر خود کو ہلاکت یا مصیبت میں ڈال دیتا ہے، مگر اسے اس کا علم نہیں ہوتا۔ اسے ہی "سوء القضا" کہا گیا ہے یعنی وہ برا وقت جو تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔

۳ . بے بسی کا اظہار : یہ شعر انسان کو عجز اور انکساری کا سبق دیتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی عقل پر کتنا ہی ناز کیوں نہ کرے، وہ کائنات کے کلی نظام (Divine Plan) سے واقف نہیں ہے۔ کئی بار ہم بڑی خوشی سے اس راستے کا انتخاب کرتے ہیں جو ہمیں ناکامی کی طرف لے جاتا ہے۔

حاصلِ کلام : شاعر کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اپنی تدبیر پر حد سے زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اور ہر حال میں اللہ کی پناہ اور ہدایت طلب کرنی چاہیے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ ہمارا اٹھنے والا اگلا قدم ہمیں کامیابی کی طرف لے جا رہا ہے یا کسی آزمائش کی طرف۔

قرآن و سنت کی روشنی میں مولانا روم کے اس شعر کا مفہوم **تقدیر، انسانی ارادہ اور مشیتِ الٰہی** کے باہمی تعلق سے واضح ہوتا ہے۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسان کو عمل کی آزادی دی گئی ہے، مگر حتمی نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس تصور کو درج ذیل نکات سے سمجھا جا سکتا ہے:

علمِ الٰہی اور انسانی بے خبری

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ انسان اپنی محدود عقل سے جس چیز کو بہتر سمجھتا ہے، ممکن ہے وہ اس کے لیے بری ہو:

"وعسیٰ اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

"ترجمہ: اور بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ — (سورۃ البقرہ:216

رومی کا شعر اسی **"تم نہیں جانتے "** کی تشریح ہے کہ تم تو خوشی خوشی (صدر رضا) جا رہے ہو، مگر انجام سے بے خبر ہو۔

۲ . تدبیر پر تقدیر کا غلبہ

حدیثِ نبوی ﷺ میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی فیصلے کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو انسان کی عقل اس وقت کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔

- **مفہوم حدیث" :** جب اللہ کسی بندے پر اپنی قضا (فیصلہ) نافذ کرنا چاہتا ہے تو اس سے عقل چھین لیتا ہے تاکہ وہ قضا پوری ہو جائے، اور جب وہ نافذ ہو جاتی ہے تو عقل واپس لوٹا دیتا ہے، تب انسان پشیمان ہوتا ہے۔"

یہ وہی کیفیت ہے جسے رومی **"خود بہ پائے خویش "** (اپنے ہی پاؤں سے چل کر جانا) کہہ رہے ہیں، یعنی انسان خود ہی ایسے اسباب پیدا کرتا ہے جو اسے آزمائش کی طرف لے جاتے ہیں۔

۳ . موت اور جگہ کا تعین

ایک مشہور روایت کے مطابق، ملک الموت ایک شخص کو بادشاہ (سلیمان علیہ السلام) کے دربار میں دیکھ کر حیران ہوئے، کیونکہ اللہ نے انہیں اس شخص کی روح "ہند" (یا کسی دور دراز مقام) میں قبض کرنے کا حکم دیا تھا جبکہ وہ یہاں بیٹھا تھا۔ وہ شخص خوفزدہ ہو کر ہوا کے ذریعے وہاں پہنچ گیا جہاں اس کی موت لکھی تھی۔

- یہ اس بات کی عملی تفسیر ہے کہ انسان اپنی "رضا" سے سفر کرتا ہے تاکہ وہاں پہنچے جہاں "قضا" اس کا انتظار کر رہی ہے۔

۴ . توکل اور استخارہ کی اہمیت

چونکہ انسان انجام سے بے خبر ہے، اس لیے اسلام نے **استخارہ** کی تعلیم دی ہے۔

- استخارہ کی دعا کا مفہوم ہی یہ ہے: "اے اللہ! اگر یہ کام میرے حق میں بہتر ہے تو اسے میرے لیے آسان کر دے، اور اگر یہ برا ہے تو اسے مجھ سے پھیر دے۔"

- رومی کا شعر دراصل انسان کو اس **تکبر** سے روکتا ہے کہ "میں جو کر رہا ہوں وہ بالکل درست ہے"۔

خلاصہ

قرآن و سنت کی رو سے اس شعر کا پیغام **عجز (Humility)** ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ:

1. انسان کو اپنی عقل اور تدبیر پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔
2. ہر قدم اٹھاتے وقت اللہ کی ہدایت اور پناہ مانگنی چاہیے (جیسے ہم نماز میں **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ** کہتے ہیں)۔
3. اگر انسان اپنی پوری کوشش کے باوجود کسی مشکل (سوء القضا) میں پھنس جائے، تو اسے صبر کرنا چاہیے کہ یہ اللہ کی مشیت تھی۔

صوفیائے کرام نے اس نکتے کی تشریح **"ارادۂ بشری "** اور **"مشیتِ الٰہی "** کے درمیان لطیف تعلق سے کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ شعر محض بے بسی کا نوحہ نہیں، بلکہ معرفت کا ایک بلند مقام ہے۔

علماء اور محققین کے ارشادات کی روشنی میں اس کے تین بنیادی پہلو ہیں:

ادراکِ عقل کی محدودیت (حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کا نقطہ نظر)

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی عقل ایک چراغ کی مانند ہے جو صرف سامنے کا راستہ دکھاتی ہے، لیکن وہ یہ نہیں دیکھ سکتی کہ موڑ کے پیچھے کیا ہے۔ علمائے حقہ کے مطابق، انسان جب اپنی عقلِ جزوی پر کلی بھروسہ کر لیتا ہے اور اللہ سے رجوع (استخارہ و دعا) چھوڑ دیتا ہے، تو اللہ اسے اس کی عقل کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنی خوشی سے اس راستے پر چل پڑتا ہے جو بظاہر پھولوں بھرا مگر حقیقت میں "سوء القضا" (ناگوار فیصلے) کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔

اسباب کا پردہ اور حقیقتِ قضا

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور دیگر علمائے ربانی کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو "عالمِ اسباب" بنایا ہے۔

- اللہ کا فیصلہ (قضا) براہِ راست نازل نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ انسان خود بخود اس طرف مائل ہو جاتا ہے۔

- علماء فرماتے ہیں کہ **"جب تقدیر آتی ہے تو بصیرت اندھی ہو جاتی ہے"**۔ رومی کے شعر میں "صدر رضا" اسی لیے کہا گیا کہ اللہ اس وقت بندے کی رغبت اور پسند کو اسی طرف موڑ دیتا ہے جہاں اس کی قضا لکھی ہوتی ہے تاکہ اللہ کا حکم پورا ہو سکے۔

۳. جبر و قدر کا اعتدال

اہلِ سنت و جماعت کے علماء اس بارے میں **"لاجبر ولا تفویض "**(نہ مکمل جبر ہے نہ مکمل اختیار) کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

- رومی کا یہ شعر اس "اختیار" کی نفی نہیں کر رہا، بلکہ یہ بتا رہا ہے کہ تمہارا اختیار اللہ کے اختیار کے تحت ہے۔
- علمائے حقہ کہتے ہیں کہ انسان کو "مکلف" (ذمہ دار) اس لیے بنایا گیا کہ وہ چلے (کوشش کرے)، لیکن اسے "عاجز" اس لیے رکھا گیا تاکہ وہ جان لے کہ چلانے والا کوئی اور ہے۔

۴. حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات

غوثِ اعظمؒ فرماتے ہیں کہ جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اسے اللہ کی مشیت کے سپرد کر دو۔ آپؒ کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس کی رضا (صدر رضا) کو خدا کی رضا پر مقدم رکھتا ہے، وہ اکثر اپنے پاؤں سے اپنی مصیبت خریدتا ہے۔
صوفیائے کرام اس شعر کو **"فنائے ارادہ "**کا سبق قرار دیتے ہیں، یعنی اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں گم کر دینا۔

(حاصلِ بحث)

علمائے حقہ اس شعر کی روشنی میں یہ تین نصیحتیں کرتے ہیں:

1. **استخارہ کی عادت :** تاکہ انسان اپنی محدود عقل کے شر سے بچ کر اللہ کے لامتناہی علم کی پناہ لے لے۔
2. **دعائے خیر :** حدیث پاک ہے کہ "دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے"۔ اس لیے ہمیشہ اللہ سے خیر کا سوال کرنا چاہیے۔
3. **عجز و نیاز :** جب کامیابی ملے تو اسے اپنی تدبیر نہ سمجھیں، اور جب ناکامی (سوء القضا) آئے تو اسے اللہ کی حکمت سمجھ کر صبر کریں۔

علماء فرماتے ہیں کہ رومی یہاں ڈرا نہیں رہے، بلکہ بیدار کر رہے ہیں کہ اے مسافر! تو اپنے پاؤں پر نہیں، اللہ کے کرم پر بھروسہ کر کے سفر کر۔

در خیالَش مُلک و عِزّ و مہتری
گفت عزرائیل رو آرے بَری

مشکل الفاظ کے معنی

در خیالَش = اس کے خیال میں، اس کے گمان میں ...... **مُلک** = بادشاہت، سلطنت۔۔۔ **عِزّ** = عزت، بزرگی

مِہتری = برتری، سرداری، بزرگی۔۔۔ **گفت** = کہا۔۔۔ **عزرائیل** = عزرائیل۔۔۔ **رو** = چہرہ، رخ

آری = لاتا ہے، لے آتا ہے۔۔۔ **بَری** = لے جانا، اٹھا لے جانا

ترجمہ

اس (غافل انسان) کے خیال میں تو سلطنت، عزت اور سرداری کے منصوبے تھے مگر عزرائیل نے (طنزاً) کہا: "ہاں! ضرور، اب یہاں سے کوچ کر اور یہ سب ساتھ لے جا"

اس شعر میں مولانا روم انسانی نفسیات کی ایک تلخ حقیقت کو بیان کر رہے ہیں۔ انسان اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مستقبل کی منصوبہ بندی، جائیداد بنانے، نام و نمود حاصل کرنے اور دوسروں پر برتری ثابت کرنے میں گزار دیتا ہے۔

تشریح کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

- **انسانی عزائم اور غفلت:** شعر کے پہلے مصرعے میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے ذہن میں ہر وقت دنیاوی ترقی کے نقشے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اپنی طاقت، دولت اور سرداری (مہتری) کا دائرہ وسیع کرتا رہے گا۔ وہ اپنی 'خیالی دنیا' میں مگن رہتا ہے۔
- **موت کی اچانک آمد:** دوسرے مصرعے میں اچانک عزرائیل (موت کے فرشتے) کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ موت انسان کے منصوبوں کی تکمیل کا انتظار نہیں کرتی۔ جب وقتِ مقررہ آتا ہے تو موت تمام دنیاوی تگ و دو کو ایک لمحے میں ختم کر دیتی ہے۔

- **عزرائیلؑ کا طنز (آری بَری) :** اس شعر کا سب سے خوبصورت پہلو عزرائیلؑ کا جواب ہے۔ جب انسان اپنی جاہ و حشم چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا، تو فرشتہ طنزیہ کہتا ہے: "ہاں! تو ٹھیک کہتا ہے، یہ سب بہت قیمتی ہے، چل اب یہاں سے کوچ کر اور دیکھتے ہیں کہ تو اس میں سے کیا کچھ اپنے ساتھ قبر میں لے جا سکتا ہے "! ظاہر ہے کہ قبر میں نہ سلطنت جاتی ہے، نہ عہدہ اور نہ سرداری۔ عزرائیل کا یہ کہنا دراصل انسان کی بے بسی پر ایک گہرا طنز ہے۔
- **حاصلِ کلام :** مولانا رومؒ کا پیغام یہ ہے کہ جو چیز تمہارے ساتھ قبر میں نہیں جا سکتی، اس پر تکبر کرنا اور اسے ہی زندگی کا کل مقصود بنا لینا سراسر نادانی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ان 'خیالی' چیزوں کے بجائے ان اعمال کی فکر کرے جو حقیقت میں اس کے ساتھ جانے والے ہیں۔

مولانا رومؒ کا یہ شعر قرآن و سنت کے ان آفاقی حقائق کی ترجمانی کرتا ہے جو انسانی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی فکر پر زور دیتے ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس شعر کے مفہوم کو درج ذیل نکات کے تحت سمجھا جا سکتا ہے:

طولِ امل (لمبی امیدیں) اور غفلت

شعر کا پہلا مصرعہ انسان کی ان لمبی امیدوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے اسلامی اصطلاح میں "**طولِ امل** " کہا جاتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اپنی جاہ و حشم کو بڑھاتا رہے گا۔

- **قرآنی نکتہ :** سورہ الھمزہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ

ترجمہ: وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

- نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ زمین پر چند لکیریں کھینچیں اور فرمایا کہ یہ انسان کی امیدیں ہیں اور موت ان کے درمیان ہے، یعنی امیدیں بہت دور تک پھیلی ہوتی ہیں مگر موت اچانک آ کر سب ختم کر دیتی ہے۔

کثرت کی ہوس اور دنیا کی حقیقت

شعر میں مذکور 'ملک و عز و مہتری' دراصل دنیاوی تفاخر کی علامتیں ہیں۔ قرآن کریم نے اسے 'تکاثر' سے تعبیر کیا ہے۔

- سورہ التکاثر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ۔ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ)

ترجمہ: تمہیں ایک دوسرے سے زیادہ مال و دولت حاصل کرنے کی ہوس نے غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔ یہ آیت بالکل اسی کیفیت کو بیان کر رہی ہے جو مولانا نے بیان کی کہ انسان اپنی خیالی سلطنتوں میں گم ہوتا ہے کہ اچانک موت کا فرشتہ آ کھڑا ہوتا ہے۔

موت کی اچانک آمد اور بے بسی

عزرائیل علیہ السلام کا یہ کہنا کہ "ہاں! اب لے جا یہ سب" ایک عبرت انگیز طنز ہے، کیونکہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق انسان دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے۔

- صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں: اس کے گھر والے، اس کا مال اور اس کے اعمال۔ دو چیزیں (گھر والے اور مال) واپس لوٹ آتی ہیں اور صرف **عمل** اس کے ساتھ رہ جاتا ہے۔"

- رومی کے شعر میں عزرائیل کا جملہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جن چیزوں (ملک و سرداری) کے تم خواب دیکھ رہے تھے، وہ یہیں رہ جائیں گی، تمہارے ساتھ صرف تمہارے عمل جائیں گے۔

دنیا بطورِ امتحان گاہ

اسلام دنیاوی مال و دولت یا منصب کو بذاتِ خود برا نہیں کہتا، بلکہ ان میں **"غرق"** ہو کر خدا کو بھول جانے کو فتنہ قرار دیتا ہے۔

- سورہ آل عمران میں ہے:

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ

)ترجمہ: اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔ (رومی کا لفظ 'خیال' (در خیالش...) اسی قرآنی لفظ 'غرور' (دھوکے / وہم) کی شاعرانہ تشریح ہے۔

خلاصہ بحث

قرآن وسنت کی روشنی میں مولانا روم یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ:

1. انسان کا اپنی طاقت اور عہدے پر غرور کرنا ایک **نفسانی دھوکہ** ہے۔
2. موت کسی بھی وقت ان تمام دنیاوی منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی ہے۔
3. عقلمند وہ ہے جو دنیا میں رہتے ہوئے سرداری اور مال کو اللہ کی امانت سمجھے اور اسے آخرت کی بہتری کے لیے استعمال کرے، نہ کہ اسے اپنی ابدی زندگی کا محور بنا لے۔

نفسیاتی اور فکری (Psychological and Intellectual) پہلوؤں سے یہ شعر انسانی وجود کی گہری پرتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ مولانا روم یہاں صرف ایک مذہبی حقیقت بیان نہیں کر رہے، بلکہ وہ انسانی شعور اور لاشعور کے درمیان جاری کشمکش کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔

ذیل میں اس کا تجزیہ پیش ہے:

ا۔ نفسیاتی تجزیہ (Psychological Perspective)

نفسیاتی طور پر یہ شعر انسانی "انا (Ego) "اور" دفاعی نظام (Defense Mechanism) "کی عکاسی کرتا ہے:

- **خبطِ عظمت :(Grandiosity)** پہلے مصرعے میں جس 'ملک و عز و مہتری' کا ذکر ہے، وہ نفسیات میں Grandiosity کہلاتی ہے۔ انسان اپنی محدود حیثیت کو تسلیم کرنے کے بجائے اپنے ذہن میں خود کو ایک عظیم اور طاقتور ہستی تصور کر لیتا ہے تاکہ وہ اپنی کمتری اور موت کے خوف (Existential Anxiety) سے بچ سکے۔
- **تخیل بطور فرار :(Escapism)** لفظ 'خیال' یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان اپنی ایک متوازی دنیا (Fantasy World) بسا لیتا ہے۔ وہ حال میں جینے کے بجائے مستقبل کے ان منصوبوں میں رہتا ہے جو کبھی پورے نہیں ہونے۔ یہ ذہنی حالت اسے "حقیقت پسندی" سے دور کر دیتی ہے۔
- **صدمہِ حقیقت :(Reality Shock)** عزرائیل کا کردار یہاں محض ایک فرشتہ نہیں، بلکہ **"اصولِ حقیقت "** (Reality Principle) ہے۔ جب خیالی دنیا کا تصادم تلخ حقیقت سے ہوتا ہے، تو وہ ذہنی ساخت لمحوں میں بکھر

جاتی ہے۔ عزرائیل کا طنز 'آری بری' (ہاں ہاں، لے جا) دراصل اس نفسیاتی صدمے کی انتہا ہے جہاں انسان کو اپنی بے بسی کا پہلی بار صحیح احساس ہوتا ہے۔

۲۔ فکری اور فلسفیانہ تجزیہ (Intellectual Perspective)

فکری لحاظ سے یہ شعر وجودیت (Existentialism) اور مابعد الطبیعیات کے اہم سوالات اٹھاتا ہے:

- **ہونے اور رکھنے کا فرق (Being vs Having):** مشہور مفکر ایرک فروم (Erich Fromm) کے نظریے کے مطابق، انسان دو طرح سے جیتا ہے: "کچھ بن کر (To Be)" یا "کچھ رکھ کر (To Have)"۔ رومی کا غافل انسان 'رکھنے' (ملک و دولت) کے خمار میں ہے، جبکہ موت 'ہونے' کی حقیقت کو آشکار کرتی ہے۔ فکرِ رومی یہ ہے کہ جو چیز تمہارے وجود کا حصہ نہیں، وہ تمہاری نہیں ہے۔

- **وقت کی جبریت:** فکری طور پر یہ شعر وقت کے دو رخ دکھاتا ہے۔ ایک وہ وقت جو انسان کے وہم و گمان میں ہے (مستقبل کی سرداری)، اور دوسرا وہ وقت جو کائناتی سچائی ہے (موت کا لمحہ)۔ ان دونوں کے درمیان کا تضاد ہی "انسانی المیہ (Human Tragedy)" ہے۔

- **وجود کی لایعنیت (Absurdity):** فلسفہِ لایعنیت کے مطابق، انسان ایک ایسی دنیا میں ابدی نقش چھوڑنا چاہتا ہے جو خود فانی ہے۔ مولانا روم عزرائیل کے مکالمے کے ذریعے اس انسانی تگ و دو کی لایعنیت پر مہر ثبت کر رہے ہیں کہ تم جس چیز کو اپنی بقا سمجھ رہے ہو، وہ تمہارے ساتھ جا ہی نہیں سکتی۔

۳۔ تقابلی مطالعہ (ایک الگ زاویہ)

جہاں رومی موت کو ایک صدمے کے طور پر دکھاتے ہیں، وہیں قدیم یونانی فلسفہ **"سٹوئیسزم (Stoicism)"** اور رومی کے اس شعر میں ایک قدرِ مشترک ہے جسے **Memento Mori** (یاد رکھو کہ تمہیں مرنا ہے) کہا جاتا ہے۔

حاصلِ فکر: نفسیاتی اور فکری طور پر یہ شعر ہمیں **"بیداری"** کی دعوت دیتا ہے۔ یہ پیغام دیتا ہے کہ اپنی شناخت ان چیزوں سے وابستہ نہ کرو جو تم سے چھین لی جائیں گی، بلکہ اپنی حقیقت کو اس جوہر میں تلاش کرو جو موت کے بعد بھی باقی رہے۔

مولانا روم کے اس شعر کا مرکزی موضوع "دنیا کی بے ثباتی اور موت کی ناگہانی" ہے۔ کلاسیکی عربی اور فارسی شاعری میں یہ مضمون ایک مستقل روایت کے طور پر موجود ہے۔ ذیل میں نامور شعراء کے کلام سے اس مفہوم کی وضاحت پیش ہے:

۱. فارسی شعراء کے کلام سے مثالیں

فارسی شاعری میں عمر خیام اور شیخ سعدی نے اس موضوع کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

حکیم عمر خیام:

خیام نے بادشاہوں کے جاہ و جلال اور ان کے عبرت ناک انجام کو سب سے زیادہ موضوع بنایا۔

آن قصر کہ بہرام درو جام گرفت

آہو بچہ کرد و روبہ آرام گرفت

ترجمہ: وہ محل جہاں بہرام (بادشاہ) جامِ مے پیا کرتا تھا، آج وہاں ہرن بچے دیتے ہیں اور لومڑیاں آرام کرتی ہیں۔

یہ رومی کے 'ملک و عز' (سلطنت و عزت) کے انجام کی بہترین تصویر ہے۔

شیخ سعدی شیرازی:

سعدی فانی دنیا کی حقیقت کو ایک مسافر خانے سے تشبیہ دیتے ہیں۔

بر این مقتدر فانی مکن تکیہ

کہ ہر کس کہ آمد برفت از میاں

ترجمہ: اس فانی اقتدار پر بھروسہ نہ کر، کیونکہ جو بھی یہاں آیا وہ آخر کار رخصت ہو گیا۔

مرزا عبد القادر بیدل:

چونکہ آپ بیدل کے ذوق سے واقف ہیں، بیدل اس 'خیال' اور 'وہم' کی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

غافل مشو ز مرگ کہ در عرصۂ وجود

ہر جا کہ پا نہی لبِ گورے کشودہ اند

ترجمہ: موت سے غافل نہ ہو کہ اس ہستی کے میدان میں، جہاں بھی تم قدم رکھتے ہو، وہاں ایک قبر نے اپنا منہ کھول رکھا ہے۔

یہ رومی کے اس مصرعے کی تشریح ہے کہ انسان خیالی محل بناتا ہے جبکہ موت قدموں کے نیچے ہوتی ہے۔

۲ .کلاسیکی عربی شعراء کے کلام سے مثالیں

عربی شاعری میں زہد (Asceticism) کا رنگ بہت قدیم ہے، بالخصوص ابوالعتاہیہ اس فن کا امام مانا جاتا ہے۔

ابوالعتاہیہ:(Abu al-Atahiya)

اس کا یہ شعر رومی کے مضمون کی ہو بہو عکاسی کرتا ہے:

لِدُوا لِلمَوتِ وَابنوا لِلخَرابِ

فَكُلُّكُمُ يَصيرُ إِلى تُرابِ

ترجمہ: موت کے لیے پیدا ہو اور تباہی کے لیے عمارتیں بناؤ، کیونکہ تم سب کو بالآخر مٹی ہو جانا ہے۔

یہ رومی کے 'ملک و مہتری' (تعمیر و اقتدار) کے جواب میں عزرائیل کا وہ طنزیہ جملہ ہے کہ "ہاں! بنالو، آخر مٹی ہی ہونا ہے"۔

لبید بن ربیعہ (دورِ جاہلیت کا شاعر):

اس کا ایک مشہور مصرعہ جسے رسول اللہ ﷺ نے سچا ترین کلام قرار دیا:

أَلا كُلُّ شَيءٍ ما خَلا اللهَ باطِلُ

ترجمہ: آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے سوا ہر چیز باطل اور فانی ہے۔

سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ (منسوب اشعار):

دنیا کی بے وفائی پر آپ کا یہ قول / شعر رومی کے 'خیال' والے نکتے کو واضح کرتا ہے:

النّاسُ نِيَامٌ فَإِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوا

ترجمہ: لوگ سو رہے ہیں (خیالوں میں ہیں)، جب مریں گے تو بیدار ہوں گے۔

ربط: رومی کا 'در خیالش' دراصل اسی نیند اور غفلت کی طرف اشارہ ہے جو موت کے جھٹکے سے ٹوٹتی ہے

چون رَسید از راہ آن مَردِ غَریب
اَندَر آوَرْدَش بہ پیشِ شَہ طَبیب

مشکل الفاظ کے معنی

چون =جب۔۔۔۔رسید =پہنچا۔۔۔۔راہ =راستہ۔۔۔۔آن مردِ غریب =وہ اجنبی / غریب آدمی

اندر آوردش =اسے اندر لے آیا۔۔۔۔بہ پیشِ شہ =بادشاہ کے سامنے۔۔۔۔طبیب = حکیم / ڈاکٹر

ترجمہ " :جب وہ اجنبی مسافر (روحانی معالج) راستے سے (سفر طے کر کے) پہنچا، تو (خادم یا بادشاہ خود) اس طبیب کو بادشاہ کے حضور لے آیا۔"

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ ایک بادشاہ کی کنیز بیمار ہو جاتی ہے اور دنیا بھر کے حکیم اسے ٹھیک کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بادشاہ مایوس ہو کر اللہ کے حضور گریہ وزاری کرتا ہے، تو اسے بشارت دی جاتی ہے کہ کل تمہارے پاس ایک "مہمان" آئے گا جو اصل طبیب ہے۔

اس شعر کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

- مردِ غریب (اجنبی مسافر) :مولانا روم نے آنے والے اللہ والے کو "غریب" کہا ہے۔ صوفیانہ اصطلاح میں "غریب" وہ ہے جو اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی اصل (عالمِ ارواح) کو یاد رکھتا ہے اور یہاں خود کو مسافر سمجھتا ہے۔ یہ وہ "الٰہی طبیب" تھا جو جسمانی بیماری کے بجائے روح کے امراض کا علاج جانتا تھا۔
- شاہ اور طبیب کی ملاقات :جب وہ درویش صفت طبیب پہنچا، تو اسے پورے احترام کے ساتھ بادشاہ کے پاس لایا گیا۔ یہاں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جب انسان سچے دل سے اللہ سے مدد مانگتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی وسیلے (مرشد یا رہبر) کو اس کی رہنمائی کے لیے بھیج دیتا ہے۔

- ادب اور تعظیم" : اندر آوردش بہ پیشِ شہ " سے مراد یہ ہے کہ حق کے متلاشی (بادشاہ) اور حق دکھانے والے (طبیب) کا آمنا سامنا ہوا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت کے لیے انسان کو اپنے دروازے کھلے رکھنے چاہئیں اور آنے والے "مردِ حق" کی قدر کرنی چاہیے۔

خلاصہ : یہ شعر اس لمحے کی عکاسی کرتا ہے جہاں دعا کی قبولیت ظاہر ہوتی ہے۔ بادشاہ (جو کہ ایک طالبِ حق کی علامت ہے) کے پاس اللہ کا بھیجا ہوا خاص بندہ پہنچ جاتا ہے تاکہ وہ اس کی مشکل (کنیز کی بیماری جو کہ نفس کی الجھنوں کی علامت ہے) کو حل کر سکے۔ یہ انسانی کوشش کے ختم ہونے اور اللہ کی رحمت کے شروع ہونے کا مقام ہے

مولانا روم کی مثنوی کے اس شعر اور واقعے کی بنیاد خالصتاً قرآنی فلسفے اور اسلامی مآخذ پر ہے۔ مولانا روم کو "خداوندگارِ معنوی" اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مشکل ترین مفاہیم کو حکایات کے پیرائے میں سمجھاتے ہیں۔

اس شعر میں "مردِ غریب" (روحانی طبیب) کی آمد اور بادشاہ کے مسئلے کا حل ہونا، اسلامی نقطہ نظر سے درج ذیل مآخذ اور اصولوں کی ترجمانی کرتا ہے:

۱. التجا اور قبولیت (مقامِ اضطرار)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ) سورہ النمل:62" (بھلا کون ہے جو بے قرار کی پکار سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس کی تکلیف دور کر دیتا ہے؟"

اس شعر سے پہلے بادشاہ نے دنیاوی اسباب (عام حکیموں) سے ناامید ہو کر اللہ کے حضور گریہ وزاری کی تھی۔ جب انسان "مقامِ اضطرار" (انتہائی بے بسی) پر پہنچ کر اللہ کو پکارتا ہے، تو اللہ اپنی غیبی مدد بھیجتا ہے۔ یہ شعر اس غیبی مدد کے پہنچنے کی عکاسی ہے۔

۲. مردِ غریب: "طُوبَىٰ لِلْغُرَبَاءِ" کا مصداق

حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

"بَدَأَ الإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ غَرِيبًا فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ "(صحیح مسلم)

" اسلام کی ابتدا غریب (اجنبیت) کی حالت میں ہوئی اور عنقریب یہ ویسا ہی ہو جائے گا، پس خوشخبری ہے غریبوں (اجنبیوں) کے لیے۔"

مولانا روم نے آنے والے طبیب کو **"مردِ غریب "** کہا ہے۔ صوفیانہ مآخذ کے مطابق "غریب" وہ اللہ والے ہوتے ہیں جو دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیاداروں کے لیے اجنبی ہوتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق "عالمِ لاہوت" سے ہوتا ہے۔ وہ ظاہری شان و شوکت کے بجائے باطنی نور سے پہچانے جاتے ہیں۔

۳. علمِ لدنی اور خضرِ راہ کا تصور

اس واقعے کی گہری جڑیں قرآن پاک میں مذکور **حضرت موسیٰ علیہ السلام** اور **حضرت خضر علیہ السلام** کے قصے (سورہ الکہف) میں ملتی ہیں۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ (ظاہری علم کے باوجود) ایک خاص علم کے لیے حضرت خضرؑ کے پاس بھیجے گئے، اسی طرح مثنوی کا بادشاہ اپنے مسئلے کے حل کے لیے اس "غیبی طبیب" کا محتاج دکھایا گیا ہے۔

- **مآخذ :** اسلام میں یہ تصور موجود ہے کہ بعض علوم "کسبی" (پڑھ کر حاصل کردہ) ہوتے ہیں اور بعض "لدنی" (اللہ کی طرف سے عطا کردہ)۔ یہ طبیب اسی علمِ لدنی کا حامل تھا۔

۴. تزکیہ نفس اور باطنی علاج

اسلامی شریعت میں جہاں جسمانی علاج کی اہمیت ہے، وہاں "طبِ روحانی" (روحانی علاج) کو بھی کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۔ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (سورہ الشعراء:88-89)

" جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، مگر وہ جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم (صحت مند دل) لے کر آیا۔"

مثنوی کا یہ طبیب دراصل **"طبیبِ روحانی "** ہے جو دل کے امراض (حسد، عشقِ مجازی کی الجھنیں، نفسانی خواہشات) کا علاج کرتا ہے۔ یہ مآخذِ اسلامیہ کے اسی تصور کی وضاحت ہے کہ انسانی مسائل کی جڑ اکثر اس کے باطن میں ہوتی ہے، جس کے لیے کسی ہادی یا مرشد کی ضرورت پڑتی ہے۔

حاصلِ کلام: یہ شعر ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ جب انسان اپنے تکبر اور مادی وسائل کے بھروسے کو چھوڑ کر اللہ کے سامنے جھک جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق کسی **"مردِ حق "** کو اس کی رہنمائی کے لیے وسیلہ بنا دیتا ہے۔ یہ "مردِ غریب" اللہ کی رحمت اور اس کی صفتِ ہادی کا مظہر بن کر آتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر اور اس سے جڑی حکایت میں **اخلاقیات (Morals)** اور **ضابطہ اخلاق (Ethics)** کے کئی ایسے پہلو پوشیدہ ہیں جو آج کے دور میں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنی صدیوں پہلے تھی۔

اگر ہم اسے اخلاقی زاویے سے دیکھیں تو درج ذیل نکات نمایاں ہوتے ہیں:

۱. عجز و انکساری (Humility in Power)

اس واقعے میں ایک بادشاہ (جو دنیاوی طاقت کا مرکز ہے) ایک اجنبی مسافر (روحانی طبیب) کے سامنے جھک رہا ہے۔

- **اخلاقی سبق:** سچا اخلاق یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت اور عہدے کے نشے میں اندھا نہ ہو۔ جب آپ کو علم، حکمت یا سچائی کی ضرورت ہو، تو اپنی انا (Ego) کو پیچھے چھوڑ کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہی اصل بڑائی ہے۔

۲. ظاہر پرستی سے گریز (Look Beyond Appearances)

مولانا نے طبیب کو "مردِ غریب" (اجنبی / مسافر) کہا ہے۔ وہ کوئی شاہی لباس پہن کر نہیں آیا تھا۔

- **ایتھکس (Ethics):** یہ ہمیں یہ اخلاقی سبق دیتا ہے کہ کسی کی قدر و قیمت اس کے ظاہری حلیے، برانڈڈ لباس یا پروٹوکول سے نہیں لگانی چاہیے۔ اصل جوہر انسان کی باطنی قابلیت اور اس کا کردار ہے۔ کسی "اجنبی" کو حقیر سمجھنا اخلاقی پستی ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے آپ کے مسئلے کا حل اسی کے پاس ہو۔

۳. مہمان نوازی اور ادبِ حصولِ علم (Etiquette of Seeking Knowledge)

شعر میں ہے: "اندر آوردش بہ پیشِ شہ" (اسے بادشاہ کے حضور لایا گیا)۔ بادشاہ نے اسے عام درباریوں کی طرح لائن میں کھڑا نہیں کیا بلکہ اسے خاص مقام دیا۔

- **اخلاقی پہلو:** جب آپ کسی سے رہنمائی یا علاج کے طالب ہوں، تو "ادب" پہلا قرینہ ہے۔ اخلاقیات ہمیں سکھاتی ہیں کہ استاد، معالج اور رہنما کو وہ عزت دی جائے جس کا وہ مستحق ہے، تاکہ وہ پورے شرحِ صدر کے ساتھ آپ کی مدد کر سکے۔

۴. پیشہ ورانہ دیانت (Professional Integrity)

اس قصے میں وہ طبیب کسی لالچ یا فیس کے معاہدے کے تحت نہیں آیا، بلکہ وہ ایک انسانی درد اور خدائی مشن کے تحت پہنچا۔

- **ایتھکس:** طب ہو یا کوئی اور شعبہ، پیشہ ورانہ اخلاقیات (Professional Ethics) یہ ہیں کہ انسان کا مقصد صرف مادی فائدہ نہ ہو، بلکہ خدمتِ خلق اور مسئلے کی جڑ تک پہنچنا ہو۔ وہ طبیب نبض دیکھ کر نہیں بلکہ "باطنی کیفیت" دیکھ کر علاج کرتا ہے، جو ایک پروفیشنل کے لیے انتہا درجے کی توجہ اور خلوص کا تقاضا کرتا ہے۔

۵. ماخذ اور ورثے کی حفاظت (Preservation of Ethical Legacy)

جس طرح ہم قدیم دستاویزات، مہریں یا خاندانی شجرے سنبھال کر رکھتے ہیں تاکہ ہمیں اپنی اصل کا پتہ رہے، مولانا روم یہ پیغام دیتے ہیں کہ "**اخلاقیات** "وہ اصل ورثہ ہے جسے نسل در نسل منتقل ہونا چاہیے۔

- **اخلاقی نکتہ:** اگر بادشاہ میں اخلاق نہ ہوتا تو وہ اپنی دعا کے نتیجے میں آنے والے طبیب کو پہچان ہی نہ پاتا۔ اپنی اقدار (Values) سے جڑے رہنا ہی انسان کو صحیح اور غلط کی تمیز سکھاتا ہے۔

خلاصہ : اخلاقی اعتبار سے یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ **"حاجت مند بن کر جھکنا "** کمزوری نہیں بلکہ دانائی ہے۔ اور ایتھکس کے حوالے سے یہ پیغام دیتا ہے کہ دنیاوی وسائل پر تکبر کرنے کے بجائے سچائی اور دانائی کے سامنے سر نگوں ہونا ہی کامیابی کی کلید ہے۔

مولانا روم کے اس شعر سے اپنی **روحانی آبیاری** (Spiritual Nourishment) کرنے کے لیے ہمیں اسے محض ایک قصے کے طور پر نہیں، بلکہ اپنے وجود کے اندر جاری ایک عمل کے طور پر دیکھنا ہوگا۔ اس شعر میں چھپے روحانی اسرار درج ذیل طریقوں سے ہمارے باطن کی تربیت کر سکتے ہیں:

۱ . اپنے اندر کے "بادشاہ" کو بیدار کریں

اس حکایت میں بادشاہ سے مراد انسان کی **"روح "** ہے، جو اپنے اصل وطن (عالمِ ارواح) میں تو حاکم تھی، مگر اس مادی دنیا کے غموں اور نفس کی بیماریوں (کنیز کی بیماری) میں الجھ کر بے بس ہو گئی ہے۔

- **آبیاری کا نکتہ :** روحانی ترقی تب شروع ہوتی ہے جب انسان یہ تسلیم کر لے کہ اس کے پاس دنیاوی وسائل (حکیم) تو بہت ہیں، مگر روح کا علاج ان کے بس میں نہیں۔ اپنی عاجزی کا اعتراف ہی اللہ کی رحمت کو دعوت دیتا ہے۔

۲" . مردِ غریب" کا انتظار اور پہچان

رومی نے طبیب کو "غریب" (اجنبی) کہا ہے۔ روحانیت میں "اجنبی" وہ روشنی ہے جو ہمارے روزمرہ کے مادی خیالات سے میل نہیں کھاتی۔ یہ ضمیر کی آواز بھی ہو سکتی ہے اور کوئی مرشدِ کامل بھی۔

- **آبیاری کا نکتہ :** کیا ہم اپنے اندر آنے والے اس "خیر" کے پیغام کو پہچاننے کے لیے تیار ہیں؟ اکثر ہدایت ہمارے پاس ایک "اجنبی" یا "غیر متوقع" صورت میں آتی ہے۔ روحانی آبیاری کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے دل کے دروازے پر پہرہ دے اور ہر اس خیال یا ہستی کی قدر کرے جو اسے اللہ کی یاد دلائے۔

۳" . اندر آوردش" (اسے اندر لے آنا)

شعر کا یہ ٹکڑا سب سے اہم ہے۔ بادشاہ طبیب کو باہر نہیں چھوڑتا بلکہ اپنے محل کے اندر، یعنی اپنے مرکز میں لے آتا ہے۔

- **آبیاری کا نکتہ :** ہم اکثر اچھی باتیں سنتے ہیں (باہر کا راستہ)، لیکن انہیں اپنے "اندر" نہیں لاتے۔ روحانی آبیاری تب ہوتی ہے جب آپ حق بات کو صرف سنیں نہیں، بلکہ اسے اپنے **باطن کا مکین** بنا لیں۔ جب تک وہ "طبیب" (نیک خیال یا ذکرِ الٰہی) آپ کے دل کے نہاں خانے میں داخل نہیں ہو گا، وہ علاج شروع نہیں کر سکے گا۔

۴. تسلیم و رضا کا مقام

بادشاہ کا طبیب کو خود آگے بڑھ کر لانا اس کے **"اعتماد "** کو ظاہر کرتا ہے۔

- **آبیاری کا نکتہ :** جب آپ کسی کو اپنا رہنما یا طبیب تسلیم کر لیں، تو پھر "کیوں اور کیسے" کے سوال ختم ہو جانے چاہئیں۔ روحانی سفر میں شک آبیاری کو روک دیتا ہے، جبکہ "تسلیم (Surrender) "روح کو وہ توانائی بخشتا ہے جس سے باطنی زخم بھرنے لگتے ہیں۔

۵. ماضی اور اصل سے تعلق (شجرہ و جڑیں)

جس طرح ایک تناور درخت اپنی جڑوں سے غذا لیتا ہے، روح کی آبیاری بھی اپنی **"اصل (Roots) "** سے جڑنے میں ہے۔ یہ "مردِ غریب" دراصل ہمیں ہماری اصل حقیقت یاد دلانے آتا ہے۔

- **آبیاری کا نکتہ :** اپنے بزرگوں، صالحین اور اہل اللہ کے تذکروں سے جڑنا دراصل اسی "مردِ غریب" کو اپنے حضور لانے کے مترادف ہے۔ جب ہم ان کے کلام (جیسے رومی یا بیدل) کا مطالعہ کرتے ہیں، تو گویا ہم اس طبیب کو اپنے دل کے پاس بلا رہے ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ : اس شعر سے روحانی فیض پانے کے لیے آج یہ عہد کریں کہ:

1. اپنی پریشانیوں میں سب سے پہلے **"مسبب الاسباب "** (اللہ) کی طرف رجوع کریں گے۔
2. اپنے اندر **عاجزی** پیدا کریں گے تاکہ "غیبی مدد" کے اہل بن سکیں۔
3. سچائی جہاں سے بھی ملے (چاہے وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو)، اسے پورے **ادب اور احترام** کے ساتھ اپنے دل میں جگہ دیں گے۔

جس طرح زمین پیاسی ہو تو بارش اثر کرتی ہے، اگر آپ کا دل "طلب" سے بھرا ہو گا تو رومی کا یہ ایک شعر ہی آپ کی کائنات بدلنے کے لیے کافی ہے۔

سوئے شاہنشاہ بُرد َنْدَش بہ ناز
تا بِسوزَد بر سَرِ شمعِ طِراز

مشکل الفاظ کے معنی

سوئے = کی طرف۔۔۔۔**شاہنشاہ** = بادشاہوں کا بادشاہ (بہت بڑا بادشاہ)۔۔۔۔**بُرد َنْدَش** = اسے لے گئے

بہ ناز = عزت و احترام کے ساتھ، نرمی اور محبت سے۔۔۔۔**تا** = تاکہ۔۔۔۔۔**بِسوزَد** = جل جائے / جلائے

بر سرِ = کے اوپر / کے سامنے۔۔۔۔۔**شمعِ طِراز** = آراستہ شمع، خوبصورت و سجی ہوئی موم بتی (محفل یا دربار کی رونق)

مولانا رومؒ کا یہ شعر عشقِ حقیقی اور فنا فی اللہ کے فلسفے کی ایک خوبصورت تمثیل ہے۔

ترجمہ

"وہ اسے ناز و انداز کے ساتھ شہنشاہ (حقیقی محبوب) کی طرف لے گئے، تاکہ وہ 'شمعِ طراز' (سجی ہوئی یا روشن شمع) کی لو پر جل کر خاک ہو جائے۔"

اس شعر کے گہرے مفاہیم کو سمجھنے کے لیے تین بنیادی نکات اہم ہیں:

1. **کششِ الٰہی (جذب)**: لفظ '**بُرد َنْدَش**' (وہ اسے لے گئے) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سالک یا عاشق اپنی ہمت سے خدا تک نہیں پہنچتا، بلکہ جب اللہ کی رحمت اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، تبھی وہ اس راستے پر چل پاتا ہے۔ یہاں 'ناز' سے مراد وہ روحانی اعزاز اور سکون ہے جو اللہ کے برگزیدہ بندوں کو اس کے قرب کی طرف بلاتے وقت حاصل ہوتا ہے۔

2. **شمعِ طراز (محبوبِ حقیقی)**: شمعِ طراز سے مراد وہ نورِ الٰہی یا حقیقتِ محمدی ہے جس کی چمک دمک کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہے۔ مولانا کے ہاں 'شمع' ہمیشہ اس مرکزِ تجلی کی علامت ہوتی ہے جس کے گرد روحِ انسانی پروانے کی طرح رقص کرتی ہے۔

.3 **فنا کا فلسفہ (جل جانا) :** شعر کا دوسرا مصرع "**تا بِسوزَد** " (تاکہ وہ جل جائے) تصوف کے بنیادی مقصد یعنی 'فنا' کو بیان کرتا ہے۔

- پروانے کا مقصد شمع کے گرد صرف چکر لگانا نہیں بلکہ اس میں ضم ہو جانا ہے۔
- عاشق کا مقصد اپنی "خودی" اور "انا" کو مٹا کر محبوب کی مرضی اور اس کی ذات میں گم کر دینا ہے۔
- یہ 'جلنا' کوئی سزا نہیں بلکہ **تکمیل** ہے۔ جیسے کندن بننے کے لیے سونے کو آگ سے گزرنا پڑتا ہے، ویسے ہی اللہ کا قرب پانے کے لیے انسانی خواہشات اور اپنی ہستی کو مٹانا ضروری ہے۔

مولانا روم یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ جب اللہ کسی بندے کو اپنی طرف بلاتا ہے، تو اس کا مقصد اسے اپنی ذات کے نور میں جذب کر لینا ہوتا ہے۔ یہ راستہ بظاہر 'جلنے' یا 'مٹنے' کا ہے، لیکن حقیقت میں یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کو دوامی زندگی (بقا) حاصل ہوتی ہے۔

خلاصہ : روح کا سفر اپنے مرکز کی طرف ہے، اور اس سفر کی انتہا یہ ہے کہ انسان اپنی محدود ہستی کو اللہ کے غیر محدود نور میں قربان کر دے۔

مولانا روم کے اس شعر کو اگر قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھا جائے، تو یہ **محبتِ الٰہی**، **جذب** اور **مقامِ احسان** کی عکاسی کرتا ہے۔ صوفیانہ شاعری میں "جلنے" سے مراد جسمانی آگ نہیں، بلکہ اپنی خواہشات اور انا (نفس) کو اللہ کے حکم کے تابع کر دینا ہے۔

قرآن و سنت کے حوالے سے اس کی تشریح درج ذیل نکات میں کی جاسکتی ہے:

۱۔ اللہ کی طرف رجوع اور "جذب" (سُوئے شاہنشاہ بُرَد نُدَش)

شعر کا پہلا حصہ اللہ کی طرف بندے کے سفر کو بیان کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"**وَاللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ**) "سورہ الشوریٰ:13(

ترجمہ: "اللہ جسے چاہتا ہے اپنی بارگاہ کے لیے چن لیتا ہے اور اپنی طرف آنے کا راستہ اسے دکھاتا ہے جو رجوع کرتا ہے۔"

مولانا کا یہ کہنا کہ "وہ اسے لے گئے" دراصل اسی **توفیقِ الٰہی** اور **اجتباء** (چن لیے جانے) کی طرف اشارہ ہے۔ سنتِ نبوی میں بھی یہ مفہوم ملتا ہے کہ جب بندہ اللہ کی طرف ایک بالشت بڑھتا ہے، تو اللہ اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے (بخاری)۔ یعنی اللہ خود بندے کو اپنے قرب کے لیے تیار کرتا ہے۔

۲۔ نفس کی قربانی اور فنا (تا بِسوزَد)

شعر میں "جلنے" کا استعارہ قرآن کے تصورِ **تزکیہ نفس** سے ملتا ہے۔ جب تک انسان اپنی انا اور شہوات کو اللہ کی محبت میں قربان نہیں کرتا، وہ حقیقتِ ایمان کو نہیں پا سکتا۔

- **قرآنی تصور** : "بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا" (سورہ الاعلیٰ)۔
- **ایثارِ کامل** : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "تم ہر گز نیکی (کے کمال) کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کر دو" (آل عمران:92)۔ صوفیاء کے نزدیک سب سے پسندیدہ چیز انسان کی اپنی **"ذات "** ہے، جسے محبوب کے لیے فنا کرنا پڑتا ہے۔

3. مقامِ احسان اور محویت (بر سَرِ شمعِ طراز)

"شمعِ طراز" یعنی اللہ کے نور کے سامنے فنا ہو جانا، حدیثِ جبرائیل کے اس حصے کی تشریح ہے جسے **"احسان "** کہا گیا ہے:

"أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ " (تم اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو)۔

جب بندہ اس مقام پر پہنچتا ہے تو اسے اللہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حدیثِ قدسی کے مطابق اللہ فرماتا ہے:

"جب میں اس (بندے) سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے..." (صحیح بخاری)۔

4. عشقِ رسول ﷺ کا پہلو

"شمعِ طراز" سے مراد کئی مفسرینِ رومی نے **نورِ محمدی ﷺ** بھی لی ہے۔ سنت کی روشنی میں اللہ تک پہنچنے کا واحد راستہ اتباعِ رسول ﷺ ہے۔

- قرآن کا حکم ہے: "کہہ دیجیے (اے نبیؐ!) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا" (آل عمران:31)۔
- گویا وہ شمع جس پر عاشق خود کو فنا کرتا ہے، وہ سنت اور عشقِ رسول ﷺ کی روشنی ہے جو اسے اللہ (شاہنشاہ) تک پہنچاتی ہے۔

حاصلِ بحث

یہ شعر قرآن کے اس فلسفے کی شاعرانہ تعبیر ہے کہ انسان کا اصل مقصد اپنی مرضی کو **مرضیِ الٰہی** میں گم کر دینا ہے۔ جس طرح پروانہ شمع کی آگ میں جل کر اپنی حقیقت کھو دیتا ہے اور صرف شمع کا نور باقی رہتا ہے، اسی طرح مومن جب اپنے نفس کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے (اسلام لاتا ہے)، تو اس کے اعمال اور وجود سے صرف حق ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر سے علمی اور روحانی آبیاری (نشو و نما) کے لیے اس کے پیغام کو محض الفاظ سے نکال کر اپنی زندگی اور فکر پر نافذ کرنا ضروری ہے۔ اس شعر میں چھپے عمل کے پہلو درج ذیل ہیں:

1. علمی آبیاری: حقیقتِ علم کی تلاش

علمی لحاظ سے یہ شعر ہمیں "معلومات" اور "حقیقت" کے فرق کو سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔

- **علمِ ظاہری سے علمِ لدنی تک:** صرف کتابیں پڑھ لینا پروانے کا شمع کے بارے میں سن لینے جیسا ہے۔ علمی آبیاری تب ہوگی جب آپ علم کو صرف دماغ تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے مشاہدے اور تجربے میں لائیں۔
- **فکر کی گہرائی:** یہ شعر سکھاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے (مظاہرِ فطرت) اس "شمعِ طراز" کا پتہ دے رہی ہے۔ ایک طالبِ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ کائنات کے مطالعے سے خالقِ کائنات تک پہنچنے کی راہ نکالے۔

2. روحانی آبیاری: تزکیہ اور سپردگی

روحانی طور پر یہ شعر آپ کے قلب کی اصلاح کے لیے تین بڑے سبق دیتا ہے:

- **اپنی 'انا' کا خاتمہ (Ego Dissolution):** روحانی پیاس تب تک نہیں بجھتی جب تک "میں" باقی رہتی ہے۔ جس طرح پروانہ جب تک خود کو الگ سمجھتا ہے، شمع سے دور رہتا ہے، اسی طرح جب تک انسان اپنی علمی برتری، دولت یا حسب نسب پر ناز کرتا ہے، وہ معرفت سے دور رہتا ہے۔ اس شعر سے سبق لیں کہ اپنی ہستی کو اللہ کی رضا کے سامنے ہیچ (کچھ نہ) سمجھیں۔
- **محبت کو عمل کا ایندھن بنانا:** محبت کے بغیر عبادت محض ایک بوجھ ہے۔ مولانا کے نزدیک روحانیت کا جوہر وہ "تپش" ہے جو انسان کو نیک کاموں پر اکسائے۔ اگر آپ کے اندر اللہ کی محبت کی تپش ہے، تو نماز، روزہ اور خدمتِ خلق بوجھ نہیں بلکہ 'ناز' اور 'لذت' بن جائیں گے۔
- **تسلیم و رضا کا مقام:** شعر میں 'بُرد دُندُش' (اسے لے گئے) سے مراد یہ ہے کہ اپنی زندگی کے معاملات اللہ کے سپرد کر دیں۔ جب آپ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس "شاہنشاہ" کی طرف سے ہے، تو زندگی کے دکھ اور تکالیف آپ کو جلاتی نہیں بلکہ آپ کے درجات بلند کرتی ہیں۔

عملی مشق (Practical Application)

روزمرہ زندگی میں اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان دو باتوں پر عمل کریں:

1. **اخلاصِ نیت:** ہر کام (چاہے وہ دنیاوی ہو یا دینی) کرتے وقت یہ سوچیں کہ کیا یہ اس "شمع" (رضائے الٰہی) کے لیے ہے؟ اگر نیت میں اپنی واہ واہ شامل ہے، تو سمجھیں پروانہ شمع سے دور ہے۔
2. **خودی کی نفی:** جب کبھی غصہ آئے یا تکبر پیدا ہو، تو اس شعر کو یاد کریں کہ میری حیثیت ایک پروانے سے زیادہ نہیں جس کا کمال ہی اپنے آپ کو مٹا دینے میں ہے۔

نتیجہ: علمی آبیاری یہ ہے کہ آپ **حق** کو پہچان لیں، اور روحانی آبیاری یہ ہے کہ آپ **حق** میں فنا ہو جائیں۔ مولانا کا یہ شعر آپ کو "جاننے" سے "ہو جانے" کے سفر پر مائل کرتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کے بنیادی مضامین —یعنی **کششِ محبوب (جذب)**، **سوز و گداز** اور **فنا**—کلاسیکی فارسی شاعری کے روحِ رواں ہیں۔ فارسی کے دیگر عظیم شعراء نے بھی اسی حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔

اس کی وضاحت کے لیے ہم تین بڑے شعراء (عطار، حافظ، اور بیدل) کے کلام سے مدد لے سکتے ہیں:

1. فرید الدین عطار: طلب اور فنا کا سفر

مولانا روم خود کو عطار کا معنوی شاگرد مانتے تھے۔ شیخ عطار کی مشہورِ زمانہ تصنیف '**منطق الطیر**' کا پورا فلسفہ ہی 'فنا' پر مبنی ہے۔ جب پرندے سیمرغ کی تلاش میں ساتویں وادی (وادیِ فنا) میں پہنچتے ہیں، تو عطار فرماتے ہیں:

بعد ازیں وادیِ فقر است و فنا

کی بود اینجا سخن گفتن روا

ترجمہ: اس کے بعد فقر اور فنا کی وادی ہے، جہاں زبان سے کچھ کہنا بھی جائز نہیں، یعنی وہاں صرف خاموشی اور مٹ جانا باقی رہ جاتا ہے۔

رومی کے شعر میں جو 'جلنا' ہے، وہ عطار کے ہاں 'سیمرغ میں فنا ہو جانا' ہے، جہاں سالک اپنی ہستی کھو کر حقیقت کو پا لیتا ہے۔

.2 خواجہ حافظ شیرازی: کششِ محبوب اور عشق کا سوز

رومی کے شعر میں '**بُرد نَدَش**' (اسے لے گئے) کا جو تصور ہے، وہ حافظ کے ہاں '**جذبِ معشوق**' کی صورت میں ملتا ہے۔ حافظ کہتے ہیں کہ جب تک وہاں سے بلاوا نہ آئے، عاشق کی ہمت نہیں کہ قدم بڑھا سکے:

تا کہ از جانبِ معشوق نباشد کششی

کوششِ عاشقِ بیچارہ بہ جایی نرسد

ترجمہ: جب تک معشوق کی جانب سے کشش (جذب) نہ ہو، بیچارے عاشق کی اپنی کوشش کسی کام نہیں آتی۔

حافظ کے ہاں بھی 'شمع اور پروانہ' کا استعارہ اسی جانثاری کے لیے استعمال ہوتا ہے:

در شبِ ہجراں مرا شمعِ مزارے بود و بس

آنکہ از پائے افتاد بر سَرِ شمعِ طراز

ترجمہ: ہجر کی رات میں میرے لیے صرف مزار کی شمع ہی سہارا تھی، وہ جو شمع کی لو پر گر کر فنا ہو گئی۔

.3 مرزا عبد القادر بیدل: حیرت اور مٹ جانے کا فلسفہ

بیدل دہلوی، جن کے ہاں مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کا گہرا رنگ ہے، 'جلنے' اور 'فنا' کو ایک علمی اور وجودی کمال قرار دیتے ہیں۔ بیدل کے نزدیک اپنی ہستی کا مٹنا ہی اصل منزل ہے:

بیدل! بہ اوجِ عجز و فنا پَر کشیدہ ایم

ما را شکستِ بال و پر، آغوشِ مدّعاست

ترجمہ: اے بیدل! ہم عجز اور فنا کی بلندیوں پر پرواز کر رہے ہیں؛ ہمارے پروں کا ٹوٹنا (فنا ہونا) ہی دراصل ہماری مراد اور منزل کی آغوش ہے۔

بیدل اس 'سوز' کو ایک روشنی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب انسان کی 'انا' جلتی ہے، تو کائنات کی حقیقت روشن ہوتی ہے۔ رومی کے ہاں جو 'شمعِ طراز' پر جلنا ہے، بیدل اسے **'آئینہ بننا'** کہتے ہیں کہ مٹنے کے بعد ہی عکسِ الٰہی واضح ہوتا ہے.

شاہ دید او را، بَسی تَعظیم کرد

مَخزَنِ زَر را بِدو تَسلیم کرد

مشکل الفاظ کے معنی

شاہ = بادشاہ۔۔۔دید = دیکھا۔۔۔بَسی = بہت زیادہ۔۔۔تعظیم = عزت، احترام۔۔۔مَخزَن = خزانہ، ذخیرہ

زَر = سونا۔۔۔تَسلیم کرد = حوالے کر دیا، سپرد کر دیا

ترجمہ

"بادشاہ نے جب اسے (اس طبیبِ الٰہی کو) دیکھا تو اس کی بہت زیادہ تعظیم و تکریم کی، اور سونے (دولت) کا خزانہ اس کے حوالے کر دیا۔"

اس شعر کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری (قصے کی حد تک) اور دوسرا باطنی یا تصوفانہ۔

۱. ظاہری مفہوم: حکایت کے مطابق جب بادشاہ کی محبوب کنیز بیمار ہوئی اور دنیاوی حکیم اسے ٹھیک نہ کر سکے، تو بادشاہ نے اللہ سے دعا کی۔ اسے خواب میں بتایا گیا کہ کل ایک خاص مہمان آئے گا جو اصل معالج ہے۔ جب وہ بزرگ (طبیب) تشریف لائے، تو بادشاہ نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ کوئی عام انسان نہیں بلکہ اللہ کا بھیجا ہوا ولی ہے۔ بادشاہ نے کمالِ عاجزی سے ان کا استقبال کیا اور اپنی سلطنت کے خزانے کے منہ ان کے لیے کھول دیے تاکہ وہ کنیز کا علاج اپنی مرضی سے کر سکیں۔

۲. باطنی و روحانی تشریح (اصل مقصود): مولانا روم اس شعر کے ذریعے سلوک اور معرفت کا ایک بڑا راز سمجھا رہے ہیں:

- **کامل سپردگی (تسلیم):** روحانی راستے میں جب تک سالک (مرید) اپنے مرشد یا ہادیِ برحق کے سامنے اپنی انا اور اپنے "اثاثے" (چاہے وہ علم ہو یا دولت) ڈھیر نہیں کر دیتا، اسے شفا نہیں ملتی۔ یہاں "خزانہ حوالے کرنا" دراصل **اپنے آپ کو مکمل طور پر سونپ دینے** کی علامت ہے۔
- **پہچان (معرفت)":** شاہ دید اورا" (شاہ نے اسے دیکھا) سے مراد بصیرت کی آنکھ ہے۔ بادشاہ نے ماتھے کی آنکھ سے نہیں بلکہ دل کی آنکھ سے پہچان لیا کہ اس کی مشکل کا حل اسی مردِ خدا کے پاس ہے۔
- **ادب و تعظیم:** تصوف کا قاعدہ ہے "با ادب بانصیب"۔ بادشاہ کا تعظیم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ علم اور فیض حاصل کرنے کے لیے عاجزی پہلی شرط ہے۔ اگر بادشاہ اپنی شاہی انا میں رہتا، تو وہ اس روحانی فیض سے محروم رہتا۔

خلاصہ: یہ شعر سکھاتا ہے کہ جب انسان کو کوئی سچا رہنما یا حقیقت مل جائے، تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی تمام تر توانائیاں، دولت اور اپنی انا اس کے سپرد کر دے، کیونکہ روحانی بیماریوں (جیسے نفس کی غلامی) کا علاج مکمل سپردگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

مولانا روم کے اس شعر میں "بادشاہ" (روح / سالک) کا "طبیبِ روحانی" (مرشد / ولی اللہ) کے سامنے عاجزی کرنا اور اپنا سب کچھ ان کے سپرد کر دینا، قرآن و سنت کے درج ذیل اصولوں کی عکاسی کرتا ہے:

۱ . اہل اللہ اور اہل علم کی تعظیم (تعظیمِ شعائرُ اللہ)

شعر کا پہلا حصہ "شاہ دید اورا، بَسی تَعظیم کرد" قرآن کے اس حکم کے عین مطابق ہے:

"جو اللہ کی نشانیوں (شعائرُ اللہ) کی تعظیم کرتا ہے، تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔) "سورۃ الحج:32)

اللہ کے نیک بندے، جو اس کی معرفت کا نور رکھتے ہیں، اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ سنتِ نبوی ﷺ میں بھی بڑوں اور اہل علم کی تکریم کا بارہا حکم آیا ہے۔ حدیث پاک ہے" : وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ پہچانے۔) "ترمذی)

۲ . علم اور ہدایت کے لیے اہل بصیرت کی طرف رجوع

بادشاہ کا اس طبیب کو اپنا پیشوا مان لینا قرآن کے اس اصول پر مبنی ہے:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

"پس تم اہل ذکر (اہل علم) سے پوچھو اگر تمہیں علم نہ ہو۔) "سورۃ النحل:43)

جس طرح ظاہری بیماری کے لیے طبیب کے پاس جانا سنتِ ابراہیمی ہے، اسی طرح باطنی امراض (حسد، کبر، حرص) کے علاج کے لیے ان لوگوں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے جنہیں اللہ نے بصیرت عطا کی ہے۔

۳ . کامل سپردگی اور اطاعت (تسلیم)

شعر کا دوسرا حصہ "مَخزَنِ زَر رابِدو تَسلیم کرد" (خزانہ اس کے حوالے کر دیا) روحانی اطاعت کی علامت ہے۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ (سورۃ الکہف) اس کی بہترین مثال ہے:

- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے علمِ لدنی کے حصول کے لیے حضرت خضر علیہ السلام کی اس شرط کو قبول کیا کہ وہ مکمل خاموشی اور سپردگی اختیار کریں گے۔
- مولانا روم یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ جب تک انسان اپنی عقل، مال اور "میں" کو اللہ والے کے حوالے نہیں کرتا، وہ نفس کی بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا۔

۴ . دنیا کی بے ثباتی اور ترجیحِ آخرت

بادشاہ کا اپنا "خزانہ "طبیب کے حوالے کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک مومن کے نزدیک روحانی شفا اور اللہ کی رضا کی قیمت دنیاوی مال وزر سے کہیں زیادہ ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾

.88 جس دن نہ کوئی مال نفع دے گا اور نہ اولاد o

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

89 . مگر وہی شخص (نفع مند ہوگا) جو اللہ کی بارگاہ میں سلامتی والے بے عیب دل کے ساتھ حاضر ہوا o

(الشُّعَرَآء، 89:26)

"جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے، سوائے اس کے جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم (پاکیزہ دل) لے کر آیا۔"

(سورۃ الشعراء: 88-89)

بادشاہ نے جان لیا کہ یہ سونا چاندی اس کی بیمار محبوبہ (علامتی طور پر انسانی روح) کو بچا نہیں سکتے، اس لیے اس نے فانی مال کو باقی رہنے والی ہدایت پر قربان کر دیا۔

حاصلِ کلام : قرآن وسنت کی روشنی میں یہ شعر **"ادب"**، **"صحبتِ صالحین"** اور **"تزکیہ نفس"** کا درس دیتا ہے۔ یہ واضح کرتا ہے کہ ہدایت کے راستے میں "انا (Ego) "کی قربانی اور اہل اللہ کی رہنمائی ناگزیر ہے، جیسا کہ صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کے سامنے اپنی جان ومال کی کوئی پروا نہیں کی تھی۔

شعر کا دوسرا مصرعہ (خزانہ اس کے سپرد کر دیا) اس ذہنی اور قلبی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جہاں انسان اپنی عقل اور تدبیر کو اپنے مرشد یا معلم کے سامنے ختم کر دیتا ہے۔ قرآن میں **حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام** کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے:

- حضرت موسیٰؑ نے جب حضرت خضرؑ سے علم سیکھنے کی خواہش کی، تو حضرت خضرؑ نے فرمایا:

"قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾

(خضر علیہ السلام نے) کہا: پس اگر آپ میرے ساتھ رہیں تو مجھ سے کسی چیز کی بابت سوال نہ کریں یہاں تک کہ میں خود آپ سے اس کا ذکر کر دوں (الْكَهْف، 70:18)

وضاحت: یہ "تسلیم" (سپردگی) ہی وہ مقام ہے جہاں سے باطنی اسرار کھلتے ہیں۔ رومی کا بادشاہ بھی اسی مقامِ تسلیم پر ہے کہ وہ بغیر کسی شرط کے اپنا سب کچھ اس طبیب کے حوالے کر رہا ہے۔

۴۔ محبوب ترین چیز کی قربانی (انفاق)

"مخزنِ زر" (سونے کا خزانہ) حوالے کرنا اس قرآنی اصول کی عملی تصویر ہے کہ جب تک انسان اپنی عزیز ترین چیز قربان نہ کرے، اسے حقیقت نہیں ملتی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکو گے جب تک تم (اللہ کی راہ میں) اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہےo

(آلِ عمران، 92:3)

- **وضاحت:** بادشاہ کے لیے اس کا خزانہ عزیز تھا، لیکن اپنی روح کی شفا (کنیز کی تندرستی) کے لیے اس نے اسے قربان کر دیا۔ یہ ایثارِ مال دراصل ایثارِ نفس کا پہلا قدم ہے۔

۵۔ اللہ کے ولیوں کا رعب اور ہیبت

بادشاہ کا "بس تعظیم" (بہت عزت) کرنا اس روحانی ہیبت کی وجہ سے تھا جو اللہ اپنے نیک بندوں کو عطا کرتا ہے۔

- **سنتِ نبوی ﷺ (حدیثِ قدسی)**
- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ اللّٰهَ قَالَ: مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ: كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ،

وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ».

- [صحيح]-[رواه البخاري]-[صحيح البخاري:6502]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: "اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جس شخص نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی، میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔ میرا بندہ جن چیزوں سے مجھ سے قریب ہوتا ہے، ان میں سب سے محبوب وہ چیزیں ہیں، جو میں نے اس پر فرض قرار دی ہیں۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، تو پھر (اس کے نتیجے میں) مَیں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے کسی چیز کا سوال کرتا ہے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں، اگر وہ کسی چیز سے میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ ضرور دیتا ہوں اور کسی چیز کے کرنے میں مجھے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا تردد مومن کی روح قبض کرنے پر ہوتا ہے، جو موت کو ناپسند کرتا ہے اور مجھے اسے کسی ناگوار خاطر چیز میں ڈالنا ناپسند ہوتا ہے"

- **وضاحت:** جب ایک انسان اس مقام پر پہنچتا ہے، تو بادشاہ جیسے طاقتور لوگ بھی اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

خلاصہ: قرآن وسنت کی روشنی میں مولانا روم کا یہ شعر ہمیں سبق دیتا ہے کہ **عجز (Humility)**، **ادب**، اور **اہلِ بصیرت کی پیروی** ہی وہ راستے ہیں جو انسان کو اس کی باطنی بیماریوں سے نجات دلا سکتے ہیں۔ بادشاہ کا خزانہ دینا دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ "اے اللہ کے ولی! اب میری عقل اور میرا مال تیرے تابع ہیں، تو ہی میری اس روح (کنیز) کا علاج کر۔"

رومی کے شعر میں بادشاہ کا طبیب کی تعظیم کرنا دراصل ہدایت کے لیے رہبر کی ضرورت کا اعتراف ہے۔ حافظ شیرازی اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں:

قطعِ این مرحلہ بی ہمرہیِ خضر مکن

ظلمات است بترس از خطرِ گمراہی

(ترجمہ: اس راستے کی منزلیں خضر (کامل رہنما) کی ہمراہی کے بغیر طے نہ کر، یہاں اندھیرا ہے، گمراہی کے خطرے سے ڈر۔)

حافظ یہاں وہی بات کر رہے ہیں جو رومی نے کہی کہ بادشاہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، اسے روحانی منزل پانے کے لیے کسی "طبیب" یا "خضر" کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔

۲۔ تعظیم اور ادب (شرطِ اول)

رومی نے کہا "بس تعظیم کرد"۔ شیخ سعدی شیرازی نے فارسی ادب میں "ادب" کو کامیابی کی کلید قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

بزرگش نخوانند اہلِ خرد

کہ نامِ بزرگاں بہ زشتی بَرَد

(ترجمہ: عقل مند لوگ اسے بڑا نہیں مانتے جو بزرگوں کا نام برے طریقے سے (بے ادبی سے) لیتا ہے۔)

بادشاہ کا اس بزرگ کی تعظیم کرنا اس کی اپنی بزرگی کی دلیل ہے۔ کلاسیکی شعرا کے نزدیک مرید یا طالب کی پہلی صفت ہی "ادب" اور "تعظیم" ہے۔

۳۔ مال و جان کی سپردگی (مخزنِ زر کی حقیقت)

رومی کے مصرعے "مخزنِ زر رابدو تسلیم کرد" کی وضاحت حافظ کے اس مشہور شعر سے ہوتی ہے جہاں وہ "مسِ وجود" (وجود کے تانبے) کو عشق کی کیمیا سے "زر" (سونا) بنانے کی بات کرتے ہیں:

دست از مسِ وجود چو مردانِ رہ بشوی

تا کیمیایِ عشق یابی و زر شوی

(ترجمہ: راہِ حق کے مردوں کی طرح اپنے وجود کے تانبے سے ہاتھ دھو لے (اسے قربان کر دے)، تاکہ تجھے عشق کی کیمیا مل جائے اور تو سونا بن جائے۔)

بادشاہ نے اپنا "زر" (سونا) طبیب کے حوالے کر کے دراصل یہ ثابت کیا کہ وہ اپنی ظاہری دولت کو باطنی سونا (روحانیت) حاصل کرنے کے لیے قربان کر رہا ہے۔

۴۔بادشاہی پر فقیری کی فوقیت

کلاسیکی فارسی شاعری میں اکثر یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک درویش یا ولی کے سامنے بادشاہ کی حیثیت ایک فقیر کی سی ہوتی ہے۔ حکیم سنائی غزنوی فرماتے ہیں:

ملکِ دنیا را نباید ہیچ قدری در دو کون

ہر کہ او را ذرہ ای از عشقِ حق در جان بود

)ترجمہ: جس کے جان میں اللہ کے عشق کا ایک ذرہ بھی ہو، اس کے نزدیک دونوں جہانوں میں دنیا کی بادشاہی کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔(

یہی وجہ ہے کہ رومی کا بادشاہ اپنے تمام تر جاہ و جلال کے باوجود اس درویش صفت طبیب کے سامنے عاجزی کر رہا ہے، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کے پاس وہ "دولت" ہے جو تخت و تاج سے نہیں خریدی جا سکتی۔

۵۔فرید الدین عطار کی تمثیل

عطار نیشاپوری (جو رومی کے فکری پیش رو ہیں) اپنی مثنویوں میں بارہا یہ دکھاتے ہیں کہ جب سالک اپنے مرشد کو پا لیتا ہے تو وہ سب کچھ نچھاور کر دیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

تو را در راہِ حق نیاز آید نہ زر

نیاز آور کہ زر ناید بہ کار

)ترجمہ: تجھے حق کی راہ میں عاجزی (نیاز) کی ضرورت ہے، سونا کام نہیں آئے گا؛ عاجزی لے کر آ کہ وہاں سونا کسی کام کا نہیں۔(

رومی کے شعر میں بادشاہ کا خزانہ پیش کرنا دراصل اس کی عاجزی (نیاز) کا ایک اظہار ہے، وہ صرف سونا نہیں دے رہا بلکہ اپنی بادشاہی انا کو اس کے قدموں میں ڈھیر کر رہا ہے۔

خلاصہ:

کلاسیکی فارسی شعرا کے نزدیک بادشاہ کا طبیب کی تعظیم کرنا اور اپنا سب کچھ اسے سونپ دینا اس عالمگیر سچائی کی طرف اشارہ ہے کہ "حقیقی اقتدار روح کا ہوتا ہے، جسم کا نہیں"۔ جب انسان کو اپنی روح کا معالج مل جاتا ہے تو وہ مادیت کے خزانوں کو اس کے قدموں کی دھول کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔

پس حکیمَش گفت کِی سُلطانِ مِہٗ

آن کَنیزَک رابِدین خواجہ بِدِہٗ

مشکل الفاظ کے معنی

حکیمَش = اس کا حکیم / دانا شخص (یہاں طبیب مراد ہے)۔۔۔۔کِی = کہ (قدیم فارسی میں)

سلطانِ مِہٗ = اے چاند جیسے بادشاہ (مِہٗ = چاند، خوبصورتی کی علامت)۔۔۔۔۔کنیزک = لونڈی / باندی (محبت و شفقت کے انداز میں بھی آتا ہے)۔۔۔۔بدین = اس کو / اسی کو۔۔۔۔۔خواجہ = مالک / آقا (یہاں سنار یا محبوب شخص)۔۔۔بدہ = دے دو

ترجمہ

"پھر اس حکیم (طبیبِ الٰہی) نے کہا کہ اے عظیم بادشاہ! اس لونڈی کو اس خواجہ (سنار) کے حوالے کر دے (یعنی ان دونوں کی شادی کر دے)۔"

اس کہان کے پس منظر میں ایک بادشاہ ایک کنیز پر عاشق ہو جاتا ہے، لیکن وہ کنیز بیمار پڑ جاتی ہے۔ تمام دنیاوی اطباء اسے ٹھیک کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ آخر کار ایک "طبیبِ الٰہی" (حکیمِ روحانی) آتا ہے اور وہ نبض دیکھ کر جان لیتا ہے کہ کنیز کی بیماری جسمانی نہیں بلکہ "عشق" ہے۔ وہ سمرقند کے ایک سنار کی محبت میں گرفتار ہے۔

2۔ **حکیم کا مشورہ :** اس شعر میں حکیم بادشاہ کو مشورہ دے رہا ہے کہ اگر تم اس لڑکی کی جان بچانا چاہتے ہو تو اپنی انا اور ملکیت کو پسِ پشت ڈال کر اسے اس کے محبوب (سنار) کے حوالے کر دو۔

3۔ **صوفیانہ اور رمزیہ پہلو :** مولانا روم یہاں صرف ایک کہانی نہیں سنا رہے، بلکہ چند گہرے نکات بیان کر رہے ہیں:

- **تسلیم ورضا :** بادشاہ یہاں "نفسِ لوامہ" یا اس انسان کی علامت ہے جو حق کی تلاش میں ہے۔ حکیم "مرشدِ کامل" یا "عقلِ ایمانی" کی علامت ہے۔ مرشد جب کوئی حکم دیتا ہے (خواہ وہ بظاہر کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو)، تو مرید کی بھلائی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ اسے مان لے۔

- **عشق کا علاج :** مولانا کے نزدیک عشقِ مجازی (دنیاوی محبت) کو جب تک اس کے منطقی انجام تک نہ پہنچایا جائے، وہ انسان کو بے چین رکھتا ہے۔ حکیم نے سنار کو بلوا کر کنیز سے اس لیے ملوایا تاکہ کنیز کی پیاس بجھے اور بعد میں جب سنار کا حسن ڈھل جائے (جیسا کہ کہانی میں آگے ہوتا ہے)، تو کنیز پر واضح ہو جائے کہ فانی چیزوں سے دل لگانا فضول ہے۔

- **ایثار (Sacrifice):** ایک بادشاہ کے لیے اپنی پسندیدہ کنیز کسی دوسرے کے حوالے کر دینا بہت بڑی قربانی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ راہِ سلوک میں اپنی عزیز ترین چیزوں کی قربانی دیے بغیر روح کو شفا نہیں ملتی۔

حاصلِ کلام : یہ شعر عقلِ سلیم کی اس آواز کی نمائندگی کرتا ہے جو انسان کو اپنی خواہشات (ملکیت کا احساس) چھوڑ کر حقیقت کو قبول کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ حکیم جانتا تھا کہ زہر کا توڑ زہر سے ہی ممکن ہے، اسی لیے اس نے وصال کا مشورہ دیا تاکہ عشقِ مجازی کی حقیقت کھل کر سامنے آ سکے۔

مولانا روم کے اس ایک شعر میں حکمت اور تصوف کے کئی سمندر پوشیدہ ہیں۔ بظاہر یہ ایک طبیب کا مشورہ ہے، لیکن حقیقت میں یہ **انسانی نفسیات اور روحانی تربیت** کا ایک عظیم نسخہ ہے۔

اس شعر میں موجود **"حکمت کے موتی"** درج ذیل ہیں:

1. اپنی عزیز ترین شے کی قربانی (ایثار)

اس شعر کا سب سے بڑا سبق **قربانی** ہے۔ بادشاہ اس کنیز سے شدید محبت کرتا تھا اور اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ حکیم (مرشد) نے اسے حکم دیا کہ اگر اس کی جان بچانی ہے تو اسے اپنے سے جدا کر کے دوسرے کے حوالے کر دو۔

- **حکمت :** سچی محبت پانے کا نام نہیں، بلکہ محبوب کی خوشی اور بقا کے لیے اپنی انا اور اپنی "پسند" کو قربان کر دینے کا نام ہے۔

2. بیماری کی اصل جڑ کا علاج

دنیاوی اطباء کنیز کا جسمانی علاج کر رہے تھے، مگر حکیمِ الٰہی نے اس کی **روحانی اور نفسیاتی تشنگی** کو پہچانا۔

- **حکمت:** جب تک انسان کی باطنی بے چینی اور اس کی خواہشِ نفس کا صحیح علاج نہ کیا جائے، ظاہری دوائیں اثر نہیں کرتیں۔ حکمت یہ ہے کہ مسئلے کی شاخیں کاٹنے کے بجائے اس کی جڑ (عشقِ مجازی یا حسرت) کو مخاطب کیا جائے۔

3. مرشدِ کامل کی اطاعت (Blind Trust)

بادشاہ کے لیے یہ مشورہ بظاہر عقل کے خلاف اور غیرت کے منافی تھا کہ وہ اپنی کنیز کسی سنار کو دے دے۔ لیکن بادشاہ نے حکیم کی بات مانی۔

- **حکمت:** روحانی راستے میں بعض اوقات مرشد ایسے فیصلے کرتا ہے جو عقلِ انسانی کو سمجھ نہیں آتے، لیکن ان کے پیچھے کوئی بڑی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ شفاء "حکم ماننے" میں ہے، "بحث کرنے" میں نہیں۔

4. خواہش کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانا

مولانا روم یہاں ایک نفسیاتی نکتہ بیان کر رہے ہیں: اگر کسی خواہش کو زبردستی کچل دیا جائے تو وہ ناسور بن جاتی ہے۔ حکیم نے چاہا کہ کنیز کو اس کے محبوب سے ملا دیا جائے تاکہ اس کا بخار اترے۔

- **حکمت:** جب انسان اپنی دنیاوی خواہش (عشقِ مجازی) کو پا لیتا ہے، تو وقت گزرنے کے ساتھ اسے اس کی بے ثباتی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کسی چیز کی حقیقت جاننے کا بہترین طریقہ اسے حاصل کر کے دیکھ لینا ہے (تاکہ اس کا سحر ٹوٹ جائے)۔

5. "ملکیت" کے وہم سے آزادی

بادشاہ سمجھتا تھا کہ وہ "سلطان" ہے اور کنیز اس کی "ملکیت" ہے۔ حکیم نے اسے یاد دلایا کہ اصل سلطان وہ ہے جو اپنی خواہشات پر قابو پا لے۔

- **حکمت :** اصل بادشاہت مادی چیزوں کو جمع کرنے میں نہیں، بلکہ انہیں "ترک" کر دینے کی ہمت پیدا کرنے میں ہے۔

خلاصہ : یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ **شفا "چھوڑ دینے" میں ہے، "پکڑنے" میں نہیں**۔ جب انسان اپنی انا (Ego) کو حکیمِ وقت (عقلِ سلیم یا مرشد) کے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے، تو وہیں سے اس کی روح کی شفا کا آغاز ہوتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر میں جو حکمت بیان کی گئی ہے، اس کی جڑیں قرآن کریم کے فلسفۂ تزکیہ اور سنتِ نبوی ﷺ کے اخلاقی اسباق میں پیوست ہیں۔ یہ شعر بظاہر ایک مشورہ ہے، لیکن حقیقت میں یہ **"نفس پر قابو پانے "** اور **"رضائے الٰہی کے لیے محبوب چیز کی قربانی "** کا درس ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

1۔ محبوب شے کی قربانی (تزکیہ کا پہلا زینہ)

اس شعر میں حکیم بادشاہ کو اس کی سب سے پسندیدہ کنیز سے دستبردار ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ یہ قرآن کے اس بنیادی اصول کی عکاسی ہے:

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ (سورہ آل عمران:92)

"تم ہر گز بھلائی (کمالِ ایمان) کو نہیں پا سکتے جب تک کہ تم اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو۔"

حکمت : جس طرح بادشاہ نے اپنی انا اور اپنی "ملکیت" کے احساس کو قربان کر کے کنیز کو سنار کے حوالے کیا، اسی طرح بندہ جب تک اپنی مرضی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے سامنے قربان نہیں کرتا، اسے معرفت کی شفا نہیں ملتی۔

2۔ نفسانی خواہشات پر قابو پانا

حکیم کا مشورہ بادشاہ کے نفس کے لیے بہت سخت تھا، لیکن اس کی اطاعت ہی میں سلامتی تھی۔ قرآن نفس کی اس جیت کو جنت کی ضمانت قرار دیتا ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۔ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (سورہ النازعات:40-41)

" اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا، تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔"

حکمت : مولانا روم یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ شفا "قبضے" میں نہیں بلکہ "ترک" کرنے میں ہے۔ بادشاہ کا کنیز کو چھوڑ دینا دراصل اس کے اپنے نفس کی بیماری کا علاج تھا۔

3۔ اللہ کے لیے چھوڑنے کا اجر

حدیث مبارکہ میں ہے کہ جو شخص اللہ کی خاطر اپنی خواہش یا کوئی شے چھوڑتا ہے، اللہ اسے بہتر عطا فرماتا ہے:

"إنك لن تدع شيئاً لله عز وجل إلا بدلك الله به ما هو خير لك منه "(مسند احمد)

"بے شک تم جو چیز بھی اللہ عزوجل کے (خوف یا حکم کے) لیے چھوڑو گے، اللہ تمہیں اس کے بدلے اس سے بہتر چیز عطا فرمائے گا۔"

حکمت : کہانی کے اگلے حصے میں جب اس قربانی کے نتیجے میں کنیز کا عشقِ مجازی ختم ہوتا ہے اور وہ اللہ کی طرف مائل ہوتی ہے، تو بادشاہ کو بھی وہ حقیقی سکون ملتا ہے جو اسے کنیز کے وصال سے کبھی نہ مل پاتا۔

4۔ مصلحتِ الٰہی پر بھروسہ (حضرت خضر علیہ السلام کا اسوہ)

جس طرح حکیم کا یہ حکم بظاہر عجیب تھا، اسی طرح قرآن میں حضرت خضر علیہ السلام کے افعال (مثلاً کشتی توڑنا یا بچے کو قتل کرنا) بظاہر سمجھ نہیں آ رہے تھے، مگر ان میں خیر چھپی تھی۔

وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ (سورہ البقرہ:216)

" اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو۔"

حکمت : مرشدِ کامل (حکیم) کی یہ نصیحت بادشاہ کے لیے تلخ تھی، لیکن یہی تلخی اس کے باطن کی صفائی کا ذریعہ بنی۔

5۔ عشقِ الٰہی بمقابلہ عشقِ مجازی

قرآن میں مومنین کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۗ (سورہ البقرہ:165)"

اور جو ایمان لائے وہ اللہ سے محبت میں سب سے زیادہ شدید ہوتے ہیں۔"

حکمت : مولانا روم کے نزدیک جب تک انسان فانی چیزوں (کنیز یا سنار) سے دل لگائے رکھتا ہے، وہ بیمار رہتا ہے۔ حکیم نے "زہر کو زہر سے کاٹنے" کے لیے انہیں ملایا تاکہ جب فانی حسن ڈھل جائے، تو دل میں صرف اللہ کی محبت باقی رہے۔

حاصلِ کلام : حکیم کا یہ مشورہ دراصل **"فنا فی اللہ "** کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ جب انسان اللہ کے کسی برگزیدہ بندے کی رہنمائی میں اپنی خواہشات کو قربان کرتا ہے، تو وہ دنیاوی غموں سے نجات پا کر حقیقی سکونِ قلب حاصل کر لیتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کی روح کو سمجھنے کے لیے قدیم فارسی اور اردو شعراء نے جو نقشے کھینچے ہیں، وہ اس "ترکِ خودی" اور "تسلیم و رضا" کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ جب ہم کلاسک شعراء کے کلام کو سامنے رکھتے ہیں، تو اس شعر کے بطن میں چھپے ہوئے اخلاقی اور روحانی پہلو مزید روشن ہو جاتے ہیں۔

قدیم شعراء کے حوالہ جات کے ساتھ اس کی تشریح کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. ایثار اور ترکِ ملکیت (قربانی کا فلسفہ)

اس شعر میں بادشاہ کا اپنی محبوب کنیز کو دوسرے کے حوالے کرنا دراصل "اپنے آپ کو مٹانے" کا عمل ہے۔ مرزا غالب نے اس جذبے کو یوں بیان کیا ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ربط : مولانا کے شعر میں بھی حکیم (عقلِ کل) بادشاہ کو یہی سمجھا رہا ہے کہ یہ کنیز جسے تم اپنی ملکیت سمجھ رہے ہو، اس کا حقِ محبت کسی اور کے پاس ہے۔ اسے اس کے حقدار تک پہنچانا ہی تمہارے نفس کی سب سے بڑی قربانی اور تمہاری شفا ہے۔

2. عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر

حکیم نے کنیز کو سنار سے ملانے کا مشورہ اس لیے دیا تاکہ اس کے دل کی تپش ختم ہو۔ فارسی کے عظیم شاعر **حافظ شیرازی** اس مصلحت کو یوں بیان کرتے ہیں:

عاشق کہ شد کہ یار بہ حالش نظر نکرد

ای خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

کون ایسا عاشق ہے جس پر یار نے نظر نہ کی ہو؟ اے خواجہ! اصل میں دردِ دل کی کمی ہے، ورنہ طبیب تو موجود ہے(

مولانا روم کے شعر میں حکیم وہ طبیب ہے جو جانتا ہے کہ جب تک "عشقِ مجازی" (کنیز اور سنار کا ملاپ) پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے گا، روح "عشقِ حقیقی" کی طرف پرواز نہیں کر سکے گی۔ یہ مشورہ ایک مصلحت ہے تاکہ مجازی بت ٹوٹیں اور حقیقت واضح ہو۔

3. مرشد (حکیم) کی ضرورت اور رہنمائی

بادشاہ اپنی تمام تر طاقت کے باوجود عاجز تھا، یہاں تک کہ اس نے حکیم کے سامنے سر جھکا دیا۔ **علامہ اقبال** نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد

از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

مولانا کے شعر میں لفظ **"پس حکیمش گفت "** (پھر حکیم نے اس سے کہا) یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب انسان کی اپنی عقل جواب دے جائے، تو اسے کسی "حکیمِ روحانی" (مرشد) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی عقل کی گتھیاں عشق اور مرشد کے مشورے ہی سے سلجھتی ہیں۔

4. دنیاوی تعلقات کی بے ثباتی

حکیم کا مشورہ ایک گہرا نفسیاتی نکتہ رکھتا ہے کہ جس "حسن" پر کنیز مٹی تھی، وہ ڈھل جانے والا ہے۔ **شیخ سعدی شیرازی** فرماتے ہیں:

بہ ہیچ یار مدہ نقدِ وقت راز دست

کہ نازنینِ جہاں راوفاو مہر نیست

کسی بھی یار کے لیے اپنا وقت ضائع نہ کر، کیونکہ دنیا کے ان حسینوں میں وفا اور مہر نہیں ہوتی

ربط : حکیم کا مشورہ دراصل اس "نازنینِ جہاں" (سنار کا عارضی حسن) کی حقیقت کھولنے کا ایک طریقہ تھا۔ یہ شعر سکھاتا ہے کہ بعض اوقات کسی چیز کو حاصل کر لینا ہی اس کی محبت کے طلسم کو توڑنے کا بہترین علاج ہوتا ہے۔

5. انا (Ego) کا خاتمہ

اردو کے کلاسیکی شاعر **میر تقی میر** نے انسانی انا کے بارے میں کہا تھا:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے

یہ نمائش سراب کی سی ہے

ربط : جب حکیم نے کہا کہ "اس کنیز کو اس خواجہ کو دے دو"، تو یہ بادشاہ کی "ہستی" اور اس کی "سلطانی" پر ایک چوٹ تھی۔ بادشاہ کا یہ حکم مان لینا اس بات کی دلیل تھا کہ اس نے اپنی ہستی (بلبلے) کو حقیقت کے سمندر میں فنا کر دیا۔

حاصلِ تشریح (خلاصہ)

اگر ہم ان تمام شعری حوالہ جات کو یکجا کریں تو اس شعر کی تشریح یہ بنتی ہے: انسان جب تک **"میرا"** اور **"مجھے چاہیے"** کے چکر میں رہتا ہے، وہ بیمار رہتا ہے۔ شفا اس وقت ملتی ہے جب وہ **"تیرا"** اور **"تیری رضا"** پر راضی ہو جائے۔ حکیم کا مشورہ بادشاہ کے لیے ایک "روحانی سرجری" تھی جس نے اس کے دل سے دنیا کی محبت نکال کر اسے بلند تر مقصد کے لیے تیار کیا۔

تا کَنیزک در وِصالَش خَوش شود
آبِ وَصلَش دَفعِ آن آتش شود

مشکل الفاظ کے معنی

کنیزک = لونڈی، باندی (یہاں مراد نفس یا انسان کی خواہش بھی ہوسکتی ہے)۔۔۔۔**وصال** = ملاپ، وصل، محبوب سے ملنا

آبِ وصل = ملاپ کی ٹھنڈک، وصل کی راحت۔۔۔۔**دفع** = دور کرنا، ختم کرنا۔۔۔۔**آتش** = آگ (یہاں عشق یا تڑپ کی آگ مراد ہے)

ترجمہ

تاکہ وہ کنیز اپنے محبوب کے وصال (ملاپ) سے خوش (اور تندرست) ہو جائے، اور اس (محبوب) کے وصل کا پانی اس (عشق کی) آگ کو بجھا دے۔

مولانا رومی فرماتے ہیں کہ عشق کی آگ کسی مادی دوا یا جڑی بوٹی سے نہیں بجھتی۔ جس طرح آگ کو صرف پانی ہی بجھا سکتا ہے، اسی طرح جدائی کی تپش اور ہجر کے بخار کا واحد علاج "وصال" (ملاپ) ہے۔ جب تک کنیز کو اس کے محبوب سے نہیں ملایا جاتا، اس کی بے چینی ختم نہیں ہو سکتی۔

مجازی سے حقیقت کی طرف:

اگرچہ بظاہر یہ ایک انسانی محبت کا قصہ ہے، لیکن رومی یہاں ایک گہرا فلسفہ بیان کر رہے ہیں۔ انسانی روح (جو یہاں کنیز کی علامت ہے) اس دنیا میں آکر اپنے اصل (خالق) سے بچھڑ گئی ہے اور بے چین ہے۔ اس کی تڑپ تبھی ختم ہو گی جب اسے معرفتِ الٰہی کا وصال نصیب ہو گا۔

3۔ **نفسیاتی نکتہ**: رومی بتاتے ہیں کہ انسان کی نفسیاتی الجھنیں اور باطنی بیماریاں تب تک دور نہیں ہوتیں جب تک ان کی اصل وجہ (محرومی) کو دور نہ کیا جائے۔ "آبِ وصل" سے مراد وہ تسکین ہے جو انسان کو اپنی مطلوبہ چیز پا لینے سے حاصل ہوتی ہے۔

دراصل یہ شعر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ محبت میں تڑپتے ہوئے دل کے لیے محبوب کا دیدار اور اس کا قرب ہی سب سے بڑی شفا ہے۔ جب وصال میسر آتا ہے تو جدائی کی تمام تکلیفیں اور دکھ اس طرح ختم ہو جاتے ہیں جیسے آگ پر پانی ڈالنے سے تپش ختم ہو جاتی ہے۔

مولانا رومی کی مثنوی محض قصہ گوئی نہیں بلکہ حقائقِ معرفت کا خزینہ ہے۔ آپ کا مذکورہ شعر انسانی روح کی تڑپ اور اس کے فطری علاج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی تشریح درج ذیل ہے:

سکونِ قلب اور وصالِ الٰہی

شعر میں مولانا فرماتے ہیں کہ کنیز (روح) کی بے چینی کا علاج اس کا "وصال" ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسانی دل کی بے چینی کا واحد حل اپنی یاد اور قرب کو قرار دیا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (سورہ الرعد:28)

" خبردار! اللہ کے ذکر (اور اس کے قرب) ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔"

جس طرح کنیز اپنے محبوب کے بغیر بیمار تھی، اسی طرح انسانی روح جب تک اپنے اصل (خالق) سے دور رہتی ہے، وہ "آتشِ ہجر" میں جلتی رہتی ہے۔ اس آگ کو بجھانے والا پانی صرف **ذکرِ الٰہی** اور **قربِ خداوندی** ہے۔

محبت کا شرعی اور فطری علاج

مثنوی کے اس قصے میں اللہ والے طبیب نے مشورہ دیا کہ کنیز کو اس کے محبوب (سمرقندی سنار) سے ملا دیا جائے۔ یہ عمل اس نبویؐ اصول کے عین مطابق ہے جس میں محبت کرنے والوں کے لیے وصال (نکاح) کو بہترین حل قرار دیا گیا ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں ہے:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى، حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ سُلَيْمَانَ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُسْلِمٍ، حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ مَيْسَرَةَ، عَنْ طَاوُسٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَمْ نَرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلَ النِّكَاحِ".

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" : دو شخص کے درمیان محبت کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی "اہـ [سنن ابن ماجہ / کتاب النکاح / حدیث:1847]

یعنی اکثر دو قوموں میں یا دو شخص میں عداوت ہوتی ہے، جب نکاح کی وجہ سے باہمی رشتہ ہو جاتا ہے تو وہ عداوت جاتی رہتی ہے، اور کبھی محبت کم ہوتی ہے تو نکاح سے زیادہ ہو جاتی ہے، اور یہی سبب ہے کہ قرابت دو طرح کی ہو گئی ہے، ایک نسبی قرابت، دوسرے سببی قرابت، اور بعض اوقات انسان کو اپنی بیوی کے بھائی بہن سے ایسی الفت ہوتی ہے جیسے اپنے سگے بھائی بہن سے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

مولانا رومی اسی نبوی حکمت کو بیان کر رہے ہیں کہ جب جذبہ سچا ہو تو اس کی تپش کو "وصالِ جائز" کے ذریعے ہی ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے، ورنہ وہ تپش انسان کو اندر سے ختم کر دیتی ہے۔

روح کی پیاس اور آبِ وصال

شعر میں "آتش" (آگ) اور "آب" (پانی) کی جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں، وہ قرآن کے اس تصور سے ہم آہنگ ہیں کہ انسان کی اصل پیاس معرفتِ الٰہی ہے۔ حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جو میری طرف ایک بالشت آتا ہے، میں اس کی طرف ایک ہاتھ جاتا ہوں..." (صحیح بخاری)

یہ اللہ کی طرف سے "آبِ وصل" کی وہ فراہمی ہے جو بندے کی طلب کی آگ کو ٹھنڈا کرتی ہے اور اسے وہ "خوشی" عطا کرتی ہے جس کا ذکر مولانا نے **"خَوش شود"** کہہ کر کیا ہے۔

محبتِ رسول ﷺ کی تپش اور تسکین

صحابہ کرام علیہم الرضوان کی زندگیوں میں بھی ہمیں یہ "آتشِ شوق" نظر آتی ہے۔ حضرت بلالؓ ہوں یا دیگر عشاق، ان کی بے چینی تبھی ختم ہوتی تھی جب انہیں رسول اللہ ﷺ کا قرب میسر آتا۔ قرآن فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (سورہ آل عمران:31)

" اے محبوب! فرما دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی (اور قرب) اختیار کرو، اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔"

یہ اتباع ہی وہ "آبِ وصل" ہے جو اتباع کرنے والے کو اللہ کے محبوب ہونے کی ٹھنڈک عطا کرتا ہے۔

جس طرح پیاسے کی آگ پانی سے بجھتی ہے، اسی طرح عاشقِ صادق (چاہے وہ مجازی ہو یا حقیقی) کی بے چینی محبوب کے دیدار اور وصال سے ہی ختم ہوتی ہے۔ مولانا نے اس تمثیل سے ثابت کیا کہ انسانی نفسیات اور روحانیت دونوں کا سکون "مطلوب" کو پا لینے میں ہے۔

مولانا رومی کا یہ تصور کہ "عشق کی آگ صرف وصال کے پانی سے بجھتی ہے"، کلاسیکی عربی اور فارسی شاعری کا ایک مرکزی موضوع رہا ہے۔ مختلف شعراء نے اپنے اپنے رنگ میں اس تڑپ اور اس کے مداوے (علاج) کو بیان کیا ہے۔
ذیل میں عربی اور فارسی کے بڑے شعراء کے کلام سے اس کی وضاحت پیش ہے:
1 . عربی شاعری (عشقِ صادق اور سوزِ دروں)
عربی ادب میں، خاص طور پر "عشقِ عذری" (پاکیزہ محبت) میں جدائی کو جہنم کی آگ اور وصال کو ٹھنڈک سے تشبیہ دی گئی ہے۔
قیس بن الملوح (مجنوں):
عشق کی آگ کے حوالے سے مجنوں کا یہ قول رومی کے شعر کی مکمل تشریح ہے:

أُداوي جِراحَ القَلبِ بِالقَلبِ في الهَوى
فَقَلبي لَهُ قَلبٌ وَأَنتِ لَهُ قَلبُ

میں محبت میں دل کے زخموں کا علاج دل ہی سے کرتا ہوں، کیونکہ میرا بھی ایک دل ہے اور (اے لیلیٰ) تو بھی ایک دل ہے
مجنوں کا ایک اور مشہور شعر ہے:

تداويتُ من ليلى بليلى من الهوى
كما يتداوى شاربُ الخمرِ بالخمرِ

میں نے لیلیٰ کی محبت کی بیماری کا علاج لیلیٰ ہی کے وصال سے کیا، بالکل اسی طرح جیسے شراب پینے والا (ہینگ اوور) کا علاج شراب ہی سے کرتا ہے
یہاں رومی کے "آبِ وصل" کا تصور واضح ہے کہ جس کی تڑپ ہے، وہی دوا ہے۔
متنبی:
عربی کا عظیم شاعر متنبی کہتا ہے:

أنا صَخْرَةُ الوادي إذا ما كُوحِمتُ
وإذا نَطَقْتُ فإنّني الجَوزاءُ

لیکن جب وہ عشق کی آگ کی بات کرتا ہے تو اسے "لاعلاج" کہتا ہے سوائے دیدار کے۔

2. فارسی شاعری (سوز و گداز اور تسکین)

فارسی شعراء نے "آتشِ عشق" اور "آبِ وصال" کے تضاد کو بہت خوبصورتی سے برتا ہے۔

حافظ شیرازی:

حافظ کے ہاں عشق کی آگ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

آتشِ آن نیست کہ از شعلہ او خندد شمع

آتش آن است کہ در خرمنِ پروانہ زدند

آگ وہ نہیں جس کے شعلے سے شمع ہنستی ہے، آگ تو وہ ہے جس نے پروانے کے وجود کے ڈھیر کو جلا کر راکھ کر دیا

اسی تپش کے علاج کے لیے حافظ "وصال" کو ناگزیر قرار دیتے ہیں:

شربتِ وصل تشنہ را خوشتر

ز آنکہ بر تشنہ آبِ حیوان است

)پیاسے کے لیے وصال کا شربت اتنا ہی خوشگوار ہے جتنا کہ آبِ حیات پیاسے کی زندگی کے لیے ہے(

شیخ سعدی شیرازی:

سعدی نے رومی کے اسی خیال کو ایک سادہ مگر پر اثر تمثیل میں بیان کیا ہے:

تشنہ را آبِ خوش آید، نہ گلاب

پیاسے کو سادہ پانی ہی بھاتا ہے، اسے قیمتی عرقِ گلاب سے غرض نہیں ہوتی

یعنی جس شخص کو جس چیز کی تڑپ ہے، اس کا سکون اسی کے مل جانے میں ہے، چاہے دنیا بھر کی دوسری نعمتیں میسر ہوں۔

مرزا عبد القادر بیدل:

بیدل کی شاعری میں یہ موضوع ایک گہری فلسفیانہ جہت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تڑپ دراصل انسان کی اپنی حقیقت کی تلاش ہے۔

بیدل! تپشِ دل کہ بحدے نرسیدہ است

آرام گہِ ماست ہمان منزلِ مقصود

اے بیدل! دل کی وہ تڑپ جو ابھی کسی حد (انتہا) تک نہیں پہنچی، وہی تڑپ ہی دراصل ہماری منزلِ مقصود کا آرام گاہ ہے

رومی کے ہاں "آبِ وصل" سکون ہے، جبکہ بیدل اس تڑپ کو بھی ایک خاص قسم کا سکون قرار دیتے ہیں، مگر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ پیاس اور پانی کا رشتہ ازلی ہے۔

ان تمام اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلاسیکی ادب میں **"عشق "** ایک ایسی آگ ہے جسے دنیا کی کوئی مادی دوا نہیں بجھا سکتی؛ اس کا واحد حل وہ "معنوی پانی" ہے جسے **وصال** کہا جاتا ہے۔

شہ بِدو بَخشید آن مَہ روی را
جُفت کرد آن ہر دو صُحبَت جوی را

مشکل الفاظ کے معنی

شَہْ = بادشاہ۔۔۔۔ **بِدو** = اُس کو / اس کے حوالے سے۔۔۔۔**بَخشید** = عطا کیا، دے دیا

مَہْ روی = چاند جیسے چہرے والا (حسین شخص / لڑکی)۔۔۔۔**جُفت کرد** = جوڑا بنا دیا، ملا دیا، شادی کر دی

صُحبَت جوی = صحبت (سنگت) کے طالب، ملنے کے خواہش مند

اس شعر کو مولانا رومی نے دو سطحوں پر بیان کیا ہے: ایک ظاہری حکایت کی سطح اور دوسری باطنی یا روحانی سطح۔

.1 حکایتی پس منظر (ظاہری پہلو):

قصہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ ایک کنیز پر عاشق ہو گیا، لیکن کنیز بیمار پڑ گئی۔ جب حکیمِ الٰہی نے اس کا روحانی معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سمرقند کے ایک زرگر کی محبت میں گرفتار ہے۔ بادشاہ نے اپنی خود غرضی کو ترک کیا اور مصلحتِ الٰہی کے تحت زرگر کو بلوایا اور کنیز کو اس کے حوالے کر دیا۔ یہ شعر اسی ایثار اور ملاپ کو بیان کر رہا ہے۔

.2 روحانی و عرفانی پہلو (باطنی تشریح):

مولانا رومی اس واقعے سے چند گہرے اسباق دیتے ہیں:

- **نفس کی تسکین اور علاج :** کبھی کبھی انسانی نفس (کنیز) دنیاوی خواہشات (زرگر) کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اگر اسے زبردستی روکا جائے تو وہ گھٹ کر مر جاتا ہے یا بیمار ہو جاتا ہے۔ بادشاہ (جو کہ عقلِ کامل یا روح کی علامت ہے) نے دانا طبیب کے مشورے پر عمل کیا کہ پہلے نفس کی جائز یا ظاہری خواہش پوری کر دی جائے تاکہ اس کا اضطراب ختم ہو۔
- **ایثار اور فقر :** یہ شعر بادشاہ کے کمالِ ظرف کو ظاہر کرتا ہے۔ حقیقی "شاہ" وہ ہے جو اپنی محبوب ترین شے کو بھی دوسرے کی خوشی کے لیے قربان کر دے۔ صوفیا کے نزدیک یہ مقامِ فقر ہے جہاں انسان اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے۔

عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر

- اگرچہ بادشاہ نے ان دونوں کو ملا دیا، لیکن اس قصے کے اگلے حصے میں ہم دیکھتے ہیں کہ زرگر کی خوبصورتی زائل ہو جاتی ہے اور کنیز کی اس سے محبت ختم ہو جاتی ہے۔ مولانا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ کے ولی (بادشاہ) نے یہ ملاپ اس لیے کرایا تاکہ کنیز پر یہ واضح ہو سکے کہ دنیاوی رنگ و روپ فانی ہے، اور اس کا دل اس فانی محبت سے اکتا کر حقیقی محبوب (خدا) کی طرف رجوع کر سکے۔

یہ شعر بظاہر دو پیار کرنے والوں کے ملاپ کی کہانی ہے، لیکن حقیقت میں یہ **انسانی روح کی تربیت** کا ایک مرحلہ ہے، جہاں اسے دنیاوی لذتوں سے گزار کر ان کی بے ثباتی دکھائی جاتی ہے۔

مولانا رومی کی مثنوی کے اس شعر میں جو اخلاقی اور روحانی پہلو اجاگر کیے گئے ہیں، ان کی جڑیں قرآن و سنت کی تعلیمات میں بہت گہری ہیں۔ یہاں اس عمل (بادشاہ کا اپنی محبوب شے کو دوسرے کے حوالے کرنا) کی قرآنی و نبوی تناظر میں وضاحت پیش ہے:

1. ایثار (دوسروں کو خود پر ترجیح دینا)

بادشاہ نے اپنی خواہش کو قربان کر کے کنیز کی خوشی اور صحت کو مقدم رکھا۔ یہ "ایثار" کا بلند ترین درجہ ہے۔

- ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

"اور وہ اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ انہیں خود شدید ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔" (سورۃ الحشر: 9)

- **نبویؐ ارشاد:** حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

"تم میں سے کوئی اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" (صحیح بخاری)

2. محبوب ترین شے کی قربانی

کنیز بادشاہ کو بے حد عزیز تھی، لیکن اسے دوسرے کے حوالے کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بادشاہ کا دل دنیاوی محبت سے زیادہ "رضائے الٰہی" کا طالب تھا۔

- **قرآنی تعلیم**

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ

"تم ہرگز نیکی (کے کمال) کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمہیں عزیز ہیں۔" (سورۃ آلِ عمران: 92)

3. حکمت اور نفسیاتی علاج

مولانا رومی نے دکھایا کہ بعض اوقات نفس کی بیماری کا علاج اسے سختی سے روکنے میں نہیں، بلکہ اسے اس کی مرغوب شے دکھا کر اس کی حقیقت واضح کرنے میں ہوتا ہے۔ یہ سنتِ الٰہی ہے کہ اللہ انسان کو آزماتا ہے تاکہ وہ حق اور باطل میں تمیز کر سکے۔

- **قرآنی اصول:** اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زینت کو "آزمائش" قرار دیا تاکہ انسان اس سے گزر کر حقیقت تک پہنچے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا

"جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اسے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔" (سورۃ الکہف: 7)

4. اصلاحِ احوال اور خیر خواہی

بادشاہ کا یہ عمل دراصل اس کنیز اور زرگر کی "خیر خواہی" پر مبنی تھا تاکہ وہ اضطراب سے نکل سکیں۔

- **حدیثِ نبویؐ:**

الدِّينُ النَّصِيحَةُ "دین (نام ہی) خیر خواہی کا ہے۔" (صحیح مسلم)

.5 فانی اور باقی کا فرق

اگرچہ اس شعر میں ملاپ کا ذکر ہے، لیکن مثنوی کے مجموعی سیاق میں یہ ملاپ اس لیے کرایا گیا تاکہ کنیز پر واضح ہو کہ "مجازی محبوب" (زرگر) زوال پذیر ہے اور اصل محبت صرف اللہ کی ذات سے ہونی چاہیے۔

- **قرآن** مجید فرماتا ہے

- **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ**

"جو بھی زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے، اور صرف تمہارے رب کی ذات باقی رہے گی جو صاحبِ جلال و اکرام ہے۔" (سورۃ الرحمٰن: 26-27)

خلاصہ : قرآن و سنت کی روشنی میں بادشاہ کا یہ فعل "**نفس پر فتح**"، "**ایثار** " اور "**حکمتِ عملی** " کا آئینہ دار ہے۔ مولانا رومی یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جب انسان اللہ کے لیے اپنی انا چھوڑ دیتا ہے، تو اللہ اسے وہ بصیرت عطا کرتا ہے جو ظاہری آنکھ سے پوشیدہ ہوتی ہے۔

مولانا رومی نے جس ایثار اور "نفس کی قربانی" کو اس کہانی میں بیان کیا ہے، یہی صوفیانہ فکر کی بنیاد ہے۔ دیگر صوفی شعراء نے بھی اپنی شاعری میں اس بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے کہ حقیقی محبت اپنی خواہش کو محبوب کی رضا میں فنا کر دینے کا نام ہے۔

ذیل میں مختلف صوفی شعراء کے کلام سے اس موضوع کی وضاحت پیش ہے:

1 . حضرت حافظ شیرازی (تسلیم و رضا)

حافظ شیرازی کے ہاں "رضائے محبوب" کو اپنی مراد پر مقدم رکھنا بنیادی سبق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عاشق کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا:

در دائرہ قسمت ما نقطہ تسلیمیم
لطف آنچہ تو اندیشی، حکم آنچہ تو فرمائی

)قسمت کے دائرے میں ہم تو محض تسلیم و رضا کا ایک نقطہ ہیں؛ لطف وہی ہے جو تو سوچے، اور حکم وہی ہے جو تو صادر کرے۔(

جس طرح رومی کے بادشاہ نے اپنی مراد چھوڑ کر اللہ کی مراد (کنیز کی صحت اور زرگر سے ملاپ) کو اپنا لیا، حافظ اسی کو "نقطہ تسلیم" کہتے ہیں۔

2. خواجہ میر درد (فنائیت اور بے خودی)

اردو کے عظیم صوفی شاعر خواجہ میر درد نے اس بات کو یوں بیان کیا کہ جب انسان اپنی "میں" (انا) کو ختم کر دیتا ہے، تو اسے کائنات کی ہر شے میں محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے:

تجھ ہی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا

برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

اور اپنی خواہش کو ترک کرنے کے حوالے سے ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

جو کچھ کہ ہم نے کی ہے تمنا، وہ تو نہ تھی

پر جو کچھ کہ تیری رضا ہے، وہی ہوا

3. بابا بلھے شاہ (نفس کی نفی)

بلھے شاہ پنجاب کے وہ صوفی ہیں جنہوں نے نفس کو مارنے اور انا کو مٹانے پر بہت زور دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک انسان "میں" کے بت کو نہیں توڑتا، وہ عشق کی منزل نہیں پا سکتا:

بلھیا رب دا کی پاؤنا

ایدھروں پٹنا تے اودھر لاؤنا

)بلھے شاہ! رب کو پانا کیا مشکل ہے؟ بس دل کو دنیا (خواہش) سے اکھاڑنا ہے اور خدا کی طرف لگانا ہے۔(

رومی کا بادشاہ بھی یہی کر رہا ہے؛ وہ اپنے دل سے "کنیز کی ملکیت" کی خواہش کو اکھاڑ کر "رضائے الٰہی" کے سپرد کر رہا ہے۔

4. شیخ سعدی شیرازی (ایثار اور خدمت)

شیخ سعدی کے ہاں تصوف اخلاقیات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسروں کو راحت پہنچانا ہی اصل بندگی ہے:

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست

بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

)عبادت مخلوق کی خدمت کے علاوہ کچھ نہیں؛ یہ محض تسبیح، جائے نماز اور صوفیانہ لبادے کا نام نہیں ہے۔(

بادشاہ کا کنیز کو اس کے محبوب سے ملا دینا دراصل خدمتِ خلق اور ایثار کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

5. علامہ اقبال (عشق اور بے خودی)

اقبال نے رومی کو اپنا پیرِ معنوی مانا ہے۔ وہ اس ایثار کو "خودی" کی تربیت قرار دیتے ہیں کہ جب عشقِ حقیقی غالب آتا ہے تو انسان اپنی خواہش کو قربان کر دیتا ہے:

خودی میں ڈوب جا غافل، یہ عینِ زندگانی ہے

نکل کر حلقہ شام و سحر سے، جاوداں ہو جا

اقبال کے نزدیک بادشاہ کا عمل "بے خودی (Selflessness) " ہے، جو اسے عام بادشاہوں سے بلند کر کے ایک "فقیر" اور "ولی" بنا دیتا ہے۔

خلاصہ

تمام صوفی شعراء کے ہاں ایک قدرِ مشترک (Common Thread) ہے:

عشقِ مجازی (کنیز اور زرگر کی محبت) ایک سیڑھی ہے عشقِ حقیقی تک پہنچنے کی۔

انا (Ego) کا خاتمہ ہی اصل کامیابی ہے۔

محبوب کی خوشی میں اپنی خوشی تلاش کرنا ہی تصوف کا نچوڑ ہے۔

جیسا کہ مرزا غالب نے بھی (صوفیانہ رنگ میں) کہا تھا:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

جب بادشاہ نے اپنے "درد" (جدائی کے خوف) کو حد سے گزار کر ایثار کر دیا، تو وہی درد اس کے لیے اور اس کی سلطنت کے لیے روحانی "دوا" بن گیا۔

علمِ باطن یا تصوف کی زبان میں اس شعر کی تشریح بہت گہری اور لطیف ہے۔ مولانا رومیؒ نے اس حکایت کو محض ایک قصہ نہیں بلکہ **سلوک اور تربیتِ نفس** کا ایک پورا نصاب بنا کر پیش کیا ہے۔

علمِ باطن کے اعتبار سے اس کے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

کرداروں کی باطنی علامتیں (Archetypes)

باطنی دنیا میں یہ کردار محض انسان نہیں بلکہ انسانی وجود کی مختلف کیفیات کی علامت ہیں:

- **شاہ (بادشاہ)**: یہ **"روح "** یا **"عقلِ کُل "** یا **"مرشدِ کامل "** کی علامت ہے، جو حق و باطل میں تمیز کرنا جانتی ہے۔

- **کنیز:** یہ **"نفس "** یا **" قلبِ انسانی "** کی علامت ہے جو ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور دنیاوی کشش کی طرف مائل ہے۔
- **زرگر:** یہ **"دنیا"**، اس کی **رعنائی** اور **عشقِ مجازی** کی علامت ہے، جو بظاہر چمکدار ہے (سونا بنانے والا) مگر اندر سے فانی ہے۔

تزکیہِ نفس کا حکیمانہ طریقہ (Wisdom of Purification)

علمِ باطن کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ نفس کو خواہشات سے کیسے روکا جائے؟ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ نفس کو سختی سے کچل دینا چاہیے، لیکن مولانا یہاں ایک بڑا نکتہ بتاتے ہیں:

- اگر نفس کسی دنیاوی محبت (زرگر) میں ایسا گرفتار ہو جائے کہ وہ بیمار پڑ جائے (یعنی اس کی روحانی ترقی رک جائے)، تو اسے زبردستی روکنا اسے ہلاک کر دینے کے مترادف ہے۔
- **شاہ (مرشد)** نے اسے زرگر کے حوالے کر دیا تاکہ نفس اپنی خواہش کو جی کر دیکھ لے اور خود اس کی بے ثباتی کا مشاہدہ کرے۔ یہ علمِ باطن کا وہ مقام ہے جہاں سالک کو "تجربے" کے ذریعے سکھایا جاتا ہے کہ جس چیز کے پیچھے تم بھاگ رہے ہو، وہ دراصل ڈھلتی ہوئی چھاؤں ہے۔

فنائے خواہش سے بقائے حق تک

"بخشید" (بخش دینا) اور "جفت کرد" (ملا دینا) بظاہر وصال لگ رہا ہے، لیکن باطنی طور پر یہ **"فنا "** کا مقدمہ ہے۔

- مرشد جانتا ہے کہ جب تک کنیز (نفس) زرگر (دنیا) سے مل نہیں لیتی، اس کے دل سے اس کی حسرت نہیں نکلے گی۔
- جب وہ مل جائے گی اور وقت گزرنے کے ساتھ زرگر کا حسن (دنیا کی چمک) ڈھل جائے گا، تو کنیز خود بخود اس سے بیزار ہو جائے گی۔ تب اسے احساس ہو گا کہ اصل محبوب تو وہ "شاہ" تھا جس نے اسے یہ سب عطا کیا تھا۔

مرشدِ کامل کی کیمیا گری

بادشاہ کا یہ عمل اس کی **"بے غرضی "** کو ظاہر کرتا ہے۔ علمِ باطن میں مرشد اپنے مرید کی خواہشات کا دشمن نہیں ہوتا، بلکہ وہ مرید کے باطن کو صاف کرنے کے لیے ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ مرید خود اپنی غلطیوں کو پہچان لے۔ بادشاہ نے اپنی انا (Ego) کو اس لیے قربان کیا تاکہ ایک روح (کنیز) کو آزاد کیا جا سکے۔

عشقِ مجازی بطورِ پُل

صوفیا کہتے ہیں" :المجـازُ قنطرۃ الحقیقہ "(مجاز حقیقت کا پل ہے)۔

- بادشاہ نے ان دونوں کو ملا کر کنیز کو اس پل پر چلنے کا موقع دیا۔
- باطنی اعتبار سے، یہ شعر بتاتا ہے کہ کبھی کبھی انسان کو اپنی مراد تک پہنچنے کے لیے ان گلیوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے جو بظاہر منزل نہیں ہوتیں، مگر وہ منزل کا رستہ صاف کر دیتی ہیں۔

حاصلِ مطالعہ : علمِ باطن کے مطابق، یہ شعر **"تربیتِ الٰہی "** کا وہ انداز ہے جہاں بندے کو اس کی مراد دے کر اسے یہ سبق دیا جاتا ہے کہ "اللہ کے سوا سب فانی ہے"۔ بادشاہ (مرشد) نے یہ ملاپ اس لیے نہیں کرایا کہ وہ دنیاداری چاہتا تھا، بلکہ اس لیے کرایا تاکہ کنیز کے دل میں چھپی ہوئی دنیاوی محبت کا زہر نکل جائے اور وہ خالص ہو کر "شاہ" کی بارگاہ کے لائق ہو سکے.

رومی کا یہ فلسفہ کہ **"نفس کی تسکین کے ذریعے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا جائے "** آج کے دور میں نہ صرف ممکن ہے، بلکہ نفسیاتی اور سماجی الجھنوں کے حل کے لیے پہلے سے زیادہ ضروری ہے۔

موجودہ دور میں اسے درج ذیل پہلوؤں سے نافذ (Apply) کیا جاسکتا ہے:

نفسیاتی علاج اور ذہنی صحت (Mental Health)

آج کے دور میں ڈپریشن اور اینگزائٹی (Anxiety) کی ایک بڑی وجہ خواہشات کو بے رحمی سے کچلنا یا ان کے پیچھے اندھا دھند بھاگنا ہے۔

- **درخواست :** جب کوئی شخص کسی ایسی چیز یا رشتے کے پیچھے بیمار ہو رہا ہو جو اس کے لیے درست نہیں، تو اسے زبردستی روکنے کے بجائے (اگر وہ سنبھلنے کی پوزیشن میں نہ ہو) اسے اس تجربے سے گزرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔
- **حکمت :** جدید نفسیات بھی کہتی ہے کہ جب انسان کسی "سراب (Goldsmith) "کو پالیتا ہے اور اس کی حقیقت دیکھ لیتا ہے، تو اس کے اندر کی "کنیز "(روح) خود بخود اس سے بیزار ہو جاتی ہے۔ یہ **"تجرباتی حکمت "** آج کے ماہرِ نفسیات مرشد بن کر کر سکتے ہیں۔

جدید والدین اور تربیتِ اولاد (Parenting)

موجودہ دور میں بچوں پر اپنی مرضی مسلط کرنا اکثر بغاوت کا سبب بنتا ہے۔

- **عمل :** اگر کوئی بچہ کسی ایسے کیریئر یا مشغلے کی ضد کرتا ہے جو والدین کی نظر میں عارضی چمک دمک (زرگر) ہے، تو رومی کے اسلوب کے مطابق والدین "شاہ" بن کر اسے وہ موقع فراہم کریں (بشرطیکہ وہ مہلک نہ ہو)۔
- **نتیجہ :** جب بچہ خود اس فیلڈ کی مشکلات یا اس کی عارضی نوعیت کو دیکھ لے گا، تو وہ زیادہ بہتر طریقے سے اپنی اصل صلاحیتوں (شاہ کی بارگاہ) کی طرف لوٹ سکے گا۔

3. قیادت اور پیشہ ورانہ اخلاقیات (Leadership)

آج کے لیڈر (شاہ) کو اپنی انا (Ego) سے بلند ہونا پڑے گا۔

- **عمل :** ایک اچھا مینیجر یا لیڈر وہی ہے جو اپنی ٹیم کے کسی رکن کی صلاحیت کو صرف اپنی ذات یا اپنی کرسی کے لیے استعمال نہ کرے، بلکہ اسے وہاں جانے دے جہاں اس کی ترقی (صحت) ہو۔
- **حکمت :** جب آپ کسی کو اس کی مراد دے دیتے ہیں (خواہ وہ آپ سے دور ہی کیوں نہ ہو جائے)، تو آپ دراصل اپنے باطن میں ایک ایسی وسعت پیدا کرتے ہیں جو آپ کو مادی فائدے سے بلند کر دیتی ہے۔

ڈیجیٹل دور کی "زرگری" اور بصیرت

آج کا "زرگر" سوشل میڈیا کی چکاچوند، شہرت اور مادی اشیاء ہیں۔ ہم سب اس وقت "کنیز" بنے ان کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

- **حل :** اس دور کا "شاہ" ہماری اپنی **عقلِ سلیم** ہے۔ ہمیں خود کو یہ تجربہ کرنے دینا چاہیے کہ یہ سب "لائیکس" اور "فالوورز" عارضی حسن ہیں۔
- **باطنی عمل :** جب ہم ان چیزوں کو حاصل کر کے ان کی بے ثباتی دیکھ لیتے ہیں، تو ہمارے اندر وہ خاموشی اور سکون پیدا ہوتا ہے جو رومی کی مثنوی کا اصل مقصد ہے۔

رشتوں میں ایثار (Sacrifice in Relationships)

آج کل رشتوں میں ٹوٹ پھوٹ کی بڑی وجہ "قبضہ (Possessiveness) " ہے۔

- **عمل :** رومی کا شاہ کہتا ہے کہ اگر تم کسی سے محبت کرتے ہو، تو اس کی خوشی کو اپنی خواہش پر ترجیح دو۔
- **موجودہ اطلاق :** کسی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے بجائے اسے اس کی اپنی مرضی اور فطرت کے مطابق جینے کا حق دینا ہی وہ "بخش دینا" ہے جو اس دور کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑ سکتا ہے۔

خلاصہ : موجودہ دور میں رومی کا یہ اصول **"زبردستی کے بجائے دانائی "** کا اصول ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ:

1. اپنی **انا** کو قربان کرنا سیکھیں۔

2. لوگوں کو **تجربہ** کر کے سیکھنے کا موقع دیں۔
3. کسی کو قید کر کے نہیں، بلکہ اسے **آزاد** کر کے اس کا دل جیتا جا سکتا ہے۔

آج کے دور کا "شاہ" وہ ہے جس کے پاس اتنی ہمت ہو کہ وہ اپنی محبوب ترین شے (خواہ وہ کوئی نظریہ ہو یا کوئی انسان) کو اس کی اپنی بہتری کے لیے خود سے دور کر سکے۔

مُدّتِ شش ماہ می رانْدَند کام
تا بہ صِحَّت آمد آن دختر تمام

مشکل الفاظ کے معنی

مُدّتِ شش ماہ = چھ ماہ کی مدت.....**می رانْدَند** = وہ گزارتے رہے / بسر کرتے رہے.....**کام** = مراد، خواہش، لذت، مقصد.....**تا بہ صِحَّت آمد** = یہاں تک کہ صحت مند ہو گئی.....**آن دختر** = وہ لڑکی.....**تمام** = مکمل طور پر

ترجمہ

"چھ ماہ کی مدت تک وہ (اپنی مراد کے مطابق) عیش و کامرانی کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ لڑکی مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی۔"

1. **ظاہری پہلو**: اس شعر میں اس وقت کا ذکر ہے جب سنار اور کنیز کی شادی ہو چکی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ چھ ماہ تک وہ دونوں اکٹھے رہے اور اپنی مراد پاتے رہے۔ اس وصال اور خوشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لڑکی جو غمِ فراق میں گھل رہی تھی اور موت کے قریب تھی، وہ دوبارہ تندرست و توانا ہو گئی۔ اس کا چہرہ پھر سے دمکنے لگا کیونکہ اسے اپنا مطلوب مل گیا تھا۔

2. **حقیقتِ حال (حکیمانہ تدبیر)**: یہاں "می راندند کام" (مراد پانا) بظاہر ان کی خوشی کا ذکر ہے، لیکن اس کے پیچھے طبیبِ الٰہی کی ایک گہری تدبیر تھی۔ طبیب جانتا تھا کہ اس لڑکی کا عشق "عشقِ مجازی" (عارضی خوبصورتی کا عشق) ہے۔ اس نے چھ ماہ تک انہیں اکٹھا رکھا تا کہ اس دوران وہ سنار کو ایسی دوائیں پلا سکے جس سے اس کا حسن و جمال ختم ہو جائے اور لڑکی پر یہ واضح ہو جائے کہ جس رنگ و روپ پر وہ فدا تھی، وہ فانی ہے۔

3. **تصوف اور سبق**: مولانا رومیؒ اس قصے سے یہ نکتہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ:

- انسانی نفس (کنیز) جب تک دنیاوی لذتوں (سنار) کے پیچھے بھاگتا ہے، بیمار اور بے چین رہتا ہے۔
- کبھی کبھی انسان کو اس کی خواہش دے دی جاتی ہے تاکہ وہ خود اس کی بے ثباتی (فنا ہونے) کا مشاہدہ کر لے۔
- جب چھ ماہ بعد سنار بدصورت ہو گیا اور اس کی کشش ختم ہو گئی، تو لڑکی کا عشق بھی ختم ہو گیا۔ یوں اس کی روح پاک ہو گئی اور وہ حقیقی عشق (عشقِ الٰہی) کے قابل ہوئی۔

یہ شعر بیماری سے تندرستی کی طرف منتقلی کا ذکر کرتا ہے، جو بظاہر جسمانی شفا ہے، لیکن درحقیقت یہ اس نفسیاتی اور روحانی علاج کا ایک مرحلہ ہے جہاں انسان مجازی سہاروں سے گزر کر حقیقت کی پہچان کرتا ہے۔

مولانا رومیؒ کی مثنوی کے اس واقعے اور خاص طور پر اس شعر میں چھپی حکمت کو اگر ہم **قرآن و سنت** کی روشنی میں دیکھیں، تو یہاں چند اہم علمی اور روحانی نکات سامنے آتے ہیں۔

مولانا رومیؒ کا یہ قصہ محض ایک کہانی نہیں بلکہ "نفس کے علاج" کی ایک تمثیل (Allegory) ہے۔ اسے درج ذیل پہلوؤں سے سمجھا جا سکتا ہے:

محبت کا علاج نکاح (حدیثِ نبوی ﷺ)

اس شعر میں ذکر ہے کہ جب کنیز اور سنار کو ملا دیا گیا تو وہ صحت یاب ہو گئی۔ یہ عمل اس مشہور حدیثِ مبارکہ کے عین مطابق ہے:

"لَمْ يُرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلُ النِّكَاحِ" "سنن ابن ماجہ" (محبت کرنے والوں کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز (مفید) نہیں دیکھی گئی۔" (پہلے بیان کی جا چکی ہے)

اسلامی نقطہ نظر سے، اگر کسی کے دل میں کسی کے لیے جائز میلان پیدا ہو جائے، تو اس کا بہترین شرعی اور نفسیاتی حل نکاح ہے تاکہ انسان کی طبیعت سکون پائے اور وہ گناہ یا ذہنی و جسمانی بیماری سے بچ سکے۔

دنیاوی لذتوں کی حقیقت اور فنائیت (قرآن)

شعر میں "شش ماہ" (چھ ماہ) کی مدت ایک اشارہ ہے کہ دنیاوی عیش و کامرانی چاہے کتنی ہی بھرپور کیوں نہ ہو، وہ **عارضی** ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ) "...سورہ آل عمران:14" (لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت (عورتیں، اولاد، سونا چاندی وغیرہ) مزین کر دی گئی ہے"...

لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ یہ سب "متاع الحیاۃ الدنیا" (دنیاوی زندگی کا فائدہ) ہے اور اصل ٹھکانہ اللہ کے پاس ہے۔ رومیؒ یہاں یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ اس لڑکی کو وہ دنیاوی لذت (سنار کا وصال) دے دی گئی تا کہ اس کا جی بھر جائے اور وہ خود اپنی آنکھوں سے اس کی فنائیت دیکھ لے۔

3. تدریجی اصلاح (حکمتِ دین)

طبیبِ الٰہی نے لڑکی کو اچانک سنار سے جدا نہیں کیا، بلکہ اسے سنار کے پاس رہنے دیا یہاں تک کہ وہ "صحت یاب" ہو گئی۔ یہ **نفسیاتی علاج** کا وہ طریقہ ہے جس میں انسان کو اس کی مرغوب چیز دے کر اس کی شدتِ طلب کو کم کیا جاتا ہے۔

- قرآن پاک میں بھی بعض احکامات (مثلاً شراب کی حرمت) تدریجاً نازل ہوئے تا کہ انسانی نفس اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔
- حکمتِ دین یہ ہے کہ پہلے انسان کو ذہنی سکون (صحت) دیا جائے، پھر اسے حقیقتِ حق کی طرف مائل کیا جائے۔

خضرؑ والی حکمت اور مشیتِ الٰہی

اس پوری کہانی میں طبیبِ الٰہی کا کردار (جو بعد میں سنار کو بیمار کر دیتا ہے) بعض لوگوں کو شرعی لحاظ سے مشکل لگ سکتا ہے، لیکن رومیؒ نے اس کی بنیاد **قرآن کریم میں مذکور حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ** کے واقعے پر رکھی ہے۔

- جس طرح حضرت خضرؑ نے بظاہر ایک کشتی توڑ دی یا ایک لڑکے کو قتل کیا (جو بظاہر غلط تھا)، لیکن اس کے پیچھے اللہ کی دی ہوئی **"علمِ لدنی "** اور حکمت چھپی تھی۔

- مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ وہ طبیب اللہ کا ولی تھا اور اس کا کوئی بھی فعل اپنی خواہش سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے تھا۔ اس کا مقصد لڑکی کو "عشقِ مجازی" کی قید سے نکال کر "عشقِ حقیقی" تک پہنچانا تھا۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی تشریح یہ ہے کہ:

1. **جائز ضرورت کی تکمیل:** انسانی فطرت اور نفسیاتی امراض کا علاج جائز حدود میں رہ کر کرنا سنتِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔
2. **دنیا کی بے ثباتی:** انسان جب اپنی مراد پالیتا ہے، تبھی اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ سکون عارضی تھا۔ اصل سکون "ذکرِ الٰہی" میں ہے۔
3. **تزکیہ نفس:** کبھی کبھی اللہ تعالیٰ بندے کو دنیاوی نعمتوں سے نواز کر پھر انہیں چھین لیتا ہے تاکہ بندہ نعمت سے نکل کر "منعم" (نعمت دینے والے) کی طرف متوجہ ہو جائے۔

علومِ اسلامیہ (Islamic Sciences) کے مختلف شعبوں، بالخصوص **تصوف (سلوک واحسان)**، **علم النفس (اسلامی نفسیات)**، اور **علم الاخلاق** کی روشنی میں اس شعر اور رومیؒ کی اس تمثیل کو ایک گہرے علمی تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔

یہاں اس کے اہم علمی پہلو درج ذیل ہیں:

علمِ تصوف اور سلوک: "مرضِ قلب" کی تشخیص

علومِ اسلامیہ میں قلب (دل) کی دو حالتیں بتائی گئی ہیں: **صحت** اور **مرض**۔

- **مرض:** اللہ کے سوا کسی اور (غیر اللہ) کی محبت میں اس طرح گرفتار ہونا کہ وہ انسان کے دین یا ذہنی توازن پر اثر انداز ہو، اسے صوفیاء "بیماری" قرار دیتے ہیں۔
- **علاج:** رومیؒ کے نزدیک، اس لڑکی کا سنار کی محبت میں گرفتار ہونا دراصل انسانی روح کا دنیاوی لذتوں (مجاز) کی طرف مائل ہونا ہے۔ یہاں طبیبِ الٰہی (جو مرشدِ کامل کی علامت ہے) نے اس کا علاج "وصال" سے کیا تاکہ اس کے اندر کی طلب پوری ہو کر ختم ہو جائے اور وہ اس کی فنائیت کا مشاہدہ کر سکے۔ اسے تصوف میں "**تزکیہ**" کا ایک طریقہ کہا جاتا ہے۔

علمِ النفس (اسلامی نفسیات): کمالِ اعتدال

اسلامی نفسیات میں انسانی نفس کے درجے بتائے گئے ہیں۔ یہ لڑکی (نفس) جب تک اپنی خواہش (سنار) سے دور تھی، اضطراب اور بیماری کی حالت میں تھی۔

- **تسکینِ نفس**: امام غزالیؒ اور دیگر مفکرین کے مطابق، کبھی کبھی نفس کی جائز سرکشی کو ختم کرنے کے لیے اسے وہ شے دے دی جاتی ہے جس کی وہ ضد کر رہا ہو، تاکہ اس کا غبار چھٹ جائے اور وہ "نفسِ مطمئنہ" کی طرف سفر کر سکے۔
- **صحتِ تامہ**: شعر میں "صحت" کا لفظ صرف جسمانی تندرستی کے لیے نہیں، بلکہ **نفسیاتی توازن** کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جب انسان کی جذباتی تسکین ہو جاتی ہے، تو اس کے جسمانی قویٰ خود بخود بحال ہونے لگتے ہیں۔

علمِ اخلاق: تدریج اور صبر

علمِ اخلاق کا ایک قاعدہ ہے کہ اصلاح یکدم نہیں ہوتی بلکہ اس میں **تدریج (Gradualism)** ضروری ہے۔

- **شش ماہ (چھ ماہ)**: یہ مدت اس بات کی علامت ہے کہ کسی کے عقیدے یا اخلاق کی اصلاح کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ "کُن فیکون" صرف اللہ کی صفت ہے، جبکہ انسانوں کی تربیت کے لیے اسباب کی دنیا میں وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔
- **حکمتِ عملی**: اخلاقیات ہمیں سکھاتی ہے کہ برائی یا غلط میلان کو ختم کرنے کے لیے پہلے اس کے ظاہری اثرات کو دور کیا جائے (جیسے لڑکی کو صحت مند کرنا)، پھر اس کی جڑ کاٹی جائے (جیسے بعد میں سنار کے حسن کا زوال)۔

فقہی و حکیمانہ زاویہ: "اخف الضررین" کا قاعدہ

فقہ کا ایک مشہور قاعدہ ہے " **اخف الضررین** "(یعنی اگر دو برائیاں سامنے ہوں، تو چھوٹی برائی کو اختیار کر کے بڑی برائی سے بچا جائے)۔

- لڑکی موت کے قریب تھی (بڑا نقصان)۔ طبیب نے ایک سنار (اجنبی) کو بلا کر اس سے شادی کرا دی اور اسے بادشاہ سے دور کر دیا (بظاہر ایک سمجھوتہ یا چھوٹا نقصان)، تاکہ لڑکی کی زندگی بچائی جا سکے۔

- علومِ اسلامیہ کی رو سے، انسانی جان کا تحفظ سب سے مقدم ہے۔ اس لیے اس طبیب کا عمل "مقاصدِ شریعہ" (حفظِ نفس) کے عین مطابق ہے۔

علمِ لدنی اور مشیتِ الٰہی

یہ قصہ **سورہ کہف** کے حضرت خضرؑ کے واقعات کی طرح "علمِ لدنی" کی تفسیر ہے۔

- عام حکیم (دنیاوی عقل) صرف نبض دیکھ کر دوا دیتے تھے، لیکن اللہ کے ولی نے "باطنی بصیرت" سے اصل وجہ جانی۔

- یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات میں کچھ ایسے اسباب بھی کام کر رہے ہیں جو عام انسانی عقل سے بالاتر ہیں، اور ان کا ادراک صرف تقویٰ اور قربِ الٰہی سے ممکن ہے۔

علمی اعتبار سے یہ شعر ہمیں بتاتا ہے کہ **حقیقی تندرستی** تب حاصل ہوتی ہے جب انسان کا ظاہر اور باطن ہم آہنگ ہو جائے۔ مولانا رومیؒ یہ سمجھا رہے ہیں کہ جب تک نفس اپنی ادھوری خواہشات کے پیچھے تڑپتا رہے گا، وہ بیمار رہے گا۔ اسے پہلے "مجاز" دے کر مطمئن کیا گیا تا کہ وہ اس قابل ہو سکے کہ اسے "حقیقت" کی طرف لے جایا جائے۔

کلاسیکی فارسی شعراء کے ہاں یہ موضوع کہ **"عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے"**، ایک مستقل روایت کی صورت میں موجود ہے۔ صوفیاء اور شعراء کے نزدیک کائنات کی خوبصورتی دراصل "جمالِ الٰہی" کا پرتو ہے، اس لیے وہ انسانی محبت کو حقیقت کی طرف جانے کا پہلا قدم قرار دیتے ہیں۔

مختلف شعراء نے اس تصور کو اپنے اپنے رنگ میں بیان کیا ہے:

1۔ عبدالرحمن جامی (عشق بطورِ زینہ)

مولانا جامیؒ نے اس فلسفے کو بہت واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ مجازی عشق سے منہ نہیں موڑنا چاہیے کیونکہ یہی راستہ آگے جاتا ہے۔ ان کا مشہور قول ہے: "**اَلْمَجَازُ قَنْطَرَةُ الْحَقِيقَة**" (مجاز حقیقت کا پل ہے)۔ وہ فرماتے ہیں:

متاب از عشقِ رُوئے خوب رویاں

کہ از بہرِ حقیقت است ایں نشاں)

خوبصورت چہروں کے عشق سے منہ نہ موڑ، کیونکہ یہ حقیقت (خدا) تک پہنچنے کا ایک نشان ہے۔)

2۔ مرزا عبد القادر بیدل (باطنی بصیرت)

مرزا بیدل کے ہاں یہ موضوع بہت گہرا ہے۔ وہ انسان کے باطنی سفر اور نفسیاتی کیفیات کو بڑی باریک بینی سے دیکھتے ہیں۔ بیدل کے نزدیک جب تک انسان مجاز کی رنگینیوں میں "گم" نہیں ہوتا، اسے اپنی حقیقت کا عرفان نہیں ہوتا۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہر چہ در آئینہ تمثالے نمود آں ماو تست

گر بروں آئی ز خود آئینہ ہم سیمائے تست

آئینہ (دنیا) میں جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ تیرا ہی عکس ہے۔ اگر تو اپنی ذات کی قید سے نکلے تو تجھے پتہ چلے کہ آئینہ خود تیری ہی حقیقت کا عکاس ہے۔ (بیدل یہ نکتہ سمجھاتے ہیں کہ جس طرح رومیؒ کی اس لڑکی نے سنار کے زوال کو دیکھ کر حقیقت کو پایا، اسی طرح انسان جب کائنات کی فنائیت کو دیکھتا ہے تو وہ "بقا" (خدا) کی طرف مائل ہوتا ہے۔

3۔ حافظ شیرازی (طبیبِ عشق کا تصور)

حافظ کے ہاں "طبیب" اور "علاج" کی اصطلاحات کثرت سے ملتی ہیں۔ ان کے نزدیک بھی دل کی بیماری کا علاج دنیاوی دواؤں میں نہیں بلکہ "نگاہِ مرشد" یا "فیضِ عشق" میں ہے۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد

اے خواجہ درد نیست و گرنہ طبیب ہست

ایسا کون سا عاشق ہے جس پر یار نے نظرِ کرم نہ کی ہو؟ اے خواجہ! اصل میں تیرے اندر وہ تڑپ اور درد ہی نہیں، ورنہ طبیب تو ہر وقت موجود ہے۔)

4۔ سعدی شیرازی (حکمت اور تدریج)

شیخ سعدیؒ نے "گلستاں" اور "بوستاں" میں انسانی نفسیات اور عشق کو اخلاقی اور حکیمانہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انسان پہلے مٹی کی خوشبو پر فدا ہوتا ہے (مجاز)، لیکن جب اسے علم ہوتا ہے کہ یہ خوشبو گلاب کی ہے (حقیقت)، تو وہ مٹی کو چھوڑ کر اصل کی طرف دوڑتا ہے۔

کلاسیکی شاعری میں اس کے بنیادی پہلو:

- **آئینہ اور عکس:** دنیا ایک آئینہ ہے جس میں خدا کا جمال نظر آتا ہے۔ شعراء کہتے ہیں کہ عکس کو دیکھ کر اصل کی طلب پیدا ہونی چاہیے۔
- **خار اور گل (کانٹا اور پھول):** مجازی عشق کی تکلیفیں وہ کانٹے ہیں جو انسان کو پھول (خدا) کی قدر سکھاتے ہیں۔
- **بیماری اور شفا:** جس طرح رومیؒ کے شعر میں چھ ماہ کی مہلت دی گئی، کلاسیکی شعراء اسے **"فراق"** کا زمانہ کہتے ہیں، جو پختگی کے لیے ضروری ہے۔

حاصلِ کلام: فارسی شعراء کے نزدیک مجازی محبوب (جیسے رومیؒ کا سنار) دراصل ایک "بہانہ" ہے تاکہ انسان کے اندر کی "طلب" بیدار ہو۔ جب یہ طلب بیدار ہو جاتی ہے اور انسان کو دنیا کی بے ثباتی کا یقین آ جاتا ہے، تو وہ خود بخود اس طبیب (اللہ یا مرشد) کی طرف رجوع کرتا ہے جو اسے دائمی صحت عطا کر سکے۔

رومیؒ کے اس واقعے اور خاص طور پر اس شعر کو جب ہم **انتھراپالوجی (علمِ بشریات)** اور **نفسیات (Psychology)** کے جدید ترازو میں تولتے ہیں، تو یہ محض ایک قدیم کہانی نہیں بلکہ انسانی فطرت اور سماجی رویوں کی ایک گہری سائنسی دستاویز نظر آتی ہے۔

1. نفسیاتی نقطہ نظر (Psychological Perspective)

نفسیات کی رو سے اس شعر میں دو بڑے اصول کارفرما نظر آتے ہیں:

- **نفسیاتی جسمانی تعلق (Psychosomatic Connection):** لڑکی کا بیمار ہونا کسی جراثیم کی وجہ سے نہیں بلکہ "جذباتی محرومی" کی وجہ سے تھا۔ نفسیات کہتی ہے کہ جب انسانی ذہن کسی شدید صدمے یا ادھوری خواہش (Unfulfilled Desire) کا شکار ہوتا ہے، تو اس کا اثر جسم پر بیماری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ "شش ماہ"

(چھ ماہ) کا عرصہ دراصل اس کے **کیتھارسس (Catharsis)** کا وقت تھا، جہاں اسے وہ جذباتی سکون ملا جس سے اس کا مدافعت کا نظام (Immune System) دوبارہ بحال ہوا۔

- **تسکین اور اکتاہٹ کا اصول :(Satiety and Habituation)** نفسیات میں ایک تصور ہے کہ جب انسان کو اس کی مطلوبہ چیز مل جاتی ہے، تو کچھ عرصہ بعد اس کی "شدت" ختم ہونے لگتی ہے۔ چھ ماہ تک ساتھ رہنے سے لڑکی کی وہ "تڑپ (Obsession) " ختم ہو گئی جو اسے بیمار کر رہی تھی۔ جب خواہش پوری ہو کر عام روٹین بن گئی، تو اس کا ہیجان ختم ہوا اور وہ ذہنی و جسمانی طور پر نارمل (صحتمند) ہو گئی۔

- **لاشعور کا سفر :(Jungian Archetypes)** کارل جنگ (Carl Jung) کے مطابق، یہ کہانی "انفرادی سفر " (Individuation) کی عکاسی کرتی ہے۔ سنار اس کے لاشعور کی ایک ادھوری خواہش تھی جسے شعور میں لا کر پورا کرنا ضروری تھا تاکہ شخصیت کا بوجھ ختم ہو سکے۔

انتھراپولوجیکل نقطہ نظر (Anthropological Perspective)

علمِ بشریات کے ماہرین اس واقعے کو انسانی معاشرت اور ثقافتی ارتقاء کے تناظر میں دیکھتے ہیں:

- **عبوری مراحل :(Rites of Passage)** انتھراپالوجی میں کسی بھی بڑی تبدیلی کے لیے ایک "درمیانی وقت " (Liminal Period) ہوتا ہے۔ یہ "شش ماہ" کا عرصہ اس لڑکی کے لیے ایک سماجی اور حیاتیاتی منتقلی کا وقت تھا۔ وہ ایک بیمار کنیز (جس کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی) سے ایک بااختیار بیوی کے مقام تک پہنچی۔ یہ سماجی حیثیت کی تبدیلی اس کی صحت یابی کا بڑا سبب بنی۔

- **شفا دینے والے کا سماجی کردار :(The Shamanic Role)** طبیبِ الٰہی کا کردار انتھراپالوجی میں ایک "شامان " (Shaman) یا "ثقافتی طبیب" جیسا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ معاشرے میں بعض امراض کا علاج جڑی بوٹیوں سے نہیں بلکہ "ثقافتی اور جذباتی مداخلت" سے ہوتا ہے۔ اس نے سماجی ڈھانچے (شادی) کو استعمال کر کے ایک فرد کو دوبارہ معاشرے کا فعال حصہ بنایا۔

- **فنائیت کا کلچرل ادراک :** انسانی تہذیبوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے ہمیشہ "خوبصورتی اور زوال" کے درمیان رشتہ تلاش کیا ہے۔ انتھراپالوجی کے مطابق، یہ واقعہ ہمیں سکھاتا ہے کہ انسانی گروہ کیسے عارضی سہارے (مجاز) ڈھونڈتے ہیں اور پھر ان کے ختم ہونے پر بڑے حقائق (مذہب یا فلسفہ) کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔

حاصل بحث : انتھراپالوجی اور نفسیات دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ **"انسان صرف گوشت پوست کا مجموعہ نہیں ہے"**۔ اس کی جسمانی صحت اس کے جذباتی اطمینان اور سماجی تعلقات سے جڑی ہوئی ہے۔ رومیؒ نے صدیوں پہلے اس شعر میں وہ بات کہہ دی تھی جسے آج کی سائنس "Mind-Body Medicine" اور "Social Psychology" کے نام سے پہچانتی ہے۔

مولانا رومیؒ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بظاہر سادہ الفاظ میں کائنات کے پیچیدہ ترین حقائق بیان کر دیتے ہیں۔ اس شعر کے شعری محاسن (Literary Merits) درج ذیل ہیں:

1. سہلِ ممتنع (Simple yet Profound)

یہ شعر "سہلِ ممتنع" کی بہترین مثال ہے۔ مولانا نے کوئی مشکل تشبیہ یا بھاری بھرکم استعارہ استعمال نہیں کیا، بلکہ روزمرہ کی زبان میں ایک پوری کیفیت بیان کر دی ہے۔ الفاظ اتنے سادہ ہیں کہ ایک عام قاری بھی مفہوم سمجھ لیتا ہے، لیکن گہرائی اتنی ہے کہ حکماء اور صوفیاء اس سے نفسیاتی اور روحانی نتائج اخذ کرتے ہیں۔

2. صنعتِ تضاد (برائے معنوی ارتقاء)

شعر کے دو حصوں میں ایک لطیف تضاد اور ارتقاء موجود ہے:

- پہلے مصرعے میں **"کام راندن "**(عیش و مراد پانا) ایک نفسیاتی عمل ہے۔
- دوسرے مصرعے میں **"صحتِ تمام "**(کامل تندرستی) ایک جسمانی نتیجہ ہے۔ شاعر نے یہاں "سبب (Cause) " اور "اثر (Effect) " کو اتنی خوبصورتی سے جوڑا ہے کہ انسانی وجود کے دو مختلف پہلو (ذہن اور جسم) ایک ہی لڑی میں پروئے نظر آتے ہیں۔

3. انتخابِ الفاظ (Diction)

- **"مدتِ شش ماہ :"** یہاں "شش ماہ" (چھ ماہ) کا ذکر محض اتفاقی نہیں ہے۔ شاعری میں وقت کا تعین واقعیت نگاری (Realism) پیدا کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ شفائے کامل یکدم نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے ایک مخصوص وقت درکار ہوتا ہے۔
- **"می راندند :"** فعلِ ماضی استمراری کا استعمال (کرتے رہے) اس تسلسل کو ظاہر کرتا ہے جو علاج کے لیے ضروری تھا۔
- **"تمام :"** دوسرے مصرعے کے آخر میں "تمام" کا لفظ "صحت" کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے، جو قاری کو ایک اطمینان بخش اختتام (Satisfying Conclusion) کا احساس دلاتا ہے۔

4. ترنم اور بحر (Rhythm and Meter)

یہ شعر مثنوی کی مخصوص بحر **"بحر رمل مسدس مقصور یا محذوف "** میں ہے:

فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) یا فاعلات (اس بحر میں ایک فطری بہاؤ اور موسیقی ہے جو قصہ گوئی کے لیے موزوں ترین ہے۔ "شش ماہ" اور "دختر تمام" کے الفاظ اس وزن میں ایک خاص صوتی آہنگ (Cadence) پیدا کر رہے ہیں۔

5. ایجاز و اختصار (Concision)

مولانا نے صرف دو مصرعوں میں ایک طویل داستان کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ بیماری کا ختم ہونا، وصال کی خوشی، وقت کا گزرنا اور مکمل شفایابی — یہ چار بڑی باتیں صرف بارہ تیرہ الفاظ میں سمو دی گئی ہیں۔ اسے **"دریا کو کوزے میں بند کرنا "** کہتے ہیں۔

6. بیانیہ انداز (Narrative Style)

شعر میں ایک "منطقی تسلسل" ہے۔ پہلا مصرع "شرط" کی طرح ہے اور دوسرا مصرع "جزاء" یا نتیجے کی طرح۔ یہ بیانیہ انداز قاری کے تجسس کو برقرار رکھتا ہے کہ اب آگے کیا ہوگا (یعنی جب وہ تندرست ہو گئی تو پھر کیا ہوا)۔

مختصر یہ کہ : اس شعر کا حسن اس کی **سادگی اور سچائی** میں ہے۔ رومیؒ یہاں ایک منجھے ہوئے معالج کی طرح الفاظ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر انسانی فطرت کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔

بعد از آن از بَہرِ او شَربَت بِساخت
تا بِخورُد و پیشِ دختر می گُداخت

مشکل الفاظ کے معنی

از بَہرِ: کے لیے، کی خاطر ۔۔۔۔**بساخت:** بنایا، تیار کیا۔۔۔ **بخورد:** اس نے پی لیا (کھالیا) ۔۔۔۔ **پیشِ:** سامنے

می گُداخت: پگھلنے لگا، گھلنے لگا، دبلا ہونے لگا

ترجمہ

"اس کے بعد (حکیم نے) اس (زرگر) کے لیے ایک (خاص) شربت تیار کیا، تاکہ وہ اسے پی لے اور (نتیجتاً) وہ لڑکی کے سامنے گھلنے (دبلا اور بدصورت ہونے) لگے۔"

اس شعر کا تعلق کہانی کے اس موڑ سے ہے جہاں ظاہری عشق کو ختم کرنے کے لیے حکیمِ الٰہی "علاج بالضد" کا طریقہ اپناتا ہے۔ اس کی تشریح کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱ . کہانی کا پس منظر: بادشاہ کی چہیتی کنیز ایک سنار (زرگر) کے عشق میں بیمار تھی۔ حکیمِ الٰہی نے جان لیا کہ یہ بیماری جسمانی نہیں بلکہ جذباتی ہے۔ اس نے زرگر کو محل میں بلوایا اور اسے خلعت و انعامات سے نوازا تاکہ وہ کنیز کے ساتھ خوش رہے۔ جب چھ ماہ گزر گئے اور زرگر پوری طرح بادشاہ کے فریب میں آ گیا، تو حکیم نے اسے وہ مخصوص شربت (دوا) دینا شروع کی جس کا ذکر اس شعر میں ہے۔

۲ . شربت کی حقیقت: یہ کوئی عام شربت نہیں تھا بلکہ ایک ایسی دوا تھی جس نے زرگر کے جسم کو اندر سے توڑنا شروع کر دیا۔ اس کے پینے سے زرگر کی رنگت پیلی پڑ گئی، اس کا گوشت پگھلنے لگا اور اس کی وہ ظاہری خوبصورتی جس پر کنیز فدا تھی، آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔

۳ . مولانا رومیؒ کا فلسفہ (عشقِ مجازی کی حقیقت): اس شعر کے ذریعے مولانا رومیؒ ایک گہرا سبق دے رہے ہیں۔ وہ بتانا چاہتے ہیں کہ:

- ظاہری حسن عارضی ہے: کنیز کا عشق زرگر کی روح سے نہیں بلکہ اس کے رنگ وروپ اور جوانی سے تھا۔ جیسے ہی دوا کے اثر سے وہ حسن ماند پڑا، کنیز کی محبت بھی ٹھنڈی پڑنے لگی۔
- حکیمِ الٰہی کا کردار: یہاں حکیم سے مراد "مرشدِ کامل" ہے جو سالک کے دل سے دنیاوی اور مجازی بتوں کی محبت نکالنے کے لیے ایسی تدبیر کرتا ہے کہ انسان کو ان چیزوں کی بے ثباتی کا یقین ہو جائے۔

اگلے اشعار میں مولانا فرماتے ہیں کہ جب زرگر بدصورت اور بیمار ہو گیا تو کنیز کو اس سے گھن آنے لگی۔ رومیؒ کے نزدیک وہ عشق جو "رنگ وبو" (ظاہری خوبصورتی) پر مبنی ہو، وہ عشق نہیں بلکہ فسق اور وبال ہے۔

خلاصہ: یہ شعر اس عمل کی عکاسی کرتا ہے جہاں ایک عارضی اور مادی کشش کو ختم کرنے کے لیے اس کے مادی اسباب کو مٹایا جا رہا ہے، تاکہ روح سچے اور لافانی عشق (عشقِ الٰہی) کی طرف رجوع کر سکے۔

مولانا رومیؒ کے اس واقعے اور خاص طور پر اس شعر کا مقصد عشقِ مجازی کی بے ثباتی اور دنیاوی حسن کے زوال کو ظاہر کرنا ہے۔ قرآن وسنت میں اس فلسفے کی تائید متعدد مقامات پر ملتی ہے، جہاں انسان کو ظاہری شکل وصورت کے بجائے باطنی حقیقت اور لافانی حسن (عشقِ الٰہی) کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

اس تناظر میں درج ذیل مستند حوالے پیشِ خدمت ہیں:

۱. دنیاوی حسن اور زندگی کی بے ثباتی (قرآن)

رومیؒ کے شعر میں زرگر کا "گھلنا" اور اس کا حسن ماند پڑنا دراصل پوری دنیا کی مثال ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے دنیاوی رونق کی مثال ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ... كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا "جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشہ، زینت اور تمہارے آپس میں فخر (ونمائش) ہے... اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش، کہ اس سے اگنے والی کھیتی کسانوں کو بھلی لگتی ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اسے زرد (پیلے رنگ کا) دیکھتے ہو، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔" (سورۃ الحدید:20)

جس طرح رومیؒ کے شعر میں حکیم نے زرگر کو دوا پلا کر پیلا اور لاغر کر دیا تا کہ اس کی ظاہری زینت ختم ہو جائے، بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دنیا کا ہر حسن انجام کار زرد پڑ کر مٹی ہونے والا ہے۔

۲. اللہ کی نظر صورت پر نہیں، سیرت پر ہے (حدیث)

کنیز زرگر کی ظاہری صورت پر عاشق تھی، لیکن اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ اصل قدر باطن کی ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ "بیشک اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔" (صحیح مسلم: 2564)

حکیمِ الٰہی نے زرگر کی صورت بگاڑ کر کنیز پر یہ واضح کیا کہ تم جس چیز (جسم) سے محبت کر رہی ہو وہ تو بدل جانے والا ہے، اصل محبت کے لائق وہ ذات ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔

۳. نفسانی خواہشات کی پیروی سے ممانعت

کنیز کا عشق دراصل "ہوائے نفس" (نفس کی خواہش) تھا، جسے رومیؒ نے ایک بیماری قرار دیا۔ قرآن میں ایسی خواہشات کی پیروی سے روکا گیا ہے:

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ * فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ "اور جس نے اپنے نفس کو خواہش (ناجائز) سے روکا، تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔" (سورۃ النازعات: 40-41)

اسلامی تعلیمات کے مطابق ایسا عشق جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دے اور محض جسمانی لذت تک محدود ہو، وہ روح کے لیے ہلاکت ہے۔

۴. فنا اور بقا کا فرق

رومیؒ کے اس قصے کا نچوڑ اس آیت میں پنہاں ہے

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ * وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ "جو بھی زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے، اور صرف تمہارے رب کی ذات باقی رہے گی جو صاحبِ جلال اور صاحبِ اکرام ہے۔" (سورۃ الرحمن: 26-27)

رومیؒ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اگر کنیز کا عشق "خالق" کے لیے ہوتا تو کبھی ختم نہ ہوتا، لیکن چونکہ وہ "مخلوق" (زرگر) کے لیے تھا جو کہ فانی ہے، اس لیے جیسے ہی زرگر کی حالت بدلی، اس کا عشق بھی ختم ہو گیا۔

حاصلِ کلام

مولانا رومیؒ کا یہ شعر اور واقعہ دراصل "اعتبار" (عبرت پکڑنے) کا درس دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ "پس اے بصیرت والو! عبرت حاصل کرو۔" (سورۃ الحشر: 2)

یہ قصہ ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ انسان کو ان عارضی صورتوں کے پیچھے اپنی روح برباد نہیں کرنی چاہیے جو ایک "شربت" یا وقت کی ایک ٹھوکر سے بدل جاتی ہیں، بلکہ اسے اس حسنِ ازل کی تلاش کرنی چاہیے جسے کبھی زوال نہیں۔

مولانا رومیؒ نے اس قصے میں جس "شربت" کا ذکر کیا ہے، طبی اور حکیمانہ نقطہ نظر سے اس کی وضاحت دو پہلوؤں سے کی جا سکتی ہے: ایک قدیم طبِ یونانی کے تناظر میں اور دوسرا جدید میڈیکل سائنس کے نفسیاتی اور عضویاتی (Physiological) اثرات کے لحاظ سے۔

طبی نقطہ نظر سے اس کی تشریح درج ذیل ہے:

۱۔ قدیم طبِ یونانی (Humoral Theory) کا تناظر

قدیم طب میں صحت کا دارومدار جسم کے چار اخلاط (خون، بلغم، صفرا اور سودا) کے توازن پر تھا۔

- رطوبتِ اصلیہ کا خاتمہ: انسانی خوبصورتی، جلد کی تازگی اور جسم کی فربہی (موٹاپا) کا تعلق جسم کی "رطوبتِ اصلیہ" (Innate Moisture) اور "خون" سے ہے۔ حکیم نے جو شربت تیار کیا، وہ غالباً ایسی اشیاء کا مرکب تھا جو "مُسہل" (Strong Purgative) "یا "مُجفّف" (Drying Agent) " تھیں۔

- خون کی کمی اور زردی: اس شربت نے زرگر کے نظامِ ہضم کو متاثر کیا ہو گا، جس سے غذا خون میں تبدیل ہونے کے بجائے فاسد مادوں کی شکل میں خارج ہونے لگی۔ جب جسم کو غذا نہیں ملتی تو وہ اپنے اندر ذخیرہ شدہ چربی اور گوشت کو پگھلانا شروع کر دیتا ہے، جسے رومیؒ نے "می گُداخت" (پگھلنے) سے تعبیر کیا ہے۔
- صفرا کا غلبہ: ایسی ادویات جسم میں حرارت اور خشکی بڑھا دیتی ہیں، جس سے رنگت زرد (Jaundice نما کیفیت) پڑ جاتی ہے اور چہرے کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔

۲۔ جدید میڈیکل سائنس (Physiological Perspective)

اگر ہم اسے جدید طبی سائنس کے ترازو میں تولیں، تو حکیم کی دی ہوئی دوا درج ذیل اثرات کی حامل ہو سکتی ہے:

- سوءِ ہضم (Malabsorption): ایسی دوا جو آنتوں کے ذریعے غذائیت کے جذب ہونے کے عمل کو روک دے۔ اس سے انسان "Cachexia" (شدید کمزوری اور وزن میں کمی) کا شکار ہو جاتا ہے۔
- میٹابولک تبدیلیاں: بعض زہریلے مادے یا تیز اثر ادویات جگر (Liver) اور گردوں پر اثر انداز ہو کر میٹابولزم کو اس قدر تیز یا خراب کر دیتی ہیں کہ انسان دنوں میں ڈھانچہ بن جاتا ہے۔
- ہارمونل اثرات: ممکن ہے اس شربت میں ایسے اجزاء ہوں جو انسان کے اندرونی نظام (Endocrine System) کو متاثر کر کے اسے افسردگی اور جسمانی گراوٹ کی طرف لے جائیں۔

۳۔ نفسیاتی طبی پہلو (Psychosomatic Aspect)

طبِ جدید میں "عشق" کو بعض اوقات ایک جنونی کیفیت (Obsessive Compulsive Disorder) کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جس کا اثر براہِ راست مریض کے اعصابی نظام پر ہوتا ہے۔

- کنیز کا علاج: حکیم نے زرگر کو بیمار کر کے دراصل کنیز کے "Visual Perception" (بصری ادراک) کو تبدیل کیا۔ جب کنیز کے دماغ کو وہ "محرک" (یعنی زرگر کا حسن) ملنا بند ہو گیا جس سے اسے لذت ملتی تھی، تو اس کے دماغ کے وہ حصے (Reward System) خاموش ہو گئے جو اس عشق کے ذمہ دار تھے۔

- کراہت کا پیدا ہونا: طبی طور پر جب کسی حسین چیز کی ظاہری شکل "بیماری" یا "تعفن" میں بدلتی ہے، تو انسانی دماغ میں "Disgust" (گھن) کا مرکز متحرک ہو جاتا ہے، جو محبت کے جذبے کو ختم کر دیتا ہے۔

۴. حکیم کا "شربت" بطورِ کیمیا

رومیؒ کے نزدیک یہ حکیم محض ایک ڈاکٹر نہیں تھا بلکہ ایک "روحانی کیمیادان" تھا۔ طبی اصطلاح میں اس عمل کو "تصفیہ " (Purification) بھی کہا جا سکتا ہے۔

- جسم کو "گھلانا" دراصل اس "نفس" کو مارنا تھا جو ظاہری چمک دمک پر فدا تھا۔
- طبی اعتبار سے اسے "علاج بالضد " کہتے ہیں، یعنی جس شہوت اور خوبصورتی نے بیماری پیدا کی تھی، اسے بدصورتی اور بیماری کے ذریعے ہی ختم کیا گیا۔

خلاصہ: طبی طور پر وہ شربت ایک ایسی کیمیائی تدبیر تھی جس نے زرگر کے جسمانی نظام (Metabolism) کو درہم برہم کر کے اس کی غذائیت چھین لی، تاکہ اس کا وہ ظاہری وجود مٹ جائے جو ایک غلط جذباتی وابستگی کا سبب بنا ہوا تھا۔ مولانا رومیؒ نے اس طبی عمل کو "عشقِ مجازی" کی موت کے لیے استعمال کیا۔

مولانا رومیؒ کی اس تمثیل میں زرگر کو زہر آلود شربت دے کر مار دینا بظاہر ایک اخلاقی بحران یا ظلم نظر آتا ہے۔ ایک عام انسان کے ذہن میں یہ سوال اٹھنا فطری ہے کہ ایک بے گناہ شخص کو محض ایک لڑکی کا عشق چھڑوانے کے لیے موت کے گھاٹ اتار دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

اس عمل کی اخلاقی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اسے تین مختلف زاویوں سے دیکھنا ہو گا:

۱. رومیؒ کا اپنا دفاع (الٰہی حکم اور خضرؑ کی مثال)

مولانا رومیؒ خود اس اعتراض سے واقف تھے، اسی لیے انہوں نے اس واقعے کے فوراً بعد چند اشعار میں اس کی وضاحت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس حکیم کا یہ فعل بادشاہ کی خواہش پر نہیں تھا، بلکہ "الہامِ الٰہی "پر مبنی تھا۔

کُشتنِ آن مَرد نہ از بَہرِ اُمید و بیم بود

زانکہ فرمودش خدائے آن حکیم

(اس شخص کا قتل نہ تو کسی لالچ کی وجہ سے تھا اور نہ کسی ڈر سے، بلکہ اس حکیم کو اللہ نے اس کا حکم دیا تھا۔)

رومیؒ یہاں حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ کے واقعے (سورۃ الکہف) کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جہاں حضرت خضرؑ نے ایک بظاہر بے گناہ بچے کو قتل کر دیا تھا کیونکہ اللہ نے انہیں اس کے مستقبل کے فتنے سے آگاہ کر دیا تھا۔ رومیؒ کے نزدیک یہ حکیم "خضرِ وقت" تھا، جس کا ہر قدم رضائے الٰہی کے تابع تھا۔

۲ . تمثیلی اور علامتی اخلاقیات (Symbolic Ethics)

مثنوی محض کہانیوں کی کتاب نہیں بلکہ حقائقِ باطنی کا بیان ہے۔ اگر ہم اس قصے کے کرداروں کو علامتی طور پر دیکھیں تو اخلاقی نقشہ بالکل بدل جاتا ہے:

- بادشاہ: روح یا عقلِ سلیم۔
- کنیز: نفسِ انسانی۔
- زرگر: دنیا کی ظاہری چمک دمک اور مادی لذتیں۔
- حکیم: مرشدِ کامل یا فیضِ الٰہی۔

اخلاقی نتیجہ: اس تناظر میں "زرگر کو مارنا" کسی انسان کو قتل کرنا نہیں، بلکہ انسان کے دل سے دنیا کی جھوٹی محبت کو نکالنا ہے۔ اخلاقی طور پر اپنی روح (کنیز) کو بچانے کے لیے نفسانی خواہشات (زرگر) کو مارنا عینِ تقاضائے بندگی اور اخلاقِ عالیہ ہے۔

۳ . مصلحتِ عامہ اور "بڑی برائی" کا خاتمہ

اخلاقیات کا ایک اصول "دفعِ ضررِ عام بہ ضررِ خاص" ہے (یعنی بڑے نقصان کو روکنے کے لیے چھوٹا نقصان گوارا کرنا)۔

- رومیؒ کے نزدیک وہ عشقِ مجازی ایک ایسا فتنہ تھا جو روح کو ہلاک کر رہا تھا۔

- زرگر کی موت محض ایک شخص کی موت نہیں تھی، بلکہ اس "فریب" کی موت تھی جو انسان کو خدا سے دور کرتا ہے۔

حاصلِ کلام:

رومیؒ کا پیغام یہ ہے کہ جب تک انسان کے اندر سے "زرگر" (دنیاوی حرص و ہوا) نہیں مرتا، تب تک اسے سچی زندگی اور حقیقی عشق نصیب نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ عمل مادی دنیا کے قانون کے بجائے "قانونِ عشق و معرفت" کے تحت کیا گیا ہے، جہاں معالج کا مقصد صرف زندگی بچانا نہیں بلکہ روح کو پاک کرنا ہوتا ہے۔

کلاسیکی فارسی شاعری میں رومیؒ کے اس فلسفے کی بازگشت کثرت سے ملتی ہے کہ "صورت" (ظاہر) محض ایک پردہ ہے اور "معنی" (حقیقت) تک پہنچنے کے لیے اس پردے کا چاک ہونا ضروری ہے۔ فارسی شعراء نے اس موضوع کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے کہ جو چیز فنا ہونے والی ہے، اس سے دل لگانا نادانی ہے۔

ان اشعار سے اس عمل کی مزید فکری وضاحت ہوتی ہے:

۱. سعدی شیرازی: ظاہری حسن کی بے ثباتی

شیخ سعدیؒ نے رومیؒ کے اسی نکتے کو بڑے سادہ مگر پر اثر انداز میں بیان کیا ہے کہ انسان کو ایسی چیز پر فریفتہ نہیں ہونا چاہیے جو وقت کے ساتھ بدل جائے۔ زرگر کا "گھلنا" دراصل ہر حسین صورت کا مقدر ہے۔

پنجہ با ساعدِ سیمین نہ بہ عقل افگندی

روزِ پیری کہ شود ساعدِ سیمین چوں نال

)تو نے چاندی جیسے بازوؤں سے جو رشتہ جوڑا ہے، یہ عقل مندی نہیں؛ بڑھاپے کے دن جب یہی چاندی جیسا بازو (کمزوری سے) نرسل کی طرح دبلا ہو جائے گا (تو تیرا عشق کہاں جائے گا؟)(

وضاحت: یہ شعر بعینہٖ اس صورتحال کی عکاسی کرتا ہے جو رومیؒ کی کنیز کو زرگر کے دبلا ہونے پر پیش آئی۔

۲. حافظ شیرازی: تعلقِ دنیا سے آزادی

حافظ کے نزدیک اصل کمال یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے آزاد ہو جائے جن پر "رنگ" چڑھتا اور اترتا ہے۔ زرگر کا حسن ایک "عاریتی رنگ" تھا جسے حکیم نے اتار دیا۔

غلامِ ہمتِ آنم کہ زیرِ چرخِ کبود

ز ہر چہ رنگِ تعلق پذیرد آزاد است

)میں اس شخص کی ہمت کا غلام ہوں جو اس نیلے آسمان کے نیچے ہر اس چیز سے آزاد ہے جو (بدل جانے والے) تعلق کا رنگ قبول کرتی ہے۔(

وضاحت: حکیم نے زرگر کو مار کر دراصل کنیز کو اسی "رنگِ تعلق" سے آزاد کرایا تاکہ وہ لافانی حسن کی طلبگار بن سکے۔

۳. مرزا عبدالقادر بیدل: ہستی کا پگھلنا

بیدلؔ، جن کا کلام رموزِ معرفت سے لبریز ہے، اس "گھلنے" اور "پگھلنے" (گداختن) کو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب تک ظاہری نقش نہیں مٹتا، حقیقتِ اصلی آشکار نہیں ہوتی۔

عبرت نشانِ ما بیدل بہ رنگ و بو نیست
شیرازۂ بہاریم از خود گسستنی ہا

)اے بیدل! ہماری عبرت کا نشان اس (دنیا کے) رنگ و بو میں نہیں ہے؛ ہم تو اس بہار کی مانند ہیں جس کا شیرازہ بکھر جانے (اور فنا ہو جانے) کے لیے ہے۔(

وضاحت: بیدلؔ کے اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ زرگر کا پگھلنا کوئی حادثہ نہیں بلکہ "عبرت" کا وہ مقام ہے جہاں مادی وجود بکھرتا ہے تو روحانی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

۴. عطار نیشاپوری: خودی کا خاتمہ

رومیؒ کے پیشرو فریدالدین عطارؒ کے نزدیک جب تک "مجاز" کا بت نہیں ٹوٹتا، "حقیقت" کا جلوہ نظر نہیں آتا۔

تا تو ہستی نقشِ باطل با تو است
چوں تو رفتی نقشِ حق پیدا شود

)جب تک تو (اپنی مادی خودی اور خواہشات کے ساتھ) موجود ہے، ایک باطل نقش تیرے ساتھ ہے؛ جب تو (اپنے نفس سے) گزر جائے گا، تبھی حق کا نقش ظاہر ہو گا۔(

وضاحت: زرگر کا وجود کنیز کے لیے "نقشِ باطل" بن گیا تھا، جسے مٹانا ضروری تھا تاکہ اس کے دل میں "نقشِ حق" کی جگہ بن سکے۔

نتیجہ

ان تمام کلاسیکی شعراء کے ہاں ایک قدرِ مشترک ہے: "فنائے ظاہر برائے بقائے باطن"۔

رومیؒ کا وہ شعر جس میں زرگر شربت پی کر گھلنے لگا، دراصل فارسی شاعری کی اس وسیع روایت کا حصہ ہے جہاں درد، بیماری اور زوال کو روح کی بیداری کے لیے بطورِ آلہ (Tool) استعمال کیا جاتا ہے۔ ان شعراء کے نزدیک زرگر کا قتل ایک فرد کا قتل نہیں بلکہ اس "حجاب" (پردے) کا خاتمہ ہے جو انسان اور خدا کے درمیان حائل ہوتا ہے۔

چون زِرَ نجوریُ جَمالِ او نمَانْد

جانِ دختر در وَبالِ او نمَانْد

مشکل الفاظ کے معنی

چون = جب، جیسے ہی۔۔۔**رنجوری** = بیماری، کمزوری۔۔۔**جمال** = حسن، خوبصورتی۔۔۔**نماند** = باقی نہ رہا

جان = روح، زندگی۔۔۔**دختر** = لڑکی۔۔۔**وبال** = مصیبت، بوجھ، عذاب۔۔۔**او** = اس (محبوب / سبب کی طرف اشارہ)

ترجمہ

جب بیماری کی وجہ سے اس (زرگر) کا حسن و جمال باقی نہ رہا، تو اس لڑکی (کنیز) کی جان اس کی محبت کے وبال (گرفت یا بوجھ) سے آزاد ہو گئی۔

اس شعر کے دو اہم پہلو ہیں:

1. **عشقِ مجازی کی بے ثباتی:** مولانا روم یہاں یہ نکتہ سمجھا رہے ہیں کہ وہ عشق جو محض رنگ و روپ اور ظاہری چمک دمک پر مبنی ہوتا ہے، وہ پائیدار نہیں ہوتا۔ جیسے ہی وہ ظاہری حسن (جمال) بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے ڈھل جاتا ہے، ویسے ہی وہ محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے مولانا فرماتے ہیں:

"وہ عشق جو رنگوں کی وجہ سے ہوتا ہے، وہ عشق نہیں ہوتا بلکہ انجام کار وہ شرمندگی (وبال) بن جاتا ہے۔"

.2وبال سے آزادی : کنیز کا سنار کی محبت میں گرفتار ہونا اس کی روح کے لیے ایک "وبال" (عذاب) بن گیا تھا کیونکہ وہ ایک فانی انسان سے لو لگائے بیٹھی تھی۔ جب سنار کا جسمانی حسن ختم ہوا، تو کنیز کی نظروں سے وہ پردہ ہٹ گیا اور اسے احساس ہوا کہ وہ جس چیز سے محبت کر رہی تھی، وہ تو عارضی تھی۔ اس طرح اس کی جان اس نفسیاتی اور جذباتی بوجھ سے آزاد ہو گئی۔

حاصلِ کلام : اس شعر کے ذریعے مولانا ہمیں یہ درس دیتے ہیں کہ **محبت کا مرکز ایسی ذات ہونی چاہیے جسے کبھی زوال نہ ہو** (یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ)۔ جو حسن بدل جائے، وہ عشق کے لائق نہیں، کیونکہ وہ بالآخر وبال بن کر انسان کو دکھ دیتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کا بنیادی فلسفہ **عشقِ مجازی (ظاہری حسن) کی بے ثباتی** اور **عشقِ حقیقی (ذاتِ الٰہی) کی ابدیت پر مبنی ہے۔** قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی عمیق وضاحت درج ذیل ہے:

.1 ظاہری حسن اور دنیا کی بے ثباتی (Transience of Beauty)

شعر میں سنار کا حسن بیماری سے ختم ہونا قرآن کی اس آیت کی عملی تصویر ہے جہاں اللہ تعالیٰ دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش کی حقیقت بیان فرماتا ہے:

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا لَعِبٌ وَّلَهۡوٌ وَّزِيۡنَةٌ "...جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت (ظاہری خوبصورتی) ہے..." (سورہ الحدید:20)

قرآن حکیم میں انسانی زندگی کے ادوار کا ذکر کرتے ہوئے جسمانی زوال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ ضَعۡفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ ضَعۡفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ ضَعۡفًا وَّشَيۡبَةً "اللہ ہی ہے جس نے تمہیں کمزوری کی حالت میں پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بخشی، پھر قوت کے بعد دوبارہ کمزوری اور بڑھاپا طاری کر دیا۔" (سورہ الروم:54)

رومی کا شعر اسی قرآنی حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ جس "جمال" پر انسان مرمٹتا ہے، وہ ایک عارضی پیکر ہے جسے بالآخر زوال پذیر ہونا ہے۔

2. اللہ کی نظر: صورت بمقابلہ سیرت

شعر میں لڑکی کی جان کا "وبال" سے آزاد ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک وہ ظاہری صورت کی اسیر تھی، وہ دھوکے میں تھی۔ حدیثِ نبوی ﷺ اس حقیقت کو یوں واضح کرتی ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ "بے شک اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔" (صحیح مسلم: 2564)

جب سنار کی صورت بگڑی، تو حقیقتِ حال واضح ہوئی کہ محبت کا تعلق جسم سے نہیں بلکہ روح کے تعلق سے ہونا چاہیے تھا۔

3. غیر اللہ سے وابستگی کا "وبال"

شعر کا دوسرا مصرعہ) **جانِ دختر در وبالِ او نماند** (ایک بہت بڑے روحانی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قرآن کے مطابق ہر وہ محبت جو اللہ کی یاد سے غافل کر دے، وہ انسان کے لیے وبال اور خسارہ بن سکتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

"اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں، اور جو ایسا کریں گے وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں۔" (سورہ المنافقون: 9)

چونکہ اس لڑکی (کنیز) کا عشق محض ایک فانی انسان کے لیے تھا، اس لیے وہ اس کی روح کے لیے ایک بوجھ (وبال) تھا۔ جیسے ہی وہ بت (خوبصورتی) ٹوٹا، اس کی روح اس قید سے آزاد ہو کر حقیقت کی طرف لوٹنے کے قابل ہوئی۔

4. کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ (فنا اور بقا کا فرق)

مولانا روم کا یہ پورا قصہ اس آیت کی تفسیر معلوم ہوتا ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۚ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ "جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے، اور صرف تمہارے رب کی ذات باقی رہے گی جو صاحبِ جلال اور صاحبِ اکرام ہے۔" (سورہ الرحمن: 26-27)

خلاصہ : قرآن و سنت کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان کا دل اللہ کی محبت کے لیے بنایا گیا ہے۔ جب انسان کسی فانی چیز (جسم، مال، منصب) سے انتہا درجے کی محبت کرتا ہے، تو وہ چیز اس کے لیے "وبال" بن جاتی ہے کیونکہ وہ چیز خود زوال پذیر ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ جب وہ زوال سامنے آجاتا ہے، تب ہی انسان کی جان اس وبال سے نکل کر "عشقِ حقیقی" کی طرف سفر شروع کرتی ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کو اگر ہم تصوف کے خانوں سے نکال کر آج کے **اخلاقی اور معاشرتی** تناظر میں دیکھیں، تو یہ ایک بہت گہری نفسیاتی اور سماجی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

1. اخلاقی لحاظ سے: "صورت" بمقابلہ "سیرت"

اخلاقیات کا پہلا سبق یہ ہے کہ کسی انسان کی قدر و قیمت اس کے ظاہری خدوخال یا وقتی چمک دمک سے نہیں، بلکہ اس کے کردار اور اخلاق سے لگانی چاہیے۔

- **ظاہریت پسندی کا انجام :** یہ شعر ہمیں خبردار کرتا ہے کہ اگر ہماری محبت یا دوستی کی بنیاد محض "ظاہر" (خوبصورتی، دولت، رعب) پر ہے، تو وہ اخلاقی طور پر کھوکھلی ہے۔ ایسی محبت "وبال" بن جاتی ہے کیونکہ جب بنیاد (خوبصورتی) ختم ہوتی ہے، تو تعلق بھی بوجھ لگنے لگتا ہے۔
- **حقیقی اخلاقی اقدار :** ایک بلند اخلاق انسان وہ ہے جو دوسرے کی روح اور اس کی مستقل خوبیوں سے جڑے۔ رومی یہاں اخلاقی سطح پر "فریبِ نظر" سے نکلنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

2. معاشرتی لحاظ سے: نمائشی معاشرت کا المیہ

آج کے دور میں، جہاں "سوشل میڈیا" اور "فلٹرز" نے ظاہری جمال کو ایک جنون بنا دیا ہے، یہ شعر بہت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے:

- **تعلقات کی کمزوری :** معاشرے میں طلاقوں کی بڑھتی شرح یا دوستیوں کا جلد ٹوٹ جانا اکثر اسی لیے ہے کہ ہم "انسان" سے نہیں، بلکہ اس کے "امیج (Image)" سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب بیماری، بڑھاپا یا معاشی تنگی اس امیج کو دھندلا کرتی ہے، تو معاشرتی بندھن بکھرنے لگتے ہیں۔

- **مادہ پرستی کی نفی:** یہ شعر ایک ایسی معاشرتی سوچ کی حوصلہ شکنی کرتا ہے جو صرف "استعمال (Use and Throw)" پر یقین رکھتی ہے۔ سنار کا حسن ختم ہوا تو لڑکی کی دلچسپی ختم ہو گئی—یہ اس سرد مہری کی عکاسی ہے جو مادہ پرست معاشروں کا خاصہ ہے۔

3. نفسیاتی اور تعمیری پہلو: "وبال" سے آزادی

معاشرتی طور پر ہم اکثر ایسے رشتوں یا خواہشات کے اسیر ہو جاتے ہیں جو ہمیں ذہنی طور پر تھکا دیتے ہیں۔

- **غلط وابستگی کا بوجھ:** جب ہم کسی غلط معیار (مثلاً صرف خوبصورتی یا شہرت) کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں، تو ہماری جان "وبال" میں رہتی ہے۔ رومی کہتے ہیں کہ حقیقت کا کھل جانا (چاہے وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو) دراصل ایک قسم کی **نفسیاتی آزادی** ہے۔

- **سچائی کی قبولیت:** معاشرے کے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ سچائی کو قبول کرنا، چاہے وہ کسی کے زوال کی صورت میں ہو، انسان کو ذہنی بوجھ سے نجات دلاتا ہے۔

خلاصہ: اخلاقی طور پر یہ شعر ہمیں **سطحیت** (Superficiality) سے روکتا ہے اور معاشرتی طور پر یہ پیغام دیتا ہے کہ پائیدار معاشرہ وہی ہے جہاں تعلقات کی بنیاد "بدل جانے والے جمال" پر نہیں بلکہ "نہ بدلنے والی سچائی اور سیرت" پر رکھی جائے۔

رومی گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ جس دن معاشرہ "پیکر" کے بجائے "جوہر" کو دیکھنا شروع کر دے گا، اس دن بہت سے ذہنی اور سماجی وبال خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

چون کہ زشت و ناخوش و رُخ زَرد شد

اندک اندک در دلِ او سَرد شد

مشکل الفاظ کے معنی

چون کہ = چونکہ، جب / کیونکہ۔۔۔ **زِشت** = بدصورت، بدشکل۔۔۔ **ناخوش** = بے رونق، ناپسندیدہ، بیمار سا

رُخ = چہرہ۔۔۔۔**زَرد شد** = زرد ہو گیا (پیلے رنگ کا ہو گیا)۔۔۔۔۔**اندک اندک** = آہستہ آہستہ، بتدریج

در دلِ او = اس کے دل میں۔۔۔۔۔**سَرد شد** = ٹھنڈا پڑ گیا، محبت کم ہو گئی

ترجمہ

"چونکہ وہ (محبوب) بدصورت، بیمار اور زرد چہرے والا ہو گیا، (تو) آہستہ آہستہ اس (کنیز) کے دل میں اس کی محبت ٹھنڈی پڑ گئی۔"

مولانا روم اس شعر میں انسانی نفسیات اور "عشقِ مجازی" (ظاہری خوبصورتی سے محبت) کی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں۔ تشریح کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. ظاہری حسن کی فانی حیثیت

اس قصے میں جب اس زرگر (سنیارے) کو زہر آلود شربت پلایا گیا تو اس کا وہ حسن و جمال جس پر کنیز مرمٹی تھی، ختم ہونے لگا۔ وہ دبلا ہو گیا اور اس کی رنگت اڑ گئی۔ مولانا بتانا چاہتے ہیں کہ وہ عشق جو رنگ اور روپ پر مبنی ہوتا ہے، وہ پائیدار نہیں ہوتا۔ جیسے ہی رنگ بدلا، عشق بھی بدل گیا۔

2. نفسیاتی پہلو:

انسان کی فطرت ہے کہ وہ خوبصورتی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ یہاں "دل کا سرد ہونا" اس بات کی علامت ہے کہ جب مادی کشش ختم ہو جائے تو جذباتی وابستگی بھی دم توڑ دیتی ہے۔ اگر کنیز کی محبت زرگر کی روح یا اس کی صفات سے ہوتی، تو اس کے بدصورت ہونے سے محبت کم نہ ہوتی۔

3. اخلاقی و روحانی سبق (حاصلِ کلام)

مولانا رومؒ اس تمثیل کے ذریعے ایک گہرا درس دیتے ہیں کہ:

"وہ عشق جو رنگ و بو کی وجہ سے ہوتا ہے، وہ عشق نہیں ہوتا بلکہ وہ انجامِ کار شرمندگی ہوتی ہے۔"

خلاصہ:

یہ شعر ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ ہمیں اپنا دل ایسی چیزوں سے نہیں لگانا چاہیے جو وقت کے ساتھ "زشت اور ناخوش" (بدصورت اور ختم) ہو جائیں، بلکہ عشق اس ذات (اللہ) سے ہونا چاہیے جو لازوال ہے اور جس کے حسن کو کبھی زوال نہیں۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس شعر کے مرکزی پیغام (یعنی ظاہری صورت کے بجائے سیرت اور زوال پذیر چیزوں کے بجائے لازوال سے تعلق) کی تائید متعدد مقامات سے ہوتی ہے۔

مولانا روم کا یہ شعر دراصل انسانی نفس کی اس کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے جہاں وہ محض "مادی خوبصورتی" کو کل کائنات سمجھ لیتا ہے، جبکہ اسلام ہمیں "باطن" اور "ابدیت" کی طرف بلاتا ہے۔

1. دنیاوی رونق کی حقیقت (قرآنی نقطہ نظر)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے دنیاوی زندگی اور اس کی ظاہری چمک دمک کو ایک عارضی منظر سے تشبیہ دی ہے، جو وقت کے ساتھ "زشت اور زرد" (ماند) پڑ جاتی ہے۔

- **ارشادِ باری تعالیٰ ہے:**

"تم جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشہ اور زینت اور تمہارا آپس میں فخر (وغرور) کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے زیادہ بننے کی کوشش کرنا ہے

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿٢٠﴾

جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا ہے اور ظاہری آرائش ہے اور آپس میں فخر اور خودستائی ہے اور ایک دوسرے پر مال و اولاد میں زیادتی کی طلب ہے، اس کی مثال بارش کی سی ہے کہ جس کی پیداوار کسانوں کو بھلی لگتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے پھر تم اسے پک کر زرد ہوتا دیکھتے ہو پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے، اور آخرت میں (نافرمانوں کے لئے) سخت عذاب ہے اور

(فرمانبرداروں کے لئے) اللہ کی جانب سے مغفرت اور عظیم خوشنودی ہے، اور دنیا کی زندگی دھوکے کی پونجی کے سوا کچھ نہیں ہےo (الْحَدِیْد، 20:57)

جیسے مولانا نے کہا کہ محبوب "زرد" ہو گیا اور کشش ختم ہو گئی، قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ دنیا کی ہر زینت آخر کار زرد ہو کر ختم ہونے والی ہے۔

.2 اللہ کے نزدیک معیارِ حسن (سنتِ نبوی ﷺ)

اسلام اس بات کی نفی کرتا ہے کہ انسان کی قدر و قیمت اس کے رنگ، روپ یا جسمانی ساخت سے ہے۔ اگر محبت کا معیار صرف جسمانی ہوتا، تو بوڑھے ہونے پر ہر رشتہ ختم ہو جاتا۔

- **حدیثِ مبارکہ :** حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ **تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔** " (صحیح مسلم)

کنیز کی محبت اس لیے سرد ہوئی کیونکہ اس کی نظر زرگر کی "صورت" پر تھی، "سیرت" پر نہیں۔ اگر نظر دل پر ہوتی تو وہ "رخِ زرد" سے متاثر نہ ہوتی۔

.3 عارضی اشیاء سے دل لگانا (حکمت)

قرآن مجید انسان کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ ایسی چیزوں کا اسیر نہ بنے جو فنا ہونے والی ہیں۔

- **ارشادِ باری تعالیٰ ہے:**

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جانے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔" (سورۃ النحل:96)

محبت کے حوالے سے قرآن کا معیار یہ ہے:

"اور جو ایمان والے ہیں، وہ اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ:165)

حاصلِ کلام

قرآن وسنت کی روشنی میں مولانا روم کے اس شعر کا پیغام درج ذیل نکات پر مبنی ہے:

1. **فنا اور بقا کا فرق :** ہر وہ چیز جس کا تعلق مٹی سے ہے (جسم، رنگ، مال)، اسے فنا ہونا ہے۔ اس سے دل لگانا انسان کو آخر میں "سرد مہری" اور دکھ کے سوا کچھ نہیں دیتا۔
2. **حقیقی حسن :** اصل خوبصورتی ایمان، اخلاق اور روح کی ہے، کیونکہ روح کو کبھی بڑھاپا نہیں آتا اور نہ ہی وہ "زشت" (بدصورت) ہوتی ہے۔
3. **عشقِ حقیقی کا درس :** انسان کو چاہیے کہ وہ اپنا دل اس ذات سے لگائے جسے نہ زوال ہے اور نہ فنا۔ جیسا کہ تصوف میں کہا جاتا ہے کہ **"عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے"** بشرطیکہ انسان ظاہری صورت کے دھوکے سے نکل کر حقیقتِ الٰہیہ کو پہچان لے۔

مولانا روم کا یہ شعر محض ایک انسانی کہانی کا ٹکڑا نہیں، بلکہ **سلوک اور معرفت** کا ایک عظیم درس ہے جس میں انسانی روح کے سفر اور اس کی ٹھوکروں کا ذکر ہے۔ صوفیانہ اور روحانی نقطہ نظر سے اس میں کئی مخفی اسرار (Secrets) پوشیدہ ہیں:

1. عشقِ مجازی کی حقیقت: "کُشتنی" (مار ڈالنے کے لائق)

تصوف میں وہ عشق جو صرف جسمانی لذت یا مادی خوبصورتی تک محدود ہو، اسے "عشق" نہیں بلکہ "نفس کا دھوکہ" کہا جاتا ہے۔

- **سِرّ (راز) :** جب تک محبوب کی ظاہری چمک باقی تھی، وہ "الٰہ" (معبود) بنا رہا۔ جیسے ہی مادہ زائل ہوا، وہ بوجھ بن گیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مادی اشیاء کی حقیقت **عدم** (کچھ نہ ہونا) ہے۔ جب اللہ کسی سالک پر مادی حقیقت منکشف کرتا ہے، تو اسے دنیا "رخِ زرد" (بدصورت) نظر آنے لگتی ہے تاکہ وہ اس سے دل اچاٹ کر لے۔

"2. اُفُول" (غروب ہونے والے) سے بیزاری

یہ شعر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کی عملی تفسیر ہے" :**لَآ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ** "(میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا)۔

- **سِرّ**: روحانی اسرار میں سے ایک یہ ہے کہ انسانی روح "بقا" کی طالب ہے اور وہ "فنا" ہونے والی چیز سے کبھی مستقل سکون نہیں پاسکتی۔ جب سالک کو یہ عرفان ہو جاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے "آفل" (غروب ہونے والی) ہے، تو اس کا دل غیر اللہ سے "سرد" ہو جاتا ہے۔ یہ سرد ہونا دراصل **"تخلیہ"** (دل کو ماسوٰی اللہ سے پاک کرنا) کی پہلی سیڑھی ہے۔

3. موت کا قبل از وقت مشاہدہ (مُوتُوا قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُوا)

اس حکایت میں حکیم نے زرگر کو دوا کے ذریعے بوڑھا اور زرد کر دیا۔ روحانی طور پر یہ **"فقر"** کی علامت ہے۔

- **سِرّ**: جب اللہ کسی بندے کو چن لیتا ہے، تو اس کی نظر میں دنیا کی لذتیں پھیکی کر دیتا ہے۔ یہ "رخِ زرد" ہونا دراصل دنیا کی بے ثباتی کا وہ مشاہدہ ہے جو ایک عارف کو موت سے پہلے ہی حاصل ہو جاتا ہے۔ جب اسے نظر آ جاتا ہے کہ یہ خوبصورت جسم آخر کار مٹی کا ڈھیر ہے، تو وہ اسے مٹی ہی سمجھ کر اس سے تعلق توڑ لیتا ہے۔

4. رنگ و بو کا پردہ

مولانا روم کے نزدیک مادی حسن ایک "رنگ" ہے جو ادھار لیا گیا ہے۔

- **سِرّ**: جس طرح دیوار پر سورج کی دھوپ پڑے تو دیوار چمکنے لگتی ہے، لیکن وہ چمک دیوار کی نہیں سورج کی ہوتی ہے۔ جب سورج ہٹ جاتا ہے تو دیوار پھر سے اندھیری اور بدنما ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کا حسن اللہ کے نور کی ایک ادنیٰ جھلک ہے۔ عارف وہ ہے جو دیوار (مادی جسم) سے عشق کرنے کے بجائے اس سورج (ذاتِ الٰہی) کو ڈھونڈے جس کی وجہ سے یہ سب چمک رہا ہے۔

5. عشقِ حقیقی کی پختگی

جب دل مجازی محبوب سے "سرد" ہوتا ہے، تبھی اس میں عشقِ حقیقی کی "گرمی" پیدا ہونے کی جگہ بنتی ہے۔

- **سِرّ:** دل ایک وقت میں دو محبتوں کا مسکن نہیں بن سکتا۔ ایک جھوٹے عشق کا زوال، ایک سچے عشق کا طلوع ہوتا ہے۔ اس کنیز کا دل سرد ہونا اس کی روح کی نجات کی علامت تھا، تاکہ وہ اب "مردِ حق" (حکیمِ الٰہی) کی طرف رجوع کر سکے۔

حاصلِ عرفان: یہ شعر ہمیں "**صورت پرستی**" سے نکال کر "**معنی پرستی**" کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ سکھاتا ہے کہ "محبت" صرف اس ذات کا حق ہے جسے کبھی "زشت" (بدصورتی) چھو نہیں سکتی اور جس کے حسن کو کبھی "زوال" نہیں۔

"عشقِ مولیٰ کے کم از عشقِ مجاز؟) > "کیا اللہ کا عشق کسی مجازی عشق سے بھی کم ہے کہ تم اس کے لیے اتنے بے قرار نہیں؟)

روزمرہ زندگی میں مولانا روم کے اس سبق پر عمل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دنیا سے کٹ جائیں یا رشتوں سے منہ موڑ لیں، بلکہ اس کا مقصد اپنی **ترجیحات (Priorities)** کو درست کرنا ہے۔

اس شعر کی روشنی میں ہم اپنی زندگی کو درج ذیل پانچ طریقوں سے بہتر بنا سکتے ہیں:

1. رشتوں میں "سیرت" کو "صورت" پر فوقیت دینا

ہم اکثر دوستی، شادی یا کاروباری تعلقات میں ظاہری ٹیپ ٹاپ، دولت یا عہدے سے متاثر ہو کر فیصلے کرتے ہیں۔

- **عملی قدم:** جب بھی کسی نئے رشتے کا انتخاب کریں تو خود سے پوچھیں: "اگر اس شخص سے یہ عہدہ یا یہ خوبصورتی چھن جائے، تو کیا پھر بھی میں اس کی عزت کروں گا؟" اگر جواب 'ہاں' ہے، تو وہ رشتہ پائیدار ہے۔ صرف اخلاق اور کردار ہی وہ چیزیں ہیں جو کبھی "زشت اور ناخوش" نہیں ہوتیں۔

2. اپنی ذات کی تعمیر (Inner Grooming)

ہم اپنے چہرے کو نکھارنے اور لباس کو بہتر بنانے پر گھنٹوں صرف کرتے ہیں، لیکن اپنی روح اور اخلاق کی بدصورتی پر توجہ نہیں دیتے۔

- **عملی قدم :** جیسے ہم آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہیں، ویسے ہی روزانہ پانچ منٹ **محاسبہ (Self-Reflection)** کریں کہ آج مجھ سے کون سی ایسی بات ہوئی جو میری روح کو "بدصورت" کر رہی ہے (جیسے جھوٹ، حسد یا تکبر)۔ یاد رکھیں، جسم بوڑھا ہو جائے گا، لیکن ایک مہربان روح ہمیشہ جوان رہتی ہے۔

3.مادی چیزوں سے جذباتی وابستگی کم کرنا

ہم اکثر نئی گاڑی، موبائل یا گھر سے اس قدر دل لگا لیتے ہیں کہ ان پر ایک خراش بھی آئے تو ہمارا سکون برباد ہو جاتا ہے۔

- **عملی قدم :** یہ ذہن نشین رکھیں کہ ہر مادی چیز "رخِ زرد" ہونے والی ہے، یعنی اسے پرانا ہونا اور ٹوٹنا ہے۔ چیزوں کو **استعمال** کے لیے رکھیں، **عشق** کے لیے نہیں۔ جب آپ چیزوں کے بجائے اقدار (Values) سے محبت کرتے ہیں، تو نقصان ہونے پر آپ کا دل "سرد" یا غمگین نہیں ہوتا۔

" .4فانی" کے بجائے "باقی" کی سرمایہ کاری

ہم اپنا سارا وقت اور توانائی ان کاموں میں لگاتے ہیں جن کا نتیجہ صرف اس دنیا تک محدود ہے۔

- **عملی قدم :** اپنے دن کا کچھ حصہ ایسے کاموں کے لیے وقف کریں جو کبھی ختم نہ ہوں، جیسے کسی کی بے لوث مدد کرنا، علم بانٹنا، یا اللہ کی یاد میں وقت گزارنا۔ یہ وہ "حسن" ہے جسے کبھی زوال نہیں آئے گا۔

.5 تنقید اور تعریف سے بے نیازی

لوگوں کی تعریف عموماً آپ کی ظاہری حالت یا فائدے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب آپ کی حالت بدلتی ہے، تو ان کا دل بھی "سرد" ہو جاتا ہے۔

- **عملی قدم :** اپنی خوشی کا مرکز لوگوں کے رویوں کو نہ بنائیں۔ اگر آپ کا ضمیر اور آپ کا رب آپ سے راضی ہے، تو لوگوں کی سرد مہری آپ کو پریشان نہیں کرے گی۔

خلاصہ : روز مرہ زندگی میں اس کا عمل یہ ہے کہ **"خوبصورت چیزوں سے محبت کرنے کے بجائے، چیزوں میں موجود خوبصورتی (جو کہ خدائی نور ہے) سے محبت کی جائے"**۔ جب آپ ہر شے میں اللہ کی قدرت دیکھتے ہیں، تو آپ کی محبت کبھی سرد نہیں ہوتی کیونکہ وہ ذات ہمیشہ رہنے والی ہے۔

عشق ہائے کَز پِیِ رَنگی بُوَد
عشق نَبوَد، عاقِبَت ننگی بُوَد

مشکل الفاظ کے معنی

عشق ہائے: وہ عشق (جمع کے طور پر)، بہت سے عشق۔۔۔ **کز (کہ + از):** جو کہ، اس وجہ سے کہ

پِیِ رنگ: رنگ کی خاطر، ظاہری چمک دمک یا خوبصورتی کے لیے۔۔۔ **نبود:** نہیں ہوتا، نہیں ہے

عاقبت: انجام کار، انجام کار، آخر کار۔۔۔ **ننگی:** باعثِ شرم، رسوائی، ننگ و عار

ترجمہ : وہ عشق جو محض ظاہری رنگ و روپ (خوبصورتی) کی بنیاد پر ہوں، وہ حقیقت میں عشق نہیں ہوتے بلکہ انجام کار باعثِ رسوائی اور شرمندگی بنتے ہیں۔

اس شعر میں مولانا رومیؒ انسانی جذبات کی ایک گہری نفسیاتی اور روحانی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ تشریح کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. **عشقِ مجازی بمقابلہ عشقِ حقیقی :** مولانا فرماتے ہیں کہ اگر کسی سے محبت کی بنیاد محض اس کا **رنگ و روپ، جسمانی کشش یا ظاہری ٹپ ٹاپ** ہے، تو اسے "عشق" کا مقدس نام دینا غلط ہے۔ ایسا لگاؤ عارضی ہوتا ہے کیونکہ جس بنیاد (خوبصورتی) پر یہ قائم ہے، وہ خود فانی ہے۔

زوالِ حسن اور انجامِ محبت

دنیاوی خوبصورتی وقت کے ساتھ ڈھل جاتی ہے۔ بڑھاپا، بیماری یا حادثہ اس "رنگ" کو چھین لیتا ہے۔ جب وہ ظاہری حسن باقی نہیں رہتا جس کی وجہ سے محبت کا دعویٰ کیا گیا تھا، تو وہ محبت نفرت یا بیزاری میں بدل جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے مولانا

"ننگی"(رسوائی) کہہ رہے ہیں، کیونکہ انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنا قیمتی وقت اور جذبات ایک فانی اور بے ثبات چیز پر ضائع کیے۔

" .3**رنگ" سے مراد کیا ہے؟** یہاں "رنگ" سے مراد صرف انسانی چہرہ نہیں ہے، بلکہ ہر وہ مادی چیز ہے جو باہر سے دلکش نظر آتی ہے (جیسے عہدہ، دولت، شہرت)۔ اگر محبت ان مادی مفادات کے لیے ہے، تو اس کا انجام شرمندگی کے سوا کچھ نہیں۔

.4**روحانی سبق :** اس شعر کے ذریعے مولانا ہمیں **عشقِ الٰہی یا عشقِ ذات** کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ عشق صرف وہی معتبر ہے جو "رنگ و بو" سے پاک ہو، یعنی جو روح سے روح کا تعلق ہو یا خالقِ کائنات کی لافانی صفات سے ہو۔ جو چیز کبھی ختم نہیں ہونے والی (اللہ کی ذات)، اس سے کیا گیا عشق ہی ابدی ہے اور وہی انسان کو وقار بخشتا ہے۔

خلاصہ : سچا عشق وہ ہے جو ظاہری شکل و صورت سے بالاتر ہو کر سیرت اور روح کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ صورت پر مرمٹنے والا جذبہ صرف ایک وقتی ہیجان ہے جو وقت کی دھول میں رسوائی بن کر اڑ جاتا ہے۔

یہ شعر مثنوی کے اس واقعے کے دوران آتا ہے جہاں ایک بادشاہ ایک کنیز (لونڈی) سے محبت کرنے لگتا ہے، لیکن وہ کنیز ایک سنار کے عشق میں بیمار ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کی تدبیر سے جب اس سنار کو لایا جاتا ہے تو وہ اپنی ظاہری خوبصورتی کی وجہ سے مرکزِ نگاہ ہوتا ہے۔ رومیؒ یہاں بتاتے ہیں کہ بعد میں جب سنار کی وہ ظاہری خوبصورتی (رنگ) بیماری یا کسی وجہ سے ڈھل جاتی ہے، تو کنیز کی محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اس مقام پر رومیؒ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ **اگر محبت کی بنیاد صرف ہڈیوں اور کھال کے اوپر چڑھا ہوا "رنگ" ہے، تو وہ عشق نہیں بلکہ ایک دھوکہ ہے جو انجام کار شرمندگی لاتا ہے۔**

قرآنی حوالہ: "فانی" اور "باقی" کا فرق

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ ہر مادی شے فنا ہونے والی ہے، اس لیے دل اس سے لگانا چاہیے جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔

"كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ○وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ) "

ترجمہ: ہر وہ چیز جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے؛ اور صرف تیرے رب کی ذات ہی باقی رہے گی جو صاحبِ جلال اور صاحبِ اکرام ہے۔ — (**سورۃ الرحمن:26-27**)

تشریح: رومی کے لفظ "عاقبت" (انجام) کا تعلق اسی آیت سے ہے۔ جب معشوق کا "رنگ" (حسن) فنا ہو جاتا ہے تو وہ عشق "ننگ" (رسوائی) بن جاتا ہے کیونکہ عاشق نے ایک فانی چیز کو لازوال سمجھ کر اس پر بھروسہ کیا تھا۔

حدیثِ نبوی ﷺ: معیارِ انتخاب

نبی کریم ﷺ نے انسانی رشتوں میں "رنگ و بو" (ظاہری کشش) کے مقابلے میں "جوہر" (دین اور سیرت) کو فوقیت دینے کی تعلیم دی ہے۔

حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، حَدَّثَنَا يَحْيَى، عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ، قَالَ: حَدَّثَنِي سَعِيدُ بْنُ أَبِي سَعِيدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: " تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَجَمَالِهَا، وَلِدِينِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ ".

ہم سے مسدد بن مسرہد نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ بن سعید قطان نے، ان سے عبیداللہ عموی نے، کہ مجھ سے سعید بن ابی سعید نے، ان سے ان کے والد نے اور ان سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت سے نکاح چار چیزوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اس کے مال کی وجہ سے اور اس کے خاندانی شرف کی وجہ سے اور اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے اور تو دیندار عورت سے نکاح کر کے کامیابی حاصل کر، اگر ایسا نہ کرے تو تیرے ہاتھوں کو مٹی لگے گی (یعنی اخیر میں تجھ کو ندامت ہو گی)۔ [صحيح البخاري / كتاب النكاح / حدیث: 5090

یہاں جمال (خوبصورتی) کو ایک معیار مانا گیا ہے مگر اسے ترجیح نہیں دی گئی۔ رومیؒ کے نزدیک اگر صرف "جمال" یا "رنگ" ہی کل اثاثہ ہو، تو وہ عشق دیرپا نہیں ہو سکتا۔

حکیمانہ و ادبی نکتہ (امام غزالیؒ اور دیگر صوفیا)

امام غزالیؒ نے 'احیاء العلوم' میں محبت کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو محبت کسی عرض (عارضی صفت) کی وجہ سے ہو، وہ اس صفت کے ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔

- **عرض :(Accident)** جیسے رنگ، جوانی، مال۔
- **جوہر :(Essence)** جیسے اخلاق، علم، روح۔

مرزا عبد القادر بیدلؒ نے بھی اسی مفہوم کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے کہ دنیا کا رنگ و بو محض ایک آئینہ ہے جس میں حقیقت کو دیکھنا چاہیے، نہ کہ آئینے کے فریم (ظاہر) میں الجھ جانا چاہیے۔

یہ شعر ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ اپنی جذباتی سرمایہ کاری کسی ایسی جگہ نہ کریں جو "وقت" کے تابع ہو۔ اگر عشق اللہ کی دی ہوئی صفات (علم، تقویٰ، اخلاق) سے ہو، تو وہ بڑھاپے میں بھی کم نہیں ہوتا، بلکہ مزید نکھرتا ہے۔

محبت کی بنیاد: اللہ کے لیے محبت (سنت)

اسلام میں محبت کا درست معیار یہ ہے کہ وہ خالص ہو اور اس میں نفسانی خواہش کے بجائے رضائے الٰہی شامل ہو۔

- **حدیثِ مبارکہ:**

"حَدَّثَنَا مُؤَمَّلُ بْنُ الْفَضْلِ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ شُعَيْبِ بْنِ شَابُورَ، عَنْ يَحْيَى بْنِ الْحَارِثِ، عَنْ الْقَاسِمِ، عَنْ أَبِي أُمَامَةَ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهُ قَالَ: "مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ وَأَعْطَى لِلَّهِ وَمَنَعَ لِلَّهِ، فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ"." (سنن ابی داؤد)

ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” : جس نے اللہ ہی کے رضا کے لیے محبت کی، اللہ ہی کے رضا کے لیے دشمنی کی، اللہ ہی کے رضا کے لیے دیا، اللہ ہی کے رضا کے لیے منع کر دیا تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا“۔ (سنن ابي داود/كتاب السنة/حدیث: 4681)

جب عشق کی بنیاد "رنگ و بو" (خواہشِ نفس) پر ہوتی ہے، تو وہ ایمان کو مکمل کرنے کے بجائے انسان کو مادیت کا غلام بنا دیتی ہے۔ جب وہ حسن ڈھلتا ہے، تو وہ محبت "ننگ" (رسوائی) بن جاتی ہے کیونکہ اس میں کوئی روحانی قدر موجود نہیں ہوتی۔

عارضی اور ابدی کا فرق

بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا‌ۖ(16) وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى (17)

بلکہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ اور آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے

غالباً حضرت علیؓ کا ایک قول رومی کے اس شعر کی بہترین تشریح کرتا ہے:

"دنیا کی لذتیں فانی ہیں اور ان کا وبال باقی رہنے والا ہے۔"

اگر انسان کسی ایسی چیز سے دل لگائے جو خود ختم ہونے والی ہے (جیسے انسانی جسم یا رنگ)، تو اس کا انجام حسرت ہی ہو گا۔ اس کے برعکس، اگر عشق اس ذات (اللہ) سے ہو جو **"حی و قیوم "**(ہمیشہ رہنے والی) ہے، تو وہ عشق کبھی رسوائی کا باعث نہیں بنتا بلکہ انسان کو وقار عطا کرتا ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں مولانا رومیؒ کا یہ شعر ہمیں **"حقیقت پسندی "** کا سبق دیتا ہے۔ وہ عشق جو محض جسمانی اور مادی کشش پر مبنی ہو، اسے قرآن "متاعِ غرور" (دھوکے کا سامان) کہتا ہے، اور جو عشق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر ہو اور جس کی بنیاد باطنی حسن پر ہو، وہی دائمی اور باعثِ رحمت ہے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کی تہوں میں تصوف اور عرفان کے وہ سمندر پوشیدہ ہیں جو سالک (راستے کے مسافر) کو ظاہری دنیا کے فریب سے نکال کر حقیقتِ ابدی تک لے جاتے ہیں۔ اس شعر سے جو **روحانی اور عرفانی اسرار** سامنے آتے ہیں، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

"بے رنگی" کا راز (The Mystery of Colorlessness)

تصوف میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو **"بے رنگ "** کہا جاتا ہے، یعنی وہ کسی مادی قید، شکل یا صنف میں محدود نہیں۔ مولانا رومیؒ کا یہ شعر ایک بڑا عرفانی سبق دیتا ہے:

- دنیا میں جتنا بھی حسن اور "رنگ" ہمیں نظر آتا ہے، وہ حقیقت میں اللہ کے نور کا ایک ادنیٰ عکس ہے۔

- عرفانی نکتہ یہ ہے کہ اگر آپ عکس (پرتو) سے دل لگالیں اور اصل (ذات) کو بھول جائیں، تو یہ شرکِ خفی ہے۔ "رنگی" سے عشق کرنا دراصل دیوار پر پڑنے والی دھوپ سے محبت کرنا ہے، جبکہ سورج کو نظر انداز کر دینا ہے۔ جب سورج ڈھلے گا، تو دیوار تاریک ہو جائے گی اور عاشق تنہا رہ جائے گا۔

مجاز سے حقیقت تک کا سفر (Bridge of Metaphor)

صوفیا کے ہاں "عشقِ مجازی" کو "عشقِ حقیقی" کی سیڑھی کہا گیا ہے، لیکن رومیؒ یہاں ایک انتباہ (Warning) دیتے ہیں:

- اگر مجازی عشق صرف "رنگ و بو" اور شہوت تک محدود رہے، تو وہ سیڑھی نہیں بلکہ **قید خانہ** ہے۔
- **اسرارِ عرفانی:** سچا عاشق وہ ہے جو معشوق کے چہرے میں اللہ کی کاریگری دیکھے۔ اگر نظر "خالق" کے بجائے "خلق" پر رک جائے، تو بصارت (Eyesight) تو ہے مگر بصیرت (Insight) مفقود ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عشق "ننگی" (رسوائی) بن جاتا ہے کیونکہ وہ روح کو بالیدگی دینے کے بجائے مٹی کا اسیر کر دیتا ہے۔

روح کی جلاوطنی اور واپسی (The Soul's Exile)

روحانی اعتبار سے انسانی روح "عالمِ امر" سے آئی ہے اور وہ فطری طور پر اپنے اصل (اللہ) کی پیاسی ہے۔

- جب انسان اس پاکیزہ جذبے (عشق) کو مادی اور فانی اشیاء (رنگ) پر خرچ کرتا ہے، تو روح پیاسی ہی رہتی ہے۔
- **سرِّ روحانی":** عاقبت ننگی" اس لیے ہے کہ جب موت کے وقت مادی جسم اور رنگ چھین لیے جائیں گے، تو روح خالی ہاتھ ہو گی۔ اسے احساس ہو گا کہ اس نے لافانی جذبہ فانی چیزوں پر ضائع کر دیا۔ یہ وہ روحانی شرمندگی ہے جس کا ذکر رومیؒ کر رہے ہیں۔

فنا اور بقا کا فلسفہ (Passing and Permanence)

عارفین کے نزدیک عشق کی پہچان اس کا **دوام** (ہمیشہ رہنا) ہے۔

- جو چیز وقت کے ساتھ بدل جائے (جیسے جوانی یا حسن)، اس سے وابستہ عشق بھی "حادث" (عارضی) ہے۔

- **بیدل دہلویؒ** کے افکار کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ کائنات ایک آئینہ ہے؛ اگر آپ آئینے کی چمک پر ریجھے رہے تو عکس کھو دیں گے، اور اگر عکس میں الجھ گئے تو صاحبِ عکس تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ رومیؒ ہمیں آئینے سے گزر کر صاحبِ عکس تک پہنچنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

یہ شعر محض ایک نصیحت نہیں، بلکہ ایک **کیمیا گری** ہے۔ یہ سالک کو سکھاتا ہے کہ اپنی محبت کا رخ مٹی کے پتلوں سے موڑ کر اس ذات کی طرف کر دے جو "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ" ہے، تاکہ اس کا عشق فنا کے بعد بھی باقی رہے اور اسے ابدی وقار نصیب ہو۔

فارسی ادب کی روایت میں "ظاہر" کے مقابلے میں "باطن" اور "رنگ" کے مقابلے میں "بے رنگی" (حقیقت) کو ہمیشہ ترجیح دی گئی ہے۔ عظیم فارسی شعراء نے رومیؒ کے اسی خیال کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے کہ جو محبت صرف آنکھ کے مشاہدے (جسمانی خوبصورتی) تک محدود ہو، وہ زوال پذیر ہے۔

درج ذیل میں نامور فارسی شعراء کے اشعار سے اس فلسفے کی وضاحت پیش ہے:

1. حافظ شیرازی (لسان الغیب)

حافظ شیرازی ظاہری خدوخال کے بجائے اس "باطنی کشش" کی بات کرتے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں:

شاہد آن نیست کہ مویی و میانی دارد
بندہ طلعتِ آن باش کہ "آنی" دارد

ترجمہ: معشوق وہ نہیں جس کی صرف زلفیں اور کمر خوبصورت ہو؛ بلکہ اس چہرے کے غلام بنو جس میں کوئی "آن" (روحانی وقار / حقیقت) ہو۔

وضاحت: حافظ یہاں رومی کے "پیِ رنگ" (رنگ کے پیچھے) کی نفی کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک سچی محبت کا مرکز وہ مخصوص "آن" یا باطنی جوہر ہے جو ظاہری رنگ و روپ سے ماورا ہوتا ہے۔

2. شیخ سعدی شیرازی (افصح المتکلمین)

سعدی شیرازی عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا آئینہ بناتے ہیں، لیکن وہ متنبہ کرتے ہیں کہ نظر صرف آئینے کے فریم (ظاہر) پر نہ رک جائے۔

بہ جہان خرم از آنم کہ جہان خرم از اوست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست

ترجمہ: میں اس لیے دنیا میں خوش ہوں کہ یہ دنیا اسی (خالق) کی وجہ سے آباد ہے؛ میں پوری کائنات سے عشق کرتا ہوں کیونکہ یہ پوری کائنات اسی کی تخلیق ہے۔

وضاحت: سعدی رومی کے نکتے کو مثبت انداز میں یوں واضح کرتے ہیں کہ اگر تم دنیا کے "رنگ" سے عشق کرتے بھی ہو، تو اسے "خالق کا رنگ" سمجھ کر کرو۔ اگر تمہارا عشق صرف "عالم" (دنیا) تک رک گیا تو وہ ادھورا ہے، اور اگر "صانع" (خالق) تک پہنچ گیا تو وہ کامل ہے۔

3 . مرزا عبد القادر بیدل دہلوی (ابو المعانی)

چونکہ آپ کو بیدل کے کلام سے خاص دلچسپی ہے، ان کا یہ نکتہ رومی کے شعر کی بہترین تشریح ہے:

عالم ہمہ افسانہ رنگ و بوئے ست

ہر جا کہ روی، نشانہ روئے اوست

ترجمہ: یہ ساری کائنات محض رنگ و بو کا ایک افسانہ (خیالی داستان) ہے؛ تم جہاں بھی جاؤ، حقیقت میں یہ سب اسی (خدا) کے چہرے کے نشانات ہیں۔

وضاحت: بیدل اس دنیا کو "رنگ و بو کا فریب" قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو شخص صرف "رنگ" (ظاہر) میں الجھ گیا وہ افسانے میں کھو گیا، اور جس نے رنگ کے پیچھے چھپی حقیقت کو دیکھ لیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔ رومی کے "عاقبت ننگی" کی تشریح بیدل کے ہاں یہ ہے کہ افسانہ آخر کار ختم ہو جاتا ہے اور انسان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

4 . حکیم نظامی گنجوی

نظامی اپنی مثنوی "لیلیٰ مجنون" میں عشق کی حقیقت کو مادی پیکر سے آزاد کر کے دکھاتے ہیں۔ جب مجنون سے کہا گیا کہ لیلیٰ تو اتنی خوبصورت نہیں (یعنی اس کا 'رنگ' اتنا دلکش نہیں)، تو مجنون نے جواب دیا:

اگر در دیدۂ مجنوں نشینی

بہ غیر از خوبیِ لیلیٰ نہ بینی

ترجمہ: اگر تم مجنوں کی آنکھ سے دیکھو، تو تمہیں لیلیٰ کے (باطنی) حسن کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

وضاحت: یہ رومی کے شعر کا دوسرا رخ ہے۔ جس عشق کی بنیاد "رنگ" پر ہوتی ہے وہ دوسروں کی باتوں یا وقت کے گزرنے سے بدل جاتا ہے، لیکن جو عشق "روح" پر مبنی ہو اسے دنیا کی ظاہری کمی بیشی سے فرق نہیں پڑتا۔

فارسی شعراء کا اتفاق ہے کہ **"رنگ "**(ظاہر) محض ایک پردہ ہے جس کے پیچھے **"بے رنگی "**(خدا/حقیقت) چھپی ہے۔ جو اس پردے پر رک گیا وہ خسارے میں ہے، اور جو پردہ چیر کر حقیقت تک پہنچ گیا، وہی سچا عاشق ہے۔ رومی اسی لیے کہتے ہیں کہ صرف رنگ کی پیروی رسوائی ہے کیونکہ پردہ تو ایک دن ہٹ جانا ہے۔

کاش کان ہم ننگ بودی یک سَری
تا نَرَفتی بر وِیُ آن بَد داوَری

مشکل الفاظ کے معنی

کاش = اے کاش / اگر ایسا ہوتا۔۔۔۔ کان = کہ (یعنی "کہ وہ")۔۔۔۔ ہم = ہم۔۔۔ ننگ = عیب، رسوائی، بدنامی

بودی = ہوتے / ہوتا۔۔۔۔ یک سری = بالکل، سرے سے، مکمل طور پر۔۔۔۔ تا = تاکہ۔۔۔ نَرَفتی = نہ جاتا

بروی = اس پر۔۔۔۔ آن = وہ۔۔۔۔ بدداوری = برا فیصلہ، غلط رائے، بدگمانی

ترجمہ " کاش کہ (یہ انسانی) عقل ایک بال برابر ننگ وعار (شرمندہ) ہوتی، تاکہ اس پر اس قدر بُری اور غلط قضاوت (فیصلہ) نہ ہوتی۔"

اس شعر میں مولانا روم عقلِ جزوی (انسانی عقل) پر طنز کر رہے ہیں۔ اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. عقل کی خود پسندی : انسان اکثر اپنی عقل پر حد سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے اور اسے کائنات کے تمام اسرار و رموز سمجھنے کا واحد ذریعہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر اس عقل میں تھوڑی سی بھی ندامت یا "ننگ" (شرم) ہوتی، تو یہ اتنی خود سر نہ ہوتی۔

2. بدداوری (غلط فیصلہ) : جب عقل اللہ کے معاملات، تقدیر، یا روحانی حقائق کو اپنی منطق سے ناپنے کی کوشش کرتی ہے، تو وہ عموماً غلط نتائج پر پہنچتی ہے۔ یہاں "بدداوری" سے مراد وہ گمراہ کن فیصلے اور فلسفے ہیں جو انسان کو حقیقتِ حق سے دور کر دیتے ہیں۔

.3 **عقل بمقابلہ عشق:** رومی کے نزدیک عقل صرف دنیاوی امور میں کام آتی ہے، لیکن جب بات معرفتِ الٰہی کی ہو تو عقل کو سرنگوں ہو جانا چاہیے۔ وہ تمنا کر رہے ہیں کہ کاش عقل اپنی حدود کو پہچان لیتی اور شرمندگی کا احساس کرکے خاموش ہو جاتی، تاکہ وہ اللہ کے فیصلوں پر معترض ہونے کی جرات نہ کرتی۔

حاصلِ کلام

مولانا یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ عقل جب اپنی حد سے باہر قدم رکھتی ہے تو رسوا ہوتی ہے۔ اگر عقل میں اپنی کم مائیگی کا تھوڑا سا بھی احساس ہوتا، تو وہ ان غلطیوں اور گمراہیوں سے بچ جاتی جو اسے حق سے دور کر دیتی ہیں۔

مولانا روم کے اس شعر کا بنیادی تصور **عقلِ انسانی کی محدودیت** اور **رضائے الٰہی کے سامنے تسلیم و رضا** ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں:

انسانی علم اور عقل کی محدودیت

شعر میں "ننگ" (شرم / ندامت) سے مراد عقل کا اپنی حد کو پہچاننا ہے۔ قرآن کریم واضح کرتا ہے کہ انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے، اس لیے اسے کائناتی حقائق پر حتمی "داوری" (فیصلہ) کرنے سے پہلے اپنی عاجزی کا اعتراف کرنا چاہیے۔

- **قرآنی حوالہ:**

وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا "اور تمہیں (بہت) تھوڑا علم دیا گیا ہے۔" (سورہ الاسراء:85)

- **تشریح:** جب عقل اپنی محدودیت کو تسلیم نہیں کرتی، تو وہ اللہ کے فیصلوں (تقدیر) پر معترض ہوتی ہے، جسے رومی نے "بد داوری" کہا ہے۔

انسانی عقل بمقابلہ مشیتِ الٰہی

شعر کا دوسرا حصہ "بد داوری" (غلط فیصلہ) اس صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے جب انسان اپنی ناقص عقل سے کسی چیز کو برا سمجھتا ہے، جبکہ اللہ کی حکمت میں وہ بہتر ہوتی ہے۔

- **ارشاد ہوا**

وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

"اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" (سورہ البقرہ:216)

- **تشریح:** رومی اسی "تم نہیں جانتے" کو عقل کے لیے "ننگ" یا عار قرار دے رہے ہیں کہ کاش عقل یہ جان لیتی کہ وہ سب کچھ نہیں جانتی۔

قصہ خضر و موسیٰ علیہ السلام (عقل و وحی کی مثال)

قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ (سورہ الکہف) اس شعر کی بہترین عملی تفسیر ہے۔ حضرت موسیٰؑ (جو یہاں عقلِ ظاہری کی نمائندگی کر رہے ہیں) نے خضرؑ کے افعال پر اعتراض کیا (بدداوری کی)، کیونکہ ان کی عقل ان واقعات کے پیچھے چھپی الٰہی حکمت تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

- **نتیجہ:** جب عقل صرف ظاہر کو دیکھتی ہے تو وہ "بدداوری" کرتی ہے، لیکن جب وہ "ننگ" (عاجزی) اختیار کرتی ہے تو اسے لدنی علم کی سمجھ آتی ہے۔

سنتِ نبویؐ اور عقل کی حقیقت

حدیثِ مبارکہ میں عقل کی حدود اور اللہ کی عظمت کے سامنے عاجزی کی اہمیت بیان ہوئی ہے۔

- **حافظ ابن حجر عسقلانی (رح) نے شرح بخاری میں حضرت موسیٰ اور خضر (علیہما السلام) کا واقعہ نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ کے یہ نیک بندے جس کشتی پر سوار تھے اس کے کنارے پر ایک چڑیا آکر بیٹھ گئی۔ اس نے سمندر میں چونچ مار کر ایک آدھ قطرہ پانی کا لیا تو خضر (علیہ السلام) نے موسیٰ (علیہ السلام) سے خطاب کرتے ہوئے یموسی ماعلمی و علمک فی جنب علم اللہ الا کمثل ھذا العصفور یعنی اے موسیٰ (علیہ السلام)! میرے اور تیرے علم کی مثال اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے اس چڑیا نے سمندر سے پانی حاصل کر لیا ہے۔ (معالم العرفان)**

رومی کا شعر اسی ندامت کی تمنا ہے کہ اگر عقل کو اس چڑیا کی طرح اپنی حیثیت کا ادراک ہو جائے تو وہ سمندر (اللہ کے فیصلوں) پر اعتراض کرنا چھوڑ دے۔

چنانچہ رومی کہہ رہے ہیں کہ اگر عقل میں اتنی شرم ہوتی کہ وہ اپنی نارسائی کو پہچان لیتی، تو وہ اللہ کی تدبیر پر اعتراض کر کے خود کو رسوا نہ کرتی۔

روحانی اور صوفیانہ نقطہ نظر سے اس شعر کی تشریح بہت گہری ہے۔ مولانا روم یہاں **عقلِ جزوی** (انسانی منطق) اور **روحانی تسلیم و رضا** کے درمیان فرق کو واضح کر رہے ہیں۔

عقل کا حجاب اور انا (Ego)

تصوف میں عقل جب تک "انا (Ego)" کے زیرِ اثر رہتی ہے، وہ حقیقت کو نہیں دیکھ پاتی۔ رومی فرماتے ہیں کہ کاش یہ عقل اپنی اوقات پہچان لیتی اور اسے اپنی کم علمی پر **"ننگ" (شرم)** آتی۔ روحانی راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ سمجھنا ہے کہ "میں جانتا ہوں"۔ جب انسان یہ مان لیتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا، تبھی اس پر معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔

بد داوری: کائنات کو اپنی نظر سے دیکھنا

"بد داوری" کا روحانی مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ کے ہر فیصلے کو اپنی محدود عقل کے ترازو میں تولتے ہیں۔

- ہم تکلیف کو "برا" اور آسائش کو "اچھا" سمجھتے ہیں۔
- ہم ظاہری اسباب کو اصل محرک سمجھتے ہیں اور مسبب الاسباب (اللہ) کو بھول جاتے ہیں۔ روحانی طور پر یہ ایک "بد داوری" (غلط فیصلہ) ہے، کیونکہ اللہ کی ہر تدبیر کے پیچھے ایک ایسی حکمت ہوتی ہے جو انسانی عقل کے احاطے سے باہر ہے۔

عقلِ جزوی بمقابلہ عقلِ کلی

مولانا روم کے نزدیک ایک عقل وہ ہے جو صرف مادی فائدے اور نقصان سوچتی ہے (عقلِ جزوی)۔ اس کے مقابلے میں **عقلِ کلی** وہ ہے جو وحی اور الٰہی نور سے منور ہوتی ہے۔

روحانی نکتہ: جب عقلِ جزوی اپنی حد کو تسلیم کر کے خاموش ہو جاتی ہے، تو وہ عقلِ کلی کے تابع ہو جاتی ہے۔ رومی تمنا کر رہے ہیں کہ کاش انسانی عقل اپنی حد پہچان لیتی تاکہ وہ خدا کے عشق اور اس کی مشیت کے معاملات میں مداخلت نہ کرتی۔

فقر اور فنائیت کا مقام

شعر میں "ننگ" کا ایک مطلب **عاجزی اور فقر** بھی ہے۔ صوفیا کے نزدیک جب عقل "فنا" ہو جاتی ہے، تو انسان **"مقامِ حیرت "** میں داخل ہوتا ہے۔

- اگر عقل خود پسندی چھوڑ کر "ننگ و عار" (یعنی مکمل عاجزی) اختیار کر لیتی، تو وہ اللہ کی تقدیر پر معترض ہونے کے بجائے "سرِ تسلیم خم" کر دیتی۔
- یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کہتا ہے" : مـیں تو کچھ بھی نہـیں، جو کچھ ہـے تو ہی ہـے۔"

خلاصہِ روحانی

روحانی طور پر رومی یہ پیغام دے رہے ہیں کہ" **:اے انسان! اپنی عقل پر اتنا ناز نہ کر کہ تو خدا کے فیصلوں پر جج بن کر بیٹھ جائے۔ اپنی عقل کی نارسائی کو پہچان، عاجزی اختیار کر، تاکہ تو اس بدنصیبی (بدداوری) سے بچ سکے جو تجھے رضائے الٰہی سے دور کر دیتی ہے۔"**

جس طرح ایک پیاسا کنویں کے پاس جا کر اپنی پیاس کا اعتراف کرتا ہے، اسی طرح عقل کو بھی اپنی "پیاس" اور "خالی پن" کا اعتراف کرنا چاہیے تاکہ وہ فیضِ الٰہی سے بھر سکے

خون دَوید از چَشمِ ہمچون جویِ او
دُشمنِ جانِ وِیُ آمد رویِ او

مشکل الفاظ کے معنی

خون دَوید: خون بہہ نکلا / خون دوڑ گیا۔۔۔۔ **ہمچون:** کی مانند / کی طرح۔۔۔۔ **جوی:** نہر / ندی۔۔۔ **وِیُ:** اُس کی (مخفف 'او')۔۔۔ **دُشمنِ جان:** جان کا دشمن / قاتل۔۔۔ **روی:** چہرہ / ظاہری خوبصورتی

ترجمہ : اُس کی نہر جیسی (اشکبار) آنکھوں سے خون بہنے لگا، اور اُس کا اپنا ہی چہرہ (خوبصورتی) اُس کی جان کا دشمن بن گیا۔

اس شعر میں مولانا رومی ایک بہت گہری نفسیاتی اور روحانی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔

اس کے دو پہلو ہیں:

الف) حکایتی پس منظر (مور کی مثال)

مثنوی میں ایک جگہ ذکر ہے کہ ایک مور اپنے پر نوچ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ تم اتنے خوبصورت پر کیوں ضائع کر رہے ہو؟ تو مور نے جواب دیا کہ ان پروں کی خوبصورتی ہی کی وجہ سے شکاری میرے پیچھے پڑے ہیں اور میری جان خطرے میں ہے۔ یہ شعر اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے کہ جب انسان کی کوئی ظاہری صفت (حسن، دولت یا شہرت) اس کے لیے وبالِ جان بن جائے۔

ب) روحانی و اخلاقی مفہوم

1. **ظاہری وابستگی کا انجام:** انسان اپنی جن ظاہری خوبیوں (چہرہ، مال، جاہ و حشم) پر ناز کرتا ہے، بسا اوقات وہی چیزیں حسد، دشمنی اور مصیبت کا سبب بنتی ہیں۔ جب انسان حقائق کو پہچانتا ہے تو وہ اپنی انہی صفات پر خون کے آنسو روتا ہے جو اسے اللہ سے دور کر کے دنیاوی فتنوں میں الجھا دیتی ہیں۔

2. **خود پسندی کا زوال:** یہاں "روی" (چہرہ) سے مراد انسان کی 'انا (Ego)' بھی ہو سکتی ہے۔ انسان کی اپنی خود پسندی اور اپنی ہستی کا زعم ہی اس کی روحانی زندگی کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوتا ہے۔

3. **عشقِ حقیقی اور توبہ":** آنکھوں سے خون بہنا" انتہائی ندامت اور شدید درد کی علامت ہے۔ جب سالک (راستہ چلنے والا) کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی ظاہری چمک دمک نے اسے حقیقت سے محروم کر دیا، تو وہ زار و قطار روتا ہے۔

مولانا رومی یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ حسن یا وہ کمال جو انسان کی جان کے لیے خطرہ بن جائے یا اسے اللہ سے غافل کر دے، وہ حقیقت میں انعام نہیں بلکہ آزمائش ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ظاہری "چہرے" (روی) کے بجائے باطنی سیرت کی اصلاح کرے تاکہ وہ دشمنِ جان بننے کے بجائے راحتِ جان بن سکے۔

رومی کے اس شعر میں "ظاہری حسن یا خوبی کا جان لیوا بن جانا" ایک گہرا اخلاقی سبق ہے، جس کی جڑیں قرآن و سنت کی تعلیمات میں پیوست ہیں۔ قرآن و سنت کے تناظر میں اس کی وضاحت درج ذیل نکات سے کی جا سکتی ہے:

۱. دنیاوی زینت: ایک آزمائش (فتنہ)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ دنیا کی خوبصورتی، مال و دولت اور ظاہری جاہ و حشم دراصل انسان کے لیے ایک امتحان ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾

- "ہم نے زمین پر جو کچھ ہے اسے زمین کی زینت بنایا تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں عمل کے اعتبار سے کون بہتر ہے" (سورہ الکہف:۷)۔
- **تشریح:** جس طرح رومی کے شعر میں "خوبصورت چہرہ" جان کا دشمن بن گیا، اسی طرح اگر انسان اپنی کسی بھی نعمت (خوبصورتی، طاقت یا علم) پر فخر کرنے لگے اور اسے اللہ کی عطا کے بجائے اپنی ذاتی صفت سمجھے، تو وہی نعمت اس کے لیے آزمائش اور وبال بن جاتی ہے۔

تکبر: ہلاکت کا راستہ

شعر کا دوسرا مصرع (دشمنِ جانِ وی آمد رویِ او) تکبر کے انجام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب انسان اپنے کسی وصف پر اتراتا ہے، تو وہی وصف اسے اللہ سے دور کر دیتا ہے۔

حدیثِ قدسی:

حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، حَدَّثَنَا حَمَّادٌ. ح وحَدَّثَنَا هَنَّادٌ يَعْنِي ابْنَ السَّرِيِّ، عَنْ أَبِي الْأَحْوَصِ الْمَعْنَى، عَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ، قَالَ مُوسَى: عَنْ سَلْمَانَ الْأَغَرِّ، وَقَالَ هَنَّادٌ، عَنِ الْأَغَرِّ أَبِي مُسْلِمٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ هَنَّادٌ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: الْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي، وَالْعَظَمَةُ إِزَارِي، فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ. (ابو داوءد ۴۰۹۰)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل کا فرمان ہے: بڑائی (کبریائی) میری چادر ہے اور عظمت میرا تہ بند، تو جو کوئی ان دونوں چیزوں میں کسی کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے جہنم میں ڈال دوں گا۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر میں جس "خون باری" کا ذکر ہے، وہ اسی وقت ہوتی ہے جب انسان پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ جس چیز کو وہ اپنی طاقت سمجھ رہا تھا، وہی اس کی روحانی موت کا سبب بنی۔

شدید ندامت اور توبہ

آنکھوں سے خون بہنا انتہائی درجے کی حسرت اور ندامت کی علامت ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کے دن نافرمانوں اور غافلوں کی اسی حسرت کا ذکر ملتا ہے۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٧﴾

- اور اس دن ظالم (حسرت سے) اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھائے گا اور کہے گا: کاش میں نے رسول کا راستہ اختیار کیا ہوتا" (سورہ الفرقان:۲۷)۔
- یہ شعر اس کیفیت کی تصویر کشی کرتا ہے جب انسان اپنی غلطی کا ادراک کرتا ہے کہ اس نے فانی چیزوں (ظاہری حسن) کی خاطر اپنی حقیقی جان (روح) کو خطرے میں ڈال دیا۔

خود پسندی (عُجب) کی ہلاکت

شعر کا دوسرا مصرعہ "عُجب (Self-admiration) " کی طرف اشارہ کرتا ہے، جسے اسلام میں باطنی بیماریوں میں سب سے مہلک قرار دیا گیا ہے۔

حدیثِ مبارکہ: **قال رسول اللہ ﷺ: "ثلاثٌ مُهلِكاتٌ: شُحٌّ مُطاعٌ، وهوىً مُتَّبَعٌ، وإعجابُ المرءِ بنفسِه)** "رواہ البیہقی فی شعب الإیمان

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تین چیزیں ہلاک کر دینے والی ہیں: بخل جس کی اطاعت کی جائے، خواہشِ نفس جس کی پیروی کی جائے، اور انسان کا اپنے آپ کو اچھا سمجھنا (خود پسندی)" (شعب الایمان)۔

یہ حدیث بعینہٖ شعر کے دوسرے مصرعے کی شرح ہے۔ جب انسان اپنی کسی صفت (روی) پر فریفتہ ہو جاتا ہے، تو یہی صفت اسے تکبر میں مبتلا کر کے اس کی روحانی زندگی کو "قتل" کر دیتی ہے۔

قارون کا واقعہ: اپنی خوبی پر ناز کا انجام

قرآن مجید میں قارون کا قصہ اس شعر کی بہترین عملی مثال ہے۔ اسے بہت مال و جمال دیا گیا تھا، لیکن اس نے اسے اللہ کا فضل ماننے کے بجائے اپنی "دانش" کی طرف منسوب کیا۔

- اس (قارون) نے کہا:
- قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ
- یہ (سب کچھ) تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو میرے پاس ہے) "**سورہ القصص:۷۸**.(
- اس کے اسی "روی" (اپنے علم اور دولت پر ناز) نے اسے زمین میں دھنسا دیا، یعنی اس کی اپنی خوبی ہی اس کی جان کی دشمن بن گئی۔

حسرت اور ندامت کے آنسو

آنکھوں سے خون کے دریا بہنے کی کیفیت کو قرآن نے قیامت کے دن کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ

:"جس دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھائے گا" (سورہ الفرقان:۲۷).

تشریح: یہ اس وقت ہو گا جب انسان دیکھے گا کہ اس کی اپنی صلاحیتیں، اس کا حسن اور اس کا وقار جسے وہ اپنی طاقت سمجھتا تھا، آج اسے اللہ کے غضب سے نہیں بچا سکتے۔

خلاصہ برائے فہم

رومی کے اس شعر کا قرآنی خلاصہ یہ ہے کہ:

"تمہارا نفس تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے اگر وہ تمہیں تمہارے رب سے غافل کر دے۔"

اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ ہر نعمت کو اللہ کا عطیہ سمجھا جائے، اپنی ملکیت نہیں۔ اگر انسان اپنی خوبی کو اپنی ذاتی صفت سمجھے گا تو وہ "دشمنِ جان" بن جائے گی، اور اگر اسے اللہ کا فضل سمجھ کر شکر کرے گا تو وہی "راحتِ جان" بن جائے گی۔

شعر میں **"آنکھوں سے خون کا دریا بہنا"** بلاشبہ ایک مبالغہ ہے، لیکن اسلامی تصوف اور فارسی شعری روایت میں اس مبالغے کا مقصد محض مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک گہری باطنی کیفیت کی تصویر کشی ہے۔

اسلامی تصوف اور اخلاقیات کے تناظر میں اس کے جواز اور اخلاقی پہلو کی وضاحت درج ذیل ہے:

۱. کیا تصوف میں ایسا مبالغہ روا ہے؟

اسلامی تصوف میں اسے **"لسانِ حال"** یا **"زبانِ عشق"** کہا جاتا ہے۔ صوفی شعراء کے ہاں مبالغہ حقیقت کو جھٹلانے کے لیے نہیں، بلکہ **حقیقت کی شدت** کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

- **اصطلاحی جواز:** تصوف میں ظاہری الفاظ کے بجائے "معنی" پر زور دیا جاتا ہے۔ "خونِ چشم" دراصل اس شدید ترین ندامت (Remorse) کی علامت ہے جو ایک سالک کو اس وقت ہوتی ہے جب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی ظاہری نمود و نمائش (روی) میں ضائع کر دی۔
- **روحانی منطق:** صوفیاء کے نزدیک جب دل ٹوٹتا ہے اور توبہ کی آگ بھڑکتی ہے، تو آنسوؤں کا رنگ بدل جانا یا ان کی شدت کا بڑھ جانا ایک **تمثیل** (Metaphor) ہے تاکہ پڑھنے والا اس دکھ کی گہرائی کو محسوس کر سکے جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔

۲. اس مبالغے کا اخلاقی پہلو

اس شعر میں مبالغہ استعمال کرنے کے پیچھے کئی اہم اخلاقی اسباق چھپے ہیں:

الف) ندامت کی انتہا (The Peak of Repentance)

اخلاقی لحاظ سے سچی توبہ کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو اپنے کیے پر شدید رنج ہو۔ مبالغہ آمیز تصویر کشی یہ بتاتی ہے کہ جب انسان کو اپنی غلطی (اپنے حسن یا کمال پر ناز کرنا) کا پتہ چلتا ہے، تو اسے معمولی آنسو نہیں بلکہ اپنے جگر کا خون بہانا چاہیے، کیونکہ اس نے اپنی ابدی زندگی کو خطرے میں ڈالا تھا۔

ب) خود فریبی کا علاج (Curing Self-Deception)

انسان عموماً اپنی چھوٹی موٹی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ رومیؒ جیسا سخت استعارہ (خون بہنا) اس لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ قاری کو "شاک" (Shock) دیا جا سکے۔ اخلاقی پہلو یہ ہے کہ اپنی **انا (Ego)** کو پالنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس پر جتنا بھی رویا جائے کم ہے۔

ج) ظاہری حسن کی بے ثباتی

شعر کا اخلاقی نکتہ یہ ہے کہ وہ چہرہ جس پر انسان اتراتا تھا، وہی اس کی تباہی کا سبب بنا۔ یہاں مبالغہ یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ دنیاوی کشش اور باطنی حقیقت میں کتنا بڑا تضاد ہے۔ جو چیز آج "راحت" نظر آتی ہے، وہی کل "دشمنِ جان" بن کر سامنے آئے گی۔

۳. مبالغہ اور شعری ضرورت

ادب کی اصطلاح میں اسے **"مبالغہ مقبول"** کہا جاتا ہے۔ اگر شاعر صرف یہ کہتا کہ "وہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے پریشان ہوا اور رویا"، تو اس میں وہ تڑپ اور تاثیر پیدا نہ ہوتی جو "خونِ چشم" کے ذکر سے پیدا ہوئی ہے۔ صوفیانہ شاعری کا مقصد محض معلومات دینا نہیں، بلکہ **دل کی کایا پلٹنا** ہوتا ہے۔

مولانا رومیؒ کے اس شعر کا مرکزی خیال (یعنی اپنی ہی خوبی یا وجود کا وبالِ جان بن جانا اور شدید ندامت) فارسی اور اردو کے دیگر عظیم شعراء کے ہاں بھی مختلف رنگوں میں ملتا ہے۔ قدیم شعراء نے اس فلسفے کو تمثیلوں اور استعاروں کے ذریعے واضح کیا ہے۔

ذیل میں چند اہم شعراء کے کلام سے اس کی وضاحت پیش ہے:

۱. شیخ سعدی شیرازی (مور کی تمثیل)

شیخ سعدی نے رومی کے اسی تصور کو "مور (Peacock)" کی مثال سے بیان کیا ہے۔ مور کے پر اس کی خوبصورتی ہیں، لیکن وہی اسے شکاری کی نظر میں لاتے ہیں۔

مور را در بوستان بینند و پرسش می کنند

کس نگوید زاغ را کز بہر چہ آئی بہ باغ؟

- **ترجمہ :** باغ میں مور کو دیکھتے ہی لوگ اس کے (خوبصورت) پر نوچ لیتے ہیں، لیکن کوئی کوّے سے نہیں کہتا کہ تو باغ میں کیوں آیا ہے؟
- **ربط :** یہاں بھی وہی نکتہ ہے کہ "حسن" اور "نمایاں ہونا" انسان کے لیے مصیبت کا سبب بنتا ہے۔ اگر مور خوبصورت نہ ہوتا تو محفوظ رہتا۔

۲. مرزا غالب (آنکھ سے لہو ٹپکنا)

رومی کے پہلے مصرعے "خون دوید از چشم" (آنکھوں سے خون بہہ نکلا) کی معنوی بازگشت غالب کے ہاں اس مشہور شعر میں ملتی ہے، جہاں وہ خونِ دل کے آنکھ سے نکلنے کو ہی اصل دکھ قرار دیتے ہیں۔

رگوں میں دوڑنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

- **تشریح :** غالب یہاں اس مبالغے کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اگر دکھ کی شدت اتنی نہ ہو کہ آنکھ سے خون بن کر ٹپکے، تو وہ محض ایک جسمانی گردش ہے، دلی تڑپ نہیں۔ رومی کے ہاں بھی یہ خون آلود آنسو اس وقت بہتے ہیں جب انسان کو اپنی "خودی" کے فریب کا احساس ہوتا ہے۔

۳. میرزا عبدالقادر بیدل دہلوی (وجود کی قید)

بیدل دہلوی، جو فارسی کے مشکل ترین اور گہرے شعراء میں شمار ہوتے ہیں، اس خیال کو ایک قدم آگے لے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کا اپنا "وجود" ہی اس کے لیے سب سے بڑا شکاری ہے۔

بغیر از خود کسی صیادِ ما نیست

بہ رنگِ غنچہ دل خون گشت و ما را از قفس رستیم

- **ترجمہ :** ہمارے اپنے سوا ہمارا کوئی شکاری نہیں ہے۔ غنچے کی طرح ہمارا دل خون ہو گیا (پھٹ گیا) اور ہم قفس (جسم / انا) سے آزاد ہو گئے۔

- **ربط :** رومی نے کہا کہ "اس کا چہرہ اس کا دشمن بن گیا"، بیدل کہتے ہیں کہ انسان خود ہی اپنا شکاری (صیاد) ہے۔ انسان کی اپنی خواہشات اور اپنی ہستی ہی اسے قید میں رکھتی ہیں۔

۴. میر تقی میر (نمایاں ہونے کا وبال)

اردو کے خدائے سخن میر تقی میر نے بھی دنیاوی جاہ و حشم اور ظاہری کمال کے خطرات کو بیان کیا ہے۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا

خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

اور ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ انسان کی اپنی ہستی ہی اس کا پردہ ہے:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے

یہ نمائش سراب کی سی ہے

- **تشریح :** میر کے ہاں یہ "نمائش (Appearance)" ایک سراب ہے جو انسان کو ہلاکت میں ڈالتی ہے۔ رومی کے "روی" (چہرہ) اور میر کی "نمائش" ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

خلاصہ

تصوف میں یہ مبالغہ اس لیے روا ہے کہ یہ **سچائی کی ترجمانی** کرتا ہے، سچائی کو چھپاتا نہیں ہے۔ اس کا اخلاقی سبق یہ ہے:

اپنی ظاہری صفات پر فخر کرنا ایک ایسی مہلک بیماری ہے جس کا علاج صرف اور صرف "خون رلانے والی ندامت" اور اپنے رب کے حضور مکمل عاجزی میں ہے۔

ان تمام اشعار کا نچوڑ یہ ہے کہ **"خودی (Ego)"** اور **"ظاہر پرستی"** وہ جال ہیں جن میں انسان خود ہی پھنستا ہے۔ نجات تب ہی ملتی ہے جب انسان اپنی ان ظاہری خوبیوں پر فخر کرنا چھوڑ دے اور ان کی بے ثباتی پر وہ "خون کے آنسو" روئے جن کا ذکر رومی نے کیا ہے۔

دُشمنِ طاووس آمد پرِّ او
ای بَسی شَہ رابِکُشتہ فرِّ او

مشکل الفاظ کے معنی

دُشمن : دشمن، نقصان پہنچانے والا---**طاووس** :مور (Peacock) ---**پرّ** :پر (feather) ---**پرِّاو** :اس کے پر

بَسی :بہت سے، کثیر---**شَہ** :بادشاہ---**بِکُشتہ** :مارڈالا، قتل کیا گیا---**فرّ** :جاہ وجلال،شان وشوکت،رعب ودبدبہ

ترجمہ

مور کا دشمن اس کے اپنے ہی خوبصورت پر بن گئے ہیں؛(اسی طرح) کتنے ہی بادشاہوں کو ان کی اپنی شان وشوکت اور جاہ وحشم نے ہلاک کر ڈالا ہے۔

اس شعر میں مولانا روم ایک بہت بڑی نفسیاتی اور روحانی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

1. **تمثیلِ مور (The Peacock Metaphor):** مور دنیا کا خوبصورت ترین پرندہ مانا جاتا ہے، لیکن یہی خوبصورتی اس کی جان کی دشمن بن جاتی ہے۔ شکاری اس کے رنگین پروں کے حصول کے لیے اسے قید کرتے ہیں یا مار دیتے ہیں۔ اگر مور اتنا خوبصورت نہ ہوتا تو شاید وہ آزاد اور محفوظ رہتا۔ یہاں "پَر" سے مراد انسان کی وہ خوبیاں، دولت یا ٹیلنٹ ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔
2. **انسانی جاہ وحشم (The Trap of Glory):** دوسرے مصرعے میں مولانا فرماتے ہیں کہ بالکل اسی طرح تاریخ میں کئی بڑے بڑے بادشاہ اور حکمران اپنی ہی "فَر" (شان وشوکت) کی وجہ سے زوال کا شکار ہوئے۔ جب انسان کے پاس حد سے زیادہ طاقت یا شہرت آجاتی ہے، تو وہ دو طرح سے خطرے میں پڑ تا ہے:
   - **اندرونی خطرہ :** اس کے اندر تکبر اور انا پیدا ہو جاتی ہے جو اس کی روحانی موت کا سبب بنتی ہے۔
   - **بیرونی خطرہ :** دوسرے لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں اور اس کے زوال کی کوششیں شروع کر دیتے ہیں۔

3. **حاصلِ کلام:** رومیؒ ہمیں یہ سبق دے رہے ہیں کہ اپنی ظاہری خوبیوں، مال و دولت اور عہدے پر کبھی ناز نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہی چیزیں اکثر انسان کے لیے آزمائش اور بربادی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ وہ انسان کو "باطن" کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ اصل حسن کردار اور عاجزی میں ہے، نہ کہ ان ظاہری "پروں" میں جو شکاریوں (حاسدین یا نفس) کو دعوتِ نظارہ دیں۔

رومیؒ کے اس شعر کا بنیادی پیغام عاجزی، انکساری اور ظاہری جاہ و حشم کے فتنوں سے بچنا ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات اس حوالے سے انتہائی واضح ہیں اور انسان کو متنبہ کرتی ہیں کہ اس کی ظاہری خوبصورتی یا دنیاوی طاقت اس کے لیے زوال کا باعث بن سکتی ہے اگر وہ اللہ کی یاد سے غافل کر دے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس موضوع کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

1۔ تکبر اور فخر کی ممانعت

رومی کے شعر میں "پروں" اور "شان و شوکت" (فَر) سے پیدا ہونے والی ہلاکت کا اشارہ دراصل تکبر کی طرف ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾

"اور لوگوں سے (تکبر کے ساتھ) اپنا رخ نہ پھیر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ کسی بھی اترانے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔" (سورۃ لقمان:18)

حدیثِ مبارکہ میں تکبر کی ہلاکت خیزی کو یوں بیان کیا گیا:

وَحَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى، وَمُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، وَإِبْرَاهِيمُ بْنُ دِينَارٍ، جَمِيعًا عَنْ يَحْيَى بْنِ حَمَّادٍ، قَالَ ابْنُ الْمُثَنَّى: حَدَّثَنِي يَحْيَى بْنُ حَمَّادٍ، أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ، عَنْ أَبَانَ بْنِ تَغْلِبَ، عَنْ فُضَيْلٍ الْفُقَيْمِيِّ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ، عَنْ عَلْقَمَةَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ» قَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ: «إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ، وَغَمْطُ النَّاسِ.»

یحییٰ بن حمادؒ نے کہا: ہمیں شعبہؒ نے ابان بن تغلبؒ سے حدیث سنائی، انہوں نے فضیل بن عمرو فقیمیؒ سے، انہوں نے ابراہیم نخعیؒ سے، انہوں نے علقمہ سے، انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی، آپ نے فرمایا: ’’جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو گا، وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔‘‘ ایک آدمی نے کہا: انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کے جوتے اچھے ہوں۔ آپ نے فرمایا: ’’اللہ خود جمیل ہے، وہ جمال کو پسند فرماتا ہے۔ تکبر: حق کو قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔‘‘ (صحیح مسلم:91)

2۔ ظاہری صورت کے بجائے باطن کی اہمیت

رومی کے مطابق مور کے "پَر" اس کی جان کے دشمن بنے۔ اسلام سکھاتا ہے کہ اصل قیمت ظاہری خوبصورتی کی نہیں بلکہ دل اور اعمال کی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "بے شک اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔" (صحیح مسلم: 2564)

3۔ دنیا کی زیب وزینت ایک آزمائش ہے

جس طرح مور کے پر اس کے لیے "خوبصورت فتنہ" ہیں، اسی طرح دنیا کی دولت، طاقت اور حسن انسان کے لیے امتحان ہیں۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿٤٦﴾

"مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (صرف) زینت ہیں، اور باقی رہنے والی نیکیاں ہی تمہارے رب کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے بہتر اور امید کے اعتبار سے بہترین ہیں۔" (سورۃ الکہف: 46)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

"جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا اور زینت اور تمہارا آپس میں فخر کرنا اور مال واولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔" (سورۃ الحدید: 20)

4۔ اقتدار اور جاہ و حشم کا انجام

شعر کے دوسرے مصرعے میں بادشاہوں کی ہلاکت کا ذکر ہے۔ قرآن میں فرعون، ہامان اور قارون جیسے کرداروں کے قصے اسی لیے بیان کیے گئے تاکہ انسان کو معلوم ہو کہ جب طاقت اور مال حد سے بڑھ جائے اور عاجزی ختم ہو جائے تو ہلاکت مقدر بن جاتی ہے۔

قارون کا انجام: اسے اس کے خزانے سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا کیونکہ اسے اپنے مال پر فخر تھا (سورۃ القصص)۔

فرعون کا انجام: اسے اس کی طاقت اور خدائی کے دعوے کی وجہ سے غرق کر دیا گیا (سورۃ یونس)۔

ادبی اور صوفیانہ کلام میں **میٹافوریکل بیان** (Metaphorical Expression) یا **استعاراتی اظہار** محض زبان کی سجاوٹ نہیں ہوتا، بلکہ یہ پیچیدہ انسانی جذبات اور روحانی حقائق کو سمجھنے کا ایک طاقتور ذریعہ ہے۔

مولانا روم کے شعر (مور کے پر اور بادشاہ کی شان) کے تناظر میں، میٹافوریکل بیان کے اسباب اور اس کی نوعیت کو درج ذیل نکات میں سمجھا جا سکتا ہے:

1۔ میٹافوریکل بیان کے اسباب (Causes)

کسی بات کو سیدھا کہنے کے بجائے استعارے میں کہنے کے چند بڑے اسباب یہ ہیں:

- **تجرید سے ٹھوس کی طرف (From Abstract to Concrete):** انسانی ذہن کے لیے مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) تصورات جیسے کہ "انا"، "تکبر" یا "روحانی زوال" کو براہِ راست سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ جب ہم ان تصورات کو "مور کے پر" جیسی کسی ٹھوس اور نظر آنے والی چیز سے تشبیہ دیتے ہیں، تو بات فوراً سمجھ میں آ جاتی ہے۔
- **اثر آفرینی اور شدت (Impact and Intensity):** براہِ راست نصیحت ("غرور نہ کرو") انسانی دماغ پر وہ اثر نہیں چھوڑتی جو ایک تصویر ("مور کے پر اس کے دشمن بن گئے") چھوڑتی ہے۔ استعارہ انسان کے تخیل (Imagination) کو متحرک کر دیتا ہے، جس سے پیغام دل میں اتر جاتا ہے۔
- **عالمگیریت (Universality):** استعارہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ اگر رومی کسی خاص بادشاہ کا نام لیتے، تو وہ بات تاریخ کا حصہ بن کر رہ جاتی۔ لیکن "طاووس" (مور) اور "پَر" کا استعارہ ہر دور، ہر طبقے اور ہر انسان پر صادق آتا ہے۔
- **پردہ پوشی اور حکمت (Veiling and Wisdom):** تصوف میں بہت سی باتیں براہِ راست نہیں کہی جاتیں کیونکہ ہر انسان ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میٹافور (استعارہ) ایک فلٹر کا کام کرتا ہے؛ جو جتنا صاحبِ نظر ہوتا ہے، وہ اتنی ہی گہرائی سے معنی نکال لیتا ہے۔

2۔ میٹافوریکل بیان کی نوعیت (Nature)

اس کی نوعیت کو ہم تین زاویوں سے دیکھ سکتے ہیں:

الف) تشبیہ سے برتر تعلق

تشبیہ (Simile) میں ہم کہتے ہیں کہ "فلاں چیز فلاں جیسی ہے"۔ لیکن استعارے (Metaphor) کی نوعیت یہ ہے کہ یہ ایک چیز کو دوسری چیز کا **عین** قرار دے دیتا ہے۔ رومی یہ نہیں کہہ رہے کہ بادشاہ کی شان مور کے پر جیسی ہے، بلکہ وہ مور کی مثال کو ایک عالمگیر قانون (Universal Law) کے طور پر پیش کر رہے ہیں کہ ہر وہ "خوبی" جو اللہ سے غافل کر دے، وہی "دشمن" ہے۔

ب) علامت سازی (Symbolism)

میٹافوریکل بیان کی نوعیت **علامتی** ہوتی ہے۔ یہاں "مور" محض ایک پرندہ نہیں ہے، بلکہ یہ "خوش نمائی" اور "دنیاوی رغبت" کی علامت ہے۔ اسی طرح "پَر" ان وسائل، مال یا ٹیلنٹ کی علامت ہیں جن پر انسان ناز کرتا ہے۔

ج) فکری وحدت (Intellectual Unity)

اس کی نوعیت یہ ہے کہ یہ متضاد چیزوں میں ایک قدرِ مشترک تلاش کرتا ہے۔ بظاہر ایک پرندے (مور) اور ایک انسان (بادشاہ) میں کوئی تعلق نہیں، لیکن "تکبر اور اس کا انجام" وہ مشترک نکتہ ہے جو ان دونوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیتا ہے۔

حاصلِ بحث

میٹافوریکل بیان کا سبب **ابلاغ کی ضرورت** ہے اور اس کی نوعیت **تخلیقی اور علامتی** ہے۔ رومی نے اس اسلوب کو اس لیے اپنایا تاکہ وہ انسانی نفسیات کے اس باریک نکتے کو سمجھا سکیں کہ **انسان کی سب سے بڑی طاقت (خوبی) ہی اکثر اس کی سب سے بڑی کمزوری (زوال کا سبب) بن جاتی ہے** اگر اس کے ساتھ عاجزی نہ ہو۔

کلاسیکل فارسی اور اردو شاعری میں یہ موضوع ایک مستقل استعارے (Motif) کے طور پر موجود رہا ہے۔ شعراء نے اکثر اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ جس چیز پر انسان ناز کرتا ہے، وہی اس کے لیے "حجاب" یا "زنجیر" بن جاتی ہے۔

مختلف شعراء کے ہاں اس تصور کی جھلکیاں ملاحظہ کریں:

1۔ مرزا عبدالقادر بیدل (مابعد الطبیعیاتی تناظر)

بیدل کے ہاں "خود نمائی" اور "ظہور" کو ایک فریب اور مصیبت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی اپنی ہستی یا اس کی خوبیاں ایک ایسے آئینے کی طرح ہیں جو اسے اصل حقیقت سے دور کر دیتی ہیں۔

بیدلؔ! ظہورِ عیب و ہنر، سدِّ راہ ہے
آئینہ کیوں نہ ہو کہ اسے گھر سے عار ہے

مفہوم: چاہے ہنر ہو یا عیب، دونوں ہی انسان کے راستے کی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ یعنی انسان جب اپنی خوبیوں (ہنر) کو ظاہر کرتا ہے، تو وہ ان کے خول میں قید ہو جاتا ہے۔

2۔ شیخ سعدی شیرازی (حکیمانہ اسلوب)

سعدی نے رومی ہی کی طرح پرندوں اور جانوروں کی تمثیلات سے کام لیا ہے۔ "گلستان" میں وہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات پرندے کا گوشت نہیں، بلکہ اس کی آواز یا اس کے پر اس کی قید کا سبب بنتے ہیں۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

"**آنکہ بالائے سرش پَرِ می زد، عاقبت از پَرِ خویش ہلاک شد**) "وہ جو اپنے سر پر فخر سے پر پھیلا تا تھا، آخر کار اپنے ہی پروں کی وجہ سے ہلاک ہوا۔(

3۔ مرزا غالب (فلسفیانہ زاویہ)

غالب کے ہاں یہ تصور "ہستی" کے بوجھ کی صورت میں ملتا ہے۔ ان کے نزدیک کمال یا حسن بذاتِ خود ایک تماشا ہے جو اپنے دیکھنے والے (اور صاحبِ کمال) کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہاں **شمع** کا استعارہ غور طلب ہے۔ شمع کی "خوبی" اس کی روشنی ہے، لیکن یہی روشنی اسے پگھلنے اور ختم ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر شمع روشن نہ ہوتی، تو وہ ہلاکت سے بچی رہتی۔

4۔ کلاسیکل اردو غزل کا عمومی رنگ

اردو کے دیگر شعراء نے بھی اس بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے کہ "**شہرت** "اور "**نمائش** "انسان کی آزادی چھین لیتی ہیں۔

کلاسیکل شعراء یہ سکھاتے ہیں کہ اصل کمال "**بے رنگی** "اور "**عاجزی** "میں ہے۔ جس طرح پکا ہوا پھل شاخ کو جھکا دیتا ہے، اسی طرح حقیقی صاحبِ کمال اپنی خوبیوں کو "پَر" بنا کر اڑنے کے بجائے "سایہ" بنا کر دوسروں کو سکون پہنچاتا ہے۔

اس شعر کی **عرفانی** (Gnostic) اور **روحانی** (Spiritual) تعبیر ظاہری تشریح سے کہیں زیادہ گہری اور نفس کے باریک دھوکوں کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ صوفیانہ نقطہ نظر سے اس کے کئی پہلو ہیں:

1۔ "ہنر" اور "کمال" کا حجاب

روحانی راستے پر چلنے والے سالک کے لیے اس کے اپنے **اوصافِ حمیدہ** (نیکیاں، علم، زہد، اور روحانی کمالات) "مور کے پروں" کی مانند ہیں۔

- جب ایک عابد اپنی عبادت پر، ایک عالم اپنے علم پر، یا ایک صوفی اپنی کرامات پر فخر کرنے لگتا ہے، تو یہی کمالات اس کے لیے **حجابِ اکبر** (سب سے بڑا پردہ) بن جاتے ہیں۔
- عرفانِ الٰہی میں اصل دشمن وہ "غیر" نہیں جو باہر ہے، بلکہ وہ "کمال" ہے جو انسان کو اللہ کے بجائے اپنی ذات کی طرف متوجہ کر دے۔

2۔ "عُجب" (خود پسندی) کی ہلاکت

تصوف کی اصطلاح میں اسے **"عُجب "** کہتے ہیں۔ مور اپنے پروں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اپنی حقیقت (اپنے بدصورت پیروں) کو بھول جاتا ہے۔

- روحانی تعبیر یہ ہے کہ جب انسان اپنی روحانی ترقی کو اپنی محنت کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے اور اسے "اپنی "خوبی قرار دیتا ہے، تو وہ توحید کے مقام سے گر کر **شرکِ خفی** میں مبتلا ہو جاتا ہے۔
- **"فَرّ "** (شان) یہاں اس "میں" یا "انا" کی علامت ہے جو انسان کو خدا بننے کے زعم میں مبتلا کر دیتی ہے، جیسے فرعون یا نمرود۔

3۔ نفس کی شکاری فطرت

اس شعر میں ایک چھپا ہوا نکتہ یہ ہے کہ **شکاری** کوئی باہر کا آدمی نہیں بلکہ انسان کا اپنا **"نفس "** ہے۔

- نفس ان خوبصورت پروں (صلاحیتوں) کو دیکھ کر انسان کو اس وہم میں ڈال دیتا ہے کہ وہ دوسروں سے برتر ہے۔
- جیسے ہی برتری کا احساس پیدا ہوا، انسان کی روحانی موت واقع ہو گئی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ **"تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دو پہلوؤں کے درمیان ہے "۔**

4۔ فقر اور فناء کا مقام

اس شعر کی عرفانی تعبیر ہمیں **"فقر "** کی طرف بلاتی ہے۔

- حقیقی صوفی وہ ہے جو اپنے تمام کمالات کو اللہ کی امانت سمجھے اور اپنی ذات کو "عدم " (کچھ نہ ہونا) تصور کرے۔
- اگر مور یہ جان لے کہ یہ پر اس کے نہیں بلکہ اللہ کی کاریگری ہیں، تو وہ ان پر ناز کرنے کے بجائے سجدہ ریز ہو جائے گا۔
- بادشاہ (روح) تبھی محفوظ رہتی ہے جب وہ اپنی "فَر " (اقتدار) کو اللہ کا عطیہ سمجھے اور خود کو اس کا غلام۔

حاصلِ معرفت

روحانی اعتبار سے یہ شعر ایک **انتباہ (Warning)** ہے کہ:

اپنی خوبیوں کو " پَر " بنا کر اڑنے کی کوشش نہ کرو کہ کہیں نظرِ بد یا صیادِ نفس کا شکار ہو جاؤ، بلکہ ان خوبیوں کو **"خاکساری "** کے پردے میں چھپا دو تا کہ تمہاری روح محفوظ رہے۔

بقولِ بیدل دہلوی (اسی مفہوم میں):

عجـزِ مـا سـرمایـہٴ پنـدارِ ماسـت) <ہماری عاجزی ہی دراصل ہمارا اصل سرمایہ اور ہماری بلندی ہے۔ (

مولانا روم کا یہ شعر فنی اور فکری اعتبار سے ایک شاہکار ہے، جس میں سادہ الفاظ کے پیچھے معنی کی گہرائی چھپی ہوئی ہے۔ اس کے شعری محاسن (Poetic Beauties) درج ذیل نکات میں واضح کیے جاسکتے ہیں:

شعری محاسن

1۔ صنعتِ تمثیل(Allegory)

اس شعر کا سب سے بڑا حسن **صنعتِ تمثیل** کا استعمال ہے۔ رومیؒ نے ایک عالمگیر حقیقت (کہ انسان کی اپنی خوبیاں یا دولت اس کا زوال بن سکتی ہیں) کو سمجھانے کے لیے مور کے پروں کی مثال دی ہے۔ جب کسی عقلی بات کو کسی حسی (دکھائی دینے والی) مثال سے واضح کیا جائے تو اسے تمثیل کہتے ہیں۔

2۔ صنعتِ تضاد(Antithesis / Paradox)

شعر میں ایک خوبصورت فکری تضاد موجود ہے:

- **پَر** (خوبصورتی اور اڑنے کا ذریعہ) کو **دشمن** قرار دیا گیا۔
- **فَر** (شان و شوکت، جو حفاظت کا باعث ہونی چاہیے) کو **قاتل** قرار دیا گیا۔ یہ تضاد قاری کو چونکاتا ہے اور اسے گہری سوچ میں ڈال دیتا ہے کہ جو چیز بظاہر نفع بخش ہے، وہ نقصان دہ کیسے ہو سکتی ہے۔

3۔ صنعتِ لف و نشر(Symmetry)

اس شعر میں بہترین ربط پایا جاتا ہے:

- پہلے مصرعے میں **مور** (پرندہ) کا ذکر ہے۔
- دوسرے مصرعے میں **شہ** (بادشاہ / انسان) کا ذکر ہے۔ یہاں مور کی ظاہری خوبصورتی (پر) اور بادشاہ کی ظاہری طاقت (فر) کو ایک ہی ترازو میں تولا گیا ہے۔

4۔ صوتی ہم آہنگی اور قوافی(Rhyme and Rhythm)

- **قوافی کا انتخاب" :** پَر" اور "فَر" ہم وزن اور ہم آواز الفاظ ہیں جو شعر میں موسیقی پیدا کر رہے ہیں۔ "پَر" مادیت اور ظاہری حسن کی علامت ہے، جبکہ "فَر" اقتدار اور جاہ و جلال کی۔ ان دونوں کا صوتی ملاپ شعر کے اثر کو دوچند کر دیتا ہے۔
- **بحر :** یہ شعر "بحر رمل مسدس مقصور" (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) میں ہے، جو مثنوی کے لیے مخصوص ہے اور اس میں ایک خاص قسم کا بہاؤ اور وقار پایا جاتا ہے۔

5۔ ایجاز و اختصار(Conciseness)

مولانا نے صرف دو مصرعوں میں تاریخ کے ہزاروں سال کے عبرت ناک واقعات اور انسانی نفسیات کا پورا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ "ای بَسی" (اے کتنے ہی!) کہہ کر انہوں نے بے شمار گمنام اور نامور بادشاہوں کی داستانوں کو ایک لفظ میں سمو دیا ہے۔

6۔ استعاراتی حسن(Metaphorical Beauty)

- **طاووس(مور)** : یہ دنیادار یا اپنے آپ پر فخر کرنے والے انسان کا استعارہ ہے۔
- **پَر** : یہ ہنر، دولت، حسن یا کسی بھی ایسی خوبی کا استعارہ ہے جو انسان میں تکبر پیدا کرے۔
- **فَر** : یہ طاقت اور دنیاوی رتبے کا استعارہ ہے۔

7۔ حکیمانہ اسلوب(Didactic Tone)

رومیؒ کا انداز خطیبانہ نہیں بلکہ حکیمانہ ہے۔ وہ سیدھی نصیحت کرنے کے بجائے ایک ایسی حقیقت بیان کرتے ہیں جس کا مشاہدہ فطرت (مور) اور تاریخ (بادشاہوں کا زوال) دونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر صدیوں گزرنے کے بعد بھی اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہے۔

خلاصہ :اس شعر کا حسن اس کی **سادگی اور معنویت** کے امتزاج میں ہے۔ رومیؒ نے الفاظ کو بہت کفایت سے خرچ کیا ہے لیکن ان سے نکلنے والا پیغام لامتناہی ہے۔

گفت من آن آہُوَم کز نافِ من

ریخت این صَیّادْ خونِ صافِ من

مشکل الفاظ کے معنی

آہُو: ہرن (Deer) ۔۔۔۔ناف: ناف / پیٹ کا درمیانی حصہ (یہاں مشک کا مقام بھی مراد ہے)

صَیّاد: شکاری۔۔۔۔خونِ صاف: پاک خون / خالص خون

ترجمہ

"(مرتے وقت اس شخص یا ہرن نے) کہا کہ میں وہ ہرن ہوں جس کے نافہ (مشک) کی خاطر اس شکاری نے میرا پاکیزہ خون بہا دیا ہے۔"

مولانا روم اس شعر میں انسانی زندگی کی ایک کڑوی حقیقت کو استعارے کے ذریعے بیان کر رہے ہیں۔ اس کے دو بڑے پہلو ہیں:

1. اپنی خوبی ہی اپنی دشمن: جس طرح کستوری والے ہرن (Musk Deer) کا قصور اس کا کوئی گناہ نہیں بلکہ اس کے اندر موجود "خوشبو" (مشک) ہوتی ہے، اسی طرح انسان کے پاس موجود مادی نعمتیں، حسن، مال و دولت یا کوئی خاص ہنر بسا اوقات اس کی جان کا وبال بن جاتے ہیں۔ شکاری ہرن کو اس کے گوشت کے لیے نہیں بلکہ اس قیمتی مشک کے لیے مارتا ہے۔

2. مادی دنیا اور انسان: اس شعر کا پس منظر مثنوی کی اس کہانی سے ہے جہاں ایک سنار اپنے حسن اور فن کی وجہ سے بادشاہ کی نظر میں آتا ہے اور بالآخر وہی خوبصورتی اس کی موت کا سبب بنتی ہے۔ مولانا سمجھانا چاہتے ہیں کہ:

- دنیا میں انسان جن چیزوں پر فخر کرتا ہے (جیسے شہرت یا عہدہ)، وہی اکثر اسے اللہ سے دور کرنے یا دنیاوی مصائب میں پھنسانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔
- یہ شعر **"عشقِ مجازی"** کی بے ثباتی پر بھی چوٹ کرتا ہے کہ وہ ظاہری حسن جو خون کی گردش پر قائم ہے، ایک دن ختم ہونے والا ہے اور اس کا انجام سوائے افسوس کے کچھ نہیں۔

مولانا رومؒ ہمیں متنبہ کر رہے ہیں کہ ایسی خوبی یا کمال کس کام کا جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دے۔ اصل کمال تو وہ "باطنی خوشبو" ہے جو روح کو صیاد (موت یا شیطان) سے بچا کر خالقِ حقیقی تک پہنچا دے۔

مولانا کا پیغام: اپنی ظاہری صلاحیتوں پر غرور کرنے کے بجائے ان کے حقیقی مقصد کو پہچانو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا اپنا ہی "کمال" تمہارے زوال کا سبب بن جائے۔

مولانا روم کے اس شعر کی فکری بنیاد دراصل قرآن و سنت کے ان عالمگیر اصولوں پر ہے جو انسان کو دنیاوی نعمتوں کے فتنے، نفس کی چالاکیوں اور ظاہری کمال کے وبال بن جانے سے خبردار کرتے ہیں۔

نعمت کا "فتنہ" (آزمائش) بننا

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ مال، اولاد اور دنیاوی جاہ و حشمت محض آزمائش ہیں۔

"إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" (التغابن: 15) (تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو محض ایک آزمائش ہیں۔)

جس طرح ہرن کی "نافع" (کستوری) اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے، اسی طرح اگر انسان کو ملنے والا حسن، علم، دولت یا ہنر اسے اللہ کی یاد سے غافل کر دے اور اس میں تکبر پیدا کر دے، تو وہی نعمت اس کے لیے **"فتنہ"** بن جاتی ہے۔ علمی اصطلاح

میں اسے **"استدراج "** بھی کہا جاتا ہے، جہاں بظاہر نعمتیں مل رہی ہوتی ہیں لیکن وہ انسان کو آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف لے جا رہی ہوتی ہیں۔

2. قارونی صفت اور اپنی نسبت کا وبال

قرآن مجید میں **قارون** کا قصہ اس شعر کی بہترین علمی مثال ہے۔ قارون کو اللہ نے بے پناہ خزانے دیے تھے، لیکن اس نے کہا:

"قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَى عِلْمٍ عِندِي) "القصص:78) (اس نے کہا: یہ سب تو مجھے میرے ہنر اور علم کی وجہ سے ملا ہے۔(

یہ وہی "نافع "(کمال) تھا جس پر اس نے فخر کیا اور یہی اس کی ہلاکت کا سبب بنا۔ جب انسان اپنی خوبی کو اللہ کا فضل سمجھنے کے بجائے اپنی ذاتی صفت قرار دیتا ہے، تو وہ شکاری (نفس اور شیطان) کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ مولانا روم اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جب کمال اللہ کے لیے نہ ہو تو وہ "خونِ صاف" بہانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

3. دنیا کی بے ثباتی (متاع الغرور)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى، وَمُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، قَالَا: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ، حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ أَبِي مَسْلَمَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا نَضْرَةَ يُحَدِّثُ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: "إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَإِنَّ اللَّهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا، فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ، فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ". وَفِي حَدِيثِ ابْنِ بَشَّارٍ: لِيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ.

محمد بن مثنیٰ اور محمد بن بشار نے ہمیں حدیث بیان کی، دونوں نے کہا: ہمیں محمد بن جعفر نے حدیث سنائی، انہوں نے کہا: ہمیں شعبہ نے ابو سلمہ سے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا: میں نے ابو نضرہ سے سنا، وہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے تھے، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ دنیا بہت میٹھی اور ہری بھری ہے اور اللہ تعالیٰ اس میں تمہیں (تم سے پہلے والوں کا) جانشین بنانے والا ہے، پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو، لہٰذا تم دنیا (میں کھو جانے سے) بچتے رہنا اور عورتوں (کے فتنے میں مبتلا ہونے سے) بچ کر رہنا، اس لیے کہ بنی

اسرائیل میں سب سے پہلا فتنہ عورتوں (کے معاملے) میں تھا۔" اور بشار کی حدیث میں ہے: "تاکہ وہ دیکھے کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔" [صحیح مسلم/کتاب الرقاق/حدیث:6948]

رومی کے شعر میں "صیاد" (شکاری) دراصل دنیا کی وہ کشش ہے جو انسان کی ظاہری خوبیوں کو شکار کرتی ہے۔ قرآن نے دنیا کو **"متاع الغرور"** (دھوکے کا سامان) کہا ہے۔ جب انسان اپنی کسی ظاہری خوبی (جیسے ہرن کی کستوری) کی وجہ سے دنیا میں مشہور ہوتا ہے اور اس پر اتراتا ہے، تو وہ دراصل اپنی روحانی موت کا سامان کر رہا ہوتا ہے۔

4. تزکیہ نفس اور باطنی مشک

سنتِ نبوی ﷺ میں مشک (کستوری) کو بہترین خوشبو قرار دیا گیا اور اسے "مومن" اور "اچھے ہم نشین" کی مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔ علمی نکتہ یہ ہے کہ:

- اگر مشک ہرن کی ناف میں ہو (ظاہری کمال)، تو وہ اس کی جان کا دشمن ہے۔
- اگر یہی خوشبو مومن کے اخلاق اور ایمان میں ہو (باطنی کمال)، تو یہ قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔

رومی اس شخص پر نوحہ کناں ہیں جس نے اپنی خوبیوں کو صرف دنیاوی نمائش (Sensory world) کے لیے وقف کر دیا، جس کا نتیجہ سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں۔

حاصلِ کلام (علمی خلاصہ)

قرآن و سنت کے تناظر میں اس شعر کا لبِ لباب یہ ہے کہ **ہر وہ کمال جو خالق سے غافل کر دے، وہ کمال نہیں بلکہ وبال ہے۔** انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی خوبیوں کو اللہ کی امانت سمجھے (شکر) نہ کہ اپنی ملکیت (فخر)۔ اگر ہرن اپنی کستوری کی خوشبو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے گا تو شکاری کے ہاتھ آئے گا؛ اسی طرح اگر انسان اپنے نفسانی تقاضوں کو ایمان پر ترجیح دے گا تو شیطان (صیاد) اس کے ایمان کا خون بہا دے گا۔

مولانا روم کے اس شعر کی روحانی اور عرفانی تعبیر مادّی تشریح سے کہیں زیادہ گہری اور لطیف ہے۔ صوفیا کے ہاں "آہو" (ہرن) اور "مشک" (خوشبو) محض تمثیل نہیں بلکہ انسانی روح اور اس کے باطنی کمالات کے رموز ہیں۔

اس کی عرفانی تعبیر کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

1. روحِ انسانی اور الٰہی امانت

عرفانی نکتہ نظر سے "آہو" سے مراد **روحِ انسانی** ہے اور "نافہ" (مشک) سے مراد وہ **الٰہی جوہر** یا "نورِ حق" ہے جو ہر انسان کے اندر رودیعت کیا گیا ہے۔

- روح جب اس دنیا میں آتی ہے تو وہ اپنے ساتھ ایک باطنی خوشبو (معرفتِ الٰہی) لے کر آتی ہے۔
- "صیاد" یہاں **نفسِ امارہ یا دنیا کی رنگینی** ہے، جو روح کے اس باطنی کمال کو چھیننے یا اسے دنیاوی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے درپے رہتی ہے۔

2. کمالِ باطن اور آزمائش (ابتلا)

عارفین فرماتے ہیں کہ سالک (راستے کا مسافر) پر جوں جوں معرفت کے ابواب کھلتے ہیں اور اس کے اندر "**مشکِ معرفت**" پیدا ہوتی ہے، اس کی آزمائشیں بھی اتنی ہی کٹھن ہو جاتی ہیں۔

- **خونِ صاف بہنا:** یہ سالک کی ان تکالیف اور مجاہدات کی طرف اشارہ ہے جو اسے اپنی روحانی ترقی کی قیمت کے طور پر ادا کرنی پڑتی ہیں۔
- باطنی خوشبو (عرفان) جتنا زیادہ ظاہر ہوتی ہے، حسد، شہرت، اور نفس کے حملوں کا خطرہ اتنا ہی بڑھ جاتا ہے۔ اسی لیے صوفیا "خمول" (گمنامی) کو پسند کرتے ہیں تا کہ ان کا "نافع" صیاد کی نظر سے بچا رہے۔

3. فنا و بقا کا تصور

اس شعر کی ایک اعلیٰ عرفانی تعبیر "**فنا**" ہے۔

- ہرن کا خون بہنا اس بات کی علامت ہے کہ مشک (حقیقت) کو پانے کے لیے ہرن (ظاہر / جسم / انا) کو قربان ہونا پڑتا ہے۔
- جب تک ہرن زندہ ہے، مشک اس کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ جب ہرن "فنا" ہوتا ہے تو وہ خوشبو کائنات میں پھیل جاتی ہے۔

- عرفانی اصطلاح میں اسے "**موتوا قبل ان تموتوا** "(مرنے سے پہلے مر جاؤ) کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنی "انا" کا خون بہا کر ہی انسان "بقا" (مشک کی ابدی خوشبو) حاصل کر سکتا ہے۔

.4 حسنِ باطن کا وبال بننا

عارفین اس سے یہ سبق بھی لیتے ہیں کہ اگر انسان اپنے باطنی مشاہدات، کشف یا کرامات (مشک) کی نمائش کرے، تو یہی چیز اس کی روحانی ترقی کے لیے "صیاد" بن جاتی ہے۔

- جو سالک اپنے حال کو چھپانے کے بجائے اسے دنیا کے سامنے ظاہر کرتا ہے، وہ دراصل صیاد کو دعوت دیتا ہے کہ وہ آئے اور اس کا "خونِ صاف" بہا دے، یعنی اس کی روحانیت کو ضائع کر دے۔

خلاصہِ عرفان : یہ شعر دراصل **تخلیقِ انسانی کے کرب** کی داستان ہے۔ انسان کے اندر "خدا کا نور" (مشک) موجود ہے، لیکن وہ جس مٹی کے بدن (ہرن) میں قید ہے، اس کی بقا اور فنا کی کشمکش ہی زندگی کا اصل امتحان ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اے انسان! تیرے اندر کی وہ "الٰہی خوشبو" ہی تیری اصل قیمت ہے، مگر یاد رکھ کہ اسی قیمت کی وجہ سے تو کائنات کی سب سے بڑی آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔

"جس قدر بلند مقام ہوگا، اسی قدر کڑی آزمائش ہوگی۔"

قدیم شعرا کے ہاں یہ مضمون کہ "انسان کا کمال یا اس کی خوبی ہی اس کی مصیبت کا سبب بنتی ہے"، ایک مستقل روایت کے طور پر ملتا ہے۔ اسے فارسی اور اردو شاعری میں مختلف استعاروں جیسے شمع، طاؤس (مور)، طوطی اور صدف (موتی) کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

رومی کے اس فکر کی بازگشت ہمیں ان اشعار میں ملتی ہے:

1 . سعدی شیرازی: مور کے پروں کی دشمنی

شیخ سعدی نے اسی مفہوم کو مور کے پروں کی مثال سے واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مور کے خوبصورت پر ہی اس کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں کیونکہ لوگ انہیں حاصل کرنے کے لیے اسے قید کرتے یا مار دیتے ہیں:

پرِ طاووس بَر اود شمنِ جاں آمد و بس

از پئے آں کہ بُکشند و پَرَش بَرگیرند

)ترجمہ: مور کے پر ہی اس کی جان کے دشمن بن گئے، کیونکہ انہی پروں کی خاطر اسے مارا جاتا ہے اور اس کے پر چھین لیے جاتے ہیں۔(

2. میر تقی میر: آواز کی گرفتاری

اردو کے خدائے سخن میر تقی میر نے پرندے کی مثال دی ہے کہ اس کا اپنا نغمہ (کمال) ہی اسے شکاری کے جال تک لے جاتا ہے:

صیاد اسیر دامِ ہم کو تو ہی کر لا یا
یا نالے ہی کچھ اپنے ایسے ہی رسا نکلے؟

)تشریح: میر صیاد سے پوچھتے ہیں کہ کیا تو واقعی اتنا ماہر تھا کہ مجھے پکڑ لیا؟ یا دراصل میری اپنی آواز (نالہ / کمال) اتنی بلند اور پر اثر تھی کہ اس نے میرا پتہ بتا دیا اور میں گرفتار ہو گیا۔(

3. مرزا غالب: ہستی کا وبال

غالب نے اسے ایک وسیع تر تناظر میں بیان کیا ہے۔ وہ انسانی وجود کو ہی ایک ایسی شمع قرار دیتے ہیں جس کا اپنا "نور" (وجود) ہی اس کے جلنے اور ختم ہونے کا باعث ہے:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقہ-ہ-دام-ہ-خیال ہے

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

شمع جس آگ میں جلتی ہے اسی سے ہے ضیا

یعنی جس خوبی (روشنی) پر دنیا ناز کرتی ہے، وہ شمع کے اپنے آپ کو جلانے اور لہو کرنے کا نتیجہ ہے۔

4. مرزا بیدل دہلوی: جوہر کی قیمت

آپ کی دلچسپی کے پیشِ نظر بیدل کا ایک لطیف نکتہ پیش ہے، وہ کہتے ہیں کہ صدف (سیپ) کا دل اس لیے چاک ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر موتی (کمال) پرورش پا رہا ہوتا ہے:

قیمتِ ہر کس بقدرِ جوہرِ اوست

بیدل کے ہاں یہ تصور بہت گہرا ہے کہ نمائش (ظہور) ہی دراصل ہلاکت ہے۔ جو جتنا زیادہ ظاہر ہو گا، وہ اتنا ہی حوادثِ زمانہ کی زد میں رہے گا۔

5. ضرب المثل فارسی شعر

قدیم شعرا میں یہ شعر بطورِ مثال بہت مشہور ہے جو رومی کے شعر کا ہم معنی ہے:

طوطی زِ نطقِ خویش گرفتارِ شد بہ بند

مظلوم بماند آنکہ زبانش بریدہ بود

)ترجمہ: طوطی اپنی خوش کلامی (بولنے کی صفت) کی وجہ سے پنجرے میں قید ہوا، جبکہ وہ پرندہ جس کی زبان نہیں تھی (جو بے ہنر تھا) وہ آزاد رہا۔(

قدیم شعرا کا نچوڑ یہ ہے کہ:

عزلت اور گمنامی میں سلامتی ہے۔

نمائشِ کمال صیاد (مصیبت) کو دعوت دیتی ہے۔

باطنی جوہر کو چھپا کر رکھنا ہی صوفیانہ روش ہے، تا کہ "خونِ صاف" بہنے سے بچ سکے۔

رومی کا آہو (ہرن) دراصل ہر اس شخص کا استعارہ ہے جو اپنی ظاہری خوبیوں کے جال میں پھنس کر اپنی اصل (روحانیت) کو گنوا بیٹھتا ہے۔

ای من آن روباہِ صَحرا کَز کَمین

سَر بُریدَندَش برای پوستین

١. مشکل الفاظ کے معنی

روباہِ صحرا: جنگلی لومڑی، صحرا میں رہنے والی لومڑی۔۔۔ **کَمین:** گھات، چھپ کر وار کرنے کی جگہ۔

سر بُریدَندَش: اس کا سر کاٹ دیا گیا (یہاں 'ش' کی ضمیر لومڑی کے لیے ہے)۔۔۔ **پوستین:** کھال، چمڑا، یا وہ لباس جو جانور کی کھال سے بنایا جائے۔

ترجمہ

"ہائے افسوس! میں اس صحرائی لومڑی کی طرح ہوں جس کا سر گھات لگا کر صرف اس کی قیمتی کھال حاصل کرنے کے لیے کاٹ دیا گیا۔"

- **کمال جو زوال بن گیا:** لومڑی کا گوشت کوئی نہیں کھاتا، اسے صرف اس کی **قیمتی کھال (پوستین)** کے لیے مارا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح، بعض اوقات انسان کا ہنر، اس کی دولت، یا اس کی شہرت ہی اسے دوسروں کی حسد اور دشمنی کا نشانہ بنا دیتی ہے۔
- **ظاہری وابستگیوں کا نقصان:** مولانا روم یہاں یہ سبق دے رہے ہیں کہ دنیاوی جاہ و حشم اور ظاہری نمائش اکثر انسان کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ جس طرح لومڑی کی کھال اس کی موت کا سبب بنی، اسی طرح انسان کی 'انا' اور 'خود پسندی' اسے روحانی طور پر ہلاک کر دیتی ہے۔
- **عاجزی کی اہمیت:** اس شعر میں ایک پوشیدہ پیغام یہ بھی ہے کہ اگر انسان اپنی خوبیوں کو چھپا کر رکھے اور 'گمنامی' اختیار کرے (یعنی لومڑی کی کھال اتنی پرکشش نہ ہوتی)، تو وہ شکاریوں (آفات و مصائب) سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

حاصلِ کلام: یہ شعر ایک انتباہ ہے کہ اپنی ظاہری خوبیوں پر اترانا نہیں چاہیے، کیونکہ وہی خوبیاں جن پر آپ کو ناز ہے، دنیا کی نظر میں آپ کی جان کی قیمت بن سکتی ہیں۔ سچی زندگی وہی ہے جو ان ظاہری وابستگیوں سے آزاد ہو کر اللہ کی رضا میں گم ہو جائے۔

مولانا روم کا یہ شعر دراصل **تزکیہ نفس** اور **اخلاص** کے ان دقیق پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے جن کا جڑیں قرآن و سنت میں پیوست ہیں۔ لومڑی کی مثال ایک ایسے انسان کی ہے جس کی ظاہری نمائش یا دنیاوی کمالات ہی اس کی روحانی (اور بسا اوقات دنیاوی) ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت درج ذیل نکات سے کی جاسکتی ہے:

دنیاوی زینت اور اس کا فریب

رومی کے شعر میں 'پوستین' (قیمتی کھال) دنیا کی ان نعمتوں، عہدوں اور ظاہری خوبصورتی کی علامت ہے جو انسان کو اللہ سے غافل کر دیتی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ "... جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت اور تمہارے آپس میں فخر و غرور ہے..." (سورہ الحدید: 20)

جس طرح لومڑی اپنی کھال پر اتراتی ہے لیکن وہی کھال شکاری کو اس کی طرف متوجہ کرتی ہے، اسی طرح دنیاوی جاہ و حشم انسان کو 'حسد' اور 'فتنوں' کا نشانہ بنا دیتا ہے۔

شہرت اور دکھاوے (ریاکاری) کی مذمت

شعر میں 'سر کاٹا جانا' اس روحانی نقصان کی طرف اشارہ ہے جو 'شہرت کی طلب' سے ہوتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ میں **"لباسِ شہرت "** (ایسا لباس جو دکھاوے اور نمائش کے لیے پہنا جائے) سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔

- نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے" :
- حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ أَبِي الشَّوَارِبِ, حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ, عَنْ عُثْمَانَ بْنِ الْمُغِيرَةِ, عَنْ الْمُهَاجِرِ, عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ, قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ: "مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ فِي الدُّنْيَا, أَلْبَسَهُ اللَّهُ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ, ثُمَّ أَلْهَبَ فِيهِ نَارًا".
- عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس شخص نے دنیا میں شہرت کا لباس پہنا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے ذلت کا لباس پہنائے گا، پھر اس میں آگ بھڑکائے گا۔

[سنن ابن ماجہ / کتاب اللباس / حدیث: 3607]

مولانا روم کے نزدیک، اگر انسان اپنی صلاحیتوں کو صرف اللہ کے لیے وقف کرنے کے بجائے لوگوں کو متاثر کرنے (پوستین دکھانے) کے لیے استعمال کرے گا، تو وہ اپنی اصل (روح) کو کھو دے گا۔

حَدَّثَنَا حَرْمَلَةُ بْنُ يَحْيَى, حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ وَهْبٍ, أَخْبَرَنِي ابْنُ لَهِيعَةَ, عَنْ عِيسَى بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ, عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ, عَنْ أَبِيهِ, عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ, أَنَّهُ خَرَجَ يَوْمًا إِلَى مَسْجِدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ, فَوَجَدَ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قَاعِدًا عِنْدَ قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَبْكِي, فَقَالَ: مَا يُبْكِيكَ؟ قَالَ: يُبْكِينِي شَيْءٌ سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ, سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ, يَقُولُ: "إِنَّ يَسِيرَ الرِّيَاءِ شِرْكٌ, وَإِنَّ مَنْ عَادَى لِلَّهِ وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزَ اللَّهَ بِالْمُحَارَبَةِ, إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْأَبْرَارَ الْأَتْقِيَاءَ الْأَخْفِيَاءَ, الَّذِينَ إِذَا غَابُوا لَمْ يُفْتَقَدُوا, وَإِنْ حَضَرُوا لَمْ يُدْعَوْا, وَلَمْ يُعْرَفُوا قُلُوبُهُمْ مَصَابِيحُ الْهُدَى, يَخْرُجُونَ مِنْ كُلِّ غَبْرَاءَ مُظْلِمَةٍ".

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن وہ مسجد نبوی کی جانب گئے، تو وہاں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، انہوں نے معاذ رضی اللہ عنہ سے رونے کا سبب پوچھا، تو معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے ایک ایسی بات رلا رہی ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: ”معمولی ریاکاری بھی شرک ہے، بیشک جس نے اللہ کے کسی دوست سے دشمنی کی، تو اس نے اللہ سے اعلان جنگ کیا، اللہ تعالیٰ ان نیک، گمنام متقی لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اگر غائب ہو جائیں تو کوئی انہیں تلاش نہیں کرتا، اور اگر وہ حاضر ہو جائیں تو لوگ انہیں کھانے کے لیے نہیں بلاتے، اور نہ انہیں پہچانتے ہیں، ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں، ایسے لوگ ہر گرد آلود تاریک فتنے سے نکل جائیں گے“۔[سنن ابن ماجہ / کتاب الفتن / حدیث: 3989]

رومی کہتے ہیں کہ اگر لومڑی 'بد صورت' ہوتی یا اپنی کھال چھپا کر رکھتی تو شکاری کی نظر سے بچ جاتی۔ اسی طرح مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے اعمال میں دکھاوے کے بجائے پوشیدگی اور عاجزی اختیار کرے تاکہ شیطان اور نفس کے حملوں سے بچ سکے.

- **الأخفياء (گمنام)**: صوفیائے کرام کے نزدیک یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی 'پوستین' (اپنی خوبیوں اور کمالات) کو اللہ کے لیے چھپا کر رکھا۔
- **پہچانے نہیں جاتے**: یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ 'شہرت' کے فتنے سے محفوظ ہیں۔ دنیا کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، لیکن اللہ کے ہاں وہ بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔

یہ حدیث ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اصل کامیابی لوگوں کی نظروں میں معتبر ہونا نہیں، بلکہ اللہ کی نظر میں مقبول ہونا ہے، چاہے دنیا ہمیں جانتی ہو یا نہ جانتی ہو۔

گمنامی اور اخلاص کی فضیلت

شعر کا چھپا ہوا سبق یہ ہے کہ "سلامتی گمنامی میں ہے"۔ اسلام میں **'خمول'** (گمنامی) اور **'اخلاص'** کو بہت اہمیت دی گئی ہے تاکہ انسان تکبر سے بچ سکے۔

حسد سے بچاؤ

لومڑی کو اس کی خوبی (کھال) کی وجہ سے مارا گیا۔ قرآن میں **'حاسد'** کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے (سورہ الفلق)۔

- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" :

حَدَّثَنَا أَبُو مُسْلِمٍ الْكَشِّيُّ، حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ سَلامٍ، حَدَّثَنَا ثَوْرُ بْنُ يَزِيدَ، عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ ":اسْتَعِينُوا عَلَى إِنْجَاحِ حَوَائِجِكُمْ بِالْكِتْمَانِ، فَإِنَّ كُلَّ ذِي نِعْمَةٍ مَحْسُودٌ"

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنی ضروریات پوری کرنے پر بھیدوں کو پوشیدہ رکھنے سے مدد حاصل کرو، کیونکہ ہر نعمت والے شخص پر حسد کیا جاتا ہے۔“ [معجم صغیر للطبراني/ کتاب الادب/ حدیث:657]

حاصلِ کلام : قرآن وسنت کے تناظر میں یہ شعر ہمیں سبق دیتا ہے کہ:

1. اپنی خوبیوں اور نعمتوں پر **تکبر** نہ کریں، کیونکہ یہ نعمتیں آزمائش بھی بن سکتی ہیں۔
2. **ریاکاری** سے بچیں، کیونکہ ظاہری واہ واہ روحانی موت کا سبب بنتی ہے۔
3. اصل توجہ **باطن کی صفائی** پر ہونی چاہیے، نہ کہ دنیاوی 'کھال' (ظاہری ٹیپ ٹاپ) کو چمکانے پر۔

صوفیائے کرام کے ہاں اس شعر کی تعبیر بہت گہری اور نفسیاتی ہے، کیونکہ تصوف کا سارا سفر ہی 'ظاہر' سے 'باطن' کی طرف ہے۔ صوفیا اس شعر کو **'آفاتِ کمال'** اور **'حجابِ ہنر'** کے عنوان سے بیان کرتے ہیں۔

درج ذیل نکات صوفیانہ نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں:

۱. ہنر کا وبال بننا (آفتِ کمال)

صوفیا فرماتے ہیں کہ عام انسان اپنی خامیوں کی وجہ سے پکڑا جاتا ہے، لیکن 'سالک' (روحانی مسافر) بسا اوقات اپنے کمال کی وجہ سے مارا جاتا ہے۔

- لومڑی کا قصور اس کی کوئی برائی نہیں بلکہ اس کی **خوبصورتی (کھال)** ہے۔

- صوفیانہ تعبیر میں، اگر ایک عابد کو اپنی عبادت پر، ایک عالم کو اپنے علم پر، یا ایک عارف کو اپنی معرفت اور کرامت پر 'ناز' ہو جائے اور وہ اس کی نمائش شروع کر دے، تو یہی 'کمال' اس کے روحانی قتل کا سبب بن جاتا ہے۔ لوگ اس کے گرد ہجوم کر لیتے ہیں، اور وہ مریدوں اور شہرت کے چنگل میں پھنس کر اصل مقصود (اللہ) سے دور ہو جاتا ہے۔

۲. 'وجود' ہی سب سے بڑی کھال ہے

حضرت جنید بغدادیؒ اور دیگر کبار صوفیا کے نزدیک انسان کا اپنا 'وجود' اور اس کی 'انا (Ego)' ہی وہ کھال ہے جس کی وجہ سے وہ دنیاوی آفات کے نشانے پر ہے۔

- جب تک لومڑی زندہ ہے اور اس کے جسم پر وہ قیمتی کھال ہے، وہ خطرے میں ہے۔
- صوفیا کہتے ہیں کہ جب تک تمہارے اندر '**میں** ' باقی ہے، تم شکاری (شیطان اور نفس) کے نشانے پر ہو۔ جس دن تم 'فنا' ہو گئے اور اپنی اس ظاہری کھال (انا) سے نجات پالی، تم ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔

۳. اخفائے حال (حال کو چھپانا)

صوفیائے کرام کے نزدیک اپنی روحانی حالتوں، کشف اور کرامات کو چھپانا واجب ہے اسے '**ستارِحال** ' کہتے ہیں۔

- وہ فرماتے ہیں کہ لومڑی کی طرح اپنے 'قیمتی پوستین' (روحانی اسرار) کی نمائش نہ کرو۔ اگر تم نے اپنے باطنی اسرار کو لوگوں پر ظاہر کر دیا، تو لوگوں کی توجہ کا مرکز بننا تمہارے روحانی سفر کے لیے 'سر قلم' ہونے کے مترادف ہو گا۔
- ملامتی صوفیا تو قصداً اپنے اوپر ملامت لیتے تھے تاکہ لوگ انہیں لومڑی کی طرح قیمتی سمجھ کر ان کے پیچھے نہ پڑیں اور وہ خاموشی سے اپنے رب سے جڑے رہیں۔

۴. شہرت کی قید

اس شعر کی ایک تعبیر '**حبِ جاہ** ' (مرتبے کی محبت) کی مذمت ہے۔

- صوفیا کے نزدیک شہرت ایک ایسا جال ہے جس میں انسان اپنی مرضی سے گردن دیتا ہے۔

- لومڑی کی کھال اس کا 'تعارف' ہے۔ صوفی کہتا ہے کہ میرا کوئی تعارف، کوئی نام اور کوئی نشان نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ جہاں 'نشان' ہوگا وہاں 'شکاری' (حاسد، دنیادار، یا خود پسندی) ضرور آئے گا۔

۵. علمِ بے عمل اور بے ثمر کمال

بعض عارفین نے اس سے مراد وہ 'علم' لیا ہے جو صرف دنیا کمانے کے لیے سیکھا جائے۔ اگر علم کی کھال تو بہت خوبصورت ہو لیکن اندر 'روح' نہ ہو، تو ایسا علم انسان کو تکبر کی وادی میں لے جاکر اسے ذلیل کروا دیتا ہے۔

خلاصہِ کلام: صوفیائے کرام کے نزدیک یہ شعر ایک پکار ہے کہ:

"اے انسان! اپنی ظاہری خوبیوں، علم اور ہنر کو اپنی پہچان نہ بنا، بلکہ اپنی **عاجزی اور بندگی** کو اپنی پناہ گاہ بنا۔ کیونکہ دنیا تمہارے ہنر کو لوٹنے کے لیے بیٹھی ہے، جبکہ اللہ تمہارے ٹوٹے ہوئے دل کو خریدنے کا مشتاق ہے۔"

مولانا روم کا یہ شعر آج کے دور میں آٹھ سو سال پہلے کی نسبت زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ آج کے 'ڈیجیٹل' اور 'نمائشی' عہد میں لومڑی، اس کی کھال اور شکاری کے استعارے ہماری سماجی اور نفسیاتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

دورِ حاضر کے لیے اس میں چھپے اہم پیغامات درج ذیل ہیں:

۱. سوشل میڈیا اور 'ڈیجیٹل پوستین'

آج کے دور میں ہماری '**پوستین**' ہمارا سوشل میڈیا پروفائل اور ہماری ظاہری زندگی کی چکا چوند ہے۔ ہم اپنی ہر خوشی، ہر کامیابی اور ہر نعمت کی نمائش کرتے ہیں۔

- **پیغام:** لومڑی کی کھال ہی اس کی موت کا سبب بنی۔ بالکل اسی طرح، ہماری حد سے بڑھی ہوئی 'نمود و نمائش' (Oversharing) ہمیں حاسدوں، نظرِ بد اور ذہنی دباؤ کا شکار بنا دیتی ہے۔ جتنا زیادہ ہم اپنے 'اثاثوں' کی نمائش کریں گے، اتنے ہی زیادہ 'شکاری' (تنقید نگار، حاسد اور استحصالی قوتیں) ہماری طرف متوجہ ہوں گے۔

۲. پرائیویسی (رازداری) کی اہمیت

قدیم دور میں لومڑی کا شکار اس کی کھال کے لیے ہوتا تھا، آج کے دور میں انسان کا شکار اس کے **ڈیٹا (Data)** اور **ذاتی زندگی** کے ذریعے ہوتا ہے۔

- **پیغام :** ہر قیمتی چیز دکھانے کے لیے نہیں ہوتی۔ اپنی زندگی کے کچھ گوشوں کو 'خلوت' میں رکھنا ہی اصل دانائی ہے۔ سلامتی 'گمنامی' میں ہے، نہ کہ ہر وقت توجہ کا مرکز (Limelight) بنے رہنے میں۔

۳. مادی اشیاء بمقابلہ انسانی اقدار

شکاری کو لومڑی کی جان سے دلچسپی نہیں، صرف اس کی کھال سے ہے۔ آج کا مادی معاشرہ بھی انسان کو اس کی 'روح' یا 'کردار' سے نہیں، بلکہ اس کے 'برانڈ'، 'گاڑی' اور 'بینک بیلنس' سے پہچانتا ہے۔

- **پیغام :** جب ہم اپنی پہچان صرف ظاہری اشیاء (کھال) کو بنا لیتے ہیں، تو معاشرہ ہمیں ایک 'انسان' کے بجائے ایک 'چیز (Commodity)' سمجھنے لگتا ہے۔ جس دن وہ ظاہری چمک ختم ہوتی ہے، انسان کی قدر بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنی پہچان 'پوستین' (ظاہر) کے بجائے 'باطن' سے کرنی چاہیے۔

۴. ذہنی سکون کا 'سر قلم' ہونا

رومی کہتے ہیں کہ کھال کے لیے 'سر' کاٹ دیا گیا۔ آج کے دور میں لوگ شہرت، پیسہ اور مقام (کھال) حاصل کرنے کے لیے اپنا **ذہنی سکون، اخلاقیات اور فیملی لائف (سر)** قربان کر دیتے ہیں۔

- **پیغام :** کیا وہ 'پوستین' اتنی قیمتی ہے کہ اس کے لیے 'سر' ہی قربان کر دیا جائے؟ ہمیں سوچنا چاہیے کہ جن دنیاوی کامیابیوں کے پیچھے ہم بھاگ رہے ہیں، کہیں وہ ہماری اصل زندگی اور سکون کو تو ختم نہیں کر رہیں۔

۵. حسد اور مسابقت کی دوڑ

آج ہر شخص دوسرے سے بہتر 'کھال' پہننے کی کوشش میں ہے۔ یہ مقابلہ ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنا رہا ہے۔

- **پیغام:** عاجزی اور سادگی وہ ڈھال ہیں جو شکاری کی نظر سے بچاتی ہیں۔ اگر انسان اپنی نعمتوں کا اظہار فخر کے بجائے شکر سے کرے اور سادگی اختیار کرے، تو وہ بہت سے معاشرتی فتنوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔
- **حاصلِ کلام:** آج کے دور کا شکاری صرف بندوق لے کر نہیں بیٹھا، وہ 'لائیکس'، 'ویوز' اور 'تعریفوں' کے جال پھیلا کر بیٹھا ہے۔ مولانا روم کا پیغام واضح ہے: **اپنی قدر و قیمت اپنے باطن میں پیدا کرو، کیونکہ ظاہر کی قیمت لگتے ہی شکاریوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے۔**
- شعراء نے اس مضمون کو یعنی 'کمال کا وبال بن جانا' یا 'ظہور کی آفت' کو مختلف استعاروں (ہرن کی کستوری، شمع کی لو، اور پھول کی خوشبو) کے ذریعے نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔
- درج ذیل اشعار مولانا روم کے اس فکر کی مزید وضاحت کرتے ہیں:
- بیدل دہلوی (نمائش اور زوال)
- مرزا عبدالقادر بیدل، جن کی شاعری میں صوفیانہ اسرار کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، اس مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں:

دریں گلشن کمالِ بے بری معراجِ پستی شد

کہ ہمچوں شعلہ در خوں می تپد ہر کس کہ بالید

- ترجمہ: اس دنیا کے باغ میں بے ثمر (خالی ہاتھ) رہنا ہی بلندی کی معراج ہے، کیونکہ یہاں جو بھی (شعلے کی طرح) سر اٹھاتا ہے یا نمایاں ہوتا ہے، وہ اپنے ہی خون میں تڑپتا ہے۔
- وضاحت: بیدل کے نزدیک عافیت 'پستی' اور 'گمنامی' میں ہے، کیونکہ شہرت اور بلندی اپنے ساتھ ہزار فتنے لاتی ہے۔
- علامہ اقبال (پھول اور خوشبو)
- اقبال نے اکثر 'نمود' (دکھاوے) کو خودی کے لیے زہرِ قاتل قرار دیا ہے۔ وہ پھول کے استعارے سے لومڑی والی بات کی تائید کرتے ہیں:

تیری قبا سے نکلے خوشبو تو کیا تعجب

رکھتا ہے تو بھی شاید مایۂ دماغی

- اور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ پھول کی زندگی اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک وہ اپنی خوشبو کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، جیسے ہی وہ مہکتا ہے، زمانے کی نظر میں آ جاتا ہے:

پھول کو دستِ چمن بند نے توڑا افسوس!

جس کی خوشبو سے مہکتا تھا دماغِ ہستی

- شیخ سعدی شیرازی (بلبل اور باز)
- شیخ سعدی 'گلستاں' میں فرماتے ہیں کہ بعض اوقات انسان کی زبان یا اس کا ہنر ہی اس کی قید کا سبب بنتا ہے:

کُنجِ عُزلَت کہ سالِکان دارَند

قَطعِ راہِ حاسِدان دارَند

- ترجمہ: گوشہ نشینی (گمنامی) جو سالکین اختیار کرتے ہیں، دراصل حاسدوں کا راستہ روکنے کے لیے ہوتی ہے۔
- وہ ایک جگہ طوطے کی مثال دیتے ہیں کہ اسے اس کی میٹھی گفتگو کی وجہ سے قید کیا جاتا ہے، جبکہ کوے کو کوئی قید نہیں کرتا۔
- یہ تمام شعراء اس بات پر متفق ہیں کہ '**عافیت گمنامی میں ہے**'۔ جب تک انسان اپنی 'پوستین' (دولت، شہرت، ہنر) کی نمائش کرتا رہے گا، وہ زمانے کے حاسدوں اور نفس کے شکاریوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

ای من آن پیلی کہ زَخمِ پیل بان

ریخت خونَم از برایِ استخوان

مشکل الفاظ کے معنی

پیل: ہاتھی۔۔۔**پیل بان:** ہاتھی کا مالک یا ہاتھی ہانکنے والا (مہاوت)۔۔۔۔**زخم:** چوٹ، ضرب۔۔۔**ریخت:** بہایا (ریختن سے)

ازبرایِ: کی خاطر، کے لیے۔۔۔**استخوان:** ہڈی (یہاں مراد ہاتھی دانت ہے)

ترجمہ: **"اے (میرے دوست)! میں وہ ہاتھی ہوں جسے ہاتھی بان کے زخم نے زخمی کیا، اور اس نے میری ہڈیوں کے لیے میرا خون بہادیا۔"**

مطلب

"ہائے افسوس! میں وہ ہاتھی ہوں کہ جس کی ہڈیوں (قیمتی ہاتھی دانت) کی خاطر فیل بان (شکاری / مالک) کے زخموں نے میرا خون بہادیا۔"

اس شعر میں مولانا رومی ایک بہت گہرا فلسفہ بیان کر رہے ہیں۔ یہاں ہاتھی سے مراد **"انسان "** یا **"انسانی نفس "** ہے، اور ہڈیوں (استخوان) سے مراد انسان کی وہ **"دنیاوی خوبیاں، مال و دولت یا ہنر "** ہیں جو بظاہر تو اسے ممتاز بناتی ہیں لیکن وہی اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہیں۔

اہم نکات:

- **اپنی خوبی کا وبال بننا:** جس طرح ہاتھی کو اس کے گوشت کے لیے نہیں بلکہ اس کے قیمتی دانتوں (ہڈیوں) کے لیے مارا جاتا ہے، اسی طرح بسا اوقات انسان کی اپنی صلاحیتیں، اس کا حسن، اس کی دولت یا اس کا علم ہی اس کے لیے آزمائش بن جاتا ہے۔ لوگ اس کی ذات سے نہیں بلکہ اس کے "دانتوں" (مفادات) سے محبت کرتے ہیں اور انہیں حاصل کرنے کے لیے اسے زخمی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

- **دنیابطورِ فیل بان :** یہاں 'فیل بان' سے مراد یہ بے رحم دنیا یا وہ لالچی عناصر بھی ہو سکتے ہیں جو انسان کے جوہر کو چوس لینے کے لیے اسے اذیت دیتے ہیں۔

- **نفس کی پکار :** ایک روحانی پہلو یہ بھی ہے کہ انسان پکار اٹھتا ہے کہ میری ان مادی وابستگیوں اور ظاہری چمک دمک نے میری روح کو زخمی کر دیا ہے۔ کاش میں ان "قیمتی ہڈیوں" کا مالک نہ ہوتا تو شاید میں اس قدر اذیت اور خونریزی سے بچ جاتا۔

- **سبق :** مولانا رومی یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ وہ کمال جو تمہارے رب سے دوری یا تمہاری اذیت کا باعث بنے، وہ دراصل کمال نہیں بلکہ ایک جال ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی ظاہری خوبیوں پر غرور کرنے کے بجائے اپنی روح کی سلامتی کی فکر کرے۔

حاصلِ کلام : یہ شعر انسان کی بے بسی اور دنیا کی بے رحمی کا نوحہ ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ بعض اوقات ہماری وہ چیزیں جن پر ہم فخر کرتے ہیں، وہی ہماری روحانی موت کا سامان بن جاتی ہیں۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر درحقیقت انسانی وجود کی اس کشمکش کی عکاسی کرتا ہے جہاں انسان کی ظاہری خوبیاں یا مادی فوائد اس کی اصل روح اور زندگی کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس فلسفے کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

سورۃ الکہف میں ارشاد ہے:

"إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا "(سورۃ الکہف:7)

"روئے زمین پر جو کچھ ہے ہم نے اسے زمین کی زینت بنایا تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔ "یہ "زینت" بالکل ہاتھی کے دانتوں کی طرح ہے جو بظاہر تو اسے خوبصورت بناتی ہے، لیکن اگر انسان اس میں گم ہو جائے تو یہی اسے ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں بھی اس خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ انسان اپنی مادی ترقی کے چکر میں اپنی اصل مقصدِ زندگی کو نہ بھول جائے۔

- **فتنۂ مال :** نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

- حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ، حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ سَوَّارٍ، حَدَّثَنَا لَيْثُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ صَالِحٍ، أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ حَدَّثَهُ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ كَعْبِ بْنِ عِيَاضٍ، قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: " إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً، وَفِتْنَةُ أُمَّتِي الْمَالُ "، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ، إِنَّمَا نَعْرِفُهُ مِنْ حَدِيثِ مُعَاوِيَةَ بْنِ صَالِحٍ.

""ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی آزمائش ہوتی ہے اور میری امت کی آزمائش مال ہے۔ "رومی کا "پیل" (ہاتھی) وہ انسان ہے جو اپنے مال کے بوجھ تلے دب کر اپنا روحانی خون بہا رہا ہے۔ (سنن ترمذي / كتاب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم / حدیث: 2336)

مزید ارشاد فرمایا

حَدَّثَنَا عِمْرَانُ بْنُ مُوسَى اللَّيْثِيُّ، حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ زَيْدِ بْنِ جُدْعَانَ، عَنْ أَبِي نَضْرَةَ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ خَطِيبًا، فَكَانَ فِيمَا قَالَ: " إِنَّ الدُّنْيَا خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ، وَإِنَّ اللَّهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا، فَنَاظِرٌ كَيْفَ تَعْمَلُونَ، أَلَا فَاتَّقُوا الدُّنْيَا، وَاتَّقُوا النِّسَاءَ ".

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کھڑے ہوئے، تو اس خطبہ میں یہ بھی فرمایا" : دنیا ہری بھری اور میٹھی ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں خلیفہ بنانے والا ہے، تو وہ دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ سنو! تم دنیا سے بھی بچاؤ کرو، اور عورتوں سے بھی "اھ]سنن ابن ماجه / كتاب الفتن / حدیث: 4000[

- **دنیا کی حقیقت :** ایک اور روایت میں دنیا کو "میٹھی اور سبز "(حلوۃ خضرۃ) قرار دیا گیا، یعنی یہ دیکھنے میں بہت پرکشش ہے لیکن اس کی طلب انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔

اس شعر کے مفہوم کو ہم درج ذیل تین بڑے مقامات (پہلوؤں) پر منطبق کر سکتے ہیں:

الف) مادی دوڑ اور معاشی جدوجہد:

آج کا انسان زیادہ سے زیادہ "استخوان "(بینک بیلنس، جائیداد) جمع کرنے کی فکر میں اپنی صحت، خاندان کی خوشیاں اور اپنا ضمیر (خون) قربان کر رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ ہڈی اسے طاقتور بنا رہی ہے، حالانکہ یہی اسے وقت سے پہلے بوڑھا اور روحانی طور پر مردہ کر رہی ہے۔

ب) شہرت اور ظاہری کمال:

کئی بار انسان کا ہنر یا اس کا حسن ہی اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ جس طرح ہاتھی اپنے دانتوں کی وجہ سے شکاری کی نظر میں آتا ہے، اسی طرح انسان کی اپنی نام و نمود کی خواہش اسے حاسدین کے نرغے میں لے آتی ہے یا اس کے اندر "تکبر" پیدا کر دیتی ہے، جو کہ روحانی قتل کے مترادف ہے۔

ج) علم بغیر عمل کے:

اگر علم صرف لوگوں کو متاثر کرنے یا دنیا کمانے کے لیے ہو، تو رومی کے نزدیک وہ بھی ایک ایسی "ہڈی" ہے جس کا بوجھ انسان اٹھائے پھرتا ہے، لیکن وہ علم اس کے باطن کو منور کرنے کے بجائے اسے غرور کی وادی میں دھکیل کر زخمی کر دیتا ہے۔

حاصلِ بحث

قرآن و سنت ہمیں "زہد" کا درس دیتے ہیں، جس کا مطلب دنیا کو چھوڑنا نہیں بلکہ دنیا کو اپنے دل میں جگہ نہ دینا ہے۔ مولانا رومی یہ فرما رہے ہیں کہ اے انسان! تو کائنات کا سب سے قیمتی وجود (ہاتھی) تھا، لیکن افسوس کہ تو نے چند ٹکا ہڈیوں (فانی مادی لذتوں) کی خاطر اپنا قیمتی لہو بہا دیا اور اپنی حقیقت کو فراموش کر دیا۔

مولانا رومی کے اس شعر کی **روحانی (Spiritual)** اور **عرفانی (Gnostic)** تشریح اس مادی جہان سے پرے انسانی روح کے اس المیے کو بیان کرتی ہے جہاں "کمال" ہی "زوال" کا سبب بن جاتا ہے۔ عارفین کے نزدیک اس کے کئی گہرے اسرار ہیں:

۱. روحانی پہلو: جوہرِ انسانی کی پامالی

روحانیت کی رو سے یہاں ہاتھی سے مراد **"روحِ انسانی"** ہے جو اپنی اصل میں بہت عظیم اور قوی ہے۔

- **استخوان (ہڈی) بمقابلہ خون:** ہاتھی کے دانت (ہڈیاں) محض ظاہری زینت اور مردہ مادہ ہیں۔ خون زندگی کی علامت اور روح کی توانائی ہے۔
- **روحانی المیہ:** انسان کی مثال اس ہاتھی جیسی ہے جو اپنے اندر "روحِ الٰہی" کا حامل ہے۔ لیکن یہ دنیا (پیل بان) اس انسان کو اس کی روح کی قیمت پر نہیں بلکہ اس کی ظاہری حیثیت، مال، اور دنیاوی ہنر (ہڈیوں) کی وجہ سے اہمیت دیتی ہے۔ انسان اپنی ان "ظاہری ہڈیوں" کو چمکانے کے لیے اپنی "روح کا خون" کر دیتا ہے، یعنی اپنے باطن کو مردہ کر دیتا ہے۔

۲. عرفانی پہلو: "میں" کا وبال (حجابِ کمال)

عرفان (تصوف) میں یہ شعر **"انا (Ego)"** اور **"حجاب"** کی ایک بہت بڑی حقیقت کو کھولتا ہے:

- **کمال جو دشمن بن جائے:** عرفا فرماتے ہیں کہ بعض اوقات انسان کا اپنا "کمال" ہی اس کے اور خدا کے درمیان پردہ بن جاتا ہے۔ اگر ہاتھی خوبصورت دانتوں والا نہ ہوتا تو اسے کیوں مارا جاتا؟ اگر مور کے پر اتنے دیدہ زیب نہ ہوتے تو اسے قید کیوں کیا جاتا؟

- **معرفتِ نفس :** عرفانی نکتہ یہ ہے کہ جب سالک (راستہ چلنے والا) اپنے کسی ہنر، علم یا زہد پر فخر کرنے لگتا ہے، تو وہی ہنر (استخوان) اس کے روحانی قتل کا سبب بنتا ہے۔ وہ اپنی "خودی" کے دانت نکال کر دنیا کو دکھانا چاہتا ہے، اور یہی شہرت اور نمود و نمائش اس کے اخلاص کا خون کر دیتی ہے۔

۳ . فیل بان (پیل بان) کی علامتی حقیقت

عرفانی نقطہ نظر سے "پیل بان" کے دو رخ ہو سکتے ہیں:

1. **نفسِ امارہ :** وہ شکاری جو انسان کے اندر ہی چھپا ہوا ہے اور عارضی لذتوں (ہڈیوں) کی خاطر دائمی زندگی (خون) کو ذبح کر رہا ہے۔
2. **دنیا و شیطان :** وہ قوتیں جو انسان کو اس کے اصل مقام (خلافتِ الٰہی) سے گرا کر اسے صرف ایک "معاشی حیوان" یا "مادی پرزہ" بنا کر رکھ دیتی ہیں۔

حاصلِ عرفان: مولانا رومی یہ فرما رہے ہیں کہ اے مسافرِ راہِ حق! اپنی ان صفات اور کمالات سے ہوشیار رہ جو تجھے لوگوں میں ممتاز تو کرتی ہیں لیکن تجھے تیرے اصل (خالق) سے دور کر دیتی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جن چیزوں کو تو اپنی زینت سمجھ رہا ہے، وہی تیرے روحانی قتل کا پروانہ بن جائیں۔

جس طرح ہاتھی کے دانت اس کے لیے بوجھ اور موت کا پیغام ہیں، اسی طرح انسان کی وہ "خودی" جس میں خدا شامل نہ ہو، اس کے لیے وبالِ جان ہے۔

مولانا رومی کا یہ فلسفہ کہ **"انسان کا کمال یا اس کی مرغوب چیز ہی اس کا دشمن بن جاتی ہے"**، فارسی اور اردو کے قدیم شعراء کے ہاں ایک مستقل موضوع رہا ہے۔ قدیم شعراء نے مختلف پرندوں اور جانوروں کی مثالوں سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔

حکیم خاقانی (باطن کی قیمت)

خاقانی نے دنیاوی جاہ و حشم کو ہاتھی دانت کی طرح بے وقعت قرار دیا ہے:

خاقانی! از ایں استخواں چہ لافی؟

کاں مایۂ صد ہزار دستان است

ترجمہ : اے خاقانی! تو ان ہڈیوں (دنیاوی مال و منصب) پر کیا فخر کرتا ہے؟ یہ تو ہزاروں فریبوں کا مجموعہ ہیں۔

وضاحت : یہاں بھی "استخواں" کا لفظ مادی اشیاء کے لیے استعمال ہوا ہے جو بظاہر قیمتی ہیں مگر حقیقت میں دھوکہ ہیں۔

مولانا رومی کا یہ شعر **ایکالوجی** (Ecology) اور **ماحولیاتی اخلاقیات** (Environmental Ethics) کے تناظر میں ایک انتہائی طاقتور استعارہ پیش کرتا ہے۔ اگر ہم "ہاتھی" کو کرۂ ارض یا قدرت (Nature) مان لیں اور "فیل بان" کو انسان یا صنعتی لالچ، تو اس کے کئی اہم ماحولیاتی پہلو سامنے آتے ہیں:

۱. وسائل کا بے جا استحصال (Resource Over-exploitation)

ایکالوجی میں یہ شعر **"قدرتی وسائل "** اور **"حیاتیاتی بقا "** کے درمیان تصادم کو ظاہر کرتا ہے۔

- **استخوان (ہڈی / دانت) :** یہ ان مادی اشیاء کی علامت ہے جنہیں انسان فطرت سے نکالتا ہے (جیسے معدنیات، تیل، لکڑی یا ہاتھی دانت)۔
- **خون :** یہ اس سیارے کا "لائف سپورٹ سسٹم (Life Support System) " ہے، جیسے صاف ہوا، پانی اور متوازن موسم۔ انسان صرف چند "ہڈیوں" (مادی فائدے) کے حصول کے لیے پورے ماحولیاتی نظام کا "خون" بہا رہا ہے، یہ سمجھے بغیر کہ جب ہاتھی (فطرت) ہی نہ رہا تو ان دانتوں کی کوئی قیمت نہیں رہے گی۔

۲. شے سازی یا شے زدگی (Commodification of Nature)

ایکالوجی کے اعتبار سے یہ شعر **انسان دوستی بمقابلہ فطرت پسندی** کی بحث چھیڑتا ہے۔

- فیل بان ہاتھی کو ایک "زندہ وجود" کے طور پر نہیں بلکہ صرف "ہاتھی دانت کے ذخیرے" کے طور پر دیکھ رہا ہے۔
- جدید سرمایہ دارانہ نظام بھی جنگلات کو "آکسیجن دینے والے نظام" کے بجائے "لکڑی کی مارکیٹ" کے طور پر دیکھتا ہے۔ رومی کا یہ شعر اس ذہنیت پر ضرب لگاتا ہے جو زندہ متحرک نظاموں کو مردہ اشیاء (Commodities) میں تبدیل کر دیتی ہے۔

۳. کلیدی انواع (Keystone Species) کا تحفظ

سائنس کی زبان میں ہاتھی ایک **"Keystone Species"** ہے۔ اگر کسی جنگل سے ہاتھی ختم ہو جائیں تو پورے جنگل کا ماحولیاتی ڈھانچہ تباہ ہو جاتا ہے۔

- **رومی کا یہ کہنا کہ "ہڈی کی خاطر خون بہادیا" دراصل اس نادانی کی نشاندہی ہے جہاں انسان ایک چھوٹے سے جزوی فائدے کے لیے پورے ماحولیاتی نظام (Ecosystem) کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ یہ **"ماحولیاتی خودکشی "** (**Ecological Suicide**) کی بہترین شاعرانہ تعبیر ہے۔

۴. پائیدار ترقی (Sustainability) کا فقدان

اگر فیل بان عقل مند ہوتا تو وہ ہاتھی کو زندہ رکھتا تاکہ وہ اس سے طویل مدتی کام لے سکتا۔ لیکن اس کا لالچ اسے "فوری نفع " (Instant Profit) پر مجبور کرتا ہے۔

- ایکالوجی میں اسے **"Tragedy of the Commons"** سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، جہاں ہر فرد اپنے تھوڑے سے "استخوان" کے لیے مشترکہ "خون" (وسائل) کو ضائع کر رہا ہے۔

حاصلِ کلام : ایکالوجی کے نقطہ نظر سے رومی ہمیں یہ وارننگ دے رہے ہیں کہ فطرت کی "خوبصورتی" اور اس کے "وسائل" انسان کے لیے نعمت تھے، لیکن انسان کی حرص نے ان نعمتوں کو فطرت کے لیے ہی وبال بنادیا ہے۔ آج کی ماحولیاتی تبدیلیاں (Climate Change) دراصل اسی "ہاتھی کے زخموں" سے رسنے والا لہو ہے جو اب پوری انسانیت کے دامن کو رنگ رہا ہے۔

مولانا رومی کا یہ شعر فنی اور معنوی اعتبار سے فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ اس کے شعری محاسن کو درج ذیل نکات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱. صنعتِ استعارہ (Metaphor)

اس شعر کی بنیاد **استعارہ** پر ہے۔ رومی نے براہِ راست "انسان" کا نام لینے کے بجائے **"پیل" (ہاتھی)** کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

- **پیل :** انسانی روح یا نفسِ انسانی کا استعارہ ہے۔
- **استخوان (ہڈی) :** دنیاوی مال، جاہ و حشم اور ظاہری کمالات کا استعارہ ہے۔
- **پیل بان :** حالاتِ زمانہ، حرص و ہوا یا نفسِ امارہ کا استعارہ ہے۔ یہ استعارہ اتنا مکمل ہے کہ قاری فوراً ہاتھی کی بے بسی اور انسان کی مادی کشمکش کے درمیان ربط پیدا کر لیتا ہے۔

۲. صنعتِ تضاد(Antithesis)

شعر میں **"خون "** اور **"استخوان "**(ہڈی) کے درمیان ایک گہرا معنوی تضاد پایا جاتا ہے:

- **خون :** زندگی، حرکت، حرارت اور باطنی حقیقت کی علامت ہے۔
- **استخوان :** موت، جمود اور بے وقعت مادے کی علامت ہے۔ شاعر نے کمالِ فن سے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ایک "زندہ" چیز(خون) کو ایک "مردہ" چیز(ہڈی) کی خاطر ضائع کیا جا رہا ہے۔

۳. پیکر تراشی(Imagery)

رومی الفاظ سے تصویر بناتے ہیں۔ "زخمِ پیل بان" اور "ریخت خونم" کے الفاظ ایک دردناک منظر آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ قاری ایک زخمی ہاتھی کو دیکھتا ہے جس کا لہو بہہ رہا ہے، اور یہ بصری پیکر (Visual Imagery) شعر کے پیغام کو دل خراش بنا دیتا ہے۔

۴. ایجاز و اختصار(Conciseness)

اس شعر میں **"دریا کو کوزے میں بند "** کیا گیا ہے۔ مادی دنیا کی پوری تاریخ، انسان کا حرص، اس کا روحانی زوال اور کمال کا وبال بننا—یہ تمام فلسفے صرف دو مصرعوں میں سمیٹ دیے گئے ہیں۔ یہ رومی کے اسلوب کا خاصہ ہے کہ وہ پیچیدہ مسائل کو انتہائی سادہ الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔

۵. نداء اور حسرت کا اسلوب

شعر کا آغاز **"ای من "**...(ہائے میں...) سے ہوتا ہے، جو کہ **حرفِ نداء** اور **تاسف** (Regret) کا اظہار ہے۔ یہ اسلوب کلام میں ایک "ڈرامائی" کیفیت پیدا کرتا ہے، جیسے کوئی اپنی بربادی کا خود مشاہدہ کر رہا ہو اور پکار اٹھا ہو۔

آنکہ کُشتَستَم پیِ مادونِ من
می نَداند کہ نَخُسبَد خونِ من

مشکل الفاظ کے معنی

آنکہ: وہ جس نے۔۔۔۔ **کُشتَستَم**: (کشتہ + است + ام) مجھے قتل کر دیا ہے۔

پِی(پے): کے لیے، کی خاطر، کے پیچھے (یہاں مراد کسی ادنیٰ مقصد کے لیے ہے)۔۔۔**مادونِ من**: مجھ سے کم تر، مجھ سے نیچا، گھٹیا (مراد دنیاوی لالچ یا کوئی کم تر انسان)۔۔۔۔ **می نَداند**: وہ نہیں جانتا، اسے خبر نہیں۔۔۔ **نَخُسبَد**: نہیں سوتا (مصدر: خُسپیدن یا خوابیدن)۔۔۔۔۔**خونِ من**: میرا لہو، میرا خون۔

ترجمہ

وہ شخص جس نے مجھے مجھ سے بھی کم تر (چیز یا انسان) کی خاطر قتل کر دیا ہے، وہ (نادان) یہ نہیں جانتا کہ میرا خون کبھی سوتا نہیں ہے۔

اس شعر میں مولانا رومی ایک بہت گہرا آفاقی اصول بیان کر رہے ہیں، جسے ہم **"مکافاتِ عمل"** کہتے ہیں۔ اس کے دو بڑے پہلو ہیں:

1۔ ظلم اور اس کا بدلہ (عدلِ الٰہی)

رومی فرماتے ہیں کہ ظالم یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کسی مظلوم کو ختم کر کے قصہ پاک کر دیا ہے۔ خاص طور پر جب کوئی شخص کسی عالی ظرف یا اللہ والے کو دنیا کے معمولی فائدے (مادون) کے لیے نقصان پہنچاتا ہے، تو وہ اسے اپنی جیت سمجھتا ہے۔ لیکن حقیقت میں مظلوم کا خون "سوتا" نہیں ہے، یعنی وہ خاموش نہیں بیٹھتا۔ وہ خون پکار پکار کر عدل کا تقاضا کرتا ہے اور انجام کار ظالم کو اس کے کیے کی سزا مل کر رہتی ہے۔

2۔ قربانی کی قدر و قیمت

یہاں "مادون" (مجھ سے کم تر) کا لفظ بہت اہم ہے۔ رومی اس انسانی المیے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ لوگ عارضی فائدے، مال و دولت یا نفسانی خواہشات (جو انسان کی اصل روح سے بہت کم تر چیزیں ہیں) کے لیے اپنی عاقبت، اپنی انسانیت یا کسی پاکباز ہستی کو قربان کر دیتے ہیں۔

3۔ استعاراتی مفہوم (خون کا نہ سونا)

"خون کا نہ سونا" ایک فارسی محاورہ بھی ہے، جس کا مطلب ہے کہ ناحق بہایا گیا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ وہ تاریخ میں، لوگوں کے ضمیر میں اور خدا کی عدالت میں ہمیشہ بیدار رہتا ہے جب تک کہ انصاف نہ ہو جائے۔

خلاصہ : یہ شعر ظالم کے لیے ایک وارننگ ہے اور مظلوم کے لیے تسلی کہ دنیا میں کوئی بھی عمل، خاص طور پر کسی کی حق تلفی، کبھی چھپی نہیں رہتی۔ وقت گزرنے کے باوجود اس کے نتائج برآمد ہوتے ہیں اور ظالم اپنے ہی کیے کے جال میں پھنس جاتا ہے۔

حکمتِ رومی : اگر تم نے کسی بڑے مقصد کو چھوٹے لالچ پر قربان کیا ہے، تو یاد رکھو کہ اس قربانی کا اثر ختم نہیں ہوا، وہ انتقام بن کر تمہارے سامنے ضرور آئے گا۔

رومی کے اس شعر کا مرکزی پیغام "ناحق خون کا رائیگاں نہ جانا" اور "مکافاتِ عمل" ہے۔ قرآن و سنت میں اس تصور کو انتہائی سختی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ذیل میں اس موضوع پر قرآن و سنت کے اہم حوالے درج ہیں:

1۔ قرآنِ کریم کی روشنی میں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ظالموں کو خبردار کیا ہے کہ وہ اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے، چاہے وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ محسوس کریں۔

- **اللہ کی بے خبری کا رد :** رومی کے الفاظ "وہ نہیں جانتا" کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ "اور (اے نبیؐ) تم ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ اللہ ان کاموں سے غافل ہے جو یہ ظالم کر رہے ہیں۔" (سورہ ابراہیم:42)

- **ناحق قتل کی سنگینی :** ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا ہے:

"جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا (کسی اور وجہ سے) قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔" (سورہ المائدہ:32)

- **بدلے کا قانون :** قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر عمل کا بدلہ مل کر رہتا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ. وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ "پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔" (سورہ الزلزال:7-8)

2۔ سنتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

احادیث مبارکہ میں مظلوم کی پکار اور ظالم کے انجام کو بہت موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے، جو رومی کے "خون کے نہ سونے" کے استعارے کی بہترین شرح ہے۔

- **مظلوم کی بد دعا اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں :** نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن بھیجا تو فرمایا:

"حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ مُوسَى، حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، حَدَّثَنَا زَكَرِيَّاءُ بْنُ إِسْحَاقَ الْمَكِّيُّ، عَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ صَيْفِيٍّ، عَنْ أَبِي مَعْبَدٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا إِلَى الْيَمَنِ، فَقَالَ: "اتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ، فَإِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللَّهِ حِجَابٌ"

ہم سے یحییٰ بن موسیٰ نے بیان کیا، کہا ہم سے وکیع نے بیان کیا، کہا ہم سے زکریا بن اسحاق مکی نے بیان کیا، ان سے یحییٰ بن عبداللہ صیفی نے، ان سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام ابو معبد نے، اور ان سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو جب (عامل بنا کر) یمن بھیجا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہدایت فرمائی کہ مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہنا کہ اس (دعا) کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔

(صحیح البخاري / كتاب المظالم والغصب / حدیث:2448)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ مظلوم کا خون یا اس کی آہ کبھی "سوتی" نہیں، بلکہ وہ براہِ راست عرشِ الٰہی تک پہنچتی ہے۔

- **ظلم قیامت کے دن اندھیرا ہو گا :** آپ ﷺ نے فرمایا:

"اتقوا الظلم، فإن الظلم ظلمات يوم القيامة، واتقوا الشح، فإن الشح أهلك من كان قبلكم حملهم على أن سفكوا دماءهم واستحلوا محارمهم

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ظلم کرنے سے بچو! اس لیے کہ ظلم قیامت والے دن (کئی) ظلمتوں کا باعث بنے گا اور بخل سے بچو! اس لیے کہ بخل نے ہی تم سے پہلے والے لوگوں کو ہلاک کیا۔ اس بخل نے انہیں اپنوں کا خون بہانے پر اور حرام چیزوں کو حلال سمجھنے پر آمادہ کیا۔“

[سلسلہ احادیث صحیحہ / التوبة والمواعظ والرقائق / حدیث:2299]

" "ظلم قیامت کے دن (ظالم کے لیے) اندھیروں کا باعث ہو گا۔" (صحیح مسلم)

- **اللہ کی ڈھیل اور اچانک پکڑ:** ایک اور روایت میں آتا ہے:

"بے شک اللہ ظالم کو مہلت دیتا ہے، لیکن جب اسے پکڑتا ہے تو پھر اسے نہیں چھوڑتا۔" (صحیح بخاری)

حاصلِ بحث

قرآن و سنت کا مجموعی مزاج یہ بتاتا ہے کہ:

1. **عدلِ الٰہی بیدار ہے:** انسان کو لگتا ہے کہ وہ بچ گیا، لیکن اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔
2. **مادی مفاد (مادونِ من):** دنیاوی فائدے کے لیے کسی کی حق تلفی کرنا خسارے کا سودا ہے کیونکہ روح اور انسانیت کا مقام دنیا کے مال و متاع سے کہیں بلند ہے۔
3. **خون کا پکارنا":** خون نہیں سوتا" کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ "**الحی** " اور "**القیوم** " ہے، اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اس کی عدالت میں ہر مظلوم کا مقدمہ ہمیشہ "اوپن" رہتا ہے۔

مولانا رومی کا یہ شعر اخلاقیات اور روحانیت کے ان باریک پہلوؤں کو چھوتا ہے جہاں انسان اکثر ٹھوکر کھاتا ہے۔ اسے ہم درج ذیل دو حوالوں سے گہرائی میں سمجھ سکتے ہیں:

1۔ اخلاقی پہلو (Ethical Perspective)

اخلاقی لحاظ سے یہ شعر "**اقدار کی تجارت** " اور "**ذاتی جوابدہی** " کا درس دیتا ہے۔

- **ناجائز سودا:** (Disproportionate Trade) اس شعر میں لفظ "**مادون** " (کم تر) اخلاقی پستی کی علامت ہے۔ جب کوئی انسان کسی اعلیٰ قدر (مثلاً سچ، انصاف یا کسی کی زندگی) کو کسی ادنیٰ فائدے (مثلاً انا، حسد یا چند ٹکوں) کی خاطر قربان کرتا ہے، تو وہ ایک انتہائی گھٹیا اخلاقی تجارت کر رہا ہوتا ہے۔ اخلاقیات ہمیں بتاتی ہیں کہ مقصد جتنا بھی بڑا ہو، اس کے لیے غلط راستہ اختیار کرنا خود کو "قتل" کرنے کے مترادف ہے۔

- **توانائی کا قانون:** (Moral Energy) اخلاقی دنیا میں کوئی بھی عمل ضائع نہیں ہوتا۔ اگر آپ نے کسی کا حق مارا ہے، تو وہ حق ایک "قرض" بن کر فضا میں موجود رہتا ہے۔ رومی کہتے ہیں کہ خون نہیں سوتا، یعنی آپ کا وہ فعل

مسلسل آپ کا تعاقب کرتا ہے۔ اخلاقی سکون (Conscience) کبھی اس شخص کو میسر نہیں آ سکتا جس نے کسی "اعلیٰ" کو "ادنیٰ" کے لیے ذبح کیا ہو۔

2۔ روحانی پہلو (Spiritual Perspective)

روحانیت میں یہ شعر "فنا" اور "بقا" کے درمیان ایک پل ہے۔

- **حق کی لافانیت:** صوفیا کے نزدیک "حق" کو کبھی قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک صاحبِ حق یا حق گوئی کو جسمانی طور پر ختم کر بھی دیا جائے، تو اس کا اثر (خون) بیدار رہتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ شہیدوں اور حق پرستوں کا خون ان کی زندگی سے زیادہ ان کی موت کے بعد انقلاب لایا۔ روحانی اعتبار سے خون کا "نہ سونا" دراصل اس کی **"حیاتِ جاویدانی "** کی علامت ہے۔
- **نفسِ امارہ اور روح کی جنگ:** ایک گہری روحانی تشریح یہ بھی ہے کہ یہاں "قاتل" انسان کا اپنا **نفس** ہے اور "مقتول" اس کی **روح** ہے۔ انسان اپنی نفسانی خواہشات (مادون) کی خاطر اپنی روح کے تقاضوں کو کچل دیتا ہے۔ لیکن روح (خون) کبھی نہیں سوتی؛ وہ تڑپ، بے چینی اور ملال کی صورت میں بیدار رہتی ہے اور انسان کو اس کے اصل مقام کی یاد دلاتی رہتی ہے۔
- **کائناتی عدل:** روحانیت ہمیں سکھاتی ہے کہ یہ کائنات ایک بازگشت (Echo) ہے۔ رومی کے نزدیک کائنات کا ذرہ ذرہ بیدار ہے اور اللہ کے حکم سے نگہبان ہے۔ ظالم یہ سمجھتا ہے کہ خاموشی چھا گئی، لیکن روحانی بصیرت بتاتی ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اس ظلم کی گواہی دے رہا ہے اور پکار رہا ہے۔

حاصلِ کلام

اس شعر کو اگر ہم اپنی زندگی پر منطبق کریں تو یہ ہمیں دو باتیں سکھاتا ہے:

1. **خوفِ خدا اور احتیاط:** کبھی کسی کا دل نہ دکھائیں اور نہ حق تلفی کریں، کیونکہ جس کو آپ مردہ یا خاموش سمجھ رہے ہیں، اس کی پکار (خون) غیبی دنیا میں پوری قوت کے ساتھ بیدار ہے۔
2. **حقیقی قدر کی پہچان:** اپنی عظیم الشان روح اور انسانیت کو دنیا کے "مادون" (گھٹیا اور عارضی) فائدوں کے لیے سستا نہ بیچیں۔

رومی دراصل ہمیں **"بیداری "** کی دعوت دے رہے ہیں کہ کائنات کا عدل کبھی نہیں سوتا، لہٰذا تم بھی غفلت کی نیند سے جاگ جاؤ۔

رومی کے اس فکر انگیز شعر کی بازگشت ہمیں دیگر عظیم صوفی شعراء کے کلام میں بھی ملتی ہے۔ ان شعراء نے مختلف زاویوں سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ **"حق دبتا نہیں "** اور **"ظلم مٹ کر رہتا ہے"**۔

ذیل میں چند عظیم صوفی شعراء کے اشعار سے اس تصور کی وضاحت پیش ہے:

1۔ شیخ سعدی شیرازی (انجامِ ظلم اور آہِ مظلوم)

شیخ سعدی اخلاقیات کے امام مانے جاتے ہیں۔ رومی کے "خونِ من نہ خسبد" (میرا خون سوتا نہیں) کے تصور کو سعدی نے "آہِ مظلوم" کے پیرائے میں بیان کیا ہے:

بترس از آہِ مظلومان کہ ہنگامِ دعا کردن

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

مظلوموں کی آہ سے ڈرو، کیونکہ جب وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں تو اللہ کے در سے قبولیت خود ان کے استقبال کو آتی ہے۔

رومی سے ربط : سعدی یہ بتاتے ہیں کہ ظالم جسے "خاموشی" سمجھتا ہے، وہ دراصل ایک ایسی دعا ہے جو عرش کو ہلا دیتی ہے۔ جیسے رومی کا "خون" جاگ رہا ہے، ویسے ہی سعدی کی "آہ" بیدار ہے۔

2۔ بابا بلھے شاہ (مکافاتِ عمل)

پنجاب کے عظیم صوفی شاعر بلھے شاہ نے اسی بات کو "بیج اور فصل" کے استعارے میں بیان کیا ہے، جو رومی کے "مادون" (گھٹیا مقصد) کے انتخاب کی سزا کو واضح کرتا ہے:

بلھیا جے بیجیں گا، سوای کڈھیں گا

اوسے راہیں جائیں گا، جتھے آپیں وڈھیں گا

بلھے شاہ! جو تو بیجے گا، وہی کاٹے گا۔ تو اسی راستے پر جائے گا جہاں تو نے خود (کانٹے) بوئے ہیں۔

رومی سے ربط: رومی کہتے ہیں کہ تم نے ادنیٰ مقصد (مادون) کے لیے خون کیا، اب وہی خون تمہارا پیچھا کرے گا۔ بلھے شاہ اسی کو قدرت کا اٹل قانونِ مکافات قرار دیتے ہیں۔

3۔ حضرت حافظ شیرازی (حق کی لافانیت)

حافظ شیرازی کے ہاں دنیاوی جاہ و جلال (مادون) کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ مادی قوت سے کسی کو مٹایا نہیں جاسکتا:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

وہ کبھی نہیں مرتا جس کا دل عشق (حق) سے زندہ ہو گیا، کائنات کے رجسٹر پر ہماری ہمیشگی لکھی جاچکی ہے۔

رومی سے ربط: رومی کا یہ کہنا کہ "میرا خون سوتا نہیں" دراصل اسی **حیاتِ جاویدانی** کا اعلان ہے جس کا تذکرہ حافظ کر رہے ہیں۔ ظالم جسم ختم کر سکتا ہے، مگر اس "حیات" کو نہیں جو عشق اور حق سے عبارت ہے۔

4۔ علامہ اقبال (شہادت اور بیداری)

اقبال نے رومی کے اس فلسفے کو جدید دور میں "خونِ شہید" کے عنوان سے نئی زندگی دی۔ رومی کے شعر کی سب سے بہترین عملی تفسیر اقبال کے اس مشہورِ زمانہ شعر میں ملتی ہے:

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

رومی سے ربط: یہ شعر رومی کے اس مصرعے "نمی داند کہ نخسبد خونِ من" کی مکمل شرح ہے۔ یزید نے سمجھا کہ اس نے (مادون / تخت کے لیے) قتل کر کے فتح پالی، لیکن اسے خبر نہ تھی کہ وہ خون سوئے گا نہیں بلکہ ہر دور میں ایک نئی زندگی بن کر ابھرے گا اور خود ظلم کی موت ثابت ہو گا۔

5۔ حضرت سلطان باہو (اندرونی بیداری)

سلطان باہو نے "خون کے نہ سونے" کو انسانی ضمیر اور ذکرِ الٰہی سے جوڑا ہے:

الف اللہ چمبے دی بوٹی، مرشد من وچ لائی ھو

اندر بوٹی مشک مچایا، جاں پھلاں تے آئی ھو

رومی سے ربط: جب انسان کے اندر حق کی بوٹی لگ جاتی ہے، تو وہ "مادون" (دنیاوی لالچ) سے پاک ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسی ہستی کو نقصان پہنچائے، تو اس کے اندر کا "حق" (خون) کبھی خاموش نہیں ہوتا، بلکہ اس کی خوشبو اور اثر پورے عالم میں پھیل جاتا ہے۔

بر من است امروز و فردا برِوِیُ است

خونِ چون من کَش چُنین ضایعِ کِی است؟

مشکل الفاظ کے معنی

بر من است امروز: آج مجھ پر ہے (یعنی آج مٹنے اور مرنے کی باری میری ہے)۔۔۔۔ **فردا برِوِی است:** کل اس پر ہو گی (یعنی کل اس شخص کی باری ہو گی جس نے مجھے قتل کیا)۔۔۔۔ **خونِ چون من:** میرے جیسے (مظلوم یا سچے عاشق) کا خون۔

کَش (کہ + اش): کہ اس کا (خون)۔۔۔۔ **ضایع:** رائیگاں، برباد۔۔۔۔ **کِی است:** کب ہے؟ (مراد یہ کہ ایسا کب ممکن ہے کہ میرا خون رائیگاں چلا جائے)۔

ترجمہ

"آج (موت اور بلا) مجھ پر ہے، لیکن کل یہ اس (قاتل) پر ہو گی۔ میرے جیسے شخص کا خون بھلا اس طرح کب ضائع ہو سکتا ہے؟ (یعنی کبھی ضائع نہیں ہو گا)۔"

مولانا رومی ان اشعار کے ذریعے چند گہرے صوفیانہ اور اخلاقی اسباق دیتے ہیں:

1۔ مکافاتِ عمل (Law of Retribution): زرگر یہ جان چکا ہے کہ اس دنیا میں ہر عمل کا بدلہ ملتا ہے۔ اگر آج وہ ایک طاقتور بادشاہ کے حکم پر اپنی جان دے رہا ہے، تو وہ ظالم کو خبردار کر رہا ہے کہ قدرت کا قانون حرکت میں آئے گا۔ آج باری میری ہے تو کل تمہاری ہوگی۔ یہ "کافات" یا بدلے کا وہ اصول ہے جسے رومی نے "این جہاں کوہ است و فعل ماندا" (یہ دنیا ایک پہاڑ ہے اور ہمارا عمل ایک پکار ہے) کہہ کر بھی واضح کیا ہے۔

2۔ خونِ ناحق کی تاثیر: رومی کے نزدیک مظلوم کا خون کبھی نہیں سوتا۔ زرگر کہتا ہے کہ میرا خون "ضایع" نہیں ہوگا۔ یہاں ضائع نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ خون قاتل کے ضمیر اور اس کی عاقبت کا پیچھا کرے گا۔ صوفیانہ نقطہ نظر سے، اللہ کے کسی بندے کو ناحق ستانا دراصل اللہ کو للکارنا ہے۔

3۔ ظاہری حسن کی بے ثباتی: زرگر کا یہ قول اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اسے اس کے جسمانی حسن کی وجہ سے مارا گیا (جو کہ مٹی کا ڈھیر بن گیا)۔ وہ ان لوگوں کو پیغام دے رہا ہے جو دنیاوی اور فانی چیزوں کے پیچھے انسانیت کا قتل کرتے ہیں کہ جس حسن کے لیے تم نے میرا خون بہایا، وہ تو ختم ہو گیا، اب اس کا وبال تمہارے سر رہے گا۔

4۔ موت کا حوصلہ: یہ شعر ایک مغلوب انسان کی بے بسی کا اظہار نہیں، بلکہ ایک صاحبِ بصیرت کی خود اعتمادی ہے جو جانتا ہے کہ موت صرف ایک دروازہ ہے اور حقیقی انصاف خدا کی عدالت میں ہونا ہے۔

حاصلِ کلام: مولانا رومی اس شعر کے ذریعے انسان کو متنبہ کرتے ہیں کہ کسی پر ظلم کر کے یہ مت سمجھو کہ تم بچ نکلے ہو۔ وقت کا پہیہ گھومتا ہے اور جو بیج تم نے بویا ہے، اس کی فصل تمہیں کاٹنی پڑے گی۔ یہ شعر مظلوم کی طاقت اور ظالم کی حتمی ناکامی کا استعارہ ہے۔

مولانا رومی کے اس شعر میں "مکافاتِ عمل" اور "خونِ ناحق" کے جو دو بڑے مفاہیم بیان ہوئے ہیں، وہ عین اسلامی تعلیمات اور قرآن و سنت کے ارشادات کے مطابق ہیں۔

درج ذیل میں قرآن و سنت کی روشنی میں اس شعر کی علمی و روحانی تشریح پیش ہے:

1۔ گردشِ ایام اور مکافاتِ عمل (بر من است امروز و فردا بر وِی است)

یہ مصرع اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اقتدار، طاقت اور زندگی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ آج اگر ایک شخص مظلوم ہے، تو کل ظالم کو بھی اسی راستے سے گزرنا ہے۔

- **قرآنی حوالہ :** اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ) سورہ آل عمران:140" (اور یہ دن (حالات) ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔"

- **تشریح :** رومی کا یہ کہنا کہ "آج مجھ پر ہے، کل اس پر ہوگی" اسی قرآنی حقیقت کا عکس ہے کہ حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے۔ ظالم کو ملنے والی ڈھیل دراصل اس کی پکڑ کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

2۔ خونِ ناحق کی حرمت اور بازپرس (خونِ چون من کَش چُنین ضایع کی است؟)

دوسرے مصرعے میں زرگر کا یہ یقین کہ اس کا خون ضائع نہیں ہوگا، اللہ کی صفتِ عدل پر اس کے بھروسے کو ظاہر کرتا ہے۔

- **قرآنی حوالہ :** انسانی جان کی اہمیت کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا) سورہ المائدہ:32" (جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا (ناحق) قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔"

- **حدیثِ نبوی ﷺ :** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے جس چیز کا فیصلہ کیا جائے گا، وہ **خون (ناحق)** ہوگا۔" (صحیح بخاری)

3۔ ظالم کو مہلت اور اللہ کی عدالت

زرگر کا یہ کہنا کہ اس کا خون "ضایع" نہیں ہوگا، اس قرآنی تنبیہ کی یاد دہانی ہے کہ اللہ ظالم کے عمل سے غافل نہیں ہے۔

- **قرآنی حوالہ:**

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ)سورہ ابراہیم:42" (اور تم ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ اللہ ان کاموں سے غافل ہے جو ظالم کر رہے ہیں۔"

- **حدیثِ نبوی ﷺ (مظلوم کی پکار) :** نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن بھیجا تو نصیحت فرمائی:

"مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔" (صحیح بخاری)

رومی اس قصے کے ذریعے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ:

1. **ظاہر پرستی کا انجام :** بادشاہ اور حکیم نے سنار کے خون کو محض اس لیے مباح سمجھا کہ وہ ایک دنیاوی مقصد (کنیز کی صحت) حاصل کرنا چاہتے تھے۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ دنیاوی مقاصد کے لیے اخلاقی حدود کو پامال کرنا ابدی خسارہ ہے۔
2. **خون رنگ لاتا ہے :** سنار کا یہ کہنا کہ میرا خون ضائع نہیں ہوگا، دراصل ایک پیشگوئی تھی کہ جس "حسن" کے لیے یہ سب کیا گیا، وہ فنا ہو جائے گا اور پیچھے صرف گناہ باقی رہ جائے گا۔
3. **عدلِ الٰہی :** اللہ کا نظامِ عدل اتنا باریک بین ہے کہ کسی کا ایک آنسو یا خون کا ایک قطرہ بھی رائیگاں نہیں جاتا۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی کمزور کو دبا کر بچ نکلے گا، وہ دراصل اللہ کے اس قانون کو بھول جاتا ہے کہ **"تم جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے"**۔

حقیقت میں یہ شعر ظالم کے لیے **خوف** اور مظلوم کے لیے **امید** کا پیغام ہے، جو مکمل طور پر اسلامی فلسفۂ عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

مثنوی مولانا روم کے اس قصے میں بادشاہ کا سنار کو زہر دلوا کر قتل کروانا بظاہر ایک سنگدلانہ اور غیر اخلاقی فعل نظر آتا ہے۔ عام انسانی اخلاقیات اور شریعت کی رو سے کسی بے گناہ کا خون کرنا عظیم گناہ ہے۔

لیکن مولانا روم نے اس فعل کے دفاع میں چند گہرے صوفیانہ اور تمثیلی دلائل دیے ہیں، جنہیں سمجھے بغیر اس واقعے کی اخلاقی حیثیت واضح نہیں ہو سکتی:

1۔ الہامی حکم اور خضر علیہ السلام کی مثال

رومی فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے یہ کام اپنی خواہشِ نفس یا انتقام کے لیے نہیں کیا، بلکہ اس "الٰہی طبیب" (ولی اللہ) کے حکم پر کیا جس کی ہر بات وحی اور الہامِ الٰہی کے تابع تھی۔ مولانا روم یہاں **حضرت خضر علیہ السلام** اور اس لڑکے کا حوالہ دیتے ہیں جسے انہوں نے قتل کر دیا تھا (جس کا ذکر سورہ کہف میں ہے)۔

- **استدلال:** جس طرح حضرت خضر کا فعل بظاہر قتل تھا لیکن حقیقت میں اللہ کے حکم پر مبنی ایک بڑی مصلحت تھی، اسی طرح اس بادشاہ (جو کہ یہاں روح یا مردِ کامل کی علامت ہے) کا فعل بھی حکمِ الٰہی کے تحت تھا۔

2۔ علامتی اور تمثیلی پہلو (Allegory)

تصوف میں اس قصے کے کردار محض انسان نہیں بلکہ انسانی وجود کی مختلف کیفیات کی علامت ہیں:

- **بادشاہ:** روح (Spirit) کی علامت ہے۔
- **کنیز:** نفس (Soul) کی علامت ہے۔
- **سنار:** دنیاوی رنگ و بو، فانی مادی لذتوں اور نفسانی خواہشات کی علامت ہے۔

اخلاقی توجیہ: نفس (کنیز) جب تک فانی دنیا (سنار) کی محبت میں گرفتار رہے گی، وہ بیمار رہے گی اور کبھی بھی روح (بادشاہ) سے واصل نہیں ہو سکے گی۔ سنار کا قتل دراصل **"نفس کو مارنے"** **(تزکیہ نفس)** کی علامت ہے۔ یعنی جب تک انسان کے اندر سے دنیاوی مال و متاع اور ظاہری حسن کی جھوٹی محبت نہیں نکلے گی، وہ حقیقی عشقِ الٰہی تک نہیں پہنچ سکتا۔

3۔ جراحی (Surgery) کی مانند عمل

جس طرح ایک ڈاکٹر کسی مریض کی جان بچانے کے لیے اس کا ہاتھ یا پاؤں کاٹ دیتا ہے (جو بظاہر تشدد ہے مگر حقیقت میں ہمدردی ہے)، رومی کے نزدیک یہ قتل بھی ویسا ہی تھا۔

- وہ سنار جس کا حسن زوال پذیر ہوا، وہ دراصل اس مادی دنیا کی حقیقت دکھانے کے لیے تھا کہ جو چیز آج خوبصورت ہے، کل وہ بدصورت اور مٹی ہو جائے گی۔

4۔ رومی کا اپنا دفاعی شعر

مولانا روم خود اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

آن کشندہ نعوذ باللہ پادشاہ نہ بود حق بود کہ او را کُشت (نعوذ باللہ! وہ مارنے والا دنیاوی بادشاہ نہیں تھا، بلکہ وہ حق (اللہ) ہی تھا جس نے اسے مارا)۔

یعنی یہ فعل اللہ کی مشیت کا مظہر تھا تاکہ ایک اعلیٰ روحانی مقصد (کنیز کی توبہ اور شفایابی) حاصل ہو سکے۔

خلاصہ

اخلاقی لحاظ سے اس فعل کو دو سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے:

1. **ظاہری سطح** :(Legalistic) یہ ایک جرم ہے اور اسے عام زندگی میں مثال نہیں بنایا جا سکتا۔
2. **باطنی سطح** :(Esoteric) یہ ایک **روحانی آپریشن** ہے جہاں ایک فانی چیز (سنار / دنیاوی محبت) کو قربان کیا گیا تاکہ ایک لافانی چیز (کنیز / انسانی نفس) کو بچایا جا سکے اور اسے اللہ سے جوڑا جا سکے۔

رومی کا مقصد ہمیں قاتل بنانا نہیں، بلکہ یہ سکھانا ہے کہ سچی محبت تک پہنچنے کے لیے جھوٹے سہاروں کا ٹوٹنا ضروری ہے۔

رومی کے اس فلسفے اور خاص طور پر اس شعر کا تمدنی و معاشرتی اثر انتہائی گہرا ہے۔ یہ صرف ایک قصہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی ضابطہ ہے جو معاشروں کے عروج و زوال کی منطق بیان کرتا ہے۔

موجودہ دور کے تناظر میں اس کے اثرات کو درج ذیل نکات میں سمجھا جا سکتا ہے:

1. معاشرتی انصاف اور مکافاتِ عمل کا تصور

معاشرے کی بنیاد اس احساس پر ہوتی ہے کہ یہاں "انصاف" موجود ہے۔ جب طاقتور یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ قانون سے بالاتر ہے، تو رومی کا یہ شعر "**بر من است امروز و فردا بر وی است** " ایک سماجی انتباہ بن جاتا ہے۔

- **تمدنی اثر:** اگر معاشرے میں یہ یقین ختم ہو جائے کہ برائی کا بدلہ ملے گا، تو وہاں جنگل کا قانون رائج ہو جاتا ہے۔ رومی یہ سکھاتے ہیں کہ تاریخ کا پہیہ گردش میں رہتا ہے؛ آج کا مظلوم کل کا منصف ہو سکتا ہے۔

- **موجودہ دور:** آج کے دور میں جب ہم بین الاقوامی سیاست یا کارپوریٹ کلچر کو دیکھتے ہیں، جہاں طاقتور ممالک یا ادارے اپنے مفاد کے لیے کمزوروں کا استحصال کرتے ہیں، وہاں یہ فلسفہ یاد دلاتا ہے کہ ظلم کی بنیاد پر قائم تمدن کبھی پائیدار نہیں ہوتا۔

2. "مقصد" اور "ذریعہ" کی اخلاقی بحث

اس قصے میں بادشاہ کا سنار کو قتل کروانا ایک بہت بڑی اخلاقی بحث کو جنم دیتا ہے: **"کیا ایک بڑے مقصد کے حصول کے لیے غلط ذریعہ استعمال کیا جا سکتا ہے؟"**

- **تمدنی اثر:** تمدن کی ترقی اس بات میں ہے کہ وہ انسانی جان کی حرمت کو مقدم رکھے۔ رومی نے اسے "روحانی جراحی" کہا، لیکن سماجی لحاظ سے یہ ایک خطرناک موڑ ہے کیونکہ ہر دور کا آمر اپنے ظلم کو "اعلیٰ مقصد" کا نام دے کر جائز قرار دیتا ہے۔

- **موجودہ دور:** موجودہ دور کے سائنسی اور طبی تجربات (Ethical dilemmas in Science) یا سیاسی فیصلے جو 'قومی مفاد' کے نام پر کیے جاتے ہیں، اسی کشمکش کا شکار ہیں۔ رومی کا یہ قصہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم ظاہری فائدے اور باطنی قیمت کے درمیان فرق کو پہچانیں۔

3. مادیت پرستی کا علاج (Materialism vs. Spirituality)

سنار کا کردار اس مادی چمک دمک کی علامت ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

- **تمدنی اثر:** ایک تمدن جب صرف مادیت اور ظاہری حسن پر مبنی ہوتا ہے، تو وہ سنار کے اس زرد چہرے کی طرح ہو جاتا ہے جو زہر کی وجہ سے اپنی کشش کھو دیتا ہے۔

- **موجودہ دور :** آج کا انسان 'برانڈز'، 'سوشل میڈیا امیج' اور 'ظاہری کامیابی' کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ رومی کا پیغام یہ ہے کہ جو چیز فانی ہے، اس پر دل لگانا خود کو موت کے حوالے کرنا ہے۔ تمدن کی بقا روحانی اور اخلاقی اقدار میں ہے، نہ کہ صرف سیم وزر میں۔

4. تاریخی شعور اور تسلسل

تاریخ محض گزرے ہوئے واقعات کا نام نہیں، بلکہ یہ اعمال کے نتائج کا ایک تسلسل ہے۔

- **تمدنی اثر :** جو معاشرے اپنے ماضی کے تجربات سے نہیں سیکھتے اور اقتدار کے نشے میں یہ بھول جاتے ہیں کہ ان سے پہلے بھی کئی "فرعون" گزرے ہیں، وہ مٹ جاتے ہیں۔

- **موجودہ دور :** آج کی ڈیجیٹل دنیا میں جہاں یادداشت بہت مختصر ہو گئی ہے، رومی کا یہ شعر ہمیں ایک **"تاریخی بصیرت "** عطا کرتا ہے کہ ہر عمل کی گونج باقی رہتی ہے اور وقت کا حساب بے لاگ ہوتا ہے۔

حاصلِ بحث

موجودہ دور کے پیچیدہ مسائل، چاہے وہ ماحولیاتی بحران ہوں (جہاں ہم آج کی ترقی کے لیے آنے والی نسلوں کا مستقبل 'قتل' کر رہے ہیں) یا معاشی ناانصافیاں، ان سب کا حل اس شعور میں ہے کہ:

کوئی بھی عمل رائیگاں نہیں جاتا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ حساب رکھ رہا ہے کہ کس کا خون بہا اور کس نے ناحق فائدہ اٹھایا۔

رومی ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ تمدن صرف بڑی عمارتوں کا نام نہیں، بلکہ اس **خوفِ خدا** اور **احساسِ ذمہ داری** کا نام ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کا ناحق خون بہانے سے روک دے، خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔

مولانا رومی کے اس شعر کا مرکزی پیغام "مکافاتِ عمل" اور "خونِ ناحق کی تاثیر" ہے۔ فارسی اور اردو کے قدیم شعراء نے اس آفاقی سچائی کو اپنے اپنے رنگ میں بیان کیا ہے۔
درج ذیل میں قدیم شعراء کے چند منتخب اشعار پیش ہیں جو رومی کے اس فلسفے کی مزید وضاحت کرتے ہیں:
1۔ میرزا عبدالقادر بیدل (مکافات کا آئینہ)
بیدل دہلوی، جن کا کلام فلسفہ اور گہرائی کا سمندر ہے، اس موضوع پر فرماتے ہیں کہ انسان جو کچھ بوتا ہے، زمین اسے واپس لوٹاتی ہے:

غافل مشو کہ آئینہ دارِ قیامت است

ہر خوں کہ ریختی بہ زمین نقشِ پاے تست

ترجمہ: غافل نہ ہو کہ یہ زمین قیامت کا آئینہ لیے ہوئے ہے۔ تو نے جتنا بھی (ناحق) خون زمین پر بہایا ہے، وہ (انصاف کے راستے پر) تیرے ہی پاؤں کا نشان بن جائے گا (یعنی وہ تیرا پیچھا کرے گا اور تجھے پکڑوا دے گا)۔

ربط: یہ رومی کے دوسرے مصرعے "میرا خون ضائع نہیں ہو گا" کی بہترین تشریح ہے کہ خونِ ناحق قاتل کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتا۔

2۔ شیخ سعدی شیرازی (ظالم کو تنبیہ)

شیخ سعدی "گلستان" اور "بوستان" میں عدل و انصاف کے حوالے سے رومی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دُعا کردن

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

ترجمہ: مظلوموں کی آہ سے ڈرو، کیونکہ جب وہ دعا (بددعا) کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، تو اللہ کی بارگاہ سے قبولیت خود ان کے استقبال کے لیے آتی ہے۔

ربط: رومی کے شعر میں جو "فردا بروِی است" (کل اس پر باری ہو گی) کا خوف ہے، سعدی اسے "آہِ مظلوم" کے ذریعے واضح کر رہے ہیں۔

ایک اور جگہ سعدی مکافاتِ عمل پر کہتے ہیں:

چو بد کردی مشو ایمن ز آفات

کہ سوئے آسماں ہرگز نرفتہ ست

(جب تو نے برائی کی ہے تو آفات سے بے خوف نہ ہو، کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ برائی آسمان تک پہنچ کر بدلے کے بغیر رہ گئی ہو)۔

3۔ حکیم ناصر خسرو (حالات کی گردش)

ناصر خسرو نے زمانے کی تبدیلی اور "آج میری باری، کل تمہاری باری" کے تصور کو بڑے حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے:

نوبتِ ما چوں بگذشت، نوبتِ تُوست

آسیا گر بگردد، نوبتِ نوست

ترجمہ: ہماری باری (اقتدار یا زندگی) گزر گئی، اب تمہاری باری ہے۔ چکی جب گھومتی ہے، تو باری نئی ہو جاتی ہے (یعنی اناج کا اگلا دانہ پسنے کے لیے آ جاتا ہے)۔

ربط: یہ رومی کے پہلے مصرعے "بر من است امروز و فردا برِ وی است" کی ہو بہو عکاسی ہے۔

4۔ اردو کے کلاسیکی شعراء (خون کی تاثیر)

اردو ادب میں بھی یہ روایت بہت مضبوط رہی ہے۔ شیخ ابراہیم ذوق کا ایک مشہور شعر رومی کے اسی خیال کو اردو قالب میں ڈھالتا ہے:

لائے گا رنگ خونِ شہیداں کبھی نہ کبھی
گو چرخِ کج رو اپنی چالیں چلا کرے

تشریح: یہاں "خونِ شہیداں" سے مراد ہر وہ خون ہے جو حق کی راہ میں یا ناحق بہایا گیا۔ ذوق کہتے ہیں کہ آسمان (وقت) چاہے جتنی ٹیڑھی چالیں چلے، خون ایک نہ ایک دن اپنا اثر (رنگ) ضرور دکھاتا ہے۔

میر تقی میر کا یہ شعر بھی اسی زمرے میں آتا ہے جہاں وہ انسانی جان کی قیمت بتاتے ہیں:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ربط: رومی کا سنار (زرگر) بھی مٹی میں مل رہا ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ ایک "گنجِ گراں مایہ" (قیمتی خزانہ / روح) ہے جس کا حساب لیا جائے گا۔

گرچہ دیوار افگَنَد سایہ ئ دراز
باز گردد سویِ او آن سایہ باز

مشکل الفاظ کے معنی

گرچہ: اگرچہ، حالانکہ۔۔۔۔۔**افگند:** ڈالتی ہے، پھینکتی ہے۔۔۔۔**سایہ دراز:** لمبا سایہ۔۔۔۔**باز گردَد:** واپس پلٹ آتا ہے

سویِ او: اس کی طرف (دیوار کی طرف)۔۔۔۔**باز:** دوبارہ، واپس

ترجمہ

"اگرچہ دیوار ایک لمبا سایہ ڈالتی ہے (جو دیوار سے بہت دور تک نکل جاتا ہے)، لیکن (آخر کار) وہ سایہ دوبارہ اسی دیوار کی طرف ہی لوٹ آتا ہے۔"

مولانا رومیؒ اس شعر میں ایک تمثیل (مثال) کے ذریعے زندگی کی ایک گہری حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں:

1۔ مکافاتِ عمل (قانونِ فطرت) : انسان اس دنیا میں جو بھی عمل کرتا ہے، خواہ وہ اچھا ہو یا برا، وہ ایک سائے کی طرح ہوتا ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ عمل کر کے انسان فارغ ہو گیا اور وہ بات دور نکل گئی، لیکن جس طرح دیوار کا سایہ کتنا ہی لمبا کیوں نہ ہو جائے، جڑا وہ دیوار سے ہی رہتا ہے اور آخر کار سورج کے ڈھلنے پر واپس دیوار میں ہی سمٹ جاتا ہے، بالکل اسی طرح انسان کے اعمال کے نتائج گھوم پھر کر خود اسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

2۔ اعمال کی بازگشت : اگر آپ کسی کے ساتھ نیکی کرتے ہیں یا ظلم، تو وہ عمل ایک بیج کی طرح ہے یا اس سائے کی طرح ہے جو وقتی طور پر آپ سے دور جاتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ آپ کی ذات ہی کا حصہ ہوتا ہے اور ایک نہ ایک دن اس کا صلہ یا سزا آپ ہی کی طرف لوٹتی ہے۔

3۔ صوفیانہ نکتہ : اس شعر سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کے معاملے میں بے پرواہ نہیں ہونا چاہیے۔ دیوار یہ نہیں کہہ سکتی کہ "سایہ مجھ سے دور ہے تو میرا اس سے کیا تعلق"۔ اسی طرح انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ "میرا ماضی کا عمل ختم ہو گیا"۔ رومیؒ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ کائنات میں کوئی بھی چیز رائیگاں نہیں جاتی، ہر عمل کا ایک دائرہ ہے جو وہیں آکر مکمل ہوتا ہے جہاں سے وہ شروع ہوا تھا۔ آپ دنیا کو جو دیتے ہیں، دنیا وہی آپ کو لوٹاتی ہے۔ اگر آپ دیوار بن کر سایہ دیں گے، تو وہ سکون بن کر آپ ہی کی طرف لوٹے گا۔ اگر آپ کا عمل کسی کے لیے تکلیف کا باعث ہے، تو وہ تکلیف بھی آخر کار آپ ہی کا مقدر بنے گی۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر قرآن و سنت کے اس بنیادی تصور کی عکاسی کرتا ہے جسے **"مکافاتِ عمل "** یا **"جزاء و سزا "** کہا جاتا ہے۔ اسلام یہ سکھاتا ہے کہ انسان کا ہر عمل، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کائنات کے ریکارڈ میں محفوظ ہے اور اس کا نتیجہ پلٹ کر عامل (عمل کرنے والے) کی طرف ہی آتا ہے۔

1۔ قرآنِ کریم کی روشنی میں

قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسان کی نیکی یا بدی در حقیقت اس کی اپنی ذات کے لیے ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل (آیت 7):

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۚ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۚ

" اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے ہی فائدے کے لیے کی اور اگر تم نے برائی کی تو وہ بھی اپنی ہی جان کے لیے (کی)۔

"**نکتہ** : یہ آیت بعینہ رومی کے شعر کا قرآنی ترجمہ لگتی ہے کہ دیوار کا سایہ (عمل) نیکی ہو یا بدی، پلٹ کر اسی کی طرف آتا ہے۔

سورۃ الزلزال (آیت 7-8): میں فرمایا

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۚ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۚ

" پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ "**نکتہ** : یہاں "دیکھ لینے" سے مراد عمل کے نتیجے کا واپس پلٹنا ہے۔

سورۃ النجم (آیت 39): میں

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ

اور یہ کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔"

2۔ سنتِ مطہرہ (احادیث) کی روشنی میں

احادیثِ مبارکہ میں اس قانونِ قدرت کو بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ زندگی ایک گونج کی طرح ہے، جو بولو گے وہی سنو گے۔

"اَلْبِرُّ لَا يَبْلٰى وَالذَّنْبُ لَا يُنْسٰى وَالدَّيَّانُ لَا يَمُوْتُ، فَكُنْ كَمَا شِئْتَ، كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ (الزہد لابن المبارک)

"نیکی پرانی نہیں ہوتی (ضائع نہیں ہوتی)، گناہ بھلایا نہیں جاتا اور حساب لینے والا (اللہ) مرتا نہیں ہے۔ پس تو جو چاہے بن جا، جیسا تو (دوسروں کے ساتھ) کرے گا، ویسا ہی تیرے ساتھ کیا جائے گا۔"

اللہ کی مدد اور بندے کا عمل : صحیح مسلم کی حدیث ہے:

"وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ....

" "اللہ بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

"**نکتہ :** یعنی آپ کی طرف سے نکلنے والی مدد (سایہ) اللہ کی نصرت بن کر آپ ہی کی طرف پلٹتی ہے۔

3۔ علمی و فکری ربط

مولانا رومیؒ نے "**دیوار** "اور"**سائے** "کی جو تمثیل دی ہے، وہ در حقیقت **عدلِ الٰہی** کی تفہیم ہے۔

دیوار : انسان کی ذات یا اس کا وجود ہے۔

سایہ دراز : انسان کے پھیلے ہوئے اعمال، تعلقات اور معاملات ہیں۔

واپس پلٹنا : یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کائنات "بے مقصد" نہیں ہے۔ اگر آپ نے کسی کے لیے گڑھا کھودا ہے تو وہ "سایہ" گھوم کر آپ کے اپنے قدموں تلے آئے گا۔ اور اگر آپ نے کسی کو چھاؤں دی ہے، تو تپتی دھوپ میں وہ سکون آپ ہی کو ملے گا۔

حاصلِ کلام : یہ شعر قرآنی تصور "**جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا** "(برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی) اور "**هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ** "(احسان کا بدلہ احسان ہی ہے) کی شاعرانہ تشریح ہے۔ یہ انسان کو متنبہ کرتا ہے کہ اپنے ہر عمل پر نظر رکھے، کیونکہ وہ جو کچھ معاشرے یا کائنات کی طرف بھیج رہا ہے، وہ ختم نہیں ہو رہا بلکہ واپس آنے کے لیے اپنا سفر مکمل کر رہا ہے۔

مولانا رومیؒ کے کلام میں ہر مادی مثال کے پیچھے ایک گہرا روحانی سمندر چھپا ہوتا ہے۔ اس شعر کی روحانی تعبیر (Spiritual Interpretation) نفس کی حقیقت اور سالک کے سفر کے حوالے سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے:

1۔ نفس اور اس کے اثرات (The Ego and its Extensions)

روحانیت میں "**دیوار** "سے مراد انسان کی "**انا** "یا "**نفس** "ہے۔ انسان اپنے نفس کے زیرِ اثر جو بھی دعوے کرتا ہے، جو تکبر کرتا ہے یا جو اثر و رسوخ (سایہ) قائم کرتا ہے، وہ بظاہر کتنا ہی طویل اور طاقتور کیوں نہ لگے، اس کی حقیقت نفس سے جدا نہیں ہے۔

تعبیر : ایک سالک کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کے اعمال کی شہرت یا اثر (سایہ) اس کی اپنی ذات کی قید میں ہے۔ اگر نفس (دیوار) ٹیڑھا ہے تو سایہ کبھی سیدھا نہیں ہو سکتا۔ تزکیہِ نفس کا مقصد دیوار کو سیدھا کرنا ہے تاکہ اس کا عکس اور سایہ بھی راہِ راست پر آ جائے۔

2۔ کائنات کا عارضی پن (The Illusion of the World)

تصوف میں دنیا کو اللہ کے نور کا "**سایہ** "کہا جاتا ہے۔ سایہ اپنی ذات میں کچھ نہیں ہوتا، وہ صرف روشنی کی عدم موجودگی یا کسی مادی چیز کی رکاوٹ کا نام ہے۔

تعبیر: جس طرح دیوار کا سایہ شام ہوتے ہی دیوار میں سمٹ کر غائب ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ مادی کائنات اور ہماری ظاہری زندگی بھی ایک سایہ ہے۔ موت کا وقت قریب آتے ہی یہ سب کچھ اپنی "اصل" (خالق) کی طرف لوٹ جائے گا۔ روحانی تعبیر یہ ہے کہ سائے (دنیا) سے دل لگانے کے بجائے دیوار (اصل / حقیقت) پر توجہ دی جائے۔

3۔ رجوع الی الاصل (Return to the Source)

یہ شعر "**کُلُّ شَیۡءٍ یَرۡجِعُ اِلٰی اَصۡلِہٖ** " (ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) کی بہترین مثال ہے۔

تعبیر: انسان کی روح عالمِ ارواح سے آئی اور اسے وہیں لوٹنا ہے۔ ہم دنیا میں جتنے بھی پھیلاؤ اختیار کر لیں، ہماری منزل وہی ہے جہاں سے ہم چلے تھے۔ یہ سایہ (انسانی زندگی) کتنا ہی دراز (طویل) کیوں نہ ہو جائے، اس کا انجام "بازگشت" (واپسی) ہی ہے۔

4۔ نیت اور حال کی بازگشت

روحانیت میں مانا جاتا ہے کہ انسان کا "**حال** " (اندرونی کیفیت) اس کے گردوپیش پر اثر انداز ہوتا ہے۔

تعبیر: اگر آپ کے دل میں حسد، کینہ یا نفرت ہے، تو یہ ایک تاریک سائے کی طرح دوسروں تک پہنچے گا، لیکن صوفیا فرماتے ہیں کہ وہ تاریکی گھوم کر آپ کے اپنے ہی قلب کو مزید سیاہ کرے گی۔ اسی طرح محبت اور سکون کا سایہ پلٹ کر آپ کی اپنی روح کو سرشار کرتا ہے۔ آپ جو خوشبو پھیلاتے ہیں، اس کی مہک پہلے آپ کے اپنے ہاتھوں کو معطر کرتی ہے۔

5۔ فنائیت کا سبق

دیوار کا سایہ کتنا ہی دور کیوں نہ نکل جائے، وہ دیوار سے "آزاد" نہیں ہو سکتا۔

تعبیر: یہ انسان کی عاجزی کا مقام ہے۔ انسان کتنا ہی بڑا عالم، زاہد یا طاقتور بن جائے، وہ اپنے خالق کی گرفت اور اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس کی حیثیت ایک سائے جیسی ہے جس کا وجود سراسر اس کے مالک (روشنی اور دیوار) کا مرہونِ منت ہے۔

خلاصہ روحانیت: مولانا رومیؒ فرما رہے ہیں کہ اے انسان! تو اپنے پھیلاؤ (اعمال، خیالات، اثر و رسوخ) پر غرور نہ کر۔ یہ سب تیرے وجود کے تابع ہیں اور تیرے ساتھ ہی ختم ہونے والے ہیں۔ اپنی توجہ سائے پر نہیں، بلکہ اپنی "**اصل** " کی درستی پر رکھ، کیونکہ سایہ تو وہی بنے گا جو دیوار کی شکل ہو گی۔

این جہان کوہ است و فعِلِ مانِدا

سوئے ما آید نِداہارا صَدا

مشکل الفاظ کے معنی

جہان = دنیا۔۔۔**کوہ** = پہاڑ۔۔۔۔**فعِل** = عمل، کام۔۔۔**ندا** = آواز، پکار۔۔۔**سوئے ما** = ہماری طرف

نداہا = پکاریں، آوازیں۔۔۔**صَدا** = گونج، بازگشت

ترجمہ : یہ دنیا ایک پہاڑ کی مانند ہے اور ہمارے اعمال ایک پکار (آواز) کی طرح ہیں؛ (پھر) ان پکارتی ہوئی آوازوں کی گونج پلٹ کر ہماری ہی طرف آتی ہے۔

اس شعر میں مولانا رومیؒ نے ایک بہت ہی خوبصورت استعارہ (Metaphor) استعمال کیا ہے۔ وہ انسانی زندگی اور اس کے نتائج کو **پہاڑ اور گونج** کی مثال سے سمجھاتے ہیں:

1. **عمل اور ردِ عمل (Cause and Effect):** اگر آپ کسی پہاڑی علاقے میں کھڑے ہو کر بلند آواز سے کوئی اچھا لفظ پکاریں، تو پہاڑ وہی لفظ آپ کو واپس لوٹائے گا۔ اگر آپ گالی دیں گے، تو جواب میں گالی ہی سنائی دے گی۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ یہ کائنات بھی بالکل ایسی ہی ہے۔ آپ جو عمل کرتے ہیں، کائنات اسے محفوظ کر لیتی ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ وہی عمل اپنے نتائج کے ساتھ آپ کی زندگی میں واپس پلٹ آتا ہے۔

2. **ذمہ داری کا احساس :** اس شعر کا اصل مقصد انسان کو اس کے اعمال کے تئیں بیدار کرنا ہے۔ ہمیں اکثر شکایت ہوتی ہے کہ دنیا ہمارے ساتھ برا کر رہی ہے، لیکن رومیؒ کے مطابق ہمیں اپنی پکار (اعمال) پر غور کرنا چاہیے کیونکہ "صدا" (نتیجہ) ہمیشہ ہماری اپنی "نِدا" (عمل) کے مطابق ہوتی ہے۔

3. **کائناتی آئینہ :** دنیا ایک آئینہ یا ایک گونجنے والا پہاڑ ہے جو خود سے کچھ پیدا نہیں کرتا بلکہ صرف وہ لوٹاتا ہے جو اسے دیا جاتا ہے۔ اگر آپ دنیا میں محبت بانٹیں گے تو محبت ملے گی، اور اگر نفرت بوئیں گے تو کانٹے آپ کا مقدر بنیں گے۔

حاصلِ کلام: یہ شعر ہمیں "جیسی کرنی ویسی بھرنی" کا سبق دیتا ہے۔ اگر آپ کو اپنے حالات سے شکایت ہے، تو اپنی "نِدا" یعنی اپنے اعمال اور نیتوں کو بدل کر دیکھیں، پہاڑ سے آنے والی "صدا" خود بخود بدل جائے گی۔

مولانا رومیؒ کا یہ شعر دراصل قرآنی تصورِ "مکافاتِ عمل" اور احادیثِ مبارکہ میں بیان کردہ "جزا و سزا" کے قانون کی ایک شعری تمثیل ہے۔ قرآن و سنت میں اس فلسفے کو متعدد مقامات پر واضح کیا گیا ہے کہ انسان کا ہر عمل، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، ضائع نہیں ہوتا بلکہ اس کا عکس یا نتیجہ پلٹ کر اس تک ضرور پہنچتا ہے۔

- **احسان کا بدلہ احسان:**

هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ)سورۃ الرحمن:60(

" بھلائی کا بدلہ بھلائی کے سوا کچھ اور ہے؟ " یہ آیت رومی کے شعر کی اصل روح ہے کہ اگر آپ پہاڑ (کائنات) میں "نیکی" کی صدا بلند کریں گے تو جواب میں "نیکی" ہی پلٹ کر آئے گی۔

- **عمل کے وزن کا حساب:**

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ)سورۃ الزلزال:7-8(

" پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ "یہ آیت اس "گونج" کی حقیقت بیان کرتی ہے کہ کوئی بھی عمل کائنات کی وسعتوں میں کھو نہیں جاتا۔

- **نفع و نقصان کا اپنا ذمہ:**

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا)سورۃ فصلت:46(

" جو کوئی نیک کام کرتا ہے تو اپنے ہی نفع کے لیے کرتا ہے، اور جو برائی کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہے۔"

2. سنتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

احادیثِ مبارکہ میں اس فلسفے کو انسانی تعلقات اور معاشرتی رویوں کے تناظر میں سمجھایا گیا ہے:

- **جیسا کروگے ویسا بھروگے:** نبی کریم ﷺ کا مشہور فرمان ہے (جسے ایک ضابطہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے):

" قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: البِرُّ لا يَبْلَى، وَالإِثْمُ لا يُنْسَى، وَالدَّيَّانُ لا يَمُوتُ، فَكُنْ كَمَا شِئْتَ، كَمَا تَدِينُ تُدَانُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیکی کبھی ختم نہیں ہوتی، گناہ کبھی نہیں بھولتا، اور قاضی کبھی نہیں مرتا۔ لہٰذا جیسا چاہو رہو، کیونکہ جیسا تم فیصلہ کرو، ویسا ہی تمہارا فیصلہ کیا جائے گا۔ قال الحافظ ابن حجر "فتح الباري"(13/466): "مرسل، ورجاله ثقات" انتهى

رومی کی "صدا" اور "ندا" کی مثال اسی حدیث کا شعری ترجمہ ہے۔

- **رحم کا بدلہ رحم:**

" حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي عُمَرَ، حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ، عَنْ أَبِي قَابُوسَ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ، ارْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ، الرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمَنِ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلَهُ اللَّهُ، وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعَهُ اللَّهُ "، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.

- عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”رحم کرنے والوں پر رحمن رحم کرتا ہے، تم لوگ زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا، رحم رحمن سے مشتق (نکلا) ہے، جس نے اس کو جوڑا اللہ اس کو (اپنی رحمت سے) جوڑے گا اور جس نے اس کو توڑا اللہ اس کو اپنی رحمت سے کاٹ دے گا“۔

- امام ترمذی کہتے ہیں:

- یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[سنن ترمذي/كتاب البر والصلة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم/حدیث: 1924] **آسانی کا بدلہ آسانی:**

حَدَّثَنَا مَحْمُودُ بْنُ غَيْلَانَ، حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ، حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ نَفَّسَ عَنْ أَخِيهِ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ، وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا قَعَدَ قَوْمٌ فِي مَسْجِدٍ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ

السَّكِينَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَمَنْ أَبْطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ "، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَكَذَا رَوَى غَيْرُ وَاحِدٍ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ هَذَا الْحَدِيثِ، وَرَوَى أَسْبَاطُ بْنُ مُحَمَّدٍ، عَنِ الْأَعْمَشِ، قَالَ: حُدِّثْتُ عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ بَعْضَ هَذَا الْحَدِيثِ)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے اپنے بھائی کی کوئی دنیاوی مصیبت دور کی تو اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کے دن کوئی نہ کوئی مصیبت دور فرمائے گا۔ اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی۔ تو اللہ اس کی دنیاو آخرت میں پردہ پوشی کرے گا، اور جس نے کسی تنگ دست کے ساتھ آسانی کی، تو اللہ تعالیٰ دنیاو آخرت میں اس کے لیے آسانی پیدا فرمائے گا۔ اللہ اپنے بندے کی مدد میں ہوتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے، اور جو ایسی راہ چلتا ہے جس میں اسے علم کی تلاش ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ ہموار کر دیتا ہے اور جب قوم (لوگ) مسجد میں بیٹھ کر کلام اللہ (قرآن) کی تلاوت کرتے ہیں اور اسے پڑھتے پڑھاتے (سمجھتے سمجھاتے) ہیں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے، انہیں رحمت الٰہی ڈھانپ لیتی ہے۔ ملائکہ انہیں اپنے گھیرے میں لیے رہتے ہیں، جس کے عمل نے اسے پیچھے کر دیا تو آخرت میں اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔ ترمذي / كتاب القراءات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم / حديث:2945[

خلاصہ

رومیؒ کے نزدیک دنیا ایک **"کاسہ نما "** یا **"پہاڑی "** نظام ہے جہاں کوئی عمل تنہا نہیں رہتا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کے حکم سے ایک ریکارڈنگ مشین اور ایک آئینے کی طرح کام کر رہا ہے۔

- اگر آپ کی زندگی میں "کڑواہٹ" کی گونج آ رہی ہے، تو قرآن و سنت کی روشنی میں آپ کو اپنی "پکار" (اپنے اعمال اور اخلاق) کا جائزہ لینا چاہیے۔

- **تصوف کا نچوڑ:** رومی اس شعر سے یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ وہ سلوک کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو، کیونکہ کائنات وہی تمہاری طرف لوٹا رہی ہے۔

رومیؒ کے اس شعر کی روحانی تعبیر محض "بدلے" یا "انتقام" تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ **تصوف اور معرفت** کے گہرے سمندر کی عکاسی کرتی ہے۔ صوفیا کے نزدیک اس کی روحانی جہتیں درج ذیل ہیں:

1. کائنات بطور آئینہ (تجلیاتِ الٰہی)

روحانی نقطہ نظر سے یہ دنیا ایک "آئینہ خانہ" ہے۔ حق تعالیٰ کی صفات ہر شے میں جلوہ گر ہیں۔ جب انسان کائنات میں محبت، رحم اور عدل کا بیج بوتا ہے یا ایسی "نِدا" (پکار) دیتا ہے، تو دراصل وہ اپنے اندر موجود الٰہی صفات کو بیدار کر رہا ہوتا ہے۔ پہاڑ (کائنات) سے آنے والی "صدا" اس کے اپنے ہی باطن کا عکس ہوتی ہے جو اسے قربِ الٰہی کی صورت میں محسوس ہوتی ہے۔

2. عالمِ باطن اور بازگشت

رومیؒ یہاں "کوہ" (پہاڑ) سے مراد انسان کا اپنا **نفس اور قلب** بھی لیتے ہیں۔

- اگر آپ کے قلب میں کینہ، حسد یا غصہ ہے، تو باہر کی دنیا آپ کو ویسی ہی نظر آئے گی اور ویسے ہی تجربات آپ کی طرف لوٹیں گے۔
- روحانیت میں "جیسا خیال، ویسا حال" کا قاعدہ چلتا ہے۔ اگر آپ کی روح پاکیزہ ہے تو کائنات کی ہر صدا آپ کے لیے ربانی پیغام بن جائے گی۔

3. فنا اور بقا کا فلسفہ

اس شعر کی ایک لطیف تعبیر یہ ہے کہ انسان کا "فعل" (عمل) فانی ہے، لیکن اس کا "اثر" (صدا) باقی رہتا ہے۔ روحانی مسافر (سالک) کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ تمہارا ہر سانس اور ہر ارادہ کائنات کے وسیع ریکارڈ میں محفوظ ہو رہا ہے۔ پہاڑ کی خاموشی یہ بتاتی ہے کہ وہ "سن" رہا ہے۔ جب سالک "اللہ" کی صدا بلند کرتا ہے، تو کائنات کا ذرہ ذرہ اسے اللہ ہی کی طرف بلاتا محسوس ہوتا ہے۔

4. نیت کی مرکزیت

روحانیت میں "نِدا" صرف زبان کی آواز نہیں، بلکہ **نیت کی گہرائی** ہے۔

اگر ایک شخص ظاہری طور پر اچھا عمل کرے لیکن نیت میں دکھاوا ہو، تو پہاڑ سے آنے والی گونج میں اسے وہ سکون نہیں ملے گا جو خلوصِ نیت سے ملتا ہے۔

پہاڑ صرف آواز نہیں لوٹاتا، بلکہ اس کی "تھرتھراہٹ (Vibration) " بھی لوٹاتا ہے۔ آپ کی روح جس فریکوئنسی پر کائنات سے مخاطب ہوگی، غیب سے جواب بھی اسی معیار کا آئے گا۔

5. خود آگاہی (Self-Awareness)

اس شعر کی سب سے بڑی روحانی تعبیر "**احتسابِ نفس** "ہے۔

- اگر آپ کو دنیا سے شکایت ہے کہ لوگ برے ہیں یا حالات تلخ ہیں، تو رومیؒ کہتے ہیں کہ باہر مت دیکھو، بلکہ اپنی "نِدا" چیک کرو۔
- شکوہ کرنے کے بجائے اپنی پکار بدل لیں۔ جب آپ اپنی فکر اور عمل کی سمت درست کر لیتے ہیں، تو کائنات کا وہ "پہاڑ" جو پہلے تلخ گونج دے رہا تھا، اچانک میٹھے نغمے الاپنے لگتا ہے۔

حاصلِ کلام: روحانی طور پر یہ شعر ایک "**کائناتی بومرینگ** (Cosmic Boomerang) "کا تصور دیتا ہے۔ کائنات ایک زندہ حقیقت ہے جو آپ کے ہر ارادے کو محسوس کرتی ہے اور اسے ضرب دے کر آپ کی طرف واپس بھیج دیتی ہے۔ اس لیے ایک صوفی ہمیشہ خاموشی اور مثبت فکر کو ترجیح دیتا ہے تا کہ اس کی طرف لوٹنے والی "صدا" بھی پر امن ہو۔

این بِگُفت و رفت در دَم زیرِ خاک
آن کَنیزک شد زِ عشق و رنجْ پاک

مشکل الفاظ کے معنی

این بگفت: یہ کہہ کر۔۔۔۔ در دَم: فوراً، اسی لمحے۔۔۔۔ زیرِ خاک: مٹی کے نیچے، قبر میں، وفات پا جانا۔۔۔۔ کنیزک: لونڈی، باندی۔۔۔۔ رنج: غم، تکلیف۔۔۔۔ پاک شدن: پاک ہو جانا، نجات پانا

ترجمہ

"یہ (بات) کہی اور وہ فوراً مٹی کے نیچے چلا گیا (مر گیا)؛ اور وہ کنیز (اس کے مرتے ہی) عشق اور رنج سے پاک ہو گئی۔"

مولانا روم اس قصے کے ذریعے ایک بہت بڑا نفسیاتی اور روحانی نکتہ سمجھا رہے ہیں۔ اس شعر کے پس منظر اور معنی کو درج ذیل نکات میں سمجھا جا سکتا ہے:

1۔ **عشقِ مجازی کا زوال :** جس سنار (زرگر) پر کنیز عاشق تھی، حکیم نے اسے ایسی دوا دی تھی کہ اس کا حسن و جمال ختم ہو گیا اور وہ دبلا ہو کر بدصورت ہو گیا۔ جب کنیز نے دیکھا کہ جس خوبصورتی پر وہ فدا تھی، وہ تو ڈھل گئی، تو اس کا وہ مادی عشق بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس شعر میں سنار کی موت کا ذکر ہے، جو دراصل اس **فانی سہارے** کے خاتمے کی علامت ہے جس پر کنیز کا دل اٹکا ہوا تھا۔

2۔ **رنج اور بیماری سے نجات :** کنیز کی بیماری دراصل جسمانی نہیں بلکہ "عشق کی بیماری" تھی۔ جیسے ہی وہ سنار (محبوبِ فانی) دنیا سے گیا، کنیز کی توجہ اس سے ہٹ گئی۔ مولانا کہتے ہیں کہ وہ "پاک" ہو گئی—یعنی اس کے دل سے وہ لایعنی اور عارضی رغبت ختم ہو گئی جس نے اسے بیمار کر رکھا تھا۔

3۔ **صوفیانہ نکتہ (تزکیہ) :** روحانی اعتبار سے "پاک" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کے دل سے دنیاوی بت اور عارضی محبتیں نکل جاتی ہیں، تو روح بیدار ہوتی ہے۔ کنیز کا رنج اس لیے ختم ہوا کیونکہ اس کا تعلق ایک ایسی چیز سے ٹوٹ گیا جو بدلنے والی تھی (موت)۔ اب وہ الٰہی محبت یا حقیقتِ مطلق کی طرف متوجہ ہونے کے لیے تیار تھی۔

حاصلِ کلام:

مولانا روم یہاں یہ سبق دے رہے ہیں کہ جو عشق محض رنگ و روپ یا مادی فوائد پر مبنی ہوتا ہے، وہ محبوب کے زوال کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقی سکون اور "پاکیزگی" تبھی ملتی ہے جب انسان فنا ہونے والی چیزوں سے دل لگانا چھوڑ کر ذاتِ باری تعالیٰ سے لو لگاتا ہے۔

مثنویِ رومی کا یہ واقعہ (بادشاہ، کنیز اور زرگر) اخلاقی اور فلسفیانہ لحاظ سے ہمیشہ سے زیرِ بحث رہا ہے۔ بظاہر ایک انسان (زرگر) کو زہر دے کر مار دینا ایک ظالمانہ اور غیر اخلاقی فعل نظر آتا ہے، لیکن مولانا روم نے خود اس اعتراض کا جواب مثنوی میں دیا ہے۔

اس عمل کو پرکھنے کے لیے دو مختلف زاویہ ہائے نظر موجود ہیں:

ا. ظاہری یا قانونی نقطہ نظر (Conventional Morality)

اگر ہم اسے ایک عام انسانی واقعے کے طور پر دیکھیں، تو یہ عمل سراسر **غلط اور سنگدلانہ** معلوم ہوتا ہے۔

- کسی کی جان لینا صرف اس لیے کہ دوسرے کی محبت ختم ہو جائے، انسانی اخلاقیات کے منافی ہے۔
- زرگر بے قصور تھا، اسے دھوکے سے بلایا گیا اور پھر آہستہ آہستہ موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔

۲. صوفیانہ اور تمثیلی نقطہ نظر (Rumi's Justification)

مولانا روم نے اس واقعے کو ایک **تمثیل** (Allegory) کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کے اخلاقی جواز کے چند اہم نکات یہ ہیں:

- **خضر کا عمل (حکمتِ الٰہی):** مولانا روم اس طبیب (حکیم) کے فعل کو حضرت خضر علیہ السلام کے اس عمل سے تشبیہ دیتے ہیں جب انہوں نے ایک بظاہر بے گناہ بچے کو اللہ کے حکم سے قتل کر دیا تھا (سورہ کہف کا قصہ)۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ طبیب "خدا کا بندہ" تھا اور اس نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ الہامِ الٰہی سے یہ کام کیا۔
- **عشقِ مجازی کا خاتمہ:** یہاں "زرگر" دنیاوی لذتوں اور ظاہری خوبصورتی کی علامت ہے۔ "کنیز" انسانی روح ہے جو دنیاوی مادی چیزوں کی محبت میں بیمار ہے۔ روح کو حقیقی سکون (عشقِ حقیقی) تبھی مل سکتا ہے جب وہ مادی اور فانی سہارے (زرگر) کے چنگل سے آزاد ہو۔
- **بڑی خیر کے لیے چھوٹی قربانی:** صوفیا کے نزدیک روح کی نجات، جسمانی زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ زرگر کی موت دراصل انسان کے "نفس" یا "دنیاوی لگاؤ" کی موت ہے، تاکہ روح اللہ کی طرف لوٹ سکے۔

مولانا روم کا اپنا دفاع

مولانا مثنوی میں فرماتے ہیں:

"اس نے (حکیم نے) اسے بادشاہ کے خوف یا انعام کے لالچ میں قتل نہیں کیا، بلکہ اس کا حکم حق تعالیٰ کی طرف سے تھا۔"

وہ مزید واضح کرتے ہیں کہ جیسے ایک سرجری کرنے والا ڈاکٹر کسی کا عضو کاٹ دیتا ہے تاکہ پورا جسم بچ جائے، اسی طرح اس حکیم نے روحانی بقا کے لیے یہ قدم اٹھایا۔

خلاصہ : اخلاقی لحاظ سے یہ عمل **"عام انسانی اخلاقیات "** پر پورا نہیں اترتا، بلکہ یہ **"ماورائی حکمت (Transcendental Ethics)"** کے زمرے میں آتا ہے۔ مولانا روم کا مقصد قتل و غارت کی تعلیم دینا نہیں، بلکہ یہ سمجھانا ہے کہ جب تک انسان فانی چیزوں (زرگر) کی محبت کو اپنے اندر نہیں مارتا، وہ حقیقی معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔

مولانا روم کی مثنوی کے اس واقعے اور خاص طور پر اس شعر کی تشریح جب ہم **قرآن و سنت** کی روشنی میں کرتے ہیں، تو یہ مسئلہ "ظاہری قانون" (شریعت) اور "باطنی حقیقت" (حکمت) کے درمیان ایک گہرے تعلق کو واضح کرتا ہے۔

مولانا روم نے اس بظاہر سنگدلانہ عمل (زرگر کے قتل) کو قرآنی اصولوں کی بنیاد پر ہی جائز قرار دیا ہے۔ ذیل میں اس کی مفصل تشریح پیش ہے:

۱. قصہ خضرؑ و موسیٰؑ کا حوالہ (حکمتِ الٰہی)

قرآن کریم کی **سورہ کہف** میں حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اس واقعے کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ حضرت خضرؑ نے ایک بظاہر بے گناہ بچے کو قتل کر دیا تھا، جس پر حضرت موسیٰؑ (جو شریعتِ ظاہری کے علمبردار تھے) پکار اٹھے:

"أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ" (کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی بدلے کے قتل کر دیا؟) — **الکہف:۷۴**

لیکن بعد میں حضرت خضرؑ نے واضح کیا کہ یہ عمل اللہ کے حکم اور ایک بڑی مصلحت (والدین کے ایمان کی حفاظت) کے تحت تھا:

"وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي" (اور میں نے یہ اپنی مرضی سے نہیں کیا) — **الکہف:۸۲**

مولانا روم کے مطابق، مثنوی کا وہ حکیم دراصل **"خضرِ وقت "** تھا، جس نے انسانی خواہش کی بنیاد پر نہیں بلکہ الہامِ الٰہی کے تحت اس "فاسد عضو" (زرگر کی محبت جو شرکِ خفی بن چکی تھی) کو کاٹ پھینکا تاکہ روح (کنیز) کو بچایا جا سکے۔

۲. دنیا کی بے ثباتی اور دھوکہ (متاعِ غرور)

شعر میں ذکر ہے کہ زرگر کے مرتے ہی کنیز "پاک" ہو گئی۔ یہ قرآن کے اس فلسفے کی عکاسی ہے کہ دنیا کی ظاہری خوبصورتی ایک دھوکہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ" (اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے) — **آل عمران:۱۸۵**

حدیثِ نبوی ﷺ ہے" :

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَاتِمٍ الْمُكْتِبُ، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ ثَابِتٍ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ ثَابِتِ بْنِ ثَوْبَانَ، قَال: سَمِعْتُ عَطَاءَ بْنَ قُرَّةَ، قَال، سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ ضَمْرَةَ، قَال: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ، يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: " أَلَا إِنَّ الدُّنْيَا مَلْعُونَةٌ، مَلْعُونٌ مَا فِيهَا إِلَّا ذِكْرُ اللَّهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِمٌ أَوْ مُتَعَلِّمٌ "، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا” : بیشک دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون ہے، سوائے اللہ کی یاد اور اس چیز کے جس کو اللہ پسند کرتا ہے، یا عالم (علم والے) اور متعلم (علم سیکھنے والے) کے “[۱]۔

امام ترمذی کہتے ہیں:

یہ حدیث حسن غریب ہے۔]سنن ترمذي / كتاب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم / حدیث: 2322[

"...(ترمذی)۔ جب زرگر (جو دنیاوی حسن کی علامت تھا) فنا ہو گیا، تو کنیز کا دل اس "متاعِ غرور" سے پاک ہو گیا اور اسے ادراک ہوا کہ وہ ایک ڈھلتی ہوئی پرچھائیں سے لو لگائے بیٹھی تھی۔

۳. تزکیہ نفس (پاکیزگی کا مفہوم)

شعر کا دوسرا مصرعہ **"آن کنیزک شد ز عشق و رنج پاک "** قرآن کے اس تصور کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے "تزکیہ" کہا جاتا ہے:

"قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا" (بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے نفس کو پاک کر لیا) — **الشمس:۹**

جب تک انسان کے دل میں غیر اللہ کی محبت (عشقِ مجازی) بت بن کر بیٹھی رہتی ہے، وہ روحانی امراض میں مبتلا رہتا ہے۔ زرگر کی موت دراصل اس **"بت "** کا پاش پاش ہونا تھا، جس کے بعد کنیز کی روح کو حقیقی شفا ملی۔

۴. موت سے پہلے موت (موتوا قبل ان تموتوا)

صوفیا اس واقعے کو ایک مشہور (اگرچہ بعض محدثین کے نزدیک معناً صحیح) روایت کی روشنی میں دیکھتے ہیں " **مُوتُوا قَبْلَ أَنْ تَمُوتُوا** "(مرنے سے پہلے مر جاؤ)۔ یہاں زرگر کا مرنا اس بات کی تمثیل ہے کہ جب انسان کی دنیاوی خواہشات مر جاتی ہیں، تبھی اسے وہ زندگی ملتی ہے جو رنج اور غم سے پاک ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام

قرآن و سنت کی روشنی میں اس عمل کی اخلاقی حیثیت درج ذیل نکات میں سموئی جا سکتی ہے:

1. **بڑی خیر کے لیے چھوٹی قربانی :** فقہی قاعدہ ہے کہ "بڑے نقصان کو ٹالنے کے لیے چھوٹا نقصان برداشت کیا جا سکتا ہے"۔ روح کی دائمی ہلاکت سے بچانے کے لیے ایک فانی جسم کی قربانی دی گئی۔
2. **محبوبِ حقیقی کی غیرت :** اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں کسی شریک کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ قتل دراصل اس پردے کو ہٹانا تھا جو بندے اور رب کے درمیان حائل تھا۔
3. **تسلیم و رضا :** یہ واقعہ سکھاتا ہے کہ اللہ کے کچھ فیصلے بظاہر "شر" نظر آتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے "خیرِ کثیر" چھپی ہوتی ہے۔

مولانا روم کا مقصود کسی انسان کو قتل کرنے کی ترغیب دینا نہیں، بلکہ یہ بتانا ہے کہ **"اے انسان! تیرا زرگر (تیری دنیاوی تڑپ) تجھے رب سے دور کر رہا ہے، اسے اپنے اندر مار دے تاکہ تو پاک ہو جائے"۔**

مولانا روم کے اس تمثیلی واقعے کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے مزید قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ ایک جامع فریم ورک فراہم کرتی ہیں۔ یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ یہاں "زرگر" محض ایک انسان نہیں بلکہ **"غیر اللہ کی محبت "** اور **"دنیاوی فریب "** کا استعارہ ہے۔

اس کی مزید وضاحت درج ذیل آیات و احادیث سے ہوتی ہے:

ا۔ دنیاوی زینت کی حقیقت (The Illusion of Beauty)

زرگر کا حسن دوا کے ذریعے زائل کیا گیا تاکہ کنیز اس سے بیزار ہو جائے۔ قرآن کریم اسی حقیقت کو یوں بیان فرماتا ہے:

"إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا * وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا" "جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اسے زمین کی زینت بنایا تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے؛ اور (یاد رکھو) جو کچھ اس پر ہے ہم اسے (ایک دن) بنجر میدان (مٹی) بنا دینے والے ہیں۔) "**الکہف:۸-۷**(

ربط: مولانا روم دکھاتے ہیں کہ جس "زرگری حسن" پر کنیز فدا تھی، وہ وہی "صَعِیدًا جُرُزًا" (بنجر مٹی) تھا جسے ہمیشگی نہیں تھی۔ جب وہ مٹی ظاہر ہوگئی تو روح کی بیماری ختم ہوگئی۔

۲۔ اللہ کی "غیرت (Divine Jealousy)"

تصوف میں یہ واقعہ "غیرتِ الٰہی" کی ایک مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ مومن کے دل میں اس کے علاوہ کوئی اور مستقل قیام کرے۔ حدیثِ قدسی اور نبوی میں اس کا ذکر ملتا ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**إِنَّ اللَّهَ يَغَارُ، وَغَيْرَةُ اللَّهِ أَنْ يَأْتِيَ الْمُؤْمِنُ مَا حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ**" "بے شک اللہ غیرت فرماتا ہے، اور اللہ کی غیرت یہ ہے کہ مومن وہ کام کرے جو اللہ نے اس پر حرام کیا ہے۔) "**صحیح بخاری**(

تشریح: کنیز (روح) کا میلان ایک فانی انسان کی طرف اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ اسے اپنے حقیقی مالک (بادشاہ / روحانی حقیقت) سے غافل کر رہا تھا۔ چنانچہ اللہ کی غیرت نے اس "حجاب" (زرگر) کو درمیان سے ہٹا دیا۔

۳۔ آزمائش اور جان کا زیاں (Trial and Loss)

بظاہر زرگر کی جان جانا ایک بڑا سانحہ ہے، لیکن قرآن اسے آزمائش کے ایک وسیع تناظر میں دیکھتا ہے:

"**وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ**" "اور ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر، بھوک اور مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے؛ اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنادیں۔) "**البقرہ:۱۵۵**(

ربط: یہاں "نقصِ انفس" (جان کی کمی) کا مقصد کنیز کی تربیت اور اسے صبر و استقامت کے ذریعے بلندی تک پہنچانا تھا۔

۴۔ دنیاوی محبت کا انجام(End of Worldly Attachment)

نبی کریم ﷺ کا ایک مشہور فرمان اس پوری صورتحال کی عکاسی کرتا ہے:

"أَحْبِبْ مَنْ شِئْتَ فَإِنَّكَ مُفَارِقُهُ" "جس سے چاہو محبت کر لو، بہرحال تم نے ایک دن اس سے جدا ہونا ہے۔) "**طبرانی/حاکم**(

تشریح : کنیز کا رنج اس لیے ختم ہوا کیونکہ اسے سمجھ آگئی کہ وہ جس سے لو لگائے بیٹھی تھی، وہ جدائی (موت) کے قانون سے آزاد نہیں تھا۔ جب وہ "مفارق" (جدا کرنے والا) آگیا، تو اس کا رنج حقیقت پسندی میں بدل گیا۔

۵۔ قلب کی صفائی(Purification of the Heart)

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ * إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ" "جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے؛ مگر وہ جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم (پاک دل) لے کر آیا۔) "**الشعراء:۸۹-۸۸**(

ربط : مولانا روم کے شعر میں "پاک" ہونے کا مطلب یہی ہے کہ کنیز کا دل "غیر اللہ" کی آمیزش سے صاف ہو کر "قلبِ سلیم" بن گیا، جو معرفتِ الٰہی کے حصول کی پہلی شرط ہے۔

خلاصہ

اگرچہ شریعتِ ظاہری میں انسانی جان کی حرمت مقدم ہے، لیکن **مثنوی** کے اس مقام پر مولانا کا مقصود ایک **باطنی جراحی (Spiritual Surgery)** دکھانا ہے۔ جس طرح ایک جراح (Surgeon) گلے سڑے عضو کو کاٹ دیتا ہے تاکہ پوری جان بچ جائے، اسی طرح اس حکیم (جو اللہ کا نمائندہ تھا) نے اس تعلق کو کاٹ دیا جس نے روح کو مفلوج کر رکھا تھا۔

یہ عمل "ظلم" نہیں بلکہ "جلالِ الٰہی" کا وہ مظہر ہے جو "جمالِ ابدی" کی راہ ہموار کرتا ہے۔

زان کہ عشقِ مُردگانُ پایَندہ نیست
زان کہ مُردہ سویِ ما آیندہ نیست

مشکل الفاظ کے معنیٰ:

زان کہ :اس لیے کہ، کیونکہ۔۔۔۔**عشقِ مُردگان** :مُردوں کی محبت۔۔۔۔**پایَندہ** :باقی رہنے والی، قائم رہنے والی

مُردہ :مردہ۔۔۔۔۔**سویِ ما** :ہماری طرف۔۔۔۔۔**آیندہ** : آنے والا

ترجمہ:

"اس لیے کہ مُردوں کی محبت پائیدار نہیں ہوتی، کیونکہ مردہ ہماری طرف واپس آنے والا نہیں ہوتا۔"

ان ابیات میں مولانا رومؒ ایک گہری نفسیاتی اور روحانی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ ان کا اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کو اپنا دل کس سے لگانا چاہیے۔

- **مجازی عشق کی بے ثباتی** : دنیا کی ہر وہ چیز جو زوال پذیر ہے، اسے مولانا نے "مردہ" قرار دیا ہے۔ چاہے وہ حسن ہو، دولت ہو یا جاہ و حشم۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر تم ایسی چیزوں سے محبت کرو گے جو خود فنا ہونے والی ہیں، تو تمہارا عشق بھی ان کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا اور بدلے میں تمہیں صرف دکھ اور حسرت ملے گی۔
- **مردہ سے مراد** : یہاں "مردہ" سے مراد صرف وہ نہیں جو قبر میں جا چکا ہو، بلکہ ہر وہ شے ہے جو تغیر پذیر ہے (جسے زوال ہے)۔ جو شے آج خوبصورت ہے اور کل مرجھا جائے گی، وہ درحقیقت "مردہ" ہی ہے کیونکہ اس کی بقا مستقل نہیں ہے۔
- **واپسی کا امکان نہیں** : دوسرے مصرعے میں مولانا فرماتے ہیں کہ جب وہ فانی محبوب یا مادی شے ایک بار چھن جائے یا ختم ہو جائے، تو وہ دوبارہ کبھی اسی حالت میں واپس نہیں آتی۔ اس کے برعکس، مولانا اس سے اگلے اشعار میں فرماتے ہیں کہ **عشقِ زندہ** (اللہ کا عشق) اختیار کرو، کیونکہ وہ "حی و قیوم" ہے اور اس کی محبت کبھی ادھورا نہیں چھوڑتی۔

حاصلِ کلام: یہ شعر انسان کو نصیحت کرتا ہے کہ اپنی محبت کا مرکز اس ذات (اللہ) کو بناؤ جو ہمیشہ رہنے والی ہے، تاکہ تمہارا سکون اور تمہاری محبت بھی "پائندہ" (ہمیشہ رہنے والی) ہو جائے۔

مولانا روم کے ان اشعار کی بنیاد مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کے اس جوہر پر ہے جسے **"زہد"** اور **"محبتِ الٰہی"** کہا جاتا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں ان اشعار کی جامع تشریح درج ذیل ہے:

۱. کائنات کی فنائیت اور اللہ کی بقا

مولانا کا پہلا مصرع **"عشقِ مُردگان پائندہ نیست"** براہِ راست قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ "ہر وہ چیز جو زمین پر ہے، فنا ہونے والی ہے، اور صرف تیرے رب کی ذات جو صاحبِ جلال اور صاحبِ اکرام ہے، باقی رہے گی۔" (سورۃ الرحمٰن: ۲۷-۲۶)

تشریح: قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کے علاوہ ہر شے (مسیویٰ اللہ) فانی ہے۔ جب محبوب خود فانی ہے، تو اس سے وابستہ محبت پائیدار کیسے ہو سکتی ہے؟ جس طرح دیوار گر جائے تو اس پر بنی تصویر بھی مٹ جاتی ہے، اسی طرح جب مادی محبوب فنا ہوتا ہے تو اس کا عشق انسان کے لیے سوائے دکھ اور حسرت کے کچھ نہیں چھوڑتا۔

۲. دنیا کی حقیقت (متاعِ غرور)

مولانا نے فانی چیزوں کو "مردہ" قرار دیا ہے۔ حدیثِ نبوی ﷺ میں دنیا کی حقیقت کو ایک مردار جانور سے تشبیہ دی گئی ہے۔

- **حدیثِ مبارکہ:** نبی کریم ﷺ ایک بازار سے گزرے جہاں ایک کان کٹا ہوا بکری کا مردہ بچہ پڑا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم میں سے کوئی اسے ایک درہم میں لینا چاہے گا؟ صحابہ نے عرض کیا: "ہم اسے کسی قیمت پر نہیں لینا چاہتے۔" آپ ﷺ نے فرمایا:

"خدا کی قسم! اللہ کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ ذلیل ہے جتنا یہ تمہارے نزدیک ذلیل ہے۔)" صحیح مسلم(

تشریح: مولانا روم اسی نبوی بصیرت کے تحت فرماتے ہیں کہ جو چیز آج ہے اور کل نہیں ہو گی، وہ حقیقت میں "مردہ" ہی ہے۔ ایسی چیز سے دل لگانا اپنی روح کو اذیت میں ڈالنا ہے۔

۳. لوٹ کر نہ آنے کا فلسفہ

دوسرا مصرع "**مردہ سوئے ما آیندہ نیست**" اس قرآنی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کی مہلت اور یہاں کی اشیاء ایک بار گزر جائیں تو دوبارہ حاصل نہیں ہوتیں۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا" ...

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آنے لگتی ہے تو کہتا ہے: اے میرے رب! مجھے واپس بھیج دے تاکہ میں اس دنیا میں جسے میں چھوڑ آیا ہوں، نیک عمل کروں۔ ہرگز نہیں! یہ تو ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے۔" (سورۃ المومنون: ۱۰۰-۹۹)

تشریح: مادی لذتیں اور فانی محبوب جب ایک بار ہاتھ سے نکل جاتے ہیں، تو وہ دوبارہ زندگی کا سکون بن کر واپس نہیں آتے۔ وہ محض ایک یاد بن کر تڑپاتے ہیں۔ سنتِ نبوی ﷺ ہمیں سکھاتی ہے کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے کوئی **مسافر یا راہگیر** (صحیح بخاری)۔ مسافر راستے کے درختوں سے دل نہیں لگاتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ یہ پیچھے چھوٹ جائیں گے۔

۴. عشقِ حقیقی کی دعوت (عشقِ زندہ)

ان اشعار کے فوراً بعد مولانا فرماتے ہیں کہ اس کے بجائے اس سے عشق کرو جو "حی و جاوید" ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ" اور اس زندہ (ذات) پر بھروسہ کرو جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔" (سورۃ الفرقان: ۵۸)

حدیثِ قدسی میں ہے:

"بندہ جب میری طرف ایک بالشت قریب آتا ہے، میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں"...

خلاصۂ تشریح: قرآن و سنت کی روشنی میں مولانا روم کا پیغام یہ ہے کہ:

1. **ناپائیدار محبت:** مادی اشیاء (دولت، حسن، عہدہ) سے عشق انسان کو مایوسی دیتا ہے کیونکہ یہ چیزیں خود "مردہ" اور زوال پذیر ہیں۔

2. **پائیدار محبت:** اصل محبت صرف اللہ کی ذات سے ہے، کیونکہ وہی "الباقی" ہے اور اس کی محبت کا جواب ہمیشہ ملتا ہے اور وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔

ان اشعار کی **روحانی اور عرفانی تعبیر** تصوف کے اس بنیادی نظریے پر قائم ہے جس میں "ہستی (Existence)" اور "نیستی (Non-existence)" کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ صوفیانہ نقطہ نظر سے اس کی گہرائی درج ذیل نکات میں پوشیدہ ہے:

۱ . "مُردہ" کا صوفیانہ تصور (عدم اور ہستی کا فرق)

عارفین کے نزدیک "مردہ" سے مراد محض وہ جسم نہیں جس سے روح نکل گئی ہو، بلکہ **"ماسوی اللہ"** (اللہ کے سوا ہر چیز) مردہ ہے۔

- **تعبیر:** صوفیاء فرماتے ہیں کہ کائنات کی ہر شے کا وجود "اعتباری" یا "عارضی" ہے۔ چونکہ کائنات کی اشیاء اپنی ذات میں قائم نہیں بلکہ اللہ کے نور سے ظاہر ہیں، اس لیے وہ اپنی اصل میں "نیست" (کچھ نہیں) ہیں۔
- **عرفانی نکتہ:** جو خود اپنی بقا کے لیے دوسرے کا محتاج ہو، وہ "زندہ" کہلانے کا حقدار نہیں۔ پس، فانی چیزوں سے دل لگانا ایسا ہی ہے جیسے کسی ڈوبتے ہوئے سائے سے سہارا لینا۔

۲ . تجلیاتِ الٰہیہ اور تغیرِ عالم

دوسرے مصرعے میں **"سوئِ ما آیندہ نیست"** (ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئے گا) ایک بہت بڑے عرفانی راز کی طرف اشارہ ہے۔

- **تجدیدِ امثال (Renewal of Likenesses):** عرفانِ الٰہی میں یہ مانا جاتا ہے کہ اللہ کی تجلی ہر لمحہ نئی ہوتی ہے۔ جو لمحہ گزر گیا، وہ کبھی واپس نہیں آتا۔ مادی محبوب کا حسن، جوانی اور رعنائی ہر پل بدل رہی ہے۔
- **تعبیر:** اگر آپ کسی مادی شے کے ایک خاص لمحے کے حسن سے عشق کرتے ہیں، تو وہ لمحہ تو گزر گیا اور دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔ گویا وہ "حسن" مر گیا اور اب وہ واپس نہیں پلٹے گا۔ اس کے برعکس، اللہ کی ذات "حی و جاوید" ہے، اس کا عشق ہر لمحہ نئی اور دائمی زندگی عطا کرتا ہے۔

۳. عشقِ مجازی بطورِ "راہ" نہ کہ "منزل"

مولانا روم یہاں عشقِ مجازی کی نفی نہیں کر رہے، بلکہ اس پر **جم جانے** (Stagnation) کی نفی کر رہے ہیں۔

- **تعبیر:** ایک عارف کے لیے مادی خوبصورتی اللہ کے حسن کا "عکس" ہے۔ اگر کوئی شخص آئینے میں نظر آنے والے عکس سے عشق کرنے لگے اور آئینے کے پیچھے چھپی اصل ہستی (اللہ) کو بھول جائے، تو وہ خسارے میں ہے۔

- **عرفانی نکتہ:** جب عکس بدل جائے یا آئینہ ٹوٹ جائے (یعنی محبوب مر جائے یا حسن ڈھل جائے)، تو وہ شخص ٹوٹ جاتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ عکس (مردہ) کے پیچھے نہ بھاگو بلکہ اصل (حی) کو پکڑو۔

۴. دل کا "قبلہ" درست کرنا

روحانیت میں دل کو "عرشِ الٰہی" کہا گیا ہے۔

- **تعبیر:** انسان کی روح لامتناہی (Infinite) ہے، اس لیے اسے سکون بھی صرف لامتناہی ذات سے مل سکتا ہے۔ جب انسان اپنی لامتناہی محبت کو محدود اور فانی (مردہ) چیزوں پر خرچ کرتا ہے، تو اسے کبھی سیری نہیں ہوتی۔

- **خلاصہ:** عرفانی طور پر یہ شعر ایک "**بیدار باش** (Wake-up call)" ہے کہ اپنی تڑپ اور تگ و دو اس کے لیے وقف کرو جو تمہاری روح کی طرح ہمیشہ رہنے والا ہے۔

حاصلِ عرفان: مولانا روم کا یہ شعر مادی دنیا سے بیزاری کا نہیں، بلکہ **حقیقت شناسی** کا درس ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سالک (روحانی مسافر) اپنی محبت کی کشتی کو ایسے ساحل پر لگائے جہاں کبھی زوال کی لہر نہ آئے۔

مولانا روم کے بیان کردہ اس فلسفہِ فنا و بقا کو قدیم فارسی اور اردو شعراء نے اپنے مخصوص رنگ اور اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ان شعراء کے ہاں بھی مادی دنیا "مردہ" یا "خواب" ہے اور صرف ذاتِ الٰہی ہی "حی و جاوید" ہے۔

قدیم اساتذہ کے کلام سے اس کی وضاحت درج ذیل ہے:

۱. مرزا عبدالقادر بیدل دہلوی (فارسی)

بیدل کے ہاں دنیا کی ناپائیداری کا تصور بہت گہرا ہے۔ وہ مادی ہستی کو ایک دھوکا اور فریبِ نظر قرار دیتے ہیں:

بترس از ریگِ رواں، غافل زِ ہستی بر کراں منشیں

کہ ایں دریا ہماں در زیرِ پا دامن کشیدن ہاست

ترجمہ و ربط : اے غافل! اس ریت کی مانند چلتی دنیا سے ڈر اور اس کی ہستی پر بھروسہ کر کے ساحل پر (مطمئن ہو کر) نہ بیٹھ، کیونکہ یہ دریا پاؤں کے نیچے سے زمین (دامن) کھینچ لیتا ہے۔**وضاحت :** رومی کے "مردہ" کی طرح بیدل اسے "ریگِ رواں" (رواں ریت) کہتے ہیں، جس پر کھڑے ہونا ممکن نہیں۔

۲ . خواجہ حافظ شیرازی (فارسی)

حافظ نے دنیا کی بے وفائی اور اس کے تغیر کو ایک بوڑھی عورت سے تشبیہ دی ہے جو ہر لمحہ اپنا شوہر بدلتی ہے:

مجُو درستیِ عہد از جہانِ سست عناصر

کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

ترجمہ و ربط : اس کمزور عناصر والی دنیا سے وفا کی امید نہ رکھ، کیونکہ یہ بوڑھی عورت (دنیا) ہزاروں شوہروں کی دلہن رہ چکی ہے۔**وضاحت :** حافظ یہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح ایک بے وفا دلہن کسی ایک کی نہیں رہتی، اسی طرح "عشقِ مردگان" (فانی محبوب) کبھی پائیدار نہیں ہو سکتا۔

۳ . میر تقی میر (اردو)

اردو کے عظیم شاعر میر تقی میر نے زندگی اور مادی وجود کی حقیقت کو ایک بلبلے سے تشبیہ دی ہے:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے

یہ نمائش سراب کی سی ہے

ترجمہ و ربط : ہماری زندگی ایک بلبلے کی مانند (ناپائیدار) ہے اور یہ ساری ظاہری رونق ایک دھوکا (سراب) ہے۔**وضاحت :** رومی کا "مردہ" اور میر کا "حباب" ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ بلبلے سے کیا دل لگانا جو ایک ہی لمحے میں فنا ہو جائے۔

۴ . خواجہ میر درد (اردو)

تصوف کے بڑے شاعر میر درد نے اسے ایک "خواب" قرار دیا ہے:

جگت میں آکر ادھر ادھر دیکھا

تو ہی نظر آیا جدھر دیکھا

ترجمہ وربط : جب میں نے اس دنیا (جگت) میں آکر حقیقت تلاش کی، تو معلوم ہوا کہ فانی چیزیں صرف دھوکا تھیں، اصل ہستی صرف تیری (اللہ کی) تھی۔ **وضاحت :** یہ رومی کے اس نکتے کی تشریح ہے کہ فانی چیزوں کے پردے میں چھپی "حی" ذات ہی اصل میں عشق کے لائق ہے۔

۵ . علامہ اقبال (اردو / فارسی)

اقبال نے اسی فلسفے کو ایک آفاقی قانون کے طور پر پیش کیا:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ترجمہ وربط : کائنات میں کسی چیز کو سکون (ٹھہراؤ) حاصل نہیں، یہاں اگر کوئی چیز مستقل ہے تو وہ صرف "تبدیلی" ہے۔
وضاحت : جب دنیا کی ہر شے تغیر پذیر (مردہ) ہے، تو اس سے پائیدار تعلق کی امید رکھنا نادانی ہے۔

ان تمام شعراء کا نچوڑ یہی ہے کہ انسان کو اپنا دل اس "زندہ" (حی) ہستی سے لگانا چاہیے جو کبھی فنا نہیں ہوگی، تاکہ اس کی محبت کو بھی دوام حاصل ہو۔

عشقِ زندہ در رَوان و در بَصَر

ہر دَمی باشد زِ غُنچہ تازہ تَر

مشکل الفاظ کے معنی

عشقِ زندہ: وہ عشق جو کبھی ختم نہ ہو (اللہ کا عشق)۔۔۔۔ **رَوان:** جان، روح، زندگی۔۔۔ **بَصَر:** نگاہ، آنکھ، بینائی

ہر دَمی: ہر لمحہ، ہر پل۔۔۔۔۔**باشد:** ہوتا ہے، رہتا ہے **غُنچہ:** پھول کی کلی۔۔۔۔ **تازہ تَر:** زیادہ تر و تازہ، شاداب

ترجمہ

"وہ عشق جو زندہ (جاوید) ہے، وہ روح اور بصارت میں (رچا بسا) ہوتا ہے اور وہ ہر لمحہ ایک کلی سے بھی زیادہ ترو تازہ رہتا ہے۔"

اس شعر میں مولانا رومی نے **عشقِ حقیقی** اور **عشقِ مجازی** کے درمیان ایک لطیف فرق بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک جو عشق فانی چیزوں یا انسانوں سے ہوتا ہے، وہ وقت کے ساتھ مرجھا جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ سے منسوب عشق ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

.1 **عشق کی زندگی سے مراد :** مولانا فرماتے ہیں کہ "عشقِ زندہ" وہ ہے جس کا محبوب (اللہ) ہمیشہ رہنے والا ہے۔ چونکہ اللہ کی ذات کو کبھی زوال نہیں، اس لیے اس کی محبت بھی کبھی پرانی یا بے رنگ نہیں ہوتی۔ یہ عشق انسان کی **روح (روان)** میں سکون پیدا کرتا ہے اور اس کی **نگاہ (بصر)** کو بصیرت عطا کرتا ہے۔

.2 **ہر لمحہ نئی تازگی :** دنیاوی چیزیں استعمال کے ساتھ اپنی کشش کھو دیتی ہیں، یہاں تک کہ ایک خوبصورت پھول بھی کھلنے کے بعد مرجھا جاتا ہے۔ لیکن رومی کے بقول، الٰہی محبت کا خاصہ یہ ہے کہ یہ "ہر دمی" (ہر پل) ایک کھلتی ہوئی کلی سے بھی زیادہ تازہ محسوس ہوتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے، سالک (راہِ حق کا مسافر) کے دل میں اس کی مٹھاس اور تڑپ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

.3 **اثرات :** جب یہ عشق انسان کی بصارت (آنکھوں) میں اترتا ہے، تو اسے کائنات کے ہر ذرے میں رب کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ یہ عشق بوجھ نہیں بنتا، بلکہ روح کے لیے غذا اور زندگی کا باعث بنتا ہے، جو انسان کو کبھی مایوس یا افسردہ نہیں ہونے دیتا۔

حاصلِ کلام : فانی محبوب سے عشق انسان کو آخر کار غم اور تنہائی دیتا ہے، جبکہ حی و قیوم ذات سے عشق انسان کو وہ ابدی تازگی عطا کرتا ہے جو کبھی نہیں مرجھاتی۔

مولانا رومی کے اس شعر میں "عشقِ زندہ" سے مراد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی محبت ہے، جو کہ حی و قیوم (ہمیشہ زندہ رہنے والی) ذات ہے۔ اس تصور کی جڑیں قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ میں گہری ہیں۔

ذیل میں اس شعر کے مرکزی مفاہیم کی قرآنی آیات اور احادیث سے وضاحت پیش ہے:

1. عشقِ زندہ (محبتِ الٰہی کی ابدیت)

شعر میں "زندہ" سے مراد وہ محبت ہے جو کبھی ختم نہ ہو، کیونکہ اس کا مرکز (اللہ) دائمی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ

"اور جو لوگ ایمان والے ہیں، وہ اللہ کی محبت میں سب سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ: 165)

دنیاوی محبتیں زوال پذیر ہیں کیونکہ محبوب فانی ہے، لیکن مومن کا عشق "زندہ" ہے کیونکہ اس کا تعلق اس ذات سے ہے جسے کبھی فنا نہیں۔

"سب کچھ جو زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے، اور صرف تمہارے رب کی ذات باقی رہے گی جو بڑی عظمت اور کرم والی ہے۔" (سورۃ الرحمن: 26-27)

2. رَوان و بَصَر (روح اور نگاہ میں عشق کا اثر)

رومی کہتے ہیں کہ یہ عشق روح میں رچ جاتا ہے اور بصارت (دیکھنے کے انداز) کو بدل دیتا ہے۔

- **حدیثِ قدسی:** حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

..."جب میں اس (بندے) سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، **اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے**، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے..." (صحیح بخاری: 6502)

  - **وضاحت:** یہ حدیث اس شعر کی بہترین تفسیر ہے کہ جب عشقِ الٰہی روح (روان) میں اترتا ہے، تو انسان کی بصارت (بصر) الٰہی نور کے تابع ہو جاتی ہے۔

3. ہر دمی تازہ تر (ایمان کی تازگی اور مٹھاس)

جس طرح کلی ہر لمحہ نئی ہوتی ہے، عشقِ الٰہی میں بھی تکرار نہیں بلکہ ہر لمحہ ایک نئی لذت اور تازگی ہوتی ہے۔

- **حدیثِ مبارکہ:** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس میں تین خصلتیں ہوں گی وہ **ایمان کی مٹھاس** پالے گا: (پہلی یہ کہ) اللہ اور اس کا رسول اسے باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں..." (صحیح بخاری و مسلم)

- **وضاحت:** یہ "مٹھاس" دراصل وہ کیفیات ہیں جو کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔ جیسے ایمان بڑھتا ہے (یَزْدَادُوا اِیمَانًا)، ویسے ہی اس کی تازگی اور عشق کی تڑپ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

رومی دراصل یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ جب انسان اپنی محبت کا رخ فانی اشیاء سے موڑ کر اللہ کی طرف کر لیتا ہے، تو اسے وہ زندگی مل جاتی ہے جسے موت نہیں اور وہ تازگی مل جاتی ہے جسے خزاں نہیں۔

مولانا رومی کے اس شعر کی روحانی اور وجدانی تعبیر تصوف کے ان باریک مشاہدات پر مبنی ہے جہاں منطق ختم ہوتی ہے اور "تجربہ" شروع ہوتا ہے۔ اس کی گہرائی درج ذیل نکات میں پوشیدہ ہے:

1. روحانی تعبیر: بقا باللہ کا مقام

روحانی طور پر "عشقِ زندہ" سے مراد وہ تعلق ہے جو انسانی انا (Self) کے مٹ جانے کے بعد اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

- **اتصالِ معنوی:** جب سالک اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے، تو اس کے اندر ایک ایسی زندگی دوڑنے لگتی ہے جسے فنا نہیں (بقا)۔ یہ عشق روح کے اندر ایک "محرک" بن جاتا ہے جو اسے مادی دنیا کی کثافتوں سے آزاد کر کے لطافت کی طرف لے جاتا ہے۔
- **نورِ بصیرت:** رومی کہتے ہیں کہ یہ عشق صرف دل تک محدود نہیں رہتا بلکہ "بصر" (آنکھ) میں اتر آتا ہے۔ اس کا روحانی مطلب یہ ہے کہ انسان کی ظاہری آنکھ اب صرف اشیاء کو نہیں دیکھتی، بلکہ اشیاء کے پیچھے چھپے "صانع" (خالق) کے حسن کا مشاہدہ کرتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دنیا کا ہر ذرہ ایک کھلی کتاب بن جاتا ہے۔

2. وجدانی تعبیر: تجددِ امثال (ہر لمحہ نئ تجلی)

وجدانی طور پر یہ شعر صوفیاء کے ایک بڑے نظریے "**تجددِ امثال**" کی عکاسی کرتا ہے۔

- **عدمِ تکرار :** وجدان کی دنیا میں اللہ کی تجلی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی تجلی دوبار نہیں فرماتا۔ وجدان میں جب سالک اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو اسے ہر لمحہ (ہر دمی) ایک نیا ذائقہ، ایک نیا رنگ اور ایک نئی کیفیت ملتی ہے۔
- **غنچے سے تشبیہ کی لطافت :** غنچہ جب کھلتا ہے تو وہ اپنی تازگی کی انتہا پر ہوتا ہے، لیکن رومی کہتے ہیں کہ عشقِ الٰہی کی تازگی اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ وجدانی کیفیت میں عاشق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی محبت ابھی شروع ہوئی ہے۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ پرانا مسافر ہے؛ اسے ہر سانس میں محبوب کا ایک نیا جلوہ نظر آتا ہے جو پچھلے جلوے سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔

3. قلبی واردات: حیاتِ جاودانی

وجدانی سطح پر یہ شعر ایک پیاسے کی اس تڑپ کی مانند ہے جو جتنا پانی پیتا ہے، اس کی پیاس میں ایک نئی لذت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

- **حیاتِ قلب :** جس طرح جسم کی زندگی سانس سے ہے، روح کی زندگی اس "زندہ عشق" سے ہے۔ اگر عشق مرجھا جائے تو انسان "زندہ لاش" بن جاتا ہے۔
- **سرورِ دوام :** یہ وہ وجدانی کیفیت ہے جہاں صوفی وقت اور مقام (Time and Space) کی قید سے نکل جاتا ہے۔ اس کے لیے ماضی اور مستقبل ختم ہو جاتے ہیں اور وہ "ابن الوقت" بن کر صرف اسی "تازہ تر" لمحے کے سرور میں غرق رہتا ہے۔

خلاصہ : روحانی طور پر یہ شعر **قربِ الٰہی** کی علامت ہے جہاں بصارت بصیرت میں بدل جاتی ہے۔ وجدانی طور پر یہ اس **بے پناہ حیرت** کا اظہار ہے جو عاشق کو محبوب کے ہر لمحہ بدلتے ہوئے جمال و جمال کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ یہ عشق وہ "آبِ حیات" ہے جو روح کو کبھی بوڑھا نہیں ہونے دیتا۔

مولانا رومیؒ کے اس تصورِ عشق (کہ عشقِ الٰہی ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور ہر لمحہ تر و تازہ رہتا ہے) کو تاریخِ تصوف اور قدیم فارسی و اردو شعراء نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ ذیل میں چند عظیم شعراء کے کلام سے اس کی وضاحت پیش ہے:

1. حافظ شیرازی: عشق کی ابدیت (عشقِ زندہ)

رومی کے "عشقِ زندہ" کی سب سے بہترین شرح حافظ شیرازی کے اس مشہورِ زمانہ شعر میں ملتی ہے:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

جس کا دل عشق کی بدولت زندہ ہو گیا اسے کبھی موت نہیں آئے گی، کائنات کے رجسٹر پر ہماری ہمیشگی (دوام) درج ہو چکی ہے۔

- **رومی سے ربط:** حافظ بھی اسی "زندہ عشق" کی بات کر رہے ہیں جو انسان کو ابدی زندگی عطا کرتا ہے اور اسے فنا سے بچا لیتا ہے۔

2. مرزا غالب: عشق بطورِ حیاتِ روح (رَوان)

غالب نے عشق کو محض ایک جذبہ نہیں بلکہ زندگی کی اصل روح اور بقا کا ذریعہ قرار دیا ہے:

عشق سے طبعیت نے زیست کا مزہ پایا

درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

رومی سے ربط: رومی کے لفظ "رَوان" (روح / جان) کی وضاحت یہاں ملتی ہے کہ زندگی کا اصل مزہ اور روح کی بالیدگی صرف عشق ہی سے ممکن ہے۔

3. علامہ اقبال: عشق کی تازگی (ہر دمی تازہ تر)

اقبال، جو خود کو رومی کا معنوی شاگرد کہتے ہیں، عشق کی اس "تازہ کاری" اور "حرارت" کو یوں بیان کرتے ہیں:

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ

عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی تقویم میں، عصرِ رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

- **رومی سے ربط :** اقبال کے نزدیک عشق "وقت" کی قید سے آزاد ہے۔ رومی نے جسے "ہر دمی تازہ تر" کہا، اقبال اسے "تقویمِ عشق (Love's Calendar) " کہتے ہیں جس میں کبھی پرانا پن یا خزاں نہیں آتی۔

4. میر تقی میر: عشق بطورِ بصیرت (بَصَر)

میر تقی میر نے عشق کو کائنات کی اصل روشنی اور دیکھنے والی آنکھ قرار دیا ہے:

محبت نے ظلمت سے نکالا ہے نور

محبت ہے قدرت کا پہلا ظہور

رومی سے ربط : رومی نے کہا تھا کہ عشق "بصر" (آنکھ) میں ہوتا ہے۔ میر اسی کی تائید کرتے ہیں کہ یہ عشق ہی ہے جو انسان کی آنکھوں سے اندھیرے ختم کر کے اسے کائنات کا حقیقی نور دکھاتا ہے۔

5. شیخ سعدی شیرازی: عشق کی بے پناہ طاقت

سعدی شیرازی عشقِ حقیقی کی تر و تازگی اور اس کے غلبے کو یوں بیان کرتے ہیں:

قیامت باشد آن قامت کہ بر خاکِ لحد باشد

بجز عشقِ خداوندی کہ ہرگز نیست زائل را

ہر قد و قامت کو ایک دن قبر کی خاک ہونا ہے، سوائے اللہ کے عشق کے جسے کبھی زوال نہیں.

مولانا رومی کے اس شعر کی **جبلی (Instinctive)** تعبیر انسانی فطرت کے ان بنیادی تقاضوں کو ظاہر کرتی ہے جو لاشعوری طور پر ہر جاندار کے اندر نمو، بقا اور حسن کی طلب کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔

جبلی لحاظ سے اس کی وضاحت درج ذیل تین پہلوؤں سے کی جا سکتی ہے:

1. بقا کی جبلت (Instinct of Survival)

انسانی جبلت فانی اور مردہ چیزوں سے خوفزدہ ہوتی ہے اور اسے "بقا" کی تلاش رہتی ہے۔

- **عشقِ زندہ**: جبلت کا خاصہ ہے کہ وہ ایسی پناہ گاہ ڈھونڈتی ہے جو دائمی ہو (Everlasting)۔ جب رومی "عشقِ زندہ" کی بات کرتے ہیں، تو وہ انسان کی اس جبلی پکار کا جواب دیتے ہیں کہ "فانی" محبوب (چاہے وہ اقتدار ہو، حسن ہو یا مال) بالآخر دھوکہ دے جائے گا۔
- انسان جبلی طور پر اس ذات سے جڑنا چاہتا ہے جو کبھی نہ مرے، تاکہ اس کا اپنا وجود بھی اس عشق کے سہارے ایک معنوی "بقا" پا سکے۔

2. ندرت اور تجدد کی جبلت (Instinct of Novelty)

انسانی دماغ اور روح جبلی طور پر "تکرار (Boredom)" سے اکتا جاتے ہیں۔ ہم ہمیشہ نئی چیز، نئے رنگ اور تازہ تجربے کی تلاش میں رہتے ہیں۔

- **تازہ تر**: دنیاوی محبتیں وقت کے ساتھ پرانی ہو جاتی ہیں اور ان کی کشش ختم ہو جاتی ہے (یہ ایک نفسیاتی و جبلی حقیقت ہے)۔
- رومی فرماتے ہیں کہ عشقِ الٰہی وہ واحد تجربہ ہے جو "ہر دمی" (ہر لمحہ) ایک نئی جہت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ ہماری اس جبلی ضرورت کو پورا کرتا ہے جہاں ہمیں ہر لمحہ ایک "نیا ذائقہ (Constant Growth)" درکار ہوتا ہے، جس طرح غنچہ ہر لمحہ کھلنے کے عمل میں ایک نئی تازگی دکھاتا ہے۔

3. ادراک کی وحدت (Unified Perception)

انسانی جبلت میں "دیکھنے" (بصر) اور "محسوس کرنے" (روان) کے درمیان ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے۔

- **رواں اور بصر**: جبلی طور پر انسان جس چیز کو خوبصورت دیکھتا ہے، اس کا اثر اس کی جان پر ہوتا ہے۔ رومی یہاں ایک "آرگینک (Organic)" تعلق بیان کر رہے ہیں کہ یہ عشق کوئی خارجی بوجھ نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی بصارت اور اس کی روح کے نظام کے اندر اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے پودے کی رگوں میں پانی۔

- یہ عشق انسان کے حواسِ خمسہ (Senses) کو اس طرح جلا بخشتا ہے کہ اسے کائنات مردہ نہیں بلکہ ایک متحرک اور زندہ اکائی نظر آنے لگتی ہے۔

حاصلِ بحث

اگر اسے خالص انسانی جبلت کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ شعر بتاتا ہے کہ:

انسان فطرتاً **جمود** (Stagnation) سے نفرت کرتا ہے اور **ارتقاء** (Evolution) سے محبت کرتا ہے۔ عشقِ الٰہی وہ قوت ہے جو روح کو منجمد ہونے سے بچاتی ہے اور اسے ہر لمحہ ایک ارتقائی تازگی عطا کرتی ہے، جو کلی کے کھلنے کے فطری عمل سے بھی زیادہ حسین اور ہمہ گیر ہے۔

شعری محاسن

مولانا رومی کا یہ شعر اپنے اندر لسانی، معنوی اور فنی خوبیوں کا ایک جہاں سمیٹے ہوئے ہے۔ ذیل میں اس کے **شعری محاسن** کی تفصیل پیش ہے:

1. **تشبیہ برتر** (Superior Simile)

اس شعر کا سب سے بڑا حسن اس کی تشبیہ میں ہے۔ عام طور پر تازگی کے لیے "پھول" یا "کلی" (غنچہ) کی مثال دی جاتی ہے، لیکن رومی نے یہاں **تشبیہ تفضیل** کا استعمال کیا ہے۔

- وہ عشق کو غنچے کے برابر نہیں کہہ رہے، بلکہ اسے **"تازہ تر"** (زیادہ تر و تازہ) قرار دے رہے ہیں۔
- **نکتہ:** غنچہ جب ایک بار کھل کر پھول بن جائے تو مرجھا جاتا ہے، لیکن عشقِ الٰہی کا غنچہ ہر لمحہ کھلنے کی کیفیت میں رہتا ہے اور اس پر کبھی بڑھاپا یا خزاں نہیں آتی۔

2. **مراعات النظیر** (Congruity of Terms)

شعر میں ایسے الفاظ لائے گئے ہیں جن کا آپس میں گہرا منطقی اور فنی تعلق ہے:

- **رَوان اور بَصَر:** روح (اندرون) اور آنکھ (بیرون) کا جوڑا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عشق انسان کو اندر اور باہر سے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

- **غنچہ اور تازہ تر**: نباتیاتی تعلق، جو نمو اور شادابی کی علامت ہے۔

3. صنعتِ تضاد (Implied Contrast)

اگرچہ یہاں کوئی لفظی تضاد (جیسے دن اور رات) موجود نہیں، لیکن ایک **معنوی تضاد** پوشیدہ ہے:

- **عشقِ زندہ بمقابلہ عشقِ مردہ"**: عشقِ زندہ" کی ترکیب خود بخود ذہن کو اس عشق کی طرف لے جاتی ہے جو فانی چیزوں سے ہو اور وقت کے ساتھ مر جائے۔ یہاں "زندہ" کہہ کر رومی نے دنیاوی محبتوں کے عارضی پن پر ضرب لگائی ہے۔

4. سہلِ ممتنع (Exquisite Simplicity)

یہ شعر "سہلِ ممتنع" کی بہترین مثال ہے۔

- اس میں کوئی ثقیل (بھاری بھرکم) لفظ استعمال نہیں ہوا، لیکن مفہوم اتنا گہرا ہے کہ اس پر دفتر لکھے جاسکتے ہیں۔
- چھوٹے چھوٹے الفاظ (روان، بصر، غنچہ) کے ذریعے اتنی بڑی کائناتی حقیقت بیان کرنا رومی کا خاصہ ہے۔

5. نغمگی اور ترنم (Musicality)

شعر کی بحر اور الفاظ کی ترتیب میں ایک خاص روانی ہے:

- **تکرارِ لفظی و صوتی"**: در روان و در بصر" میں "در" کی تکرار اور "تازہ تر" کے وزن نے شعر میں ایک وجدانی کیفیت اور موسیقی پیدا کر دی ہے، جو پڑھنے والے کے دل پر دستک دیتی ہے۔

6. ایجاز و اختصار (Brevity)

صرف دو مصرعوں میں رومی نے **عشق کے مقام** (روح و چشم)، **عشق کی صفت** (زندہ) اور **عشق کی کیفیت** (ہمیشہ کی تازگی) کو سمیٹ لیا ہے۔ یہ "سمندر کو کوزے میں بند کرنے" کا ہنر ہے۔

خلاصہ

فنی اعتبار سے یہ شعر محض قافیہ پیمائی نہیں، بلکہ ایک **تصویری شاعری (Imagery)** ہے۔ جب ہم "تازہ تر غنچہ" کا تصور کرتے ہیں، تو ہمارے ذہن میں ایک ایسی متحرک (Dynamic) تصویر ابھرتی ہے جو ساکت نہیں بلکہ مسلسل نمو پا رہی ہے۔ یہی وہ کمال ہے جو رومی کے کلام کو صدیوں بعد بھی "تازہ تر" رکھتا ہے۔

عشقِ آن زندہ گُزین ُکو باقی است
کَز شَرابِ جانُ فَزایَت ساقی است

مشکل الفاظ کے معنی

عشق: محبت۔۔۔زِندہ: زندہ، ہمیشہ باقی رہنے والا۔۔۔گُزین: اختیار کر، منتخب کر۔۔۔باقی: ہمیشہ رہنے والا

شرابِ جان فزا: روح کو تازگی اور زندگی دینے والی شراب، یعنی روحانی فیض۔۔۔ساقی: پلانے والا؛ صوفیانہ اصطلاح میں مرشدِ کامل یا اللہ تعالیٰ

ترجمہ

"اس زندہ (اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہستی) کی محبت اختیار کر جو دائمی ہے، کیونکہ وہی ایسا ساقی ہے جو تجھے روح کو زندگی بخشنے والی شراب پلاتا ہے۔"

اس شعر میں مولانا رومیؒ انسانی دل کو ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ اس کے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. **فانی اور باقی کا فرق:** دنیا میں ہم جن چیزوں یا انسانوں سے محبت کرتے ہیں، وہ سب ایک نہ ایک دن ختم ہو جانے والے ہیں۔ جب محبوب فنا ہو جاتا ہے، تو اس کا عشق انسان کو دکھ اور صدمہ دیتا ہے۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ نادان ہے وہ شخص جو ایسی چیز سے دل لگائے جو خود عارضی ہو۔ عقلمندی یہ ہے کہ محبت اس سے کی جائے جسے کبھی زوال نہیں۔ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ، جو "الحیّ القیوم" (ہمیشہ زندہ رہنے والا) ہے۔

2. **شرابِ جان فزا اور ساقی کا استعارہ:** تصوف کی اصطلاح میں "شراب" سے مراد انگور کا رس نہیں، بلکہ **"معرفتِ الٰہی"** اور **"عشقِ حقیقی کی لذت"** ہے۔

- **ساقی:** یہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کو ساقی کہا گیا ہے جو اپنے بندے کے دل میں سکون، اطمینان اور اپنی محبت کی مٹھاس ڈالتا ہے۔
- یہ ایسی شراب ہے جو انسان کو مادی دنیا کے غموں سے بے نیاز کر کے اس کی روح کو تازگی (Jan-faza) عطا کرتی ہے۔

3. **انتخاب کی دعوت (گُزین):**

لفظ "گُزین" (چن لو) یہ ظاہر کرتا ہے کہ محبت کا رخ متعین کرنا انسان کے اپنے بس میں ہے۔ ہم اپنے دل کا قبلہ خود درست کر سکتے ہیں۔ اگر ہم مادی فائدوں اور عارضی رشتوں کو کل کائنات سمجھ لیں گے تو پریشان رہیں گے، لیکن اگر ہم اپنی محبتوں کا مرکز اللہ کی ذات کو بنا لیں گے تو ہمیں وہ ساقی مل جائے گا جو کبھی جدا نہیں ہوتا۔

حاصلِ کلام: رومیؒ کا پیغام سادہ مگر گہرا ہے: **"مردہ چیزوں (فانی دنیا) سے دل نہ لگاؤ کیونکہ وہ بے وفا ہیں۔ اس سے لو لگاؤ جو زندگی بخشنے والا اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔"**

مولانا رومیؒ کا یہ شعر تصوف کے اس بنیادی سبق پر مبنی ہے جس کا منبع قرآن کریم کی آیات اور احادیثِ نبویہ ہیں۔ اس شعر کی قرآن و سنت کی روشنی میں تشریح درج ذیل ہے:

1۔ اللہ کی صفتِ بقا اور فانی دنیا (الْحَيُّ الْقَيُّومُ)

شعر کا پہلا حصہ **"عشقِ آن زندہ گُزین کو باقی است"** براہِ راست قرآن کریم کی ان آیات کی ترجمانی کرتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو "باقی" اور کائنات کو "فانی" قرار دیا ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

"ہر وہ چیز جو زمین پر ہے فنا ہونے والی ہے، اور صرف تیرے رب کی ذات باقی رہے گی جو بڑی عظمت اور بڑے کرم والی ہے۔) "**سورۃ الرحمٰن:26-27**)

- **تشریح:** رومیؒ فرماتے ہیں کہ جب بقا صرف اللہ کے لیے ہے، تو دل بھی اسی سے لگانا چاہیے جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔ انسانوں یا مادی چیزوں سے عشق کا انجام صدمہ اور جدائی ہے کیونکہ وہ خود فنا ہونے والے ہیں۔

2۔ محبتِ الٰہی کی فوقیت (أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ)

رومیؒ کا "انتخاب" (گُزین) کرنے کا مشورہ قرآن کے اس مطالبے کے عین مطابق ہے کہ مومن کی سب سے شدید محبت اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ"

اور جو لوگ ایمان والے ہیں، وہ اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں۔) "**سورۃ البقرہ:165**(

- أَخْبَرَنَا سُوَيْدُ بْنُ نَصْرٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ قَتَادَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يُحَدِّثُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: " ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: مَنْ أَحَبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَمَنْ كَانَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ كَانَ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ أَنْ يَرْجِعَ إِلَى الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ اللَّهُ مِنْهُ".
-) **انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین چیزیں جس میں ہوں گی وہ ایمان کی مٹھاس پائے گا، ایک یہ کہ جو کسی آدمی سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے کرے، دوسرے یہ کہ اس کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول ہر ایک سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہوں اور تیسرے یہ کہ آگ میں گرنا اس کے لیے زیادہ محبوب ہو بہ نسبت اس کے کہ وہ کفر کی طرف لوٹے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس سے نجات دے دی"۔[سنن نسائی/کتاب الإيمان وشرائعه/حدیث:4991]**

شرابِ جان فزا اور ساقی (سَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا)

شعر کا دوسرا مصرعہ **"کز شرابِ جانْ فزایَت ساقی است "** اس روحانی لذت اور فیض کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے۔

وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا "اور ان کا رب انہیں نہایت پاکیزہ شراب (شرابِ طہور) پلائے گا۔) "**سورۃ الدھر:21**(

یہاں "شراب" سے مراد وہ معرفت اور عشق کی مٹھاس ہے جو روح کو تازگی (جان فزا) بخشتی ہے۔ صوفیانہ فکر میں اللہ ہی اصل "ساقی" ہے جو اپنے ذکر اور قرب کے ذریعے بندے کے باطن کو سیراب کرتا ہے۔ جب انسان فانی محبوبوں کو چھوڑ کر "حی و باقی" ہستی کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اسے وہ روحانی سکون ملتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

اس شعر کی **روحانی اور وجدانی تشریح** علم اور منطق سے ماوراء اس "ذوق" اور "کیفیت" سے تعلق رکھتی ہے جو ایک سالک (راہِ حق) اپنے سفر کے دوران محسوس کرتا ہے۔ مولانا رومیؒ یہاں محض ایک نصیحت نہیں کر رہے، بلکہ وہ انسانی روح کی اس پیاس کا علاج بتا رہے ہیں جو صدیوں سے اسے بے چین کیے ہوئے ہے۔

.1 انتخاب کی کیمیا (عشقِ آن زندہ گُزین)

روحانی نقطہ نظر سے، انسانی دل ایک آئینے کی طرح ہے۔ ہم جس چیز کی طرف اس کا رخ کرتے ہیں، اسی کا عکس اس میں سما جاتا ہے۔

- **وجدانی نکتہ :** اگر ہم فانی انسانوں یا مادی چیزوں سے دل لگاتے ہیں، تو ہمارا دل بھی ان کی طرح "مردہ" اور "تاریک" ہو جاتا ہے کیونکہ وہ چیزیں خود مٹنے والی ہیں۔
- رومیؒ کہتے ہیں کہ اپنے عشق کا رخ اس **"زندہ "** ہستی کی طرف موڑ دو جس کی زندگی مستعار (مانگی ہوئی) نہیں بلکہ ذاتی ہے۔ جب تم ایک زندہ اور جاوید ہستی سے جڑ جاتے ہو، تو تمہاری روح کو بھی "دوام" (ہمیشگی) مل جاتی ہے۔

.2 بقا کا ستون (کو باقی است)

دنیا کا ہر دکھ "جدائی" کا دکھ ہے، اور جدائی اس لیے ہوتی ہے کہ یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔

- **روحانی رمز :** سالک جب اللہ کی **بقا** کا مشاہدہ کرتا ہے، تو اسے کائنات کی ہر شے ہیچ (ناچیز) نظر آنے لگتی ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ جس کا سہارا اللہ ہے، اسے کبھی تنہائی کا خوف نہیں ہو سکتا۔
- یہاں "باقی" سے مراد وہ لنگر ہے جو زندگی کے تلاطم خیز سمندر میں روح کی کشتی کو ڈوبنے نہیں دیتا۔ جس نے باقی سے رشتہ جوڑ لیا، وہ خود بھی فنا کے خوف سے آزاد ہو گیا۔

.3 ساقی اور شرابِ جان فزا (وجدان کی انتہا)

مصرعِ ثانی اس شعر کا **"وجدانی عروج "** ہے۔ تصوف میں شراب سے مراد وہ "تجلیات" اور "واردات" ہیں جو قلبِ انسانی پر نازل ہوتی ہیں۔

- **روح پرورے :** یہ شراب انگور کے عرق سے نہیں، بلکہ ذکر، فکر اور حضوریِ الٰہی سے کشید کی جاتی ہے۔ اسے **"جان فزا "** اس لیے کہا گیا کہ یہ مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ یہ انسان کے اندر سے "خود پسندی" اور "انا" کو ختم کر کے اسے "خدامست" کر دیتی ہے۔
- **اللہ بطور ساقی :** سب سے خوبصورت نکتہ یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ خود **"ساقی "** ہے۔ یعنی وہ صرف رزق ہی نہیں دیتا، بلکہ وہ اپنے محبوب بندوں کے دلوں میں اپنی محبت کی لذت خود انڈیلتا ہے۔

وجدانی کیفیت : جب بندہ اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ ہر شے سے کٹ جاتا ہے، تو اسے وہ کیف حاصل ہوتا ہے جس کے سامنے دنیا کی تمام بادشاہتیں ہیچ ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں "عاشق" اور "محبوب" کے درمیان کوئی پردہ باقی نہیں رہتا۔

حاصلِ تشریح (خلاصہِ وجدان)

اس شعر کا روحانی پیغام یہ ہے کہ:

1. **دل کی ہجرت :** اپنے دل کو فانی محبوبوں (جو آج ہیں، کل نہیں) کی بستی سے نکال کر اس "قدیم" اور "ازلی" محبوب کی طرف لے جاؤ۔
2. **حقیقی زندگی :** جب تک انسان کا تعلق اللہ سے نہیں جڑتا، وہ چلتا پھرتا مردہ ہے۔ حقیقی زندگی تب شروع ہوتی ہے جب اللہ کا عشق دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔
3. **اطمینانِ قلب :** روح کی بے چینی کا واحد حل وہ "شرابِ معرفت" ہے جو صرف اللہ کے دربار سے ملتی ہے۔

رومیؒ کا وجدان ہمیں یہ سکھاتا ہے" : اے انسان! تو ایک شہزادہ ہے، تو نے اپنے آپ کو مٹی کے کھلونوں (دنیا) کا قیدی کیوں بنا رکھا ہے؟ اس کی طرف آ جو تجھے ابدی زندگی کا جام پلانے کے لیے منتظر ہے۔"

مولانا رومیؒ کے اس فلسفے کو کہ "فانی کو چھوڑ کر باقی سے دل لگاؤ"، تاریخِ ادب کے دیگر عظیم شعراء نے بھی اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ ان اشعار کے ذریعے رومیؒ کے کلام کی تشریح مزید واضح ہو جاتی ہے:

1 . عشقِ حقیقی اور دوام (بقا)

رومیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے عشق کرو جو "باقی" ہے۔ اسی مفہوم کو خواجہ حافظ شیرازی نے اپنے مشہورِ زمانہ شعر میں یوں بیان کیا ہے:

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق

ثبت است بر جریده عالم دوام ما

)ترجمہ: وہ شخص کبھی نہیں مرتا جس کا دل عشق (الٰہی) سے زندہ ہو گیا، کائنات کے ریکارڈ پر ہماری ہمیشگی لکھ دی گئی ہے(

تشریح: حافظ یہاں رومیؒ کے لفظ "زندہ" کی وضاحت کر رہے ہیں کہ حقیقی زندگی مادی سانسوں کا نام نہیں، بلکہ عشقِ الٰہی کے ذریعے روح کا بیدار ہو جانا ہے، جو انسان کو ابدی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

2 . دنیا کی بے ثباتی اور اللہ کی ہستی

رومیؒ کے "کو باقی است" (جو باقی رہنے والا ہے) کی بہترین شعری تفسیر مرزا غالب کے اس شعر میں ملتی ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

تشریح: غالب یہاں اس ازلی اور ابدی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جب کائنات کا وجود نہ تھا تب بھی وہ "باقی" تھا اور جب سب ختم ہو جائے گا تب بھی وہی ہو گا۔ رومیؒ اسی لیے کہتے ہیں کہ جب سب نے مٹ جانا ہے تو پھر مٹنے والوں سے دل کیوں لگانا؟

3 . سرابِ ہوس اور حقیقتِ عشق

مرزا عبدالقادر بیدل، جو حقائق و معارف کے بیان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، وہ دنیاوی لگاؤ کو ایک "وہم" اور "سراب" قرار دیتے ہیں:

غافل بہ وہمِ ہستیِ موہوم ماندہ ای

بر رنگِ گل فریفتہ چوں بو ماندہ ای

)ترجمہ: اے غافل! تو ایک ایسی ہستی کے وہم میں گرفتار ہے جو اصل میں ہے ہی نہیں، تو پھول کے رنگ (ظاہری خوبصورتی) پر ایسے فدا ہے جیسے اس کی خوشبو میں الجھ کر رہ گیا ہو(

تشریح: بیدل یہاں رومیؒ کے لفظ "گُزین" (انتخاب کرو) کی اہمیت واضح کرتے ہیں کہ انسان ظاہری رنگ و روپ (فانی چیزوں) کو اصل سمجھ کر دھوکہ کھا جاتا ہے، جبکہ اسے حقیقت کا انتخاب کرنا چاہیے۔

4 . مےِ باقی اور ساقیِ ازل

رومیؒ نے "شرابِ جان فزا" اور "ساقی" کا جو استعارہ استعمال کیا، علامہ اقبال نے اسے جدید دور میں "مےِ باقی" کے عنوان سے یوں پیش کیا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

مےِ باقی ہے اب تک مے کدے میں

وہی ساقی ہے، وہی جام و سبو ہے

تشریح: اقبال اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ وہ "شرابِ معرفت" جو قرونِ اولیٰ میں دستیاب تھی، وہ آج بھی موجود ہے۔ اللہ کی ذات (ساقی) آج بھی اپنے فیض کے جام بھر بھر کر بانٹ رہی ہے، بس شرط یہ ہے کہ کوئی رومیؒ کی طرح فانی دنیا سے منہ موڑ کر اس در پر آ جائے۔

عشقِ آن بگزین کہ جملہ ی انبیا
یافتند از عشقِ او کار و کیا

مشکل الفاظ کے معنی

عشق: گہری محبت، سچی وارفتگی۔۔۔۔بگزین: اختیار کر، چُن لے۔۔۔۔جملہ: تمام۔۔۔انبیا: نبیوں کی جماعت، پیغمبر

یافتند: انہوں نے پایا۔۔۔۔کار و کیا: کامرانی، عظمت، مرتبہ، شان و شوکت

ترجمہ

"تو اُس (اللہ) کی محبت کو اختیار کر، جس کے عشق کی بدولت تمام انبیاء نے جاہ و جلال، رتبہ اور عظمت پائی۔"

مولانا رومیؒ اس شعر میں انسان کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ دنیا کی عارضی محبتوں کے بجائے "عشقِ حقیقی" یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کو اپنانا چاہیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام کی زندگیوں میں جو عظیم انقلاب، صبر، قربانی، ہمت اور روحانی قوت نظر آتی ہے، اس کی اصل بنیاد اللہ کا عشق تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آگ میں کود جانا قبول کیا، موسیٰ علیہ السلام نے فرعون جیسے جابر کے سامنے حق بلند کیا، عیسیٰ علیہ السلام نے مخالفتوں کے باوجود دعوتِ حق جاری رکھی، اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے مثال صبر اور رحمت کے ذریعے انسانیت کو ہدایت دی—یہ سب عشقِ الٰہی کی قوت کا نتیجہ تھا۔

رومیؒ کے نزدیک عشق محض جذباتی کیفیت نہیں بلکہ ایک ایسی روحانی طاقت ہے جو انسان کو خود غرضی، خوف اور دنیا پرستی سے بلند کر دیتی ہے۔ یہی عشق انسان کو قربانی، اخلاص اور معرفت کی منزلوں تک پہنچاتا ہے۔

اس شعر میں یہ پیغام بھی پوشیدہ ہے کہ اگر انسان حقیقی کامیابی، عزت اور روحانی بلندی چاہتا ہے تو اسے انبیاء کے راستے کو اختیار کرنا ہوگا، اور انبیاء کا راستہ عشقِ الٰہی کا راستہ ہے۔

1۔ اللہ کی محبت ایمان کی بنیاد

قرآن مجید میں فرمایا:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ

"اور ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔" البقرہ:165

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مومن کی اصل پہچان اللہ سے شدید محبت ہے۔ انبیاءِ کرام چونکہ ایمان کے کامل ترین نمونے تھے، اس لیے ان کا ہر عمل عشقِ الٰہی سے سرشار تھا۔

2۔ انبیاء کی قربانیاں محبتِ الٰہی کا نتیجہ تھیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ اتَّخَذَ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا

"اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنالیا۔" النساء:125

"خلیل" وہ ہوتا ہے جس کی محبت دل میں پوری طرح اتر جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کی قربانی، وطن چھوڑنے اور آگ میں ڈالے جانے جیسے امتحانات اسی محبت میں برداشت کیے۔

3۔ رسول ﷺ کی زندگی عشقِ الٰہی کا کامل نمونہ

قرآن مجید میں فرمایا:

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ ... أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا

"کہہ دیجیے اگر تمہارے باپ، بیٹے... اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو۔" (التوبہ:24)

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہونی چاہیے۔

احادیثِ نبویہ ﷺ سے وضاحت

1۔ ایمان کی تکمیل محبتِ رسول ﷺ سے

صحیح بخاری میں ہے:

"تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" (صحیح بخاری)

یہ حدیث عشقِ رسول ﷺ کو ایمان کا لازمی حصہ قرار دیتی ہے۔

2۔ محبتِ الٰہی انسان کو اللہ کا محبوب بنا دیتی ہے

صحیح بخاری کی حدیثِ قدسی میں ہے:

"میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔"

یہی وہ مقام ہے جسے صوفیہ "عشقِ حقیقی" کہتے ہیں۔

3۔ انبیاء کی عبادت اور محبت

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راتوں کو اتنی عبادت فرماتے کہ قدم مبارک سوج جاتے۔ عرض کیا گیا:
"یا رسول اللہ! اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیے ہیں، پھر اتنی مشقت کیوں؟"

آپ ﷺ نے فرمایا:

"کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟" (صحیح بخاری)

یہ شکر اور عبادت دراصل محبتِ الٰہی کا اظہار تھا۔

صوفیانہ و دینی مفہوم

مولانا رومیؒ کا مقصد یہ نہیں کہ محض جذباتی عشق اختیار کیا جائے، بلکہ ایسا عشق:

- جو اطاعت پیدا کرے،
- قربانی سکھائے،

- نفس کو مغلوب کرے،
- اور انسان کو اللہ کے قریب لے جائے۔

اسی عشق نے:

- حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے سامنے ڈٹنے کی قوت دی،
- حضرت نوح علیہ السلام کو صدیوں تبلیغ پر ثابت قدم رکھا،
- اور رسول اللہ ﷺ کو طائف، ہجرت اور جہاد کی آزمائشوں میں استقامت عطا کی۔

مولانا روم کے اس فکر انگیز شعر کی بنیاد دراصل اس قرآنی تصور پر ہے کہ حقیقی طاقت، عزت اور کامیابی صرف اللہ کی محبت اور اس کی وفاداری میں پوشیدہ ہے۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ انبیاء کی جو شان و شوکت (کار و کیا) ہم دیکھتے ہیں، وہ ان کی اپنی مادی طاقت نہیں تھی، بلکہ اللہ کے عشق کا عکس تھا۔

اس موضوع پر مزید آیات اور احادیث درج ذیل ہیں:

1. محبتِ الٰہی کا تقاضا اور ترجیح

رومیؒ کا "بگزین" (چُن لے) کہنا دراصل قرآن کی اس آیت کی پکار ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ اگر دنیا کی دیگر محبتیں اللہ کی محبت پر غالب آ جائیں تو یہ خسارے کا سودا ہے۔

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ... أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ سورۃ التوبہ:24" (فرما دیجیے: اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں... تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے۔"

۲۔ عزت اور غلبہ صرف اللہ کے لیے ہے

شعر میں مذکور لفظ **"کار و کیا"** (شان و شوکت اور اختیار) کی اصل حقیقت قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا)سورۃ فاطر:10 " (جو شخص عزت (اور غلبہ) چاہتا ہے، تو (جان لے کہ) عزت سب کی سب اللہ ہی کے لیے ہے۔"

انبیاء علیہم السلام نے اللہ کا عشق اختیار کیا، تو اللہ نے اپنی صفتِ عزت کا پرتو ان پر ڈال دیا، جس سے وہ دنیا کے بڑے بڑے جابر بادشاہوں (نمرود، فرعون) کے سامنے تنِ تنہا ڈٹ گئے۔

۳۔ اللہ کی دوستی اور کائناتی تصرف

رومیؒ کے نزدیک انبیاء کو جو "کار و کیا" ملا، وہ اللہ کی "ولایت" (دوستی) کا نتیجہ تھا۔ جب انسان اللہ کا ہو جاتا ہے، تو کائنات کی قوتیں اس کے تابع کر دی جاتی ہیں۔

- **حدیثِ قدسی :** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جس نے میرے کسی **ولی (دوست / عاشق)** سے دشمنی کی، میرا اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔۔۔ اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔" (صحیح بخاری)

یہی وہ مقام ہے جہاں ایک نبی یا ولی کی مرضی اللہ کی مرضی بن جاتی ہے، اور اسے وہ "کار و کیا" حاصل ہوتا ہے جو عام انسانوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

.4 ذکرِ الٰہی سے دلوں کا سکون اور ثبات

عشقِ الٰہی کا پہلا ثمرہ وہ اطمینانِ قلب ہے جو انبیاء کو بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی ثابت قدم رکھتا تھا۔

- **قرآنی حوالہ:**

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ)سورۃ الرعد:28 " (آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر (اور اس کی یاد / محبت) ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔"

.5 فانی اور باقی کا فرق

رومیؒ نے "عشقِ آن" (صرف اس کا عشق) کہہ کر باقی تمام محبتوں کی نفی کی، کیونکہ باقی سب مٹنے والا ہے۔

- **قرآنی حوالہ:**

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ * وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (سورۃ الرحمن:26-27" (جو کچھ اس زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے، اور صرف تیرے رب کی ذات باقی رہے گی جو صاحبِ جلال اور صاحبِ اکرام ہے۔"

موجودہ دور، جسے مادی دوڑ، بے یقینی اور نفسیاتی اضطراب کا عہد کہا جاتا ہے، اس میں مولانا روم کے اس شعر کی معنویت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ فی زمانہ اس شعر کا اطلاق درج ذیل پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے:

1. مادی عروج کے بجائے اخلاقی و روحانی عروج

آج کے دور میں "کارو کیا" (کامیابی و کامرانی) کا معیار صرف بینک بیلنس، بڑی گاڑی یا سوشل میڈیا فالوورز کو سمجھا جاتا ہے۔ رومیؒ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ:

- **عارضی اثر و رسوخ :** مادی چیزوں سے حاصل ہونے والی عزت عارضی ہوتی ہے (عشقِ مجازی کی طرح)۔
- **دائمی اثر و رسوخ :** انبیاء نے بغیر کسی ظاہری مال و دولت کے دلوں پر حکومت کی کیونکہ ان کا تعلق "اصل مرکزِ قوت" (اللہ) سے تھا۔
- **اطلاق :** اگر آج کا انسان اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں دیانت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار (جو عشقِ الٰہی کا خاصہ ہیں) کو اپنا لے، تو اسے وہ وقار حاصل ہو گا جو محض دولت سے ممکن نہیں۔

2. نفسیاتی استحکام اور ذہنی سکون

جدید دور کا سب سے بڑا المیہ "ڈپریشن" اور "تنہائی" ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ فانی چیزوں اور انسانوں سے حد سے زیادہ وابستگی ہے۔

- **ٹوٹے ہوئے بت :** جب ہمارا معشوق (عہدہ، مال، یا کوئی انسان) بدلتا ہے یا چھن جاتا ہے، تو ہم ٹوٹ جاتے ہیں۔
- **محکم سہارا :** رومیؒ کہتے ہیں کہ "اس کا عشق چُن لے" جو کبھی نہیں بدلتا۔

- **اطلاق :** جس کا دل خدا کی محبت سے بھرا ہو، وہ دنیاوی اتار چڑھاؤ سے مایوس نہیں ہوتا۔ اسے وہ "اطمینانِ قلب" حاصل ہوتا ہے جو اسے ہر قسم کے نفسیاتی بحران سے محفوظ رکھتا ہے۔

3. سوشل میڈیا اور "ظاہر پرستی" کا علاج

آج کل ہم اپنی زندگی دوسروں کو دکھانے اور ان سے داد (Validation) وصول کرنے کے لیے جیتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا "عشقِ مجازی" ہے جو انسان کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔

- **انبیاء کا طریقہ :** انبیاء نے لوگوں کی واہ واہ کے بجائے اللہ کی رضا کو مقدم رکھا۔
- **اطلاق :** اگر ہم اپنی نیتوں میں اخلاص پیدا کر لیں اور اپنی پہچان کسی مادی برانڈ کے بجائے اپنی "روحانیت" سے کریں، تو ہم اس غلامی سے آزاد ہو سکتے ہیں جو آج کے دور نے ہم پر مسلط کر دی ہے۔

4. قیادت اور رہنمائی (Leadership)

آج دنیا کو ایسے لیڈروں کی ضرورت ہے جو صرف مصلحت پسند نہ ہوں بلکہ صاحبِ کردار ہوں۔

- **عشقِ الٰہی کا ثمرہ :** انبیاء میں جو بے خوفی تھی، وہ اسی عشق کا نتیجہ تھی۔
- **اطلاق :** ایک طالب علم، ایک بزنس مین یا ایک سیاستدان اگر اس فلسفے کو اپنا لے کہ "اصل طاقت اللہ کے پاس ہے"، تو وہ کسی بھی دباؤ کے سامنے جھکنے کے بجائے حق پر قائم رہے گا۔ یہی وہ "کار و کیا" ہے جو تاریخ میں انسان کو زندہ رکھتا ہے۔

حاصلِ کلام

فی زمانہ اس شعر کا اطلاق ہمیں **"مقصدِ حیات"** کی درستگی کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ:

1. **ترجیحات بدلیں :** فانی (ختم ہونے والی) چیزوں کو دل لگی کا سامان بنائیں، مگر دل کا مرکز لافانی کو رکھیں۔
2. **خودی کی پہچان :** جب انسان خدا کا ہو جاتا ہے، تو کائنات اس کی ہو جاتی ہے (جیسا کہ انبیاء کے معاملے میں ہوا)۔

مختصر یہ کہ : آج کا انسان باہر کی دنیا میں تو بہت طاقتور ہو گیا ہے، مگر اندر سے کمزور ہے۔ رومیؒ کا یہ نسخہ انسان کو **اندرونی طور پر طاقتور** بنانے کا فارمولا ہے، تاکہ وہ زمانے کے حوادث کا مقابلہ انبیاء جیسی شان اور استقامت سے کر سکے۔

مولانا روم کے اس نظریے کی گونج فارسی اور اردو کے تمام بڑے کلاسیکی شعراء کے ہاں سنائی دیتی ہے۔ قدیم شعراء کے ہاں "عشقِ حقیقی" صرف ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک ایسی "قوت" ہے جو انسان کو مادی غلامی سے نکال کر کائناتی اقتدار (کار و کیا) عطا کرتی ہے۔

قدیم اساتذہ کے کلام سے اس شعر کی وضاحت درج ذیل ہے:

.1 علامہ اقبال (رومی کے معنوی شاگرد)

اقبال نے رومی کے اسی تصورِ عشق کو اپنی پوری شاعری کی بنیاد بنایا۔ رومی کے دوسرے مصرعے (جس میں انبیاء کی عظمت کا ذکر ہے) کی بہترین شرح اقبال کے اس شعر میں ملتی ہے:

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق

معرکہِ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

وضاحت : اقبال بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں کودنا (صدقِ خلیل) ہو یا میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی استقامت، یہ سب اسی عشقِ الٰہی کا نتیجہ تھا۔ یہی وہ "کار و کیا" ہے جس نے انہیں تاریخ کا لازوال باب بنا دیا۔

.2 میر تقی میر (عشق بحیثیتِ کائناتی قوت)

میر تقی میر، جنہیں خدائے سخن کہا جاتا ہے، وہ بھی عشق کو کائنات کی اصل روح قرار دیتے ہیں:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو

سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

اور ایک اور جگہ رومی کے اسی خیال کی تائید کرتے ہیں کہ عشق ہی انسان کو پست سے بلند کرتا ہے:

ہوئے ہیں خاک سے پیدا، ستارے بن گئے ہیں ہم

محبت نے ہماری ہم کو کیا سے کیا بناڈالا

.3مرزاغالب(بے نیازی اور بلندی)

غالب اگرچہ فلسفہ و تشکیک کے شاعر ہیں، مگر جہاں وہ عشقِ حقیقی کی بات کرتے ہیں، وہاں وہ رومی کے "گُزین"(انتخاب) کی تائید کرتے نظر آتے ہیں کہ جب انسان خدا کی محبت کا انتخاب کر لیتا ہے، تو اسے کائنات کی ہر شے مل جاتی ہے:

بندگی میں بھی وہ آزادو خود آرا ہیں کہ ہم

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وانہ ہوا

وضاحت : یہ وہ شان ہے جو عشقِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے، جہاں انسان اللہ کے سوا کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ یہی وہ "کاروکیا" (اختیار) ہے جس کا ذکر رومی کر رہے ہیں۔

.4مرزاعبدالقادر بیدل(فلسفہِ ظہورِ عشق)

محبت بسکہ مشتاقِ ظہور است

زِہر ذرے نمایاں طورِ نور است

ترجمہ: محبت چونکہ ظاہر ہونے کی مشتاق ہے، اس لیے (خدا کی محبت کا) نور کائنات کے ہر ذرے سے طورِ سینا کی طرح نمایاں ہے۔

وضاحت : بیدل کے نزدیک انبیاء کا "کاروکیا" دراصل اسی الٰہی نور کا ظہور تھا جو ان کے دلوں میں عشق کی صورت میں موجود تھا۔ جب انسان اس عشق کو چن لیتا ہے، تو وہ ذرے سے آفتاب بن جاتا ہے۔

.5خواجہ میر درد(خالص صوفیانہ رنگ)

اردو تصوف کے سب سے معتبر شاعر خواجہ میر درد، رومی کے "عشقِ آن" (صرف اس کا عشق) کی شرح اس طرح کرتے ہیں:

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا

توہی آیا نظر جدھر دیکھا

درد کے نزدیک جب انسان کی نظر صرف اللہ پر ٹھہر جاتی ہے، تو اسے وہ مقام حاصل ہوتا ہے جسے رومی نے انبیاء کی میراث قرار دیا ہے۔

خلاصہ و تطبیق

ان تمام شعراء کے کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ:

- **عشقِ حقیقی** ایک ایسی کیمیا (Alchemy) ہے جو مٹی کے انسان کو نوری صفات عطا کرتی ہے۔
- **انبیاء کی عظمت** ان کی مادی طاقت میں نہیں، بلکہ ان کے اس "تعلق باللہ" میں تھی جس نے انہیں کائنات کا سردار بنا دیا۔
- **قدیم شعراء کا پیغام:** اگر تم بھی دنیا اور آخرت میں "کاروکیا" (مرتبہ اور کامیابی) چاہتے ہو، تو اپنی محبتوں کا مرکز اس ذات کو بناؤ جو فانی نہیں ہے۔

مولانا روم کا یہ شعر دراصل **"فقرِ غیور"** کا سبق ہے، جو انسان کو غیر اللہ کی غلامی سے نکال کر خالق کی دوستی کے تخت پر بٹھا دیتا ہے۔

تو مگو ما را بِدان شَہ بار نیست

با کَریمانؒ کارہا دشوار نیست

مشکل الفاظ کے معنی

مگو: مت کہو۔۔۔بِدان: اُس کے ساتھ / اُس شاہ کے حضور۔۔۔شَہ: بادشاہ، یہاں مراد اللہ تعالیٰ۔۔۔بار: رسائی، قرب، پہنچ۔۔۔۔کَریمان: سخی و مہربان ہستیاں۔۔۔۔دشوار: مشکل

ترجمہ

تو یہ مت کہہ کہ ہماری اس بادشاہ (اللہ) کے دربار تک رسائی نہیں ہے، کیونکہ سخیوں اور کرم کرنے والوں کے لیے (اپنے سائل کا) کام کر دینا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی۔

حضرت رومیؒ اس شعر میں بندۂ مومن کو امید، توکل اور رحمتِ الٰہی کا درس دیتے ہیں۔ انسان جب اپنے گناہوں، کمزوریوں یا دنیاوی مشکلات کو دیکھتا ہے تو کبھی مایوس ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک اس کی رسائی نہیں رہی۔ رومیؒ فرماتے ہیں کہ ایسی ناامیدی درست نہیں۔

اللہ تعالیٰ "شہ" یعنی حقیقی بادشاہ ہے، اور وہ انتہائی کریم، رحیم اور بخشنے والا ہے۔ اگر بندہ سچے دل سے رجوع کرے تو اس کے لیے اللہ کی رحمت کے دروازے بند نہیں ہوتے۔ "با کریمان کارہا دشوار نیست" کا مطلب یہ ہے کہ کریم ہستیوں کے لیے بڑے سے بڑا کام بھی آسان ہوتا ہے۔ جب دنیا کے سخی لوگ دوسروں کی مدد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ، جو سب سے زیادہ کریم ہے، اپنے بندوں پر کیوں رحم نہ فرمائے گا؟

مولانا روم اس شعر میں انسان کو مایوسی سے نکال کر امید کی شاہراہ پر گامزن کرتے ہیں۔ اس کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

1۔ **احساسِ کمتری اور مایوسی کی نفی :** اکثر انسان اپنی گناہوں، کوتاہیوں یا اپنی کم مائیگی کو دیکھ کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ "میں تو بہت گنہگار ہوں، میری دعا کیسے قبول ہوگی؟" یا "مجھ جیسے عام انسان کی رسائی خدا کے دربار تک کیسے ہو سکتی ہے؟" مولانا فرماتے ہیں کہ ایسی باتیں زبان پر مت لاؤ۔ یہ تمہاری اپنی سوچ ہے، خدا کا قانون یہ نہیں ہے۔

2۔ **صفتِ کریمی کا سہارا :** دوسرے مصرعے میں مولانا ایک بہت بڑی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ جب تم کسی "کریم" (سخی) کے دروازے پر جاتے ہو، تو وہاں تمہاری حیثیت نہیں دیکھی جاتی، بلکہ دینے والے کی سخاوت دیکھی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ "اکرم الاکرمین" (سب سے بڑا سخی) ہے۔ اس کے لیے کسی نااہل کو نواز دینا یا کسی بگڑے ہوئے کام کو بنا دینا ذرا بھی مشکل نہیں۔

3۔ **ہمت نہ ہارنے کا درس :** رومیؒ کا پیغام یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے طلب اور جستجو جاری رکھو۔ یہ مت سوچو کہ راستہ بند ہے۔ راستے ان کے لیے کھلتے ہیں جو چلنا شروع کرتے ہیں۔ اگر وہ بادشاہ ہے، تو وہ نہایت سخی بھی ہے۔ اس کے دربار میں حاضری کے لیے کسی خاص پروٹوکول کی نہیں، بلکہ سچی تڑپ اور عاجزی کی ضرورت ہے۔

حاصلِ کلام: یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر کے برابر ہے۔ اپنی کمزوریوں کو دیکھنے کے بجائے اس کی "صفتِ کریمی" پر نظر رکھنی چاہیے، کیونکہ کرم کرنے والوں کے ہاں بڑے سے بڑا کام پلک جھپکتے میں ہو جاتا ہے۔

مولانا روم کا یہ شعر دراصل اسلامی تعلیمات کے نچوڑ پر مبنی ہے۔ قرآن و سنت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی صفتِ کریمی اور بندے کی پکار پر اس کے فوری جواب کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بے شک اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے۔"

یہ مضمون قرآن مجید کی سورۂ زمر (53) میں بیان ہوا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اور میرے بندے جب آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو میں قریب ہوں، دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔"

(سورۂ بقرہ:186)

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ بندے اور اللہ کے درمیان فاصلہ مایوسی سے پیدا ہوتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بہت قریب ہے۔

احادیثِ مبارکہ سے وضاحت

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اُس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جس کی گم شدہ سواری اسے اچانک واپس مل جائے۔"

یہ حدیث اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور بندوں کی طرف اس کی شفقت کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

"اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔"

صوفیانہ نکتہ

تصوف میں "شہ" سے مراد صرف ظاہری بادشاہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اور "بار" سے مراد قربِ الٰہی ہے۔ رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر انسان اخلاص، محبت اور عاجزی اختیار کرے تو اللہ کی بارگاہ تک رسائی ممکن ہے۔ اصل رکاوٹ گناہ نہیں بلکہ ناامیدی اور غفلت ہے۔

یہ شعر امید، محبتِ الٰہی اور رحمتِ خداوندی کا نہایت خوبصورت پیغام دیتا ہے۔

1۔ مایوسی کی ممانعت اور رسائی کا یقین

شعر کا پہلا حصہ) **تو مگو ما را بدان شہ بار نیست** (اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کبھی یہ مت سوچو کہ اللہ تک تمہاری پہنچ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر مایوسی سے منع فرمایا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (سورۃ الزمر:53)

ترجمہ " : آپ فرمادیجیے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کرلی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف فرمادیتا ہے، وہ یقیناً بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔"

حدیثِ نبوی ﷺ : حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي (صحیح بخاری:7405)

ترجمہ " : میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں جیسا وہ میرے بارے میں رکھتا ہے۔ "یعنی اگر تم یہ گمان رکھو گے کہ بادشاہ کے دربار تک تمہاری رسائی ہے، تو وہ راستہ ضرور کھول دے گا۔

2۔ اللہ کی صفتِ کریمی اور سخاوت

شعر کا دوسرا حصہ) **باکریمان کارہا دشوار نیست** (اللہ تعالیٰ کی صفتِ "کریم" پر زور دیتا ہے۔

قرآنِ کریم میں اللہ کی اس صفت کا ذکر یوں ملتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِيۡمِ (سورۃ الانفطار:6)

ترجمہ " :اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے ربِ کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا؟"

حدیثِ نبوی ﷺ :اللہ تعالیٰ کی سخاوت اور حیا کا ذکر اس حدیث میں نہایت خوبصورتی سے ہوا ہے:

إِنَّ اللَّهَ حَيِيٌّ كَرِيمٌ يَسْتَحْيِي إِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ إِلَيْهِ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا خَائِبَتَيْنِ (سنن ترمذی:3556)

ترجمہ " :بے شک اللہ نہایت باحیا اور سخی (کریم) ہے، جب کوئی آدمی اس کے سامنے اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے شرم آتی ہے کہ انہیں خالی اور ناکام واپس لوٹا دے۔"

3۔ اللہ کے لیے کسی کام کا مشکل نہ ہونا

مولانا فرماتے ہیں کہ کرم کرنے والوں کے لیے کام "دشوار" نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ذکر قرآن میں کئی جگہ ہے:

اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ (سورۃ یٰسین:82)

ترجمہ " :اس کا کام تو صرف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے کہتا ہے: 'ہو جا'، پس وہ ہو جاتی ہے۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيۡزٍ (سورۃ ابراہیم:20)

ترجمہ " :اور یہ اللہ پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔"

خلاصہ کلام

ان آیات و احادیث کی روشنی میں مولانا روم کے شعر کی تشریح یہ بنتی ہے کہ:

1. **بندہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو**، اسے اللہ کے دربار سے دوری کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اللہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔
2. **خالق کی صفت "کرم"** ہے، اور سخی کا شیوہ یہ ہے کہ وہ سائل کی اہلیت نہیں بلکہ اپنی سخاوت دیکھتا ہے۔

3. **اللہ کے لیے ناممکن کچھ نہیں**، اس لیے اپنی مشکل کو بڑا نہ سمجھو بلکہ اپنے رب کے کرم کو بڑا سمجھو۔

مولانا روم کا یہ شعر محض ایک اخلاقی درس نہیں ہے، بلکہ یہ **سلوک اور معرفت** کی وہ منزل ہے جہاں سالک (راستہ چلنے والا) اپنی ہستی کو مٹا کر رب کی صفتِ کریمی میں جذب ہو جاتا ہے۔

1۔روحانی تشریح(The Spiritual Perspective)

نفس کی نفی اور قربِ الٰہی

روحانی طور پر "شاہ" (اللہ) کے دربار تک "بار" (رسائی) نہ ہونے کا دعویٰ کرنا دراصل **حجابِ نفس** ہے۔

- جب انسان کہتا ہے کہ "میری وہاں تک رسائی نہیں"، تو وہ اپنی "میں" کو ثابت کر رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنی گناہ گاری یا کمزوری کو اللہ کی رحمت سے بڑا قرار دے رہا ہوتا ہے۔
- **روحانی نکتہ :** یہ شعر سالک کو سکھاتا ہے کہ اپنی بساط نہ دیکھو، بلکہ اس کی عطا دیکھو۔ روحانیت میں "ناامیدی" ایک دیوار ہے، اور "امید" ایک کھڑکی۔ رومیؒ فرماتے ہیں کہ اس کھڑکی کو بند مت کرو، کیونکہ تمہاری روح کا اصل مرکز وہی شاہی دربار ہے۔

2۔وجدانی تشریح(The Ecstatic/Intuitive Perspective)

محبت کا غلبہ اور بیخودی

وجدان (Intuition) کی زبان میں یہ شعر **عشق** کی پکار ہے۔

- عاشق کبھی یہ نہیں کہتا کہ "محبوب مجھ سے دور ہے"۔ وجدانی کیفیت میں دوری کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔
- **وجدانی نکتہ :** جب دل کی آنکھ کھلتی ہے، تو انسان پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ "کریم" (سخی) کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ کسی پکارنے والے کو محروم رکھے۔ وجدان ہمیں بتاتا ہے کہ "کارہا دشوار نیست" (کام مشکل نہیں) کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کی **توجہ** کسی بندے پر ہو جائے، تو برسوں کی مسافت لمحوں میں طے ہو جاتی ہے۔ اسے تصوف میں **"جذب "** کہتے ہیں، جہاں کوشش (سلوک) ختم اور کشش (جذب) شروع ہوتی ہے۔

3۔ عرفانی تشریح (The Gnostic Perspective)

حقیقتِ صفتِ کریمی اور فنا

عرفان (Divine Knowledge) کی رو سے یہ شعر "معرفتِ الٰہی" کے ایک گہرے سمندر کو سمیٹے ہوئے ہے:

- **حجابِ دوئی کا خاتمہ:** عارف جانتا ہے کہ اللہ سے دوری کا تصور ایک وہم ہے۔ جب قرآن کہتا ہے "وہ تمہاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے"، تو یہ کہنا کہ "مجھے وہاں باریابی نہیں" ایک طرح کی جہالت (Ignorance) ہے۔
- **صفتِ کریمی کا ظہور":** کریم "وہ نہیں جو صرف مانگنے پر دے، بلکہ کریم وہ ہے جو سائل کی نااہلی کے باوجود اسے اپنے رنگ میں رنگ لے۔ عرفانی طور پر، اللہ کا "کرم" اس کی صفتِ ذاتیہ ہے۔ جب سالک اس صفتِ کریمی میں فنا ہو جاتا ہے، تو تمام مشکلات (خواہ وہ نفس کی ہوں یا دنیا کی) ہیچ ہو جاتی ہیں۔
- **ادبِ بارگاہ:** عارف کے نزدیک اللہ کے بارے میں یہ کہنا کہ "وہ مجھے نہیں ملے گا" اللہ کی شان میں گستاخی ہے۔ معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے فضل پر ایسا بھروسہ ہو کہ اپنی ہستی درمیان سے ہٹ جائے۔

حاصلِ عرفان (The Mystical Essence)

اس شعر کا مغز یہ ہے کہ:

"تیری طلب ہی تیری رسائی کی دلیل ہے"

اگر اس شاہ کے دربار میں تیری حاضری مقدر نہ ہوتی، تو تیرے دل میں اس کی تڑپ ہی پیدا نہ ہوتی۔ یہ جو تو "اللہ اللہ" کر رہا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے تجھے پکارنے کی اجازت دے دی ہے۔

رومیؒ کا فلسفہ یہ ہے: اپنی نااہلی کے بہانے تراش کر اللہ سے دور نہ ہو، بلکہ اس کی "کریمی" کا واسطہ دے کر اس میں گم ہو جا۔ جہاں "کرم" آ جائے، وہاں "قانون" پیچھے رہ جاتا ہے، اور جہاں "فضل" آ جائے، وہاں "عدل" کی سختی ختم ہو جاتی ہے۔

ایک عارفانہ قول": تیرا یہ کہنا کہ میں گنہگار ہوں اس لیے وہ مجھے نہیں ملے گا، تیری عاجزی نہیں بلکہ تیرا تکبر ہے کہ تو نے اپنے گناہ کو اس کی رحمت سے بڑا سمجھ لیا۔"

موجودہ دور میں، جہاں انسان مادیت پرستی، معاشی بحران، نفسیاتی دباؤ اور "ڈیجیٹل تنہائی" کا شکار ہے، مولانا روم کا یہ شعر ایک **"روحانی اینٹی بائیوٹک "** کی حیثیت رکھتا ہے۔

آج کے حالات میں اس کا اطلاق درج ذیل تین سطحوں پر ہوتا ہے:

1. نفسیاتی سطح پر: مایوسی اور ڈیپریشن کا علاج

آج کا انسان اس لیے پریشان نہیں کہ اس کے پاس وسائل کم ہیں، بلکہ اس لیے کہ اسے **"رسائی (Access) "** ختم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ ہم اکثر کہتے ہیں: "میرا کوئی سفارشی نہیں"، "سسٹم کرپٹ ہے"، یا "میری قسمت ہی خراب ہے"۔

- **اطلاق :** مولانا فرماتے ہیں کہ یہ "منفی گفتگو (Self-negative talk) "بند کرو۔ جب تم کہتے ہو کہ "مجھ جیسے عام آدمی کی شنوائی نہیں ہوگی"، تو تم دراصل اپنی صلاحیتوں اور رب کے کرم پر تالا لگا دیتے ہو۔ موجودہ دور میں **مثبت سوچ (Optimism)** ہی وہ پہلی سیڑھی ہے جو بند راستوں کو کھولتی ہے۔

2. معاشی سطح پر: توکل اور وسیلہ

مہنگائی، بے روزگاری اور معاشی عدم استحکام نے عام آدمی کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ "اب حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے"۔

- **اطلاق" :** با کریمان کارہا دشوار نیست "کا اطلاق یہاں یہ ہے کہ ہم مادی اسباب (Resources) کو ہی کل کائنات سمجھ بیٹھے ہیں۔ رومیؒ یاد دلاتے ہیں کہ مادی اسباب سے اوپر ایک **"صفتِ کریمی "** کام کر رہی ہے۔ موجودہ حالات میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی محنت پوری کرے اور نتائج اس "کریم" پر چھوڑ دے جس کے لیے معیشت کا رخ بدلنا ذرا بھی مشکل نہیں۔

3. سماجی اور عالمی سطح پر: ظلم کے سامنے ڈٹ جانا

عالمی سطح پر جب ہم طاقتور ممالک یا ظالم نظاموں کو دیکھتے ہیں، تو ہمیں لگتا ہے کہ حق کی آواز پہنچانا ممکن ہے) **مارا بدان شہ بار نیست**(۔

- **اطلاق :** یہ شعر ہمیں سکھاتا ہے کہ حق کی جدوجہد میں کبھی یہ نہ سوچو کہ تم اکیلے ہو یا تمہاری آواز کمزور ہے۔ جب مقصد نیک ہو اور پکار سچی ہو، تو غیبی مدد (کرم) کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب لوگوں نے "ناممکن" کا لفظ اپنی لغت سے نکالا، تو بڑے بڑے "دشوار" کام آسان ہو گئے۔

عملی زندگی میں اس کا خلاصہ (Practical Takeaway)

آج کے دور میں اس شعر کو اپنی زندگی پر نافذ کرنے کے لیے یہ تین کام کریں:

1. **بہانے تراشنا چھوڑیں :** یہ کہنا بند کریں کہ "حالات ساز گار نہیں" یا "مجھے کوئی راستہ نہیں مل رہا"۔
2. **خالق کی سخاوت پر یقین رکھیں :** یاد رکھیں کہ آپ کا مسئلہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اللہ کی صفتِ کریمی کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔
3. **پہلا قدم اٹھائیں :** جب آپ یہ مان لیتے ہیں کہ "کارہا دشوار نیست" (کام مشکل نہیں)، تو آپ کے اندر وہ ہمت پیدا ہوتی ہے جو مشکل سے مشکل ہدف کو بھی آسان بنا دیتی ہے۔

سادہ لفظوں میں : آج کا دور "ڈیٹا اور لاجک" کا دور ہے، لیکن رومیؒ ہمیں "عشق اور امید" کا ڈیٹا دے رہے ہیں، جو ہر لاجک سے زیادہ طاقتور ہے۔

مولانا روم کے اس آفاقی پیغام کی گونج ہمیں فارسی اور اردو کے تمام بڑے کلاسیکل شعراء کے ہاں ملتی ہے۔ ان شعراء نے مختلف انداز میں اسی بات کی تشریح کی ہے کہ بندے کی عاجزی اور رب کی کریمی کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔

1. علامہ اقبال: صفتِ کریمی اور گناہ گار کی رسائی

مولانا روم کے "کریم" والے نکتے کو اقبال نے بہت خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب اللہ کا کرم حرکت میں آتا ہے، تو وہ بندے کی ندامت کو بھی قیمتی بنا دیتا ہے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ربط: رومیؒ فرما رہے تھے کہ "کام مشکل نہیں"، اور اقبال گواہی دے رہے ہیں کہ دیکھو، اس کی کریمی نے میرے شرمندگی کے پسینے (عرقِ انفعال) کو بھی موتی بنا کر قبول کر لیا۔ یہ رسائی کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔

2. حافظ شیرازی: رسائی میں رکاوٹ تم خود ہو

رومیؒ نے کہا تھا "یہ مت کہو کہ بادشاہ تک رسائی نہیں"۔ حافظ شیرازی اسی بات کی عرفانی وجہ بتاتے ہیں کہ رسائی کیوں نہیں ہوتی؟

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست

تو خود حجابِ خودی حافظ، از میان برخیز

ترجمہ: عاشق اور معشوق (اللہ) کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے؛ اے حافظ! تو خود ہی اپنی انا کا پردہ بنا ہوا ہے، بس درمیان سے ہٹ جا (رسائی مل جائے گی)۔

ربط: حافظ بتاتے ہیں کہ "شاہ" کے دربار کا راستہ بند نہیں ہے، بلکہ تمہاری "میں" دیوار بنی ہوئی ہے۔ جیسے ہی تم نے "مگو" (نہ کہو) پر عمل کیا، راستہ کھل گیا۔

3. شیخ سعدی شیرازی: کرم کی وسعت

سعدی شیرازی "کریم" کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف نوازتا ہے، بلکہ عیبوں پر پردہ بھی ڈالتا ہے۔

کریمے کہ بر خوانِ یغمائے خویش

کند حِصّہ دشمن کہ آید بہ پیش

ترجمہ: وہ ایسا سخی (کریم) ہے کہ اپنے کرم کے دسترخوان پر دشمن کو بھی حصہ عطا کر دیتا ہے اگر وہ سامنے آ جائے۔

ربط: یہ رومیؒ کے دوسرے مصرعے (با کریمان کارہا دشوار نیست) کی بہترین مثال ہے۔ جب وہ دشمن کو محروم نہیں کرتا، تو تم تو اس کے "شاہی دربار" کے طلب گار ہو، تمہیں کیسے محروم رکھے گا؟

4. مرزا غالب: رحمتِ حق کا بہانہ

غالب، جو انسانی نفسیات اور الہیاتی رندی کے ماہر ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ اللہ کی رحمت تو بہانے ڈھونڈتی ہے، وہاں "دشواری" کا کوئی تصور ہی نہیں۔

بقدرِ حسرتِ دل عرضِ معصیت نہ ہوئی

جگہ بہت ہے ترے دامنِ کریم میں ابھی

ربط: رومیؒ فرما رہے ہیں کہ اسے پکارنے میں مشکل کیا ہے؟ غالب کہتے ہیں کہ میرے گناہ اتنے زیادہ نہیں تھے جتنی اس کے "دامنِ کریم" میں وسعت تھی۔ یعنی "دشواری" سائل کی طرف سے ہو سکتی ہے، اس سخی "شاہ" کی طرف سے نہیں۔

5. میر تقی میر: عاجزی ہی باریابی ہے

رومیؒ کے ہاں "بار" (اجازت) کا ملنا عاجزی سے جڑا ہے۔ میر کہتے ہیں:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

(تشریح بذریعہ ضد): جب انسان اپنی تدبیروں پر بھروسہ کرتا ہے تو راستہ بند ملتا ہے، لیکن جب وہ "بیمارِ دل" بن کر، یعنی ٹوٹ کر اس کے در پر گرتا ہے (جیسا کہ رومیؒ کا منشا ہے)، تو وہی شکستگی اس کے لیے "بار" (رسائی) بن جاتی ہے۔

خلاصہ کلام (لبِ لباب)

ان تمام شعراء کے کلام سے ایک بات واضح ہوتی ہے:

دربارِ الٰہی میں حاضری کے لیے کسی "وی آئی پی" پروٹوکول کی ضرورت نہیں۔

رکاوٹ صرف انسان کی اپنی سوچ اور مایوسی ہے۔

کریم کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ناممکن کو ممکن بنا دے۔

جیسا کہ کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا:

رحمتِ حق بہانہ می جوید، بہانمی جوید

(اللہ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے، قیمت نہیں مانگتی)

مولانا روم کے اس شعر کے **شعری محاسن** (Poetic Beauties) اسے کلامِ الٰہی کی ایک لطیف شرح بناتے ہیں۔ اس مختصر سے شعر میں بلاغت، فصاحت اور معنوی گہرائی کے کئی پہلو پنہاں ہیں:

1. صنعتِ سہلِ ممتنع (Simple yet Unmatchable)

اس شعر کی سب سے بڑی خوبی اس کی **سادگی** ہے۔ اس میں کوئی پیچیدہ استعارہ یا مشکل فلسفیانہ اصطلاح استعمال نہیں کی گئی، لیکن جو پیغام دیا گیا ہے وہ انسانی زندگی کے سب سے بڑے مسئلے (مایوسی) کا حل ہے۔ اسے "سہلِ ممتنع" کہتے ہیں — یعنی ایسا کلام جو دیکھنے میں سادہ لگے مگر ویسا کہنا نہایت مشکل ہو۔

2. تقابل اور تضاد (Contrast)

شعر کے دونوں مصرعوں میں ایک خوبصورت معنوی تقابل موجود ہے:

- **پہلا مصرع**" : شاہ" (بادشاہ) کی ہیبت اور رعب کو ظاہر کرتا ہے، جہاں رسائی مشکل معلوم ہوتی ہے۔
- **دوسرا مصرع**" : کریم" (سخی) کی صفت کو لاتا ہے، جو قربت اور آسانی کی علامت ہے۔ رومیؒ نے "شاہ" کے رعب کو "کریم" کی صفت سے پگھلا دیا ہے، جو کہ بلاغت کا کمال ہے۔

3. صنعتِ حسنِ تعلیل (Poetic Causality)

اس صنعت میں شاعر کسی بات کی ایسی وجہ بیان کرتا ہے جو منطقی تو نہیں ہوتی مگر شاعرانہ اعتبار سے نہایت خوبصورت ہوتی ہے۔

- مولانا نے یہ دعویٰ کیا کہ "یہ مت کہو کہ رسائی نہیں"۔
- اس کی **دلیل** یہ دی کہ "کیونکہ وہ کریم ہے اور کریموں کے لیے مشکل کام بھی آسان ہوتے ہیں"۔ یہاں اللہ کے دربار تک رسائی کی وجہ بندے کی اہلیت کو نہیں، بلکہ اللہ کی "صفتِ کریمی" کو قرار دیا گیا ہے۔

4. ایجاز و اختصار (Conciseness)

صرف دو مصرعوں میں رومیؒ نے **خوف اور رجا (امید)** کے پورے فلسفے کو سمیٹ دیا ہے۔

- "تومگو" (تو مت کہہ) ایک جابرانہ ممانعت نہیں بلکہ ایک مشفقانہ نصیحت ہے جو بندے کو نفسیاتی طور پر مایوسی کے حصار سے باہر نکالتی ہے۔

.5 ردیف اور قافیہ کا اثر

- **قافیہ**" : بار" اور "دشوار"۔
- **ردیف**" : نیست" (نہیں ہے)۔ ردیف "نیست" کا بار بار آنا ایک قطعی فیصلے (Definitive Decree) کی طرح محسوس ہوتا ہے، جو سننے والے کے ذہن سے ہر قسم کے شک وشبہ کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے کہ وہاں رسائی "نہیں ہے" ایسا ممکن ہی نہیں۔

این کتاب همچون سفری بود در کوچه پس کوچه های جان، جایی که هر واژه چراغی شد و هر اندیشه پلی برای عبور به سوی حقیقت. پایان این نوشته، پایان راه نیست؛ بلکه همچون غروب خورشید، نوید طلوعی دیگر است. اگر این صفحات توانسته باشند دل را به اندیشه و اندیشه را به پرواز درآورند، رسالت خویش را یافته اند. حقیقت، در ژرفای روح انسان نهفته است و هر جوینده ای با گام های استوار می تواند به آن نزدیک شود.

یہ کتاب گویا ایک سفر تھی جو روح کی گلیوں اور کوچوں میں طے ہوا، جہاں ہر لفظ چراغ بنا اور ہر خیال ایک پل بن گیا حقیقت تک پہنچنے کے لیے۔ اس تحریر کا اختتام دراصل اختتامِ سفر نہیں؛ بلکہ سورج کے غروب کی مانند ایک نئے طلوع کی بشارت ہے۔ اگر یہ صفحات دل کو سوچنے اور سوچ کو پرواز بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں تو اپنی ذمہ داری ادا کر چکے ہیں۔ حقیقت انسان کی روح کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے اور ہر تلاش کرنے والا مضبوط قدموں کے ساتھ اس کے قریب پہنچ سکتا ہے۔